جلد ۸ نمبر ۴

جولائی سنہ ۱۹۵۶ء ایڈیٹر ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت
دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ میں ایک ایسا دَور بھی گزرا ہے کہ کرۂ ارض پر ہم مسلمانوں سے زیادہ معزز اور اقبال مند کوئی قوم نہ تھی۔ فتحمندی اور کشور کشائی ہمارے قشونِ قاہرہ کے جلو میں رہتی تھی اور کامیابیاں اور کامرانیاں ہمارے قدم چومتی تھیں۔ خلافتِ الٰہی کی زمام ہمارے ہاتھوں میں تھی۔ اور انسانیت کے گلّہ کی پاسبانی ہم کرتے تھے۔ ساری دُنیا میں بس ہمیں ہم نظر آتے تھے۔ "خیر الامم" کا لقب سچ مچ ہمیں زیب دیتا تھا۔

ہم اہلِ ایمان صرف فاتح اور کشور کشا ہی نہ تھے۔ دُنیا ہمیں انسانیت کا سب سے بڑا غمخوار اور امن و صلاح کی کھیتی کا رکھوالا سمجھتی تھی۔ شرافت و آدمیت کی سند ہم سے ہی جاتی تھی۔ علم و فضل کے سکّے ہماری مُہر اور ٹھپّہ کے بعد معتبر بنتے تھے۔ مظلوموں کے لئے ہم شبنم کی طرح رقیق القلب اور سراپا عجز و تواضع تھے اور ظالموں اور سرکشوں کے لئے ہماری ذات سنگِ خارا سے زیادہ سخت اور شعلوں سے بڑھ کر تند و گرم تھی!

ہمارا انصاف بے لاگ تھا، ہمارا اصولِ عدل اپنے اور پرائے میں تمیز کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہماری عدالتوں نے غیروں کی فریاد رسی اس طرح کی ہے کہ اپنوں کو سزائیں دی ہیں اور اُن پر حدیں جاری کی ہیں۔ ہمارا ابرِ کرم دوست دشمن کے کھیتوں میں امتیاز روا نہ رکھتا تھا ہم کہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" تھے اس لئے اللہ کی شانِ احسان و کرم کا اظہار ہماری ذات سے ہوتا تھا۔ دُنیا ہمارے قول و فعل پر اعتبار کرتی تھی اور ہمیں اپنا خیر خواہ اور غمخوار جانتی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے چراغ دُنیا کی محفلوں میں ہم نے روشن کئے ہیں۔ اور جہانبانی کے اصول دُنیا کو ہم نے سکھائے ہیں!

حکمت کو اپنی متاعِ گم شدہ سمجھ کر ہم نے جہاں بھی پایا، اُٹھالیا۔ روم و یونان کے علوم کا نام و نشان بھی آج دنیا میں باقی نہ رہتا اگر ہم علم و دانش کے ان موتیوں کی حفاظت نہ کرتے! علوم کی تحقیق و اکتشاف کی منزلوں کے امیرِ کارواں ہم تھے۔ ہمارے نقشِ قدم سے دُوسروں کو منزلوں کا سُراغ ملتا تھا۔ سائنس کی طرف دماغوں کی رہنمائی ہم نے کی اور صنعت و حرفت کی شاہراہوں میں

سنگِ میل ہم نے قائم کئے۔ پچھلی قوموں نے علم و حکمت کی جتنی مقدار بھی چھوڑی تھی ہم نے اُس میں نہ اسی بھی خُرد بُرد نہیں کی۔ بلکہ اُن میں حیرت انگیز اضافے کئے۔ افادیت تو دُنیا میں ہمارا نام لے کر پھُولتی پھلتی تھی۔ اور دُنیا میں رفاہِ عام کا وجود ہمارے دم قدم سے تھا!

آرٹ کی قدر و قیمت ہی کو نہیں اس کے حدود کو بھی ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے کہ اس کی شوخی اور رنگینی کس نقطہ پر پہنچ کر غیر سنجیدہ اور بازاری بن جاتی ہے۔ تفریح کو ہم نے جائز حدود میں تفریح ہی سمجھا۔ اُسے حاصلِ زندگی نہیں بنایا۔ اس احتیاط کے باوجود محفلوں میں ہم سے زیادہ کشادہ جبیں اور خوش طبع کوئی نہ تھا۔ ہم نے "بادشاہ" بن کر لوگوں کے درمیان زندگی بسر کی "بادشاہ" بن کر نہیں!

ہمارا گھریلو ماحول ایک مثالی ماحول تھا۔ پوری فضا شرم و غیرت، پاکبازی اور نقاہت سے لبریز! دُنیا نے عورت کے ناموس کی حفاظت کے طور طریق ہم سے سیکھے ہیں۔ ہمارے آئینوں میں دیکھ دیکھ کر قوموں نے اپنے کردار و سیرت کی زلفوں کی مشاطگی کی ہے۔ اخلاق کے معلم، نیکیوں کے مبلغ اور صداقت کے علمبردار دُنیا میں ہم تھے، ہماری امانت اور راستبازی کی لوگ قسم کھاتے تھے۔ ہماری بات پانی کی نہیں پتھر کی لکیر ہوتی تھی!

ظلم و ستم کو دیکھ کر ہماری جن آنکھوں سے غضب کے شرارے نکلتے تھے، وہی آنکھیں خدا کے خوف سے راتوں کی تنہائی میں اشکبار رہتی تھیں۔ ہم جفاکش، ایثار پیشہ، اور سختی اُٹھانے والے تھے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے کنواں کھودتے اور اُس سے خود بھی سیراب ہوتے اور دُوسروں کی پیاس بھی بجھاتے، افلاس ہمیں خود فروش اور دولت ہمیں مغرور نہ بناتی تھی۔ ہم "اُمّتِ وسط" ہونے کے سبب توازن و اعتدال کے تقاضوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے!

ہماری عزیمت و ہمت نے پہاڑوں کے درق موڑ کر رکھ دیئے۔ ہمارے حوصلے کسی نازک سے نازک وقت میں بھی پست نہیں ہوئے، مایوسی ہماری کارگاہِ عمل میں قدم رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ تواضع میں ہم ہر قدم کی خاک تھے مگر عزت و جلالت اور خود داری میں ہم اتنے بلند تھے کہ شاہوں کے تاج ہمارے تلووں سے لگے رہتے تھے!

ہماری خوشی اور غم کا پیمانہ رضائے الٰہی تھا۔ ہمارا جینا اور مرنا صرف اللہ کے لئے تھا، اُسی کا خوف اُسی سے طمع! ہماری یہ پیشانی اپنے نبیؐ کی قبر کے آگے نہیں جھکی تو اور کسی کے آستانہ پر کیا جھکتی! خدا کے بعد ہمیں سب سے زیادہ محبت خدا کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تھی۔ حضورؐ ہی کے نقوشِ قدم ہمارے لئے دلیلِ راہ تھے۔ سنتِ نبویؐ کو ہم نے اپنی زندگیوں میں اُتار رکھا تھا۔ یہ رشتہ، رشتۂ جاں سے بھی زیادہ ہمیں عزیز تھا۔ ہم نے حضورؐ ہی کی غلامی کی برکت سے بادشاہوں کے تخت و تاج کو اپنے پیروں سے روندا ہے اور دُنیا کی قیادت اور سیادت ہمارے گھر کی کنیز بن کر رہی ہے!

پردہ نشینانِ حرم عصمتِ مریمؑ کی وارث تھیں ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

جن کی بے داغ زندگیوں کا مطمحِ نظر تھا۔ خدا کی یہ نیک بندیاں کسی غیر مرد کے نظارے کے لئے اپنے لباس کے ایک تار کو بھی مزین نہ بناتی تھیں۔ زینتِ محفل بننے کا تصور بھی بھولے سے اُن کے دل و دماغ میں نہ آتا تھا۔ اُن کے آغوش میں ایکٹر اور رقاص نہیں، مجاہد اور غازی پروان چڑھتے تھے۔

ہم ملت کے اجتماعی مفاد پر اپنے بڑے سے بڑے ذاتی فائدے کو بے دریغ قربان کر سکتے تھے۔ ہم میں اتحاد و اخوت اتنا تھا

کہ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی تسبیح کے دانے نظر آتے تھے۔ نسل و رنگ کے تمام امتیازات کو ہم نے اسلام کی وحدت میں سمو دیا تھا!

ہمارے علماء میں یہ جرأت تھی کہ امراء اور حکام کو اُن کی غلط کاریوں پر ٹوک سکتے۔ انہوں نے حق گوئی کی پاداش میں اپنے جسموں پر کوڑے کھائے ہیں اور قید و بند کے مصائب برداشت کئے ہیں!

اور اب! مگر اب ہم کیا ہیں؟ خزاں دیدہ پتّوں کی طرح بکھرے ہوئے کہ ہوا کا کمزور سے کمزور جھونکا ہمیں جہاں چاہتا ہے اڑا لے جاتا ہے۔ ہماری پراگندگی اور بکھرے ہوئے شیرازے کو دیکھ کر کوئی اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ کبھی متحد تھے! فقہ کے نام پر، علم کلام کی بنیاد پر، رنگ و نسل اور جغرافیائی خطّوں کے امتیاز پر، رسم و رواج، بزرگوں، تصوّف کے خانوادوں اور سجادوں کے تنوع پر اور سیاست کے اغراض پر فرقے، جماعتیں، ٹولیاں اور پارٹیاں جو اَب تک بن چکی ہیں اور بنتی رہتی ہیں اُن کی کوئی حد و نہایت ہے۔ اتحاد کی جگہ افتراق و تشتت نے لے لی ہے اور اُمت گروہوں میں بٹتی چلی جارہی ہے۔

عزت و اقبال ہمارا کب کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ہمارے در و دیوار پر ذلّت و خواری کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ دنیا میں ہماری ساکھ گر چکی ہے۔ ہم سے معاملت کرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں کہ یہ اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں کھا کر اور قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر نہ جانے کب زبان بدل جائیں!

ہم میں ایسے خود غرض لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی اغراض کی خاطر پوری قوم کو کھڑے کھڑے کوڑی کے مول پر بیچ سکتے ہیں۔ ہم میں ایسا ایسا منافق بھی موجود ہے جو اسلام کی ترقی دیکھ کر دل ہی دل میں جلتا اور آپ ہی آپ پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اور غیروں سے سازشیں کر کے اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم میں وہ مجوسی سرشت لکھے پڑھے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے قلم و زبان سے اسلام کے بارے میں بدگمانی پھیلانے اور دلوں کو تشکیک و بے یقینی کی راہ پر لگانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس تخریبی مشن پر انہوں نے "فکر و دانش" اور "تحقیق و آگہی" کا لیبل لگا رکھا ہے!

ہمارے اکابر اور حکمرانوں میں جمال ناصر اور اولیاء السادات جیسے ظالم، شقی القلب اور بے رحم لوگ بھی موجود ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی حق کی جگہ باطل کو لانا اور حق کے علمبرداروں کو مٹانا، برباد کرنا اور بے اثر بنانا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ بے ضمیر علماء ان ظالموں اور منافقوں کی ہم نوائی اور پذیرائی کے لئے موجود ہیں۔ — دراز دستی ایں کوتاہ آستیناں بیں!

ہمارے علمائے کرام کا اب یہ مشغلہ رہ گیا ہے کہ دین کے مخلص اور بے لوث خدمت گزاروں پر کفر و گمراہی کے فتوے لگائیں اُن پر طرح طرح کی ناروا تہمتیں جوڑیں اور اُن کی تحریروں میں تحریف کر کے یا اُن سے عجیب و غریب نکتے تراش کر، مسلمانوں میں بدگمانی پھیلائیں!

ہم ایسے "بڑے لوگوں" سے بھی واقف ہیں جو مسلمانوں کے جلسوں میں علامہ اقبال کے کلام کے مفسّر بلکہ مبلّغ بن کر نمودار ہوتے ہیں اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کو اخوت کا درس دیتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں صوبائی تعصب کے بُت کدے قائم ہیں۔ اور جن کو سدا یہی فکر رہتی ہے کہ فلاں صوبہ کے لوگوں کا سرکار و دربار پر کس عنوان سے غلبہ ہو اس کے لئے کیا چارۂ کار اختیار کیا جائے!

---

[1] علمائے حق کو اس گروہ سے مستثنیٰ سمجھا جائے۔

قوم کی عورتوں میں بے حجابی اور آزادی و بیباکی کا وہ شوق پیدا ہوا ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو اگر جلد سے جلد چیک نہ کیا گیا تو پوری مسلم آبادی "فلم اسٹوڈیو" بن کر رہ جائے گی۔ شریف سے شریف گھرانوں پر بھی اس نحوست کی پرچھائیں پڑنے لگی ہے۔ وہ جو منہ دیکھے کی تھوڑی بہت شرم و آبرو رہ گئی تھی اب اس پر بھی شب خون مارنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جن کا آنچل سر دوپہر بھی نہ دیکھ سکتے تھے اب وہ خود اپنے جسمانی حُسن کو طرح طرح سے نمایاں کر کے حریص نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

عین اُس وقت جبکہ مساجد میں جماعت کھڑی ہوتی ہے اور تکبیر کہنے والا "حی علی الصلوٰۃ" اور "قد قامت الصلوٰۃ" پکار رہا ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوان سینما ہالوں کے دروازوں پر ٹکٹ لینے کے لئے دھینگا مشتی میں مصروف ہوتے ہیں۔ لہو و لعب، عیش و تفریح اور فسق و فجور کی آج گرم بازاری ہمارے دم سے ہے!

"صدقِ مقال" کا یہ عالم کہ ہم ذرا سے فائدے کے لئے بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اور "اکلِ حلال" کی یہ کیفیت کہ حرام و حلال کا امتیاز ہی سرے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ سٹہ، جوا، لاٹری، چور بازاری، جعل، فریب۔ غرض جس طرح بھی روزی کمائی جا سکتی ہے کماتے ہیں۔ اور شرم و ندامت کے پسینہ کی ایک بوند بھی ہمارے ماتھے پر نمودار نہیں ہوتی!

دفتری کاروبار کا یہ عالم ہے کہ چپراسی اپنا حق مانگتا ہے اور افسر اپنے لئے تحفہ طلب کرتا ہے۔ ہر طرف رشوت کا چلن ہے اور جلبِ منفعت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں!

دعویٰ یہ کہ ہم توحید پرست ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں اور ساری دُنیا میں توحیدِ خالص کی حامل صرف ہماری ذات ہے مگر ہم میں کتنے ایسے ہیں جو قبروں کا طواف کرتے، آستانوں کو چومتے، چوکھٹوں پر سر رکھتے اور اہلِ قبور سے مدد مانگتے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ہمارے بھائی بند مطمئن ہیں کہ ایسی مشرکانہ باتوں سے نہ توحید پر کوئی حرف آتا ہے نہ ایمان پر کوئی زد پڑتی ہے!

ہماری محفلیں ایک دوسرے کی غیبتوں کے لئے وقف ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو گرانے اور ذلیل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔ اپنے کلمہ گو بھائی کے زوالِ نعمت کی خبر ہمارے لئے نویدِ مسرت ہوتی ہے!

ہم میں سے ہر کوئی اپنے رسولؐ کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ مگر عمل کی دُنیا میں ہماری محبت قدم قدم پر اپنے محبوب سے غداری اور بے وفائی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات و احکام کی ہم کس نشاطِ خاطر کیساتھ خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کی محبت ہے کہ محبوب کی چاہت پر اپنی پسند کو ہم نے غالب کر رکھا ہے اور جن کو ہم اپنا آقا، حضورؐ اور سرکارؐ کہتے ہیں اُن کے فرمان کی عدمِ تعمیل کو ہم نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے!

آخرت کا، جنّت و دوزخ کا اور گناہ و ثواب کے اجر و عقوبت کا ہم میں سے کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اعمال و کردار میں محاسبۂ آخرت کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے! ہمارے اور منکرینِ خدا و آخرت کے مشاغل میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا!

ہم میں جو مذہبی لوگ ہیں اُن میں کتنے ایسے ہیں جو اقامتِ دین کے تقاضوں سے باخبر ہیں اور اُن کے اندر اللہ کے دین کو غالب کرنے کا ولولہ پایا جاتا ہے۔ نظامِ کفر کے سایہ میں اذانیں اور نمازیں ہوتی رہیں بس اسی کو انہوں نے دین کی اقامت، تبلیغ اور سربلندی کا ماحصل سمجھ رکھا ہے!

ہمارے حالات کو، مشاغل کو اور معاشرے کو دُنیا دیکھ دیکھ کر ہنستی ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کو دینِ فطرت

کہتے ہیں اور جن کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کے سوا اور کوئی دوسری صراطِ مستقیم نہیں اور یہی ہدایت و فلاح کی راہ ہے ـــــ مگر یہ خود کہاں بھٹکے جا رہے ہیں۔ دعوے رہبری اور رہنمائی کے مگر رہزنوں اور بٹ ماروں کے سے چلن! سچ تو یہ ہے خود ہمارے وجود نے اسلام کو رسوا کر رکھا ہے۔ لوگ ہم نابکاروں اور نافرمانوں کی "خزاں" سے گلشنِ اسلام کی "بہار" کا اندازہ لگاتے ہیں۔

جھونپڑیوں سے لے کر قصر و ایوان تک خدا فراموشی کا ایک ہی رنگ ہے۔ غریب و امیر کی غفلتوں کا ایک ہی عالم ہے۔ ہماری زندگیوں کا ایسا کونسا رُخ ہے جس میں بگاڑ پیدا نہیں ہوا ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کُجا کُجا نہم

اتنی بلندی اور ایسی پستی۔ وہ عروج اور یہ زوال۔ اُس "طربیہ" کے بعد یہ "حزنیہ"! اللھم احفظنا من الحور بعد الکور!

بہ خیز......! یہ شامتیں خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہیں۔ ہم نے جو بویا اُسے کاٹ بھی رہے ہیں۔ ہماری غفلتوں، شرارتوں اور بد اعمالیوں کا صلہ ہمیں مل رہا ہے!

اب کیا ہوگا؟؟ اگر ہم نے کسی اچھے تغیر کے لئے جد و جہد نہ کی اور قوم نے غفلت کو بیداری سے نہ بدلا تو ہمارے مسلمانوں جیسے نام اور یہ اصطلاحی اور قانونی "نسبتیں" ہمیں اس خوفناک زوال سے نہیں بچا سکتیں جس کی پرچھائیاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں!

ہمارے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنی اس نکبت اور زبوں حالی کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں۔ جن کے اندر اصلاح و انقلاب کا کوئی ولولہ اور کوئی اُمنگ نہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی ذلت جن کی رگِ حمیت و غیرت کو حرکت میں نہیں لاتی! ہمارا خطاب اُن افراد سے ہے جو ملت کے بگاڑ کا احساس اپنے اندر رکھتے ہیں اور اصلاح و انقلاب کی تڑپ جن کے اندر موجود ہے۔ ملت کا یہی وہ زندہ عنصر اور جوہرِ قابل ہے جس سے تغیرِ احوال کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ اور جن کی جد و جہد اللہ کے غضب کو رحمت سے بدل سکتی ہے۔

یہ اضطراب، یہ دھڑکن، یہ تپش، یہ بے تابی، یہ اخلاص اور لگن جہاں جہاں بھی پائی جاتی ہے اسے ایک قوتِ متحدہ بن جانا چاہیئے۔ منتشر ذروں کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں۔ جب یہ مل جاتے ہیں تو بہت بڑی چیز بن جاتے ہیں۔ اب یہ سوچنے کا وقت نہیں رہا کہ پہل کون کرے! اور پہل تو اللہ کے فضل سے ہو چکی ہے۔ ایسے مخلص، حق شناس اور باہمت لوگ میدانِ عمل میں آ چکے ہیں جو اللہ کے دین کو غالب کرنے کا سودا اپنے سروں میں رکھتے ہیں۔ جو اسلامی انقلاب کی تحریک کے داعی ہیں۔ جنہوں نے انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اقامتِ دین کی جد و جہد کو جاری رکھا ہے۔ کوئی رکاوٹ انھیں اپنے مقصد اور مشن سے دل برداشتہ نہیں بناتی اور کسی مصیبت کو دیکھ کر وہ ہمت نہیں ہارتے۔ وہ آزمائشوں میں بھی ڈالے گئے ہیں مگر اُن کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی!

خدا کے ان نیک اور مخلص بندوں کے پاس صرف جوش اور ولولہ ہی نہیں، دین کی صحیح فہم بھی ہے اور ساتھ ہی زمانہ کے تقاضوں سے بھی وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ اسی تحریک سے، اسی جماعت سے اور اسی اندازِ فکر و عمل سے اقامتِ دین کی توقع وابستہ ہیں۔ آپ کو اسلام کی سربلندی مطلوب ہے تو اس تحریک کا ساتھ دیجئے۔

مگر اُدھر آنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح سوچ لیجئے کہ "اقامتِ دین" کی تحریک کوئی وقتی اور ہنگامی تحریک نہیں ہے جو کسی سیاسی اور اقتصادی مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ جس طرح نظامِ کائنات قیامت تک حرکت میں رہیگا اور اسکی افادیت ختم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح "اقامتِ دین" کی تحریک کو سکون و آرام کی فراغت اور فرصت نصیب نہیں۔ پھر اس راہ میں

نفس کے لئے کوئی لذت نہیں، یہ چٹخاروں کی نہیں ایثار اور جفاکشی کی راہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر خطرے بھی ہیں۔ ادھر کا رُخ کرتے ہی سب سے پہلے تو بعض تنگ نظر مولویوں اور صاحبانِ دلق و سجادہ کی کفر ساز مشینوں کی چاند ماری سے آپ کا سابقہ پڑے گا۔ آپ پر گمراہی اور بے دینی کی تہمتیں جوڑی جائیں گی، طنز کی جائے گی کہ آپ "محمدی اسلام" کو چھوڑ کر "مودودی اسلام" کی طرف جا رہے ہیں۔ اس راہ میں قدم رکھتے ہی کتنی لمبی داڑھیاں، کتنی نیچی قبائیں اور کتنے سجادے آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کوئی کہیگا آپ "خارجی" ہو گئے ہیں۔ کہیں سے آواز آئے گی آپ "منکرِ حدیث" ہیں۔ مگر آپ کو یہ سفر جاری رکھنا ہے تو زہر کے ان جرعوں کو گوارا کرنا ہوگا!

پھر آپ کو حق و باطل کی مستقل کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جس میں ہر مصیبت پیش آسکتی ہے اور آنی چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نبیوں جیسے محبوب ترین بندوں کے لئے اس خارزار کو پھولوں کی سیج اور فرشِ گل نہیں بنایا تو آپ کیلئے اللہ کی سنت کس طرح بدل سکتی ہے! اور یہ تو وہ دَور ہے جب دہکتے ہوئے انگارے کو مٹھی میں پکڑنا آسان ہے مگر دینِ حق پر جمے رہنا مشکل ہے۔ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

بدر و اُحد کے شہیدوں کا خون کربلا کے میدان میں حق پرستوں کے خون سے جا کر ملا۔ اور پھر یہ ایک مستقل سنت بن گئی۔ امام احمد بن حنبل کا دَور ہو یا علامہ ابن تیمیہؒ کی صدی، مجدد الف ثانیؒ کا عہد ہو یا سید احمد شہیدؒ کا زمانہ۔ یہ سوزِ عشق اور سودائے محبت ہمیشہ گردش میں رہا ہے ؎

ابھی ہے اس حقیقت سے چراغِ صبح بیگانہ
کہ سوزِ عشق گردش میں ہے پروازِ پروانہ!

اور ہمارے زمانے میں حسن البنا کے خونِ ناحق نے اس محضر پر شہادت کی مُہر ثبت کر دی، پھر عبدالقادر عودہ، طلعت محمود فرغلی اور دوسرے شہیدوں نے حق و صداقت کی تاریخ میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ لاہور کے پھانسی گھر نے ان کڑیوں کو مربوط کر دیا ؎

لاکھوں حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اگر آپ کو سچے دل سے اسلام کی سربلندی مطلوب ہے تو پھر اقامتِ دین کی تحریک کا ساتھ دیجئے اور اللہ کے دین کو غالب کر کے تمام دنیا کو امن و عافیت سے معمور کر دیجئے کہ تخریبی انقلابات سے دنیا تنگ آچکی ہے اور اب وہ تعمیر و اصلاح کی بنیاد پر انقلاب چاہتی ہے۔ جس کے آغوش میں انسانیت کو آسودگی میسر آسکے!

جو لوگ کسی عزم و حرکت کے بغیر محض دعاؤں سے انقلاب چاہتے ہیں وہ دعا کی غرض و غایت سے بے خبر ہیں۔ دعا کی اہمیت سے کوئی مسلمان منکر نہیں ہو سکتا کہ ہر تدبیر کا سر رشتہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے مگر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ امامِ انس و جان اور محبوبِ ربِ کون و مکان نے بدر کے میدان میں جب دعا مانگی تھی تو اُس پر آمین کہنے کے لئے مجاہدوں کی تلواریں بھی موجود تھیں۔ "دعائے بے تدبیر" راہبوں کا شیوہ ہے اور "تدبیر بے دعا" خدا کے باغیوں کی روش ہے۔ اور ہم ان میں سے کسی مسلک کو قبول نہیں کر سکتے۔ اپنی تمام توانائیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگائے رہنا اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے فوز و فلاح کی دعا کرتے رہنا۔ یہ ہے مردِ مومن کی وہ صحیح روش جس کو انبیاء کرام نے اختیار فرمایا ہے اور اسی راہ پر ہمیں بھی چلنا ہے اور اس راہ پر گامزن ہونے کی توفیق ہی اس منزل کی کامیابی ہے!

حق و صداقت کو تاریخ کے ہر دَور میں آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ غرض کے بندوں اور خواہشوں کے پجاریوں نے ہا ...

سرورِ کائنات کے معجزات

(ملا واحدی کی زیرِ ترتیب کتاب "حیاتِ سرورِ کائنات" حصہ دوم کا ایک مضمون)

حیاتِ سرورِ کائنات حصہ اوّل کے ابتدائی صفحات میں ایک مضمون ہے۔ جس کا عنوان ہے "اہلِ عرب سرورِ کائنات سے قبل" اُسے پڑھیے اور دیکھیے کہ جب ساری دُنیا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عرب اندھیرے کے اعتبار سے دُنیا کا سرتاج تھا۔ اُس وقت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو پیدا کیا گیا۔ اور پھر حضورؐ کو باپ، ماں اور دادا کی سرپرستی سے یکے بعد دیگرے محروم کر دیا گیا۔ تاکہ جو اُلٹی سیدھی تربیت مل سکتی ہو وہ تک نہ ملے۔

لکھنا پڑھنا اوّل تو اہلِ عرب کو نسا جانتے تھے۔ لیکن حضورؐ نے حروف شناسی کا موقع بھی نہیں پایا۔ حضورؐ بچپن میں اپنی انّا بی بی حلیمہ کے بچوں کے ساتھ بکریاں چراتے رہے۔ جوانی میں تجارت کرنے لگے، تجارتی قافلوں کے ساتھ باہر گئے تو زیادہ سے زیادہ شام گئے۔ روم، ایران اور مصر نہیں گئے۔ جو اُس وقت کے ملکوں میں نسبتاً تہذیب یافتہ تھے۔ اور چلے جاتے تو وہاں ایسا کیا سبق مل جاتا کہ حضورؐ یکایک کُل عالم کو سبق سکھانے کے قابل ہو جاتے۔ تمام انبیاء تو ایک ایک قطعہ زمین کی رہنمائی کرتے آئے تھے۔ حضورؐ ساری دُنیا کی رہنمائی فرماتے اور معاشرت و معیشت، قانون و سیاست، تہذیب و تمدّن، مذہب و اخلاق کی ایسی باتیں بتلاتے جن کا چالیس سال کی عمر سے پہلے تو حضورؐ کو علم نہ تھا اور جن کا اُس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا۔ اور معلومات کا ایسا ذخیرہ چھوڑ جاتے جنہیں اُس وقت عرب کیا دُنیا میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

يُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ ہمارا رسول تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم اور حضورؐ کی صحبت نے تیئیس سال کے اندر اندر جاہل اور سرکش عربوں کو جیسا آدمی بنا دیا اُس پر غور فرمائیے۔ اسے معجزہ نہ کہیے گا تو کیا کہیے گا۔ حضورؐ پارس تھے، جو حضورؐ سے چھو گیا سونا بن گیا۔ آج کل تبلیغ کے جتنے وسائل ہیں، مدرسے، کالج، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، اخبار، رسالے، کتابیں، ریل، ہوائی جہاز۔ ان وسائل کا چودہ سو برس پہلے انسان تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ کیا اب ان وسائل کی موجودگی میں اور دولت و حکومت کی مدد سے کر حضورؐ کے برابر کامیاب ہوا جا سکتا ہے؟

عرب میں نہ دولت تھی نہ حکومت اور اگر تھی تو حضورؐ کے پاس نہیں تھی۔ اُن کے پاس تھی جو گوارا نہیں کرتے تھے کہ حضورؐ جہالت و وحشت کو ختم کریں اور تہذیب و تمدّن پھیلائیں۔ ضابطوں، قاعدوں میں انہیں جکڑیں۔ چوری، رہزنی، قتل، خونریزی، شراب، جوئے اور زنا سے انہیں روکیں، انہیں سوتیلی ماؤں سے نکاح نہ کرنے دیں۔ مادر زاد برہنہ ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف نہ کرنے دیں۔ پتھروں، درختوں، ستاروں وغیرہ کی پرستش نہ کرنے دیں۔ مگر حضورؐ کے مخالفوں کی دولت اور مخالفوں کا اقتدار دونوں دھرے رہ گئے اور بالآخر حضورؐ نے انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر ہی دیا۔ اتنی روشنی میں کہ جس تعلیم کے وہ مخالف تھے اُسے وہی دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے ... تمدن پھیلاتے پھرے، مخالف ڈو چار نہ تھے۔ ملک کا ملک مخالف تھا اور سارے ملک کا ملک حضورؐ کی تعلیمات کا

دل وجان سے فدائی بلکہ اس کا مبلغ و منّاد ہو گیا۔

مخالفوں نے حضورؐ سے کہا کہ ہمیں ہماری قدیم روش پر چلنے دو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے اور اگر تم باز نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ حضورؐ نے بادشاہت کو ٹھکرا دیا اور ظلم پر ظلم سینے پر قبول کئے اور مسلسل تیرہ برس ظلم سہے اور پھر اُن ظلم کرنے والوں کو جنہوں نے حضورؐ کو لہولہان کیا تھا۔ جنہوں نے حضورؐ کو وطن سے بے وطن کیا تھا۔ جنہوں نے حضورؐ پر فوج کشیاں کی تھیں، انسانیت کی انتہائی بلندی پر جا بٹھایا جانوروں سے بدتر لوگ فوق البشر قسم کے انسان بن گئے۔ ایسے انسان جن کی نظیر نہیں ملتی۔ کیا بادشاہت کو ٹھکرا دینا اور مظالم کو قبول کرنا اور دشمنوں کو دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کر دینا اور خود دنیا کا ذرا سا آرام نہ اٹھانا معجزہ نہ تھا۔

بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی جیسی انگلی نبوت کا سب سے بڑا معجزہ آپ کی نبوت سے قبل زندگی تھی۔ نبوت سے قبل کا کیرکٹر اور نبوت سے قبل کے حالات اُن کے دعوے کی صداقت کو ثابت کرتے تھے۔ لیکن سمجھنے والے صدیقین اور صالحین ہی اسے سمجھ سکتے تھے[1] اور نہ سمجھنے والے اور اور معجزے مانگتے رہتے تھے اور وہ معجزے دیکھ کر بھی عموماً ایمان نہ لاتے تھے۔ مَا اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ○ (ان منکرین خاتم النبیینؐ سے پہلے کی جن جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا ہے اُن میں کوئی بھی (ہلاکت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد اپنے زمانہ کے پیغمبر پر) ایمان نہیں لایا تھا۔ تو کیا یہ (آجکل کے ایمان نہ لانے والے خرق عادات اور حسی معجزوں کی وجہ سے) ایمان لے آئیں گے۔ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ (اور ہم حسی معجزے بھیجیں تو ہمارا ہاتھ کون پکڑتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ایمان نہ لانے والے یہ معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لایا کرتے) پچھلے لوگوں نے حسی معجزے ہی تو جھٹلائے تھے۔

تاہم اتمام حجت کے لئے نبیوں اور رسولوں کو حسی معجزے دیئے ضرور گئے اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس معاملہ میں مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حضورؐ کو بھی خرق عادات اور حسی معجزے ملے۔

ہمیشہ سے تین قسم کے آدمی ہوتے رہے ہیں۔ ایک حضرت خدیجہؓ حضرت زیدؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ جیسے۔ جنہیں حسی معجزوں کی قطعی احتیاج نہیں تھی۔ دوسری قسم میں ابولہب اور ابوجہل ہیں کہ مرتے مر گئے۔ لیکن کسی دلیل، کسی نشانی اور کسی معجزے نے اُن کی آنکھوں کے آگے سے پردہ نہیں ہٹایا۔ وہ معجزہ دیکھتے تھے تو اسے جادو کہہ دیتے تھے۔ تیسری قسم درمیانی حضرات کی ہے کہ حسی معجزات سے اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور اُن کے ایمان مستحکم ہو گئے۔

معجزے نبیوں اور رسولوں کو حالات اور وقت کے مناسب دیئے جایا کرتے تھے۔ حضورؐ کو حضورؐ کے حالات اور وقت کے مناسب

---

[1] مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

در دلِ ہر اُمتی کز حق مزہ است   روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

جو حق و صداقت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے اس کا دل تو پیغمبر کے چہرہ اور پیغمبر کی آواز میں اعجاز دیکھ لیتا ہے۔

معجزہ جست از نبی بوجہل سگ   دید و نفزودش ازاں الا کہ شک

ابوجہل کتے نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزہ کا مطالبہ کیا اور معجزہ دیکھ کر اس کے کفر میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

لیکن آں صدیق حق معجز نخواست   گفت ایں رو خود نگوید غیر راست

لیکن ابوبکر صدیقؓ معجزہ کے طالب نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ چہرہ بھلا سچ کے سوا کیا بول سکتا ہے۔

پچھلے پیغمبروں کے تمام معجزے اپنے اپنے زمانوں کے لئے تھے اور ان کا اثر محدود تھا۔ حضورؐ سارے دنیا کے لئے آئے تھے، اور آخری پیغمبر ہو کر آئے تھے۔ لہٰذا حضورؐ کو ایسا معجزہ عطا کیا گیا جس کا اعجاز تا قیامت باقی رہیگا۔ اور جوں جوں انسان کی عقل اور انسانیت ترقی کرے گی ووں ووں حضورؐ کے معجزے چمکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن گیا اور جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کوڑھیوں کو تن درستی اور مُردوں کو زندگی عطا کی۔ مگر ان معجزوں کا نتیجہ کیا نکلا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور پچھلے جملہ نبی اور رسول دُنیا سے رخصت ہونے لگے تو ان کے گنے چنے پیرو تھے۔ اور وہ پیرو بھی ان عظیم المرتبت پیغمبروں سے کیا اتنے متاثر ہوئے جتنا ہونا چاہیئے تھا۔ پھر ان پیغمبروں کے معجزوں کو انہی زمانے کے لوگوں نے دیکھا یا سُنا دیکھ لیا۔ آج ان معجزوں کا انکار اقرار کی نسبت آسان ہے۔ برخلاف ازیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو وقتی معجزے بھی ملے۔ مثلاً معجزہ شق القمر۔ اور دائمی معجزہ بھی ملا۔ یعنی قرآن مجید۔ حضورؐ زندہ نبی ہیں اور حضورؐ کا معجزہ زندہ معجزہ ہے!

معجزہ کی اصطلاح بعد کے حضرات نے تجویز کی ہے۔ قرآن یا حدیث میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ قرآن اور حدیث میں بجائے معجزہ کے آیت، حجت، برہان اور سلطان کے الفاظ ہیں۔ یا تائید اور نصرت کہا گیا ہے۔ جامع لفظ آیت ہے۔ آیت کے معنی ہیں علامت۔ نشانی، شناخت کی علامت و نشانی۔ دُنیا میں جتنی چیزیں ہیں علامتوں اور نشانیوں سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ یہ فلاں شخص ہے۔ یہ فلاں جانور ہے۔ یہ فلاں پھل ہے۔ یہ فلاں پتھر ہے۔ یہ اچھا ہے۔ یہ بُرا ہے۔ اگر علامات ذہن میں نہ ہوں تو انسان کسی چیز کی بابت کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ انسان اور حیوان میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ بُرے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اللہ اور اللہ کے پیغمبروں کے پہچاننے کے لئے آیت کا لفظ خاص طور سے اور اصطلاحاً بولا جاتا ہے۔

انسان فقط اُن چیزوں پر حیرت کا اظہار کیا کرتا ہے جنہیں وہ روز مرّہ نہیں دیکھتا۔ حالانکہ حیرت کے لائق اللہ کی ایک ایک صنعت ہے۔ قرآن اور حدیث اللہ کی صنعتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ چاند کا طلوع ہونا۔ پھر بڑھنا اور گھٹنا۔ رات بھر چمکنا اور دن بھر غائب رہنا۔ مستقل اور دائمی آیت ہے اور چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا وقتی اور عارضی آیت۔ جس اللہ میں چاند کو بنانے اور نظم کے ساتھ قابو میں رکھنے کی قدرت ہے اس میں چاند کے دو ٹکڑے کر دینے کی بھی قدرت ہے اور یہ بھی قدرت ہے کہ ایسا واقعہ ظہور میں لائے اور اس کے باوجود نظامِ عالم میں خرق نہ آنے دے۔ مستقل اور دائمی آیات اللہ کی پیدا کی ہوئی تمام چیزیں ہیں۔ رات، دن، سورج، چاند، آسمان، زمین، پہاڑ، سمندر، بارش، بجلی، نر، مادہ، چوپائے، چرند، پرند، خود تمہاری پیدائش۔ تمہارا پلنا۔ تمہارا زبانوں اور رنگوں میں اختلاف، غرض کس کس چیز کا نام لیا جائے، گنوایا نہیں جا سکتا۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۔ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی نشانیوں کو نہ مانے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

مستقل اور دائمی آیات وقتی اور عارضی آیات کی صداقت کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہیں۔[1]

بہرحال اسلام عارضی اور غیر عارضی دونوں کو آیات کہتا ہے۔ ہم غیر عارضی آیات کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عارضی وہ وقتی

---

[1] پیغمبروں کے معجزے اللہ کے قبضہ میں تھے۔ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ پیغمبر اپنے اختیار سے اور اللہ کی مرضی اور مشیت کے بغیر معجزے نہیں دکھا سکتے تھے۔ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔

آیات و معجزات سے دیکھنے والوں نے اثر لیا بھی اور نہیں بھی لیا اور اب نہ دیکھنے والے اُن کے تعلق شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ بھلا یہ کیونکر ہوا ہوگا۔ اتنی بڑی زمین کے متعلق چکر کھانے پر عقل نہیں چکراتی۔ لیکن اگر بیان کیا جائے کہ اللہ چھوٹا سا گولا معلق رکھ سکتا ہے اور اُسے معلق حالت میں گردش دے سکتا ہے تو عقل کو گھمیری آ جاتی ہے۔ اللہ کے ادنیٰ کارناموں کو مانتے ہوئے ہم ہچکچاتے ہیں اور سٹپٹاتے ہیں حالانکہ سٹپٹانے کے لائق تو زمین اور زمین کے اُوپر کا ذرّہ ذرّہ ہے۔ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۔ ماننے والوں کے واسطے زمین میں آیات ہی آیات ہیں۔ خود تمہارے وجود میں آیات ہیں۔ تم انہیں آنکھیں کھول کر دیکھتے نہیں ــــ!

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ صرف عقل سے اپنے کو پہچنوانا اور اپنے احکام کو منوانا چاہتا تھا۔ لیکن کم عقلوں اور کٹ حجتوں نے مطالبہ کیا کہ نہیں، تم ہم قسم کے معجزے ہی لاؤ۔ ہمارے نزدیک صداقت کا معیار خارق عادات واقعات ہی ہیں۔

ایک دَور تھا کہ انسان افعالِ اللہ سے اتنا متاثر تھا کہ اُس نے افعالِ اللہ کو اللہ قرار دے دیا۔ اُس دَور کی یادگاریں آگ، پانی، درخت اور پہاڑ کی پرستش کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں۔ اُس دَور کے انسان افعالِ اللہ کے سامنے اللہ کو بھول گئے۔ وہ اللہ کی بجائے اللہ کے مظاہر کی پرستش کرنے لگے۔ پھر ایک دَور آیا کہ افعالِ اللہ کے ساتھ مساوات ہوگئی اور اللہ کے پیغمبر بھٹکے ہوئے لوگوں سے راہ راست پر آنے کے لئے کہتے تو اُن سے خواہش کی جاتی کہ اللہ کے نئے کرشموں کا مشاہدہ کراؤ۔ لیکن حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نے تیسرے دَور کا آغاز کیا۔

حضور کی بعثت کے وقت نوعِ انسان اس قابل ہو چکی تھی کہ اُس کے بچپنے اور جوانی دیوانی کی ذہنیت بدل جائے اور اُس میں پختہ کاری آئے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اب نوعِ انسان سے اُسی طرح خطاب فرمایا جس طرح پختہ عمر والوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ فرمایا:۔
قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ (اے محمدؐ!) کہہ دو۔ میرا طریق یہ ہے کہ میں اللہ کی جانب (عقل اور) بصیرت کے ذریعہ بُلاتا ہوں۔ میرا اور جو میرے نقشِ قدم پر چلتا ہے اس کا طریق کار یہی ہے۔ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ جسے ہلاک ہونا ہے وہ اتمامِ بیّنات کے بعد ہلاک ہو اور جسے جینا ہے وہ بیّنات دیکھ کر جئے۔ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۔ اللہ کی نگاہ میں بدترین حیوان وہ انسان ہیں جو بہرے اور گونگے ہو گئے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

معجزہ طلبی پر ارشاد ہوا:۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔

(اے محمدؐ!) جب تم اُن کے پاس کوئی (خرقِ عادت) نشانی (معجزہ) لے کر نہیں جاتے تو وہ (از راہِ طنز) کہتے ہیں۔ نشانی اپنے جی سے کیوں نہ گھڑ لی۔ کہہ دو کہ میں تو اُس وحی کی تعمیل کرتا ہوں جو میرا پروردگار مجھے بھیجتا ہے۔ (اپنے جی سے کچھ نہیں گھڑتا)

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بصیرتوں کا مجموعہ ہے اور جو اہلِ یقین ہیں اُن کے لئے باعثِ ہدایت و رحمت ہے۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ٥

(ذرا بنی اسرائیل سے پوچھو تو) ہم نے انھیں کیسی کیسی (خرق عادت) نشانیاں دکھائی تھیں۔ (انھیں دیکھ کر بھی تو وہ راہ ہدایت پر قائم نہ رہے) اور جو اللہ کی رحمت آنے کے بعد اُسے (شقاوت سے) بدل ڈالے تو یاد رکھو اللہ سزا دینے میں بڑا سخت ہے۔ (اس کے بعد عذاب آتا ہے)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ۔ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۔ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

اس قرآن میں ہم نے بنی نوع انسان کے فائدہ اور ہدایت کی ساری باتیں بیان کردی ہیں (جنھیں فائدہ اٹھانا اور ہدایت یاب ہونا ہوگا وہ فائدہ اٹھالیں گے اور ہدایت یاب ہوجائیں گے) اور جنھوں نے راہ انکار اختیار کر رکھی ہے، اُن کے پاس تم کیسی ہی نشانی لے جاؤ وہ یہی کہیں گے کہ تم (اور تمھارے متبع) سب غلط راہ پر گامزن ہو۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اونہی عقل والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ۔ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۔

• تمہاری پکار کا وہی جواب دے سکتے ہیں جو تمہاری پکار سُنتے ہیں۔ لیکن جو (سرے سے) مُردہ ہیں (اُن سے جواب کی کیا اُمید لگائے ہو) انھیں تو (بس) اللہ (قبروں سے) اٹھائے گا اور وہ اُس کے پاس لوٹائے جائیں گے۔ (اور اُس وقت جو دیکھنا ہو دیکھ لیں گے)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا۔ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ٥ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ٥ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰی وَحَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ ٥

اور یہ (کفار) اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی (خرق عادت) معجزہ انھیں دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے ——

(اے محمد!) تم جواب دے دو کہ معجزے اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ (میرے قبضہ میں نہیں ہیں) تمھیں کیا معلوم، معجزہ دکھا دیا جائے تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (کیونکہ خود ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں) ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اُلٹ دیں گے (یہ خرق عادت معجزے بھی دیکھیں گے تو انکار ہی کریں گے) جس طرح قرآن پر اوّل دن ایمان نہیں لائے تھے (اُسی طرح خرق عادت معجزوں کا اِن پر اثر نہیں ہوگا) ہم انھیں (اُن کے حال پر) چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں سر پھوڑتے اور بھٹکتے پھریں۔ یقین جانو، ہم اِن پر فرشتے اُتار دیتے یا (ایسا کرتے کہ قبروں کے) مُردے (اُٹھ کر) اِن سے باتیں کرنے لگتے اور جتنی چیزیں بھی دُنیا میں ہیں سب کو اِن کے سامنے (گواہی میں) لاکھڑا کرتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے) ہاں اگر اللہ کی مشیت ہو (تو اُس کی قدرت سے کچھ باہر نہیں ہے۔ لیکن اللہ نے چند قاعدے قوانین بنا رکھے ہیں) جنھیں ان (لوگوں) میں سے اکثر سمجھتے نہیں (اللہ ایسا خرق عادت معجزہ لا سکتا ہے کہ پھر اقرار کے سوا چارہ نہ رہے۔ مگر اُس سے عقلوں اور طبیعتوں کی آزمائش کیا ہوگی۔ اللہ رضا و رغبت کا ایمان چاہتا ہے۔ جبر و اکراہ کا ایمان نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ اب صورت یہ ہے کہ اللہ کی ہدایتیں بار بار نہیں آئیں گی۔ جو جو ہدایتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں وہ قیامت تک کے واسطے ہیں۔ اللہ معجزہ مانگنے والوں کی مرضی کے مطابق معجزہ دکھا بھی دے تو اُسے موجودہ آدمی دیکھ لیں گے۔ وہ معجزہ قیامت تک نہیں چلے گا۔ قیامت تک صرف قرآن اور قرآنی تعلیمات کا معجزہ ہی چل سکتا ہے)

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ ط

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۔

یہ (خرق عادت معجزے مانگنے والے) کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ فرشتے اُتریں یا تمہارا پروردگار ان کے روبرو آ جائے۔ یا تمہارے پروردگار کی بعض (ایسی) نشانیاں ظاہر ہو جائیں (جو قیامت کے دن ہوتی ہیں)، تو (اے محمدؐ! انھیں بتا دو کہ) جس روز تمہارے پروردگار کی وہ نشانیاں ظاہر ہوں گی اُس روز کسی شخص کو، جو پہلے سے ایمان قبول نہ کر چکا ہوگا۔ یا ایمان کی حالت میں اُس نے نیکی نہ کمائی ہوگی۔ ایمان لانے سے خاک فائدہ نہیں ہوگا (اُس روز کا ایمان غیر معتبر ہے۔ اے محمدؐ!) تم (ان سے) کہہ دو کہ جاؤ (انتظار کئے جاؤ۔ ہم بھی (فیصلے کے وقت کے) منتظر ہیں۔

حسّی اور خرق عادت معجزات کو اہمیت نہ دینے اور دُنیا کا رُخ تفکر و تدبر کی طرف پھیرنے کے باوجود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے ایسے افعال سرزد ہوتے رہتے تھے جن کی بابت ارشاد ہے۔ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ وَقَالُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۔ جب وہ (یعنی کفار) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کھلا جادو ہے[1]

---

[1] دُنیا کا رُخ تفکر و تدبر کی طرف پھیرنے کے علاوہ حسّی اور خرق عادت معجزات کو اہمیت نہ دینے اور اُن کا مطالبہ کرنے پر جھنجلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پیغمبروں سے مداریوں کے سے کرتب اللہ تعالیٰ نے کبھی نہیں کرائے۔ پیغمبروں سے معجزے خود بخود سرزد ہوتے رہتے تھے۔ فرمائشی معجزے دکھانے سے ہر پیغمبر نے تامل کیا۔ بقول علامہ سید سلیمانؒ "انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے تمام انبیاء سے زیادہ معجزات اور نشانیاں دکھائیں۔ تاہم فریسی یہودیوں میں معجزہ کی تشنگی باقی ہی رہی اور ہر ملاقات میں انہوں نے معجزہ کی نئی فرمائش کی۔"

انجیل میں ہے۔

"تب فریسی نکلے اور اُس سے (حضرت عیسیٰؑ سے) حجت کرکے اس کے امتحان کے لئے کوئی آسمان سے نشان چاہا۔" (مرقس ۸-۱۱)

حضرت عیسیٰؑ نے آہ سرد بھر کر فرمایا۔

"اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائیگا۔" (مرقس ۸-۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ نے کسی گونگے کو اچھا کیا۔ بعض آدمیوں نے کہا۔ "یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے اور اوروں نے آزمائش کے لئے اُس سے (حضرت عیسیٰؑ سے) ایک آسمانی نشان مانگا۔" (لوقا ۱۱-۱۶)

حضرت عیسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔ "اس زمانے کے لوگ بُرے ہیں، وہ نشان ڈھونڈتے ہیں، پر کوئی نشان ان کو نہیں دیا جائیگا۔ مگر یونس نبی کا نشان۔" (لوقا ۱۱-۲۹)

غرض حضرت عیسیٰؑ سے یوں تو معجزے سرزد ہوتے تھے مگر فرمائشی معجزوں سے انہوں نے بالعموم انکار کیا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کی تباہی دیکھنی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن سے آسمانی خوان اُتروانے کی فرمائش کی گئی تو اللہ نے کہا۔

"میں یہ آسمانی خوان تم پر اُتار تو سکتا ہوں۔ لیکن اُس کے بعد بھی اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا تو میں اُسے ایسا سخت عذاب دوں گا۔ جو دُنیا میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔" (مائدہ - ۱۵)

پیغمبر اگر فرمائشی معجزے دکھانے لگتے تو پھر انھیں اُس کام کی فرصت نہ رہتی جس کیلئے وہ بھیجے گئے تھے۔ بس دن رات معجزے ہی دکھائے جاتے اور تماشہ بن جاتے، ایک کے بعد دوسری فرمائش ہوتی اور دوسری کے بعد تیسری۔ پیغمبروں کو پیغمبری کی فرصت نہ ملتی اور معجزے مانگنے والوں کو عذاب [illegible] انکا استہزا اور تماشا [illegible] مگر فرمائش پر حضورؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔

ان معجزات کا قرآن مجید میں بھی ذکر یا اشارہ ہے اور احادیث میں تو پوری تفصیل ہے۔ مثلاً غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کفار سے ایک تہائی تھی۔ نیز مسلمان بے سازو سامان تھے اور کفار سازو سامان سے ملبس تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی۔ ایک ہزار فرشتے مسلمانوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ اور مسلمانوں نے معجزانہ فتح پائی۔ سورہ انفال میں ہے:-

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ۔

جب تم اپنے پروردگار سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمہاری درخواست کو منظور فرمایا اور کہا میں ایک ہزار سواروں سے تمہاری مدد کئے دیتا ہوں۔

جنگ شروع ہونے سے قبل خواب میں دکھا دیا گیا تھا کہ کفار مسلمانوں سے تعداد میں کم ہیں۔ اس خواب کو اللہ یاد دلاتا ہے:-

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ (انفال)

اللہ کا احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں خواب میں کفار کو تھوڑا کر کے دکھایا۔ اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے، لڑائی کے بارے میں اختلاف کرنے لگتے (کہ لڑیں یا نہ لڑیں) لیکن اللہ نے بچا لیا۔ اللہ سینوں کے راز جانتا ہے۔

میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو کفار اپنے سے کم نظر آ رہے تھے اور وہ اطمینان سے لڑ رہے تھے اور کفار کو بھی مسلمان اتنے ہی نظر آ رہے تھے جتنے وہ تھے۔ یعنی کم۔ یہ اس لئے کہ زیادہ نظر آنے سے کفار بھاگ نہ کھڑے ہوں، میدان میں ڈٹے رہیں۔ اور خوب قتل ہوں۔ اس احسان کو بھی قرآن مجید میں یاد دلایا گیا ہے۔

پھر جب گھمسان کی لڑائی لڑی جانے لگی اور مسلمان اور کفار گتھم گتھا ہو گئے تو کفار نے محسوس کیا کہ مسلمان اُن سے دگنے ہیں۔ اب کفار کے ہاتھ پاؤں پھول جانے ہی میں بہتری تھی۔

میدانِ بدر میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ اونچی تھی۔ اور جہاں کفار تھے وہ جگہ نیچی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مینہ برسا دیا اس سے مسلمانوں کے ہاں تو گرد و غبار دب گیا اور مسلمانوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو گئی اور کفار کے ہاں پانی نے کیچڑ کر دی۔ اُن کے پاؤں پھسلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قرآن مجید میں جتایا ہے۔

بدر میں ایک اور واقعہ بھی ہوا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ مٹی اور کچھ کنکریاں مٹھی میں بھر کر دشمن کی سمت پھینکیں اور دشمن نے فوراً شکست مان لی۔ قرآن مجید اس واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے:-

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔

مسلمانو! کفار کو تم نے قتل نہیں کیا۔ اللہ نے قتل کیا۔ اور (اے محمد! وہ کنکریاں) جب تم نے پھینکیں تو تم نے نہیں پھینکیں۔ تاکہ اس (عمل) کے ذریعہ مسلمانوں کو (فتح کی) نعمتِ حسنہ سے سرفراز کرے ......

غزوہ احزاب، یعنی وہ لڑائی جس میں عرب کے جملہ قبائل نے مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ اس کے وقوع سے پہلے حضور بتا چکے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایسا ایسا ہونے والا ہے۔ جب وہ جنگ پیش آئی تو پریشان ہونے کی بجائے مسلمانوں کے ایمان نے تازگی پائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔

جب مسلمانوں نے (دشمن) قبائل کو (حملہ کرتے) دیکھا تو بولے (یہی وہ (بات) ہے) جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ (ذکر) کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کا کہنا سچا نکلا۔ اس واقعہ (یعنی دشمنوں زیادہ قبائل کے حملہ آور ہونے) نے ان کے ایمان اور اعتراف کو اور زیادہ پکا کر دیا۔

ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل یہ آیت آئی تھی:۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا

اگر کفار نے تمہارا مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا تاکہ (دوبھر کر کے) تمہیں مکہ سے نکال دیں تو (فکر مت کرو) یہ لوگ تمہارے بعد بہت دن اپنی ہستی برقرار نہ رکھ سکیں گے۔

یہ پیشین گوئی جن حالات میں کی گئی تھی کوئی عام انسان اسے باور نہیں کر سکتا تھا اور ایک اور پیشین گوئی تو اس سے بڑھ کر تھی:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ۔

تم میں سے جو ایمان لے آئے ہیں اور (جنہوں نے) نیک عمل کئے ہیں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں زمین میں (اپنا) خلیفہ (و نائب) بنائے گا۔

یہ بشارت اس وقت دی گئی تھی جس وقت مدینہ پہنچ کر بھی اطمینان میسر نہیں آیا تھا۔ اور مسلمان کہتے تھے کہ آیا کوئی گھڑی ایسی آئے گی کہ ہم اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور ہمیں تیرے سوا کسی کا ڈر نہ رہے۔ مدینہ جانے سے پہلے کی ایک اور آیت ہے:۔

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

یعنی (اے رسول) تم اپنے پروردگار سے دعا مانگو کہ اے پروردگار! مجھے (کسی) اچھی جگہ پہنچا اور (مکہ سے) بعافیت نکال اور مجھ کو اپنی جناب سے ایسی قوت عطا فرما جو دشمنوں کے مقابلے میں میری معین و مددگار ہو۔ اور (پھر) اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل کو (ایک نہ ایک دن) مٹنا تھا۔

یہ دعا اس وقت سکھائی جا رہی ہے جبکہ دشمنوں پر غلبہ پانا تو درکنار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن میں جائے پناہ نہیں ملتی چنانچہ ترکِ وطن ہی کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ یوں دعا کرو۔ لیکن اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ تمہیں ایسی جگہ لے جایا جائے گا جہاں سے فاتح بن کر لوٹو گے، دس برس پہلے اور انتہائی پریشانی کے زمانے میں بشارت دے دی ہے کہ حق غالب آئے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ فتح مکہ کے دن حضورؐ یہ آیت بار بار پڑھتے تھے۔

غرضکہ متعدد پیشین گوئیاں قرآن مجید میں ہیں۔ جو ایک ایک کر کے حرف بہ حرف ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ حضورؐ کی وفات کی پیشین گوئی بھی قرآن میں موجود ہے۔ بعض پیشین گوئیاں بالکل صاف ہیں بعض اشارے ہیں۔

سب سے بڑھ کر معرکۃ الآراء پیشین گوئی کو تو دنیا بھول ہی گیا۔ روم کے غلبہ پانے کی پیشین گوئی۔ ملاحظہ کیجئے کتنی صاف پیشین گوئی ہے۔ عرب کے ایک جانب روم کی حکومت تھی۔ اور ایک جانب فارس کی۔ سنہ نبوی میں یہ دونوں حکومتیں لڑ پڑیں۔ رومی چونکہ عیسائی اور اہل کتاب تھے۔ مسلمانوں کو ان سے ہمدردی تھی۔ اور اہل فارس (ایرانی) مشرک تھے اس لئے مشرکین کو ان سے لگاؤ تھا۔ فارس نے

اور تماشہ بن جاتے، ایک کے بعد دوسری قربانی [illegible] [illegible] انگلیاں پکڑ کر نکالا اور شانے سے [illegible]
[illegible] حضور صلعم کی [illegible]

ت مان
یہ
پروردگار کو
کی دو نشا
سے خاکہ
کے مقد
آلہ کا
محمدیہ
سلہ
ہم
یہ

رُوم نے شکست پائی اور رومی سلطنت بتاشے کی طرح بیٹھ گئی۔ مشرکین مکّہ نے مسلمانوں سے کہا۔ ہماری تمہاری لڑائی ہو تو تمہارا بھی یہی حشر ہو جائے۔ رومی اس قدر کمزور پڑ گئے تھے کہ فارس کی جن شرائط کو انہوں نے قبول کیا ان میں ایک شرط یہ تھی کہ رومی ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالے کریں گے اور جس وقت رومی قاصد ایران کے دربار میں مصالحت کا پیام لایا تو خسرو (بادشاہ ایران) نے کہا کہ خود بادشاہ روم کو پابزنجیر میرے تخت کے نیچے آکر کھڑا ہونا چاہیئے اور اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے سامنے سر جھکانا چاہیئے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں:۔

الٓمٓ۔ غُلِبَتِ الرُّومُ فِیٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔

رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے۔ وہ مغلوب ہونے کے چند (ہی) سال بعد پھر غلبہ حاصل کریں گے۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں پہلے اور پیچھے (جتانے) کا کل اختیار رہا (جس روز رومی جیتیں گے) اس روز اللہ کی نصرت سے مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔ اللہ جس کی چاہے مدد کرے۔ وہ غالب رحم والا ہے (یہ) اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا۔

اس پیشین گوئی کو سن کر کفار نے مذاق اڑایا اور کہا شرط لگالو۔ پیشین گوئی صحیح نکلے تو اتنے اونٹ ہم دیں گے ورنہ تم دینا۔ تمہارے اللہ میاں نے میعاد مقرر کر ہی دی ہے۔

انگریز مورخ گبن لکھتا ہے۔ "شہنشاہ روم ہر قل شکست سے قبل سستی، عیاشی اور اوہام میں مبتلا رہتا تھا اور رعایا کے مصائب کا تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ دفعتاً اس کی طبیعت بدلی اور روم کی عزت بچ گئی۔ عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو فتح پر فتح ہو رہی تھی۔ محمد نے وحی الٰہی کی بناء پر ایسی پیشین گوئی کرنے کی جرأت کی۔ جس سے زیادہ دور از قیاس پیشین گوئی اس وقت اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی"۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "بِضْعِ سِنِیْنَ" کا مطلب "دس سال سے کم" فرمایا تھا۔ چنانچہ نویں سال ادھر مسلمانوں نے کفار مکّہ کو ہرایا ادھر خبر آئی کہ رومیوں نے ایرانیوں کو بھگا دیا۔

اس پیشین گوئی کے پورا ہونے سے قریش کے کافی آدمی ایمان لے آئے تھے۔

قرآن مجید میں ان آیات اور نشانیوں کا بھی ذکر ہے کہ:۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں سے ہاتھیوں اور ہاتھی نشین فوج کو ہلاک کرا دیا۔ یہ واقعہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے چند دن پہلے کا ہے۔ یہ حضور کے ظہور کا اشارہ تھا۔ ابرہۃ الاشرم خانہ کعبہ ڈھانے آیا تھا۔ جو سمجھا جاتا تو نقصان حقیقتاً معمار خانہ کعبہ کے جانشین کا ہوتا۔ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چیز ہے اور حضور اس کی حفاظت کے کفیل تھے، حضور کو اُسے پاک اور صاف کرنا اور سنبھالنا تھا۔ حضور کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ ابابیلیں کنکریاں برسا کر ہاتھیوں اور ہاتھی نشینوں پر غالب آگئیں۔ جب سورۃ "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ" نازل ہوئی تو اس واقعہ کی تصدیق کرنے والے مسلم و غیر مسلم زندہ تھے، کسی واقعہ کی تکذیب نہیں کی، اور یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اس لئے بچایا تھا کہ اس میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے۔

(۲) ہجرت سے قبل جو سازش کفار نے حضور کے قتل کرنے کی تھی کوئی مسلمان سازش کے وقت کفار کے پاس نہیں بیٹھا تھا۔ اور کفار خود [illegible] [illegible] کہ [illegible] معلوم کیسے کیا گیا۔ [illegible] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔

یاد کرو وہ وقت جب کفار تمہارے ساتھ داؤں کر رہے تھے تاکہ تمہیں قید کر دیں، یا گھر سے نکال دیں۔ (اُدھر) وہ تدبیریں سوچ رہے تھے اور (اِدھر) اللہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

(۳) ہجرت کا یہ واقعہ بھی معجزہ ہی تھا کہ کفار غارِ ثور کے مُنہ پر جا کھڑے ہوئے، ذرا نیچی گردن کر کے دیکھتے تو کھوج لگا لیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی گھبرا گئے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا"۔ ڈرو مت (ہم صرف دو نہیں ہیں) اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اس جملہ کو قرآن مجید میں محفوظ کر دیا ہے۔

حضورؐ ہجرت کے قصد سے نکلے تو مکان کے چاروں طرف کفار کا پہرہ تھا۔ لیکن حضورؐ نکل گئے اور کفار کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔

(۴) مکّے سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس ایک رات میں لے گیا۔ (حالانکہ دونوں مقامات کا فاصلہ اُس زمانے میں مہینوں کا تھا۔)

(۵) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ آیت معجزۂ شق القمر کے متعلق ہے۔

یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ قرآن نے دعویٰ کیا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اللہ کفار سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔ وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا۔ اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے بیٹھے رہو۔ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو (ہم تمہیں گزند نہیں پہنچنے دیں گے) اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ۔ تمہارے پروردگار نے لوگوں کو (ایسا) گھیر رکھا ہے کہ (اُن کے لئے ممکن نہیں ہے کہ تم پر دسترس پائیں) قرآن کا یہ دعویٰ سچا رہا۔ حضورؐ کے خلاف کیا کیا سازشیں نہ کی گئیں کیا کیا منصوبے نہ گانٹھے گئے۔ کھانے میں زہر دیا گیا، سوتے میں قتل کا اہتمام کیا گیا۔ چھپ چھپ کر حملے کئے گئے۔ کھُل کھُل کر نرغے میں لیا۔ لوگ تلواریں زہر میں بجھا بجھا کر مارنے پہنچے۔ لیکن اللہ کے فضل سے حضورؐ سلامت رہے۔

غرضکہ ایسے معجزات قرآن مجید میں کافی ہیں اور احادیث میں تو بے شمار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اِن معجزات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی حامل قرآن[1] کے مستقل اور دوامی معجزے کو دیتا ہے اور حضورؐ کی قبل نبوت زندگی کو دیتا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ

یہ (ہدایت نامہ) جو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلعم) پر اُتارا ہے اس کی صداقت میں اگر تمہیں شک ہو (اور تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلعم نے خود تصنیف کر لیا ہے) تو (سیدھا حل یہ ہے کہ) تم قرآن جیسی (پوری کتاب نہیں، قرآن جیسی)

---

[1] حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ کوئی پیغمبر نہیں ہے جسے نبوت کی نشانی نہ ملی ہو۔ مجھے قرآن ملا ہے اور قرآن میں ہے۔ "اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم" کیا کفار کو یہ نشانی کافی نہیں معلوم ہوتی کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا ہے جو انہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔

ایک سورۃ تصنیف کر کے لے آؤ۔

یہ چیلنج سُن کر کفار تلواریں نکال لائے مگر ایک سورۃ نہ لا سکے۔ اور سورۃ طور میں تو سورۃ نہیں بات کا مطالبہ ہے۔ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ۔ قرآن جیسی ایک بات پیش کر دو۔ شروع میں دس سورتیں لانے کو کہا تھا۔ دُوسرے انبیاء کے صحیفے معجزہ نہیں تھے۔ قرآن مجید کی ہر آیت معجزہ ہے، قرآن مجید کا انداز کلام اور انداز بیان معجزہ ہے۔ قرآن مجید نے نظم و نثر کے درمیان ایک عجیب و غریب اسلوب ایجاد کیا اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہا دیا۔ قرآن کے سامنے عرب کے شعراء کی زبانیں گونگی ہو گئیں۔ اُس وقت کے عرب شعراء کا۔ غیر عرب، غیر اہل زبان، آکیا مقابلہ کریں گے۔ پھر قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہی قرآن مجید کا اعجاز نہیں ہے۔ قرآن مجید کے مخاطب عہد نبویؐ سے لے کر قیامت تک کے لوگ ہیں اور قرآن مجید تنہا عرب کے لئے نہیں ہے سارے عالم کے لئے ہے۔ فصاحت و بلاغت کا جواب دیتے تو اہل عرب ہی دیتے[1] لیکن قرآن کے حکمت و موعظت سے بھرے ہوئے بیانات ساری دُنیا کو چیلنج کر رہے ہیں۔ کوئی بیان علمائے نفسیات کو چیلنج کر رہا ہے۔ کوئی بیان ماہرین سیاست کو دعوت دیتا ہے۔ قرآن کے قوانین قانون دانوں کو پکار رہے ہیں ؎

بہار اب جو دُنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے

قرآن نے مزید نزولِ وحی سے دُنیا کو مستغنی کر دیا۔ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي۔

قرآن مجید نے دلوں کے وہ اسرار فاش کئے جن تک انسانوں کی نگاہ خود کبھی نہیں پہنچی تھی۔

قرآن مجید کا سمجھنے کے بعد وہ اثر ہوتا ہے کہ کسی کتاب کا نہیں ہوتا۔ آدمی مسخر ہو جاتا ہے۔

پھر قرآن مجید کے احکام اور ارشادات تو اعجاز ہیں ہی۔ قرآن نے کہیں اپنی تاثیر کی طرف توجہ دلائی ہے، کہیں اپنی یکسانی اور اپنے مضامین کے عدم اختلاف کو جتایا ہے۔ قرآن کا ایک بیّن معجزہ یہ ہے کہ قریباً چودہ سو برس گزر چکے اور جُوں کا تُوں محفوظ ہے۔ اور وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (ہم قرآن کے محافظ ہیں) کی صداقت کو ثابت کر رہا ہے۔ منسوخ کوئی ارضی اور سماوی کتاب اصلی حالت پر باقی نہیں رہی اور ہمارا ایمان ہے کہ قرآن تا قیام قیامت باقی رہیگا۔ اور اس کی جامعیت میں اور اس کے زیر، زبر اور پیش میں فرق نہیں آئیگا۔ توراۃ، زبور اور انجیل اب اپنے پیروؤں کو راستہ دکھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن قرآن اپنے پیروؤں کی ہمیشہ رہنمائی کرتا رہیگا۔ قرآن آفتاب ہے جو ڈوبنے والا نہیں ہے۔

قرآن مجید حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمّی ہونے کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور رسالت سے قبل کی ناواقفیت کو بتاتا ہے۔ قرآن میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک کا جو حال ہے۔ وہ حضورؐ کے علم میں کیسے آگیا۔ قرآن مجید نے گزرے ہوئے ایسے واقعہ پیش کئے ہیں جنہیں حضورؐ بطور خود جان ہی نہیں سکتے تھے۔ ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ۔ یہ پچھلے زمانے کی باتوں کا علم ہم وحی کے ذریعہ دے رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کے پاس اُس زمانہ میں نہیں تھے جب باہم مشورہ کر رہے تھے۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ۔ تم تو رسالت سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھ سکتے تھے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ۔ تم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ

---

[1] سبعہ معلقہ والے لبید حضورؐ ہی کے زمانہ کے شاعر ہیں نہیں تمام سبعہ معلقہ عرب شعراء میں ممتاز ہیں۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور کہا کرتے تھے کہ اللہ نے بقرہ اور آل عمران جیسی سورتیں سکھا دی ہیں۔ اُن کے سامنے شعر کہنا زیب نہیں دیتا۔

یہ پچھلے زمانہ کی باتیں جنہیں ہم تمہیں ذریعہ وحی بتلاتے ہیں۔ انہیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم جانتی تھی۔

کفارِ قریش نے حضورؐ کو شاعر، ساحر اور مجنون تو کہا لیکن حضورؐ پر یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ چھپ کر پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے۔ یہ ضرور کہا کہ باہر کا فلاں آدمی قرآن لکھوا رہا ہے، چنانچہ قرآن نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۔ جس سے قرآن کو منسوب کیا جاتا ہے اس کی زبان عجمی ہے۔

یہاں تک مکہ کا قصہ تھا۔ مکہ کا عجمی مکہ ہی میں رہ گیا اور حضورؐ مدینہ پہنچے تو وہاں یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان ہو جاتے اور پھر ترکِ اسلام کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ اسی قماش کا ایک عیسائی کہنے لگا۔ بس جتنا لکھوا چکا اس سے زیادہ محمدؐ کچھ نہیں جانتے، لیکن چونکہ وحی کا سلسلہ اس عیسائی کے ارتداد کے بعد جاری رہا۔ اس کی بات چلی نہیں۔ حتیٰ کہ وہ عیسائی مر گیا اور وحی برابر آتی رہی۔

حضورؐ کی قبلِ نبوت زندگی کو بھی قرآن نے بطورِ چیلنج پیش کیا ہے، فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ میں نبوت کے دعوے سے پہلے (ایک دو نہیں، چالیس سال قریباً) پوری عمر تم ہی میں بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم (اتنا) نہیں سوچ سکتے (کہ مجھ جیسا شخص جس نے انسانوں کے معاملہ میں عمر بھر جھوٹ نہیں بولا آخر عمر میں اللہ پر بہتان باندھے گا۔ وحی نہ آتی ہوگی اور کہیگا کہ وحی آتی ہے، کیا میری زندگی افترا پردازوں کی زندگی تھی، تم میری زندگی میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سقم بھی بتا سکتے ہو)

اس چیلنج کا بھی جو اللہ نے اپنے رسولؐ سے قرآن میں دلوایا کفار جواب نہ دے سکے، حضورؐ کی سیرت کے خلاف کسی کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا اور کسی نے کہنے کا ارادہ کیا تو دوسرے کفار نے روک دیا کہ وہ بات کہو جو اٹھائی اور بٹھائی جاسکے جسے لوگ مان سکیں۔ فقط ایک چیز ہے۔ اسے شہرت دو کہ محمدؐ کا اتباع کرنے سے بیٹے باپ سے، بیویاں شوہروں سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتے ہیں۔ آپس کا اتفاق باقی رکھنا ہے تو محمدؐ کے قریب مت جاؤ۔

بہرحال قرآن اور سیرت سے متاثر ہونے والے سب نہیں تھے۔ زیادہ لوگ ایسے ہی تھے جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلے میں حسی معجزات سے متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے سب کا ذوق اور سب کا رجحان طبع یکساں نہیں تھا۔ مگر دنیا آجکل کے ذوق اور رجحانِ طبع کے ساتھ تو اس بات کو جو تئیے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف حضورِ سرورِ کائنات سے حسی معجزے بھی صادر کراتا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف معجزوں پر معجزے مانگنے والوں کو سمجھاتا ہے کہ معجزوں کے پیچھے مت پڑو۔ معجزے تو فقط متحیر اور مبہوت کر دیتے ہیں۔ تم ہماری تعلیم کے محاسن سے بہرہ ور ہو۔ یہ دیکھو کہ جو نظامِ زندگی تمہیں دیا جا رہا ہے وہ دلیل و برہان پر مبنی ہے یا نہیں۔ قرآنی دعوت کی بنیاد سرتاسر حکمت و بصیرت پر قائم کی گئی ہے۔ قرآن نے دنیا کے مذہب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بات بذاتِ خود ایک معجزہ ہے۔

معجزات اور امکانِ معجزات کے متعلق چہ میگوئیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے اختلاف ممکن نہیں ہے کہ حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اہلِ وطن سے اُن عادات کو ترک کرنے کے لئے کہا جو اُن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھیں۔ اُن عادات کی خرابی اُن ہی میں کے صرف ایک شخص کو کس نے سمجھا دی۔ حضورؐ نے اُن بتوں کی مذمت کی اور اُن بتوں کو توڑ پھینکنے کا وعظ کہا جن کی سارا عرب پرستش کرتا تھا۔ ان بتوں کی ہیبت یکہ و تنہا، بے یار و مددگار اور بے زر و بے پر انسان کے دل سے کس نے ہٹا دی۔

پھر یہ کیا ماجرا تھا کہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے حضورؐ کے پاس ظاہری بدلہ اور معاوضہ کچھ نہ تھا۔ پھر بھی لوگ اسے قبول کر رہے تھے۔ مصیبتیں اٹھاتے تھے، بلائیں جھیلتے تھے، گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہوتے تھے لیکن کھنچے چلے آتے تھے۔ مکہ کے تیرہ سال میں جنہوں نے اسلام قبول کیا کس امید پر قبول کیا۔ اور فتح مکہ سے پہلے تک بھی جنہوں نے اسلام قبول کیا انہیں ہی کون سی توقعات تھیں۔ وہ سود، قمار، لوٹ مار، سرقہ، ڈاکہ وغیرہ کے ایک ذریعہ معاش سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور فاقہ کرنے لگے تھے۔ کفر کی ...

دشمنانِ اسلام پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ کیا بدر کے تین سو تیرہ مجاہد بھی شمشیر کے زور سے ایمان لائے تھے۔ فرمائیے، پہلے شمشیر زن کس شمشیر سے مسلمان ہوئے تھے؟

پھر اسے معجزہ اور کرشمۂ ربانی نہ کہیے گا تو کیا کہیے گا کہ نبوت کے تیرہ سال مصائب میں گزرے اور دس سال حملوں کے دفاع میں۔ کوئی اور ہوتا تو تیرہ سالہ مصائب ہی سے بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا۔ اور حملے بھی ہمت ہارنے کے لئے کافی تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ پورا زمانۂ نبوت مصیبتوں اور جنگوں کی نذر ہو گیا۔ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصیبتوں اور جنگوں ہی میں مبتلا رہے۔ لیکن حضورؐ ان حالات کے باوجود وہ کام کر گئے کہ غیر نبی اطمینان کی حالت میں نہیں کر سکتا۔ حضورؐ نے اندھیرے کو اُجالے سے بدل دیا۔ روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا کر دیا۔ بندوں کا اللہ سے رشتہ جوڑ دیا اور انسانوں کو فرشتوں سے بڑھا دیا۔ حضور کی احادیث ہی کو پڑھ کر دیکھئے۔ کس کا دماغ پُر آشوب حالات میں ایسی حکمت و موعظت کی باتیں سوچ سکتا ہے۔

آجکل کمیونزم کا بڑا چرچا ہے اور لوگ اس کے گرویدہ ہیں۔ ہم کمیونزم سے واقف نہیں کہ کیا چیز ہے۔ ایک فقرہ برنارڈ شا کا البتہ اس کی بابت کہیں پڑھا تھا کہ اسلام سے خدا اور عاقبت خارج کر دیئے جائیں تو اسلام کا نظامِ حیات اور کمیونزم کا نظامِ حیات قریباً ایک ہے۔

بعض لوگوں کو جن بڑے آدمیوں سے عقیدت ہوتی ہے، اُن کی عقیدت اور محبت کا حق وہ اس طرح ادا کرنا چاہتے ہیں کہ ان بزرگوں سے زیادہ سے زیادہ ایسی باتیں منسوب کر دیں جو کرامات، معجزات اور خوارق سے ملتی جلتی ہوں۔ عقیدت کے اس جوش میں بات کو جانچنے اور معاملہ کو پرکھنے کی بھی کوشش نہیں کی جاتی۔

اسی طبیعت اور مزاج کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے معجزوں کے منسوب کرنے میں درایت و روایت کی حدود کا خیال نہیں کیا۔ ان متساہلین اور معجزوں کے شوقینوں کو بس اس کی دُھن رہی کہ حضورؐ کے معجزات میں کسی نہ کسی طرح تعداد کا اضافہ ہو جائے۔

ایسے واقعات کو بھی معجزات کے شوقینوں نے خواہ مخواہ معجزہ قرار دے لیا ہے۔ مثلاً حضورؐ حضرت جابرؓ کی عیادت کرنے گئے۔ حضرت جابرؓ سخت بیمار تھے اور بے سدھ پڑے تھے۔ حضورؐ نے اُن کے مُنہ پر پانی چھڑکا۔ اُنھیں ہوش آ گیا۔ یہ واقعہ بخاری و مسلم میں ہے، اور صحیح ہے۔ لیکن محض واقعہ ہے۔ معجزات کے شوقینوں نے اسے معجزہ بنا ڈالا۔

مسند امام حنبلؒ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں کوئی جانور پلا ہوا تھا۔ وہ یوں تو ہر وقت پھرتا رہتا تھا مگر جب حضورؐ تشریف لاتے تو ایک جگہ بیٹھ جاتا تھا۔ اور حضورؐ تشریف لے جاتے تو پھر دوڑنا شروع کر دیتا تھا۔ یہ معجزہ نہیں ہے۔ محدثین نے مندرجہ بالا دونوں واقعوں کو بطور معجزہ پیش نہیں کیا۔ لیکن کتب دلائل و فضائل میں پہلا واقعہ بھی بطور معجزہ درج ہے اور دوسرا واقعہ بھی بطور معجزہ درج ہے۔

صحابہ کرامؓ حضورؐ کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کو یاد رکھتے تھے۔ ہمیں بھی انھیں تبرک اور باعثِ برکت سمجھنا چاہیئے اور حرزِ جان بنا لینا چاہیئے لیکن ہر قول اور ہر عمل کو اس کی جگہ پرکھنا چاہیئے جس طرح ہدفِ مطاعن بنانے والی من گھڑت حدیثیں حضورؐ کے لئے موجبِ تکلیف ہیں، اسی طرح معجزات کی تعداد بڑھانے سے بھی حضورؐ خوش نہیں ہوں گے۔ ناراض ہوں گے، خوشی کی صورت تو فقط ایک ہی ہے۔ کہ حضورؐ کے احکام کی تعمیل کی جائے اور حضورؐ کے لائے ہوئے اسلام کا پابند ہوا جائے۔ حضورؐ کا وقار معجزوں کی تعداد بڑھانے سے نہیں بڑھ سکتا۔ حضورؐ کا وقار اس میں ہے کہ اُن کے نام لیوا احکامِ اسلام کا کتنا خیال کرتے ہیں اور نظامِ اسلام کو کہاں تک عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اسلامی نظام اگر عملاً منطبق ہو جائے تو یہ حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزہ کے آگے دنیا ایک دفعہ سر جھکا چکی ہے۔

اسد ملتانی

جگر کا ایک شعر

اپریل اور مئی کے "فاران" میں "اقبال کی فارسی شاعری" کے عنوان سے سید محمد عبد الرشید فاضل صاحب کا ایک فاضلانہ مضمون نکلا ہے۔ یہ خاص محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے اور اس میں فکرِ اقبال کے بعض مخصوص پہلوؤں پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے فارسی کے کن شعرا کا تتبع کیا ہے اور کن سے استفادہ؟ بالخصوص مرشدِ رومؒ سے کس قدر اکتسابِ فیض کیا ہے؟ فاضل مضمون نگار نے ان سوالوں کا جواب دینے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور موضوع کی مقررہ حدود کے اندر رہنے کے باعث مضمون کی علمی اور افادی حیثیت بلند کر دی ہے۔

مضمون کے سلسلہ میں اقبال کے "گستاخانہ" اشعار کا بھی ذکر آیا ہے۔ مضمون نگار نے یہ لکھ کر کہ "اقبال کے ہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو گستاخی اور سوءِ ادبی[1] پر محمول کیا جاتا ہے"۔ مثال کے طور پر پانچ فارسی شعر نقل کئے ہیں۔ اور ان کی صفائی ان الفاظ میں پیش کی ہے کہ "ان کو بھی صوفی شعرا اور بالخصوص مولانا رومؒ کے اتباع میں سمجھنا چاہئے"۔ مولانا کے ایک شعر کی مثال دے کر مزید لکھا ہے۔ "مگر ان اشعار کو گستاخی پر محمول وہی لوگ کرتے ہیں جو مقامِ بندگی اور تخلقوا باخلاق اللہ کے مفہومِ حقیقی سے ناآشنا ہونے کے باعث انسان کے جذب و تسخیر کی غایت الغایات تک نہیں پہنچے ہیں اور جنہوں نے قربِ نوافل والی حدیث کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا"۔ اس کے بعد اس حدیث کا ترجمہ دیا ہے اور "روحِ اقبال" سے دو مختصر اقتباس جو اقبال کے ان اشعار کی توضیح و توجیہ کرتے ہیں۔

اس پر "فاران" کے ایڈیٹر صاحب نے ذیل کا نوٹ دیا ہے :-

"بعض مقامات پر تو اس قسم کے اشعار کی حیثیت "نازِ عبدیت" جیسی ہے اور کہیں اس کی صورت "بچوں کی ہٹ" کی سی ہے۔ مگر جہاں یہ رنگ ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تو یہ بے شبہ "شاعرانہ شطحیات" ہیں اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ حلم و عفو ان شطحیات سے چشم پوشی اختیار کرے گی۔ جگر مراد آبادی نے اقبال کے اس شعر کا کس قدر بلیغ انداز میں جواب دیا ہے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم
نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم!"

جہاں تک ان اشعار کا تعلق ہے جنہیں گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے، اقبال کا اپنا جواب یہ ہے ؎

ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک
رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی

گویا گستاخی اور بے باکی محب اور محبوب کی باہمی گفتگو تک محدود رہنی چاہئیں۔ جونہی ان کا اظہار کیا جائے اور معاملہ خلوت سے جلوت میں لایا جائے تو پھر یہ سب کچھ حکمِ شریعت کی زد میں آجاتا ہے۔ اقبال کا روحانی مقام کچھ بھی ہو اور محبت کی رمزیں کتنی ہی خاص کیوں نہ ہوں

---

[1] "سوءِ ادبی" غالباً سہوِ کاتب ہے کیونکہ صحیح ترکیب "سوءِ ادب" ہے یا "بے ادبی"۔ (اسد)

جہاں تک شرعی آداب کا تعلق ہے الفاظ کے استعمال میں بہرحال مناسب احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ بالخصوص صاحب اسمائے حسنیٰ سے کوئی بری صفت منسوب کرنا خواہ وہ حقیقت واقعی ہی کیوں نہ ہو کسی طرح جائز نہیں۔ لہٰذا مضمون نگار کی پیش کردہ صفائی اور اقبال کے دعویٰ اختصاص کے باوجود مدیر فاران کے اعتراض سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

لیکن مدیر فاران نے اقبال کے اس شعر کے "بلیغ جواب" کے طور پر جگر مرادآبادی کا جو شعر پیش کیا ہے وہ ذرا غور طلب ہے۔ اقبال کو شکوہ ہے کہ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم" جگر کا جواب ہے کہ "نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم"۔ یعنی میسر تو دریا ہے لیکن نظر آتا ہے شبنم۔ مگر کیوں؟ اس کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔ (۱) نظر کی کمی، (۲) جستجو کی کمی۔ (۳) تشنگی کی کمی۔ دیکھنے کی بات ہے کہ کیا یہ تین وجوہ وہ نتیجہ پیدا کرتی ہیں جو حضرت جگر نے حتمی طور پر پیش کیا ہے۔

نظر کی کمی | نظر کی کمی کی ایک صورت کوتاہ نظری ہے جس سے قریب کی چیز تو دکھائی دے مگر دور کی چیز نظر نہ آئے۔ ضعف بینائی کی دوسری صورت یہ ہے کہ سامنے کی چیز بھی دھندلی معلوم ہو اور صاف صاف نظر نہ آئے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چیز تو دکھائی دیتی ہے مگر اس کے باریک اجزاء نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کم بینی یہ ہے کہ نظر کسی شے کو دیکھے مگر اس کی حقیقت کا اندازہ نہ کرسکے۔ بقول اقبال ؎

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دوسرے لفظوں میں کم نظری کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی چیز کے ظاہر کو دیکھا جائے اور اس کے باطن کو نظر انداز کردیا جائے۔ اقبال ہی نے کہا ہے ؎

کم نظر بے تابیِ جانم ندید　　آشکارم دید و پنہانم ندید

کم نظری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کل کو دیکھ کر جزو کا احساس تو کیا جائے مگر جزو سے کل کا اندازہ نہ لگایا جائے۔ بقول عرفی ؎

من از گل باغ می بینم تو گل از باغ می جوئی　　من آتش از دخان بینم تو از آتش دخاں بینی!

اسی طرح دیدۂ بینا کی تعریف غالب نے ان لفظوں میں کی ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا!

یا جیسا کہ ذوق نے کہا ہے ؎

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو　　آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ "دیدۂ بینا" نہ ہونے سے دانہ خرمن یا قطرہ دریا نہ دکھائی دے۔ مگر یہ نہ ہوگا کہ خرمن دانہ نظر آنے لگے اور دریا قطرہ۔

البتہ کم نظری کی ایک مجازی صورت کم شناسی ہے جس کے باعث کسی چیز کی عظمت کا صحیح اندازہ نہ ہوسکے یا بد بینی کے سبب کوئی اچھی چیز بھی بری نظر آئے۔ بقول سعدی ؎

چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد　　عیب نماید ہنرش در نظر

یا تحقیر کا جذبہ اتنا بڑھ جائے کہ بڑی چیز کو چھوٹا کر دکھائے۔ اقبال نے ایک جگہ "کافر گر" ملا کی شکایت کی ہے کہ ؎

شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است　　از نگاہِ او یمِ ما شبنم است

ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی صورت بھی ایسی نہیں کہ کم نظری کے سبب بڑی چیز چھوٹی معلوم ہو یا دریا بھی شبنم نظر آئے۔ البتہ ایسی

عین برعکس وسعتِ نظر پیدا ہو جائے تو دریا کی حیثیت بھی ہیچ معلوم ہو اور وہ محض قطرہ کے برابر دکھائی دینے لگے۔

جستجو کی کمی یہی صورت جستجو کی کمی سے پیدا ہوتی ہے، اگر جستجو کم ہو تو انسان بڑی چیز کے بجائے چھوٹی پر اکتفا کرلے۔ بقول اقبال ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

جستجو کم ہو تو راہرو کو منزلِ مقصود کا صحیح اندازہ بھی نہ ہو اور وہ سفر کی دشواریوں کو ترک کر کے راہ میں بیٹھ جانے کو کافی سمجھ لے ؎

غمِ تلاش سے بچنے کا کیا بہانہ ملا پڑے ہیں نقشِ قدم پر کہ آستانہ ملا

غرضکہ جستجو کی کمی سے بھی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ بڑی چیز چھوٹی نظر آئے یا دریا قطرہ۔ البتہ جستجو زیادہ بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ دریا بھی شبنم نظر کرنے لگے اور بڑی سے بڑی چیز چھوٹی۔

تشنگی کی کمی علیٰ ہذا القیاس پیاس کی کمی بھی اس امر پر تو آمادہ کرسکتی ہے کہ قطرہ کو دریا تصور کر کے مطمئن ہو جائیں لیکن یہ کیونکر ہو کہ دریا شبنم نظر آنے لگے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

تشنہ جوید آب واندر جہاں آب ہم اندر تلاشِ تشنگاں!

تا توانی تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

یعنی تشنگی زیادہ ہو جائے تو پانی خود بخود ہر طرف سے جوش زن ہو۔ اس لحاظ سے یہ تو بالکل صحیح ہے کہ تشنگی میں جتنی زیادتی ہو اتنا ہی زیادہ پانی بہم پہنچے اور تشنگی میں جتنی کمی ہو اتنا ہی کم پانی ملے مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ تشنگی کم ہو تو پانی کی زیادہ مقدار بھی تھوڑی نظر آئے۔ اس کے برعکس البتہ تشنگی بہت زیادہ ہو تو اغلب ہو کہ دریا کو بھی شبنم سمجھ لیا جائے۔ عرفی کا ایک شعر ہے ؎

ز نقصِ تشنہ لبی داں، بعقلِ خویش مناز دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد!

یعنی سراب کا فریب نہ کھانا بھی تشنگی کی کمی کی دلیل ہے۔ تشنگی بڑھی ہوئی ہو تو انسان سراب کو دیکھ کر یہی سمجھتا ہے کہ سیراب پہنچ رہا ہے لیکن تشنگی کم ہو تو دھوکا نہیں کھاتا۔ سراب کو سراب ہی سمجھتا ہے ریت کو پانی نہیں سمجھتا۔ گویا اس پہلو سے بھی تشنگی کی کمی کا یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ دریا شبنم نظر آئے۔

اس مختصر تجزیہ سے ظاہر ہے کہ اگرچہ کم نگاہی کی تاویل سے کوئی پہلو نکال بھی لیا جائے پھر بھی کم از کم جستجو اور تشنگی کی کمی سے دریا کا شبنم نظر آنا کسی حالت میں بھی صحیح نہیں۔ بلکہ معاملہ عین اس کے برعکس ہے، قطع نظر اس سے کہ جگر کا یہ شعر اقبال کے مصرعہ کا جواب۔ اور وہ بھی بلیغ انداز میں، ہے یا نہیں، خود اس شعر کی معنویت محلِ نظر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو اس کے دوسرے مصرعہ کو اس طرح الٹ دیا جائے ؎

نظر کم، جستجو کم، تشنگی کم نظر آئے نہ کیوں شبنم بھی دریا!

مدیر "فاران" :— جناب اسد ملتانی نے جس دقتِ نظر سے جگر مرادآبادی کے شعر کا تجزیہ فرمایا ہے۔ اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ مگر بات اس "اعتراف" پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ سلسلہ طویل و دراز ہونا چاہتا ہے۔

شعر میں جو بات کہی جائے اس کے لئے یقیناً کوئی نہ کوئی "قرینہ" پایا جانا چاہیے۔ مگر "شعر و دل" کا بالکل واقعاتی انداز پر تجزیہ کیا جائے تو نہ جانے کتنے اچھے شعر ایسے نکلیں گے جو واقعات کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکیں گے، مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

اپنی جگہ "سحرِ حلال" بلکہ شاعری کی معراج ہے! اس میں نزاکتِ خیال، تاثر اور حُسنِ بیان سبھی طرح کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر کوئی واقعاتی

انداز پر اس شعر کا تجزیہ کیجیے تو اس شعر کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا !

کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے مرنے کے بعد کیا واقعی ایسا ہوا تھا کہ حسینانِ جفا پیشہ کو کشا کشِ ناز و ادا سے فرصت مل گئی تھی ؟ اور کیا تمام دنیا کے حسین اور خوبرو غالب ہی کو لبھانے اور ستانے کے لئے ناز و غمزہ دکھایا کرتے تھے - اور کیا یہ کسی طرح ممکن بھی تھا کہ دنیا کے تمام حسینوں پر غالب کی نگاہ ہو اور تمام حسین اور ماہ وش غالب کو جانتے اور پہچانتے ہوں ؟ اس واقعاتی تجزیہ کے بعد سوچئے کہ اس شعر کی کیا گت بنتی ہے ؟

میر کا مشہور شعر ہے ؎

کل کا وعدہ کیا ہے اُس نے میر   ایک دن اور بھی جئے ہی بنی !

اس شعر میں کس قدر شدید تاثر ہے - مگر " واقعات " کی خراد پر اس شعر کو رکھ دیجئے تو اس کے پرزے اُڑ جائیں گے - کہا جا سکتا ہے کہ موت کا جو وقت مقرر ہے ، ایک لمحہ بھی وہ وقت اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا - مرنے اور جینے پر کسی جاندار کو دسترس نہیں - یعنی واقعات کی دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ محبوب کے وعدہ کر دینے سے کسی کی آئی ہوئی ٹل جائے اور جسے آج مرجانا تھا وہ محبوب کے وعدے کے سبب اپنی زندگی کی مدت کو " بہ قدر یک روز " طویل کر دے ! ---- اس قسم کے تجزیئے " شعر کو " " یہ کچھ " بنا سکتے ہیں !!

اقبال کا شعر ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے !

اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقی پر نامناسب انداز میں چوٹ کی گئی ہے اور اس قسم کے شعروں کا شمار " اقبال کے شطحیات " میں ہے جگر نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

نظر کم جستجو کم ، تشنگی کم   نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم !

اس شعر پر غور کرتے وقت اقبال کا مندرجہ بالا شعر ذہن و فکر میں ضرور رہنا چاہیئے - اقبال نے یہ کہا ہے کہ " پیاسے کو دریا سے شبنم دی جا رہی ہے " جگر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایتوں کا دریا ہر وقت موجیں مار رہا ہے اور یہ دریا کا دریا ہر تشنہ کام کی پذیرائی کے لئے موجود ہے - مگر نظر ، جستجو اور تشنگی کی کمی کے سبب " دریا " " شبنم نظر آتا ہے - یعنی سائل اور طالب کے اندر خود ایسی خامیاں موجود ہیں جس کے باعث اُسے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتیں بہت ہی کم دکھائی دیتی اور محسوس ہوتی ہیں -

اقبال کے شعر میں " کفرانِ نعمت " کا پہلو نکلتا ہے - جگر کے شعر میں " شکرِ نعمت " کی فراوانی ہے - جگر نے اپنے شعر میں " کفرانِ نعمت " کی تردید کی ہے اور شکرِ نعمت کے رُخ کو اُبھارا ہے - جگر نے ضمن جاں و جان کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کوئی سعی و جستجو سے کام لے تو قدرت کے خزانے اُس کا دامن بھرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں - بندے کے لئے کسی حال میں بھی شکوہ و شکایت زیبا ہی نہیں ہے ، صرف ایک " سانس " جو بظاہر حقیر معلوم ہوتا ہے اپنے اندر بے پایاں منافع رکھتا ہے -

اس انداز پر جگر کے شعر پر غور کیا جائے تو اس شعر میں حُسن ہی حُسن نظر آئے گا اور اس میں کوئی بات بھی گرفت کے قابل یا قرینہ کے خلاف محسوس نہ ہوگی -

اسد صاحب کو مصرعہ میں " نظر آنے " کے الفاظ آجانے سے دھوکا ہوا ہے اور وہ شعر کو " آنکھ کے دیکھنے کی قوت اور اس کے فصل و اور دوری و نزدیکی " کے فیتے سے ناپنا چاہتے ہیں - کوئی کہے اور لوگ اس طرح کہتے ہی رہتے ہیں کہ " مجھے تو دنیا میں چاروں طرف جھوٹ ہی نظر آتا ہے " تو کیا اس پر یہ اعتراض کسی طرح بھی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جھوٹ تو ایک صفت کا نام ہے جو غیر مادی ہے - وہ آنکھوں کو نظر کس طرح آ سکتا ہے - شعر و ادب پر اگر اس طرح احتساب کیا جائے تو لٹریچر کے نجانے کتنے بڑے حصّہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دینا پڑے گا -

"نظر کم" ـــــ کے بہت سے پہلو ہیں، بصارت اور بصیرت کی کمی، نظر کی پستی، مشاہدہ کی خامی، تنگ نظری ...... اور "تنگ نظری" آدمی میں جذبۂ شکر و استحسان پیدا نہیں ہونے دیتی کہ بڑے سے بڑے احسان کو بھی تنگ نظر آدمی تھوڑے سے تھوڑا ہی سمجھتا ہے۔ تو اس شعر میں اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ کائنات میں اللہ کی نعمتوں کے چشمے انسان کے لئے اُبل رہے ہیں مگر بصیرت و بصارت کی کمی اور تنگ نظری اُسے اعتراف شکر نعمت نہیں کرنے دیتی اور نعمتوں کا یہ دریا اُسے شبنم دکھائی دیتا ہے۔

"جستجو کی کمی" میں ذرا سا بھی ابہام نہیں۔ یہ الفاظ زبان حال سے خود اپنی شرح کر رہے ہیں کہ جو لوگ سعی و جستجو میں کمی کرتے ہیں وہ تقدیر کا رونا روتے رہتے ہیں اگر آدمی جد و جہد کرے اور سعی و جستجو کا حق ادا کردے تو اللہ کی نعمتوں کے خزانے اُس کا دامن مراد بھرنے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ جستجو کی کمی ہے کہ دریا پر شبنم کا اور خزانوں پر خزف ریزوں کا دھوکا ہوتا ہے!

"تشنگی کم" سے مراد ذوقِ اضطراب کی کمی ہے اور اسی ذوقِ اضطراب کی کمی کے سبب شوقِ جستجو میں بھی کمی آگئی ہے کہ اضطراب و جستجو لازم و ملزوم ہیں اور فاضل ناقد نے یہ جو کہا ہے کہ "...... لیکن تشنگی کم ہو تو دھوکا نہیں کھاتا، سراب کو سراب ہی سمجھتا ہے، ریت کو پانی نہیں سمجھتا" تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ شاعر نے یہ نہیں کہا کہ "تشنگی کی کمی" کے سبب اُسے پانی ریت دکھائی دے رہا ہے۔ اس قسم کے دھوکے اور فریب نظری کا شعر میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ شعر میں یہ نہیں کہا گیا کہ نظر، جستجو اور تشنگی کی کمی کے سبب "شے" کی ماہیت بدل ہوئی نظر آرہی ہے۔ شاعر نے در اصل اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ نگاہ، جستجو اور اضطراب (تشنگی) کی یہ کمی ہے۔ جس کے سبب دریا شبنم نظر آتا ہے۔ اور یہ نعمت فراواں بہت ہی حقیر اور چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔

اگر واقعاتی انداز پر "تشنگی کم" کا تجزیہ کیا جائے تو بھی اس شعر میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ کہ پیاس جتنی کم ہوتی جاتی ہے پانی کی قدر و قیمت کم محسوس ہوتی ہے اور پیاس بڑھی ہوئی ہو تو پانی کا ایک گھونٹ بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ "تشنگی کی کمی" کے سبب "دریا کے شبنم نظر آنے" کا مفہوم "دریا کے پانی کی قدر و قیمت کی کمی" کا احساس ہے!

جگر کے شعر کا مرکزی تخیل:۔

"اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی فراوانی کا احساس دلاتا اور جذبۂ شکر کو اُبھارتا ہے۔ لفظوں کے دروبست سے لے کر معنویت تک اور خیال سے لے کر پیرایۂ بیان تک یہ شعر اپنی جگہ مکمل ہی نہیں حسین و اثر انگیز بھی ہے۔

رضوان الندوی
(مقیم دمشق)

عقل و جنوں اقبال کی کسوٹی پر

اقبال کے یہاں عقل اپنے تمام علوم و فنون، فلسفہ و حکمت، ایجاد و اختراع، تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک اکائی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ اس سے موجودہ مغرب کا مدرسۂ فکر بھی مراد لیتے ہیں۔ عقل کے ساتھ وہ انہی معنوں میں اکثر فکر و نظر، اندیشہ و حکمت اور علم و ادب کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جنوں اُن کے یہاں دیوانگی اور بے خبری و مدہوشی کا نام نہیں بلکہ وہ انسان کی اُس قلبی طاقت کا نام ہے جس سے اُس کے تمام اعمال و افعال میں زندگی و حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بغیر زندگی کے سارے مظاہر مردہ و افسردہ ہیں، جنوں کے ساتھ ہی وہ اکثر اسی معنی میں عشق و جذبہ، ذکر و محبت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں!

علامہ اقبال کے کلام میں ہمیں عقل و جنوں یا علم و عشق کے موضوعات بکھرے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ایک کو موضوع فکر بناتے ہیں تو کبھی دوسرے کو اور کبھی دونوں کا بر سبیل مقابلہ و موازنہ یکجا ذکر کرتے ہیں۔

اگرچہ پہلی اور سرسری نظر کے بعد ہی ہم کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اقبال خود "صاحب جنوں" یا "مرد عشق" ہیں ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ "لایحزنون" کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

یہیں اُن کے جگر پاروں سے بآسانی دریافت ہوجاتا ہے کہ علم و دانش کا یہ مرد میدان "جنون بے سامان" کے سامنے سر بزیر ہوچکا ہے اور اُسی کا کشتہ اور اسی کے فیض سے ہر دم و زندہ ہے ؎

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من — عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر اقبال نے جنون یا عشق کو اپنے یہاں پہلی جگہ دی ہے اور وہی ان کے نزدیک "میر کارواں" ہے لیکن فکر و عقل کا وہ سرے سے انکار نہیں کرتے، اُس کی حیثیت اُن کے یہاں ثانوی ہے اور اگر وہ اپنی حدود و دائرہ کے اندر ہے تو پھر جنوں کا دمساز اور شریک ہے اور کمالِ انسانی کیلئے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمان کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

آپ نے دیکھا کہ نہایت اندیشہ اور کمالِ جنوں پہلو بہ پہلو ہیں اور ان کے بغیر تکمیل حیات ناممکن ہے۔ ایک دوسرے موقع پر الفاظ و معانی کے تغیر کے ساتھ اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں — تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

اس حد تک تو اُن کے یہاں ان دونوں اضداد میں ہم آہنگی اور صلح ہے۔ لیکن جب عقل تنہا ڈکٹیٹر بن جائے اور دل و نظر اس

نیم وحشی زمینوں کو پھونکنا اس کا کارنامہ یا غلط کارنظر آتی ہے۔ حقیقت وہی ہے کہ ذیل میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں　　راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا جذب عمل بے بنیاد　　سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات

اصل میں اس "عقل بے مایہ" یا "عقل محض" سے اُن کی ساری پیکار ہے علاوہ اس کو اپنے یہاں وہ کوئی جگہ دینے کو تیار نہیں وہ اپنی عیار سے نئے نئے قالب اختیار کر کے انسانیت کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بیچارہ نہ صوفی ہے نہ ملا نہ حکیم

درآنحالیکہ یکرنگ عشق ان ہتھکنڈوں سے بالکل دور ہے۔ پھر اس عقل کی ایک بڑی خرابی اس کا نکما پن ہے۔ یہ انسان کو شدائد و خطرات کے مقابلے سے روکتی اور چون وچرا کر کے اس کو بزدل بناتی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی !

یہاں بھی عشق کی سخن گسترانہ بات آگئی ہے۔ ورنہ مقصود عقل نمرود کی حیرانی اور خوف دکھانا ہے۔ یہ عقل انسان کو ظاہر پرست بناتی اور حقیقتوں کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ کرتی ہے۔ چنانچہ آج کا نیا انسان زبردست انکشافات اور کائنات کا دل چیرنے کے بعد بھی اس "ظاہر" کے ماورا "حقیقت کبریٰ" یا کثرت کے حجابات کے پیچھے "وحدت" کو نہ پاسکا۔ یہ اپنی منطقی پیچیدگیوں اور فلسفہ کی بھول بھلیوں میں اصل راہ کو گم کردیتی ہے۔ اپنے شیدائی کو سرگشتہ و حیران رکھتی اور اس میں تذبذب اور بے یقینی پیدا کرتی ہے۔ ؎

انجام خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت　　ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

"زمانہ حاضر کے انسان" کے عنوان سے ایک مستقل اور مختصر نظم ہے۔ جس میں اس عقل بے مایہ کی کوتاہ دستی اور نارسائی کو بہت لطیف اور حقیقت آمیز پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

عشق ناپید و خرد میگزدش صورت مار　　عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اس عقل بے مایہ یا علم بے نور کی یہ ساری کیوں ہے جس کا سیلاب مغرب سے قدیم و حاضر میں آ رہا ہے اور جس کی برکات شک و تنقید والحاد و بے دینی، بے ضمیری و نفس پرستی و شہوانیت و بہیمیت اور فسق و فجور ہے۔ اسی نے ایٹم اور ہائیڈروجن بم کو جنم دیا۔ اور اُس نے مغرب و مشرق میں انسان سے انسانیت کا جامہ اتار کر اس کو ایک وحشتناک اور بے رحم درندے میں تبدیل کر دیا ہے۔ جن کی دنیا میں "مستی شہرت" اور "مکروہ نقش" کے "گندے تالابوں" یا پھر آگ اور دھوئیں کے بادلوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس عقل کو لے کر انسان کیا کرے جو اس کو پرندوں کی طرح فضا میں اڑنا اور مچھلی کی طرح سمندر کی تہوں میں تیرنا تو سکھا دے لیکن وہ انسان کو انسان نہ بنا سکے۔ شاید اسی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر غالب نے کہا تھا کہ ؎

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا !

وہ عقل جو سر و پر دیں کا کھیلتی ہے شکار　　شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک مختصر نظم جس کا عنوان "علم و عشق" ہے اور جو اپنی لطافت اور زور کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس میں علامہ نے بہت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ علم و عشق کا موازنہ کیا ہے ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن   عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن   عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات   علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات   علم ہے پیدا سوال عشق ہے پیدا جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں   عشق کے ازلی غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں   عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام   شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام   علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

جنوں اقبال کے یہاں محسوس بھی ہے اور محسوسات سے ماورا بھی۔ میرا مطلب ہے کہ کبھی تو وہ خود عمل و حرکت کا نام ہے اور کبھی وہ حرکت و عمل کی وہ بے پناہ قوت ہے جس سے زندگی میں گرمی و حرارت، عالم میں شادابی و رونق اور قلب میں یقین و سکون پیدا ہوتا ہے اپنی حرکت و عمل کی لامحدود قوت سے کبھی یہ جنوں تقدیر کو بھی بدلتا نظر آتا ہے ؎

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے   جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
وہ چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں   عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار رفو

انسانیت کے سارے محیر العقول عجائبات اور زبردست کارنامے اس "عشق بلاخیز" کا کرشمہ ہیں۔ نمرود کی آگ میں یہی عشق کودا تھا۔ بدر و حنین میں بھی یہی عشق معرکہ آرا تھا۔ کربلا کے معرکہ میں بھی یہی عشق خوں چکاں تھا ؎

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق   معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہی عشق بیچارہ یا "جنون آتش بجاں" ہے جو خود سر اور گردن کش عقل سے نبرد آزمائی کرتا اور اُسے نیچا دکھاتا رہتا ہے ؎

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی   باہر نہیں کچھ عقل خداداد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلال ازلی کا   اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

محسوسات سے ماوراء وہ ایک زندہ و پائندہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی کی اصل اور روح ہے اور جس کے بغیر ہر انسانی کوشش و تخلیق بے جان و سرد ہے ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات   عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

"مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" دو طویل اور پر کیف و ولولہ انگیز نظموں میں علامہ نے انتہائی جذب و لطافت کے ساتھ عشق کی کیفیات و صفات اور امتیازات و کمالات کو گنایا ہے۔ ایک موقع پر عقل پر تنقید کرتے ہوئے جنوں کی ایک پوشیدہ اور ممتاز صفت "ادراک" کا ذکر کیا ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ   کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

اسی عشق پر شرع و دین کی بنیاد ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق ● عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اس مضمون کے بظاہر ان کے بیں پر اپنچھے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ درحقیقت انما الاعمال بالنیات کی طرف اشارہ۔ شریعت میں ہر عمل کی شرط یہ ہے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ اور سنتِ نبوی کے مطابق ہو۔ ورنہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ منافقین کا ایمان مقبول نہیں۔ اسی جذبۂ اخلاص و اتباع کا نام اقبال کے یہاں عشق ہے۔ بلکہ یہی عین ایمان ہے۔ جس کا اقبال نے بارہا ذکر کیا ہے۔

غرضکہ جیسا ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے جنون و عشق کے لفظ کو پاکیزگی و لطافت کے ساتھ معانی و حقائق کی ایک وسیع دنیا سے مالا مال کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عقل و جنوں کے تضاد کو ختم کرنے اور ان کو باہم جمع کرنے کی علامہ نے کیا صورت اختیار کی ہے۔

درحقیقت عقل کا ان کے یہاں ایک مقام ہے جس سے اگر وہ تجاوز نہ کرے تو مفید اور کارکشا ہے، ورنہ تباہ کن ہے۔ یہ مقام دل و نظر یا عشق و وحی کا اتباع ہے اگر عقل جنون کی دمساز اور شریک کار ہے تو رحمت ہے ورنہ زحمت ہی زحمت ہے۔ اس عقل کا نام اقبال کے یہاں "عقل جہاں بیں" یا "دانشِ نورانی" ہے اور انسانیت کو اس سے مفر نہیں ؎

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی ● ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است ● بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست ● نورِ افرشتہ و سوزِ دل عالم با اوست

یہ "عقلِ پاک" جنوں کے کوچوں میں ہی دستیاب ہو سکتی ہے ؎

وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلہ کو شرر سے ● پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں

اقبال کے نزدیک "مسلم صادق" ہی انسان کامل ہو اور اس کی حقیقت "نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں ہے" اور اس طرح عقل و جنوں کا معرکہ ختم ہو جاتا ہے!

ماہر القادری

یادِ رفتگان

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم

حیدرآباد دکن نے چھوٹے پیمانہ پر حقیقت میں قرطبہ اور بغداد کی علمی مجلسوں کی یاد تازہ کردی تھی۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ارباب کمال کھنچ کھنچ کر سرزمین دکن میں پہنچ گئے تھے۔ ان آنکھوں نے دکن میں جو چہل پہل دیکھی ہے اور علم و کمال کے جن جمگھٹوں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حیدرآباد ہی میں سب سے پہلے نیاز حاصل ہوا۔ اُن کے مضامین کے ذریعہ غائبانہ تعارف تو تھوڑا بہت پہلے ہی سے تھا۔ حیدرآباد کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں اُن کی تقریریں سُن کر یہ غائبانہ تعارف، تعلقِ خاطر سے بدل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد دکن میں سیاسی اور مذہبی جلسوں کا بڑا زور و شور تھا۔ بہت ہی کم ایسے جلسے ہوتے تھے جن کے پروگرام میں میری "نظم" نہ شامل ہوتی ہو۔ قایدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی تقریر اور میری نظم جلسوں کے پروگرام میں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ انہی جلسوں کی بدولت مولانا گیلانی مرحوم سے تعارف ہوا اور یہ جان پہچان رسمی تعارف ہو کر ہی نہیں رہ گئی بلکہ ربط و اخلاص بڑھتا ہی چلا گیا۔

میں نے اپنی مشہور نظم "ظہورِ قدسی"* کہی تو اُسے لے کر مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُن دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے قریب ایڈیکمیٹ میں رہتے تھے، میں نے نظم سُنائی، تو اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوگئیں۔ کاش! عشقِ رسُول کے ان موتیوں کو میں چُن سکتا!

• میری اس نظم پر مولانا گیلانی مرحوم نے مقدمہ لکھا اور نظم کی شہرت و مقبولیت کی جو پیشگوئی انہوں نے اُس وقت کی تھی۔ وہ بعد میں جاکر حرف بحرف پُوری ہوئی۔ میری سعادت اور خوش نصیبی کی انتہا ہے کہ دو سال پہلے جب میں نے روضۂ رسُول پر حاضری دی تو مسجدِ نبوی کے دروازوں پر یہ نظم (ظہورِ قدسی) کتابی صورت میں تقسیم ہو رہی تھی۔

حیدرآباد دکن میں ایک نیک نفس بزرگ "مچھلی والے شاہ صاحب" (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی عقیدت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ سر اکبر حیدری مرحوم تک اپنے تمام اعزاز و مرتبت کے باوجود اُن کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ انہی شاہ صاحب کے ایک خلیفہ مولوی محمد حسین صاحب تھے، جو دکن کی ایک جاگیر (وقبرتی) میں ناظم تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب مرحوم کو توحید کے اسرار و معارف کی شرح و تفسیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے "طولِ لسان" عطا فرمایا تھا۔ گھنٹوں "لا الٰہ الا اللہ" کی تفسیر فرماتے اور کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا مگر مضامین کی تکرار اور اعادہ نہ ہونے پاتا۔ ہر لحظہ نئی تشریح اور تازہ سے تازہ تر مضامین! مولانا مناظر احسن گیلانی بھی اُن کے عقیدت مندوں میں تھے۔

---

* سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی۔

ایک دن میں اپنے مکان[1] میں تھا کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی چوکھٹ کے قریب کھڑے ہیں۔ اُن کو شاید محسوس بھی نہ ہوا ہو۔ مگر میں نے دیدہ و دل ان دونوں بزرگوں کے قدموں تلے بچھا دیئے۔ فرمانے لگے، "ہم تمہیں مولوی محمد حسین صاحب قبلہ کے یہاں لے چلنے کے لئے آئے ہیں"۔ بس کن کی آن میں شیروانی پہن کر تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب مرحوم کے یہاں ہم پہنچے تو وہ مجھے دیکھتے ہی بولے:۔

"عہدہ بہت چھوٹا ہے۔ ابھی اور ترقی ہونا .... اور .... ترقی"

وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔ صوفی محمد حسین صاحب قدس سرہٗ کی ذات اور شخصیت میں بڑی جاذبیت بلکہ محبوبیت تھی۔ ساری عمر وعظ و تلقین ہی میں گزار دی۔ اور توحید کے وہ دمکتے بیان کئے کہ بڑے بڑے کتابی علم رکھنے والوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم!

کسی نہ کسی عنوان اور تقریب سے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے نیاز حاصل ہوتا ہی رہتا اور ہر ملاقات میں میری نیازمندی اور اُن کی کرم فرمائی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا۔ جب ملتے بڑی کشادہ خاطری اور بے تکلفی کے ساتھ ملتے۔ اپنی علمی عظمت اور شہرت کا احساس تک نہ ہونے دیتے!

حیدرآباد دکن سے قطع تعلق کے بعد ۱۹۴۹ء تک کوئی آٹھ نو سال کی مدت ہوتی ہے، اس مدت میں مولانا گیلانی سے نہ تو پھر ملنا ہوا اور نہ خط و کتابت کی نوبت آئی۔ جب میں نے "فاران" نکالنے کا ارادہ کیا تو اُن کی خدمت میں مضمون کے لئے عریضہ بھیجا۔ جواب میں مضمون روانہ فرمایا اور ساتھ ہی محبت آمیز مکتوب بھی! مولانا مرحوم نے اس کے شاید تین چار مہینے کے بعد پھر ایک اور مقالہ روانہ فرمایا مگر وہ "فاران" میں نہ چھپ سکا۔ اسی شرمندگی کے سبب کئی سال تک میں اُن کی خدمت میں خط بھیجنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر رسالہ (فاران) مولانا کی خدمت میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا۔

جب میں زیارت حرمین شریفین سے واپس ہوا تو اُس وقت علامہ گیلانی مرحوم کا گرامی نامہ آیا۔ جسے میں نے بار بار پڑھا۔ اور اُن کو مجھ نابکار کی ذات سے جو غیر معمولی حسن ظن تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مکتوب میں فرمایا تھا۔ اُس نے مجھے خوب رُلایا۔ اُن کی تحسین و ستائش سے مجھے غرق ندامت کر دیا!

مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہٗ علم و فضل، اخلاق و کردار اور وضع قطع کے اعتبار سے علماء سلف کا نمونہ تھے۔ گداز بدن، متوسط قد و قامت، گندمی رنگت، چہرے پر داڑھی کتنی بھلی لگتی تھی، مسکراہٹ کا خاص انداز تھا۔ باتیں بڑی دلنشین کرتے اور اُن میں جو ایک "جذب" کی سی کیفیت تھی، اُس نے اُن کی ذات میں بڑی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔

درس نظامی کی تکمیل امتیازی شان کے ساتھ کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں خود اُن کے اساتذہ اُن کی ذہانت اور فہم و دانش کے معترف تھے۔ سب کچھ پڑھ کر پھر ٹونک پہنچے اور حضرت مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ سے علوم عقلی میں استفادہ کیا۔ علامہ برکات احمد جیسا کامل اُستاد اور مناظر احسن جیسا ذہین شاگرد، ہم جیسے بے علم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کہ اُستاد نے کیا سکھایا اور شاگرد نے کیا حاصل کیا؟

مولانا مرحوم کی زندگی کا زیادہ زمانہ دکن میں گزرا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں شعبہ دینیات کے صدر رہے۔ ایک ہزار سے اُوپر

---

[1] واقع ملک پیٹ (حیدرآباد دکن)

تو کوئی نہ تھی۔ ہر طرح کے فراغت کے اسباب میسر تھے، موٹر نشین تھے، بنگلے میں رہتے تھے، بلدہ حیدرآباد کے ہر طبقہ میں اُن کا احترام کیا جاتا تھا۔ بلکہ لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے، مگر مزاج میں انکسار اور طبیعت میں تواضع کا رنگ ہمیشہ باقی رہا!

مولانا گیلانی اُونچے درجہ کے واعظ نہیں مُقرر (اسپیکر) تھے۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم جو تقریر میں اپنا آپ جواب تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ "میں نے تقریر کرنی مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے، میں اُن کے پیچھے موٹر لئے پھرتا تھا، جہاں اُن کی تقریر ہوتی وہاں جاکر اُن کو ضرور سنتا"۔ اُن کی تقریر میں خطابت کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ آخر میں بیماری کے سبب تقریر میں اُلجھنے لگے تھے۔ مگر اس دورِ انحطاط میں بھی جب سنبھل کر بولتے تو خطابت کا حق ادا کر دیتے۔

تحریر میں قلم کی روانی کا یہ عالم کہ ذرا سی بات پھیل کر ایک اچھا خاصہ دفتر بن جاتی۔ "اختصار و ایجاز" انھیں ناپسند اور "شرح و اطناب" سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ معلومات کے انبار کے انبار لگاتے چلے جاتے۔ اُن کا قلم طوفان کی طرح خس و خاشاک اور لالہ و گل سب کو اپنی رَو میں بہائے جاتا۔ "تحریر میں" انجیل "کا انداز جھلکتا تھا" "النبی الخاتم" میں مولانا گیلانی کی تحریر کے جوہر پوری طرح جھلکتے ہیں۔ دسیوں کتابیں اور درجنوں طویل مقالے یادگار چھوڑے!

شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی، خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ مگر اُن کے دُوسرے کمالات کے سامنے اُن کا یہ وصف دبا اور چھپا رہا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی وفات پر جو فارسی نظم کہی[1] اُسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا!

ذاتِ رسالت مآبؐ سے مولانا گیلانی مرحوم کو جو محبت اور عشق تھا۔ وہی اُن کی سیرت و کردار کا سب سے زیادہ نمایاں باب ہے عشقِ رسولؐ کی زادِ راہ لے کر جس نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہو اُس کی سعادت اور خوش نصیبی کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ دل بڑا درد مند پایا تھا۔ دُنیا کے کسی خطہ سے بھی مسلمانوں کی مظلومیت کی کوئی خبر سنتے تو بے چین ہو جاتے۔ بہار اور دکن میں مسلمانوں کی تباہی اور قتل و غارت گری کے روح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور مظلوموں کی جگر خراش داستانیں اپنے کانوں سے سُنیں۔ اِس نے اُن کے دل میں اور زیادہ گداز پیدا کر دیا تھا۔ مولانا گیلانی "نالۂ نیم شب" اور "آہِ سحرگاہی" کی لذت سے بھی آشنا تھے۔ اور وہ اُن لوگوں میں سے تھے کہ خشیتِ الٰہی کے سبب جن کے آنسوؤں سے سجادہ سچ مچ بھیگ جاتا ہے۔ صاحبِ حال و قال، اہلِ جذب و سوز۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو معطر فرمائے کہ اُن کے اُٹھ جانے سے خیر و فلاح اور علم و فضل کی مسند خالی ہو گئی۔ اُن کی موت کا اُن کے کس عزیز کو پُرسا دیجئے کہ مولانا گیلانی مرحوم کے ہم تمام مغموم عقیدت کیش اور نیازمند خود تعزیت کے مستحق ہیں!!

(رحمہ اللہ تعالیٰ)

---

[1] بعشق مصطفےٰ دیوانہ بودی۔

معراج کی رات

(گبر پرشاد گوہر دہلوی)

کھل گئے چرخ پہ اسرارِ خدا آج کی رات
ہے فرشتوں میں بھی اک شور بپا آج کی رات

پڑ گئی عرش پہ بنیادِ وفا آج کی رات
کس کے پرتو سے منور ہے بساطِ عالم

عرش پر آتے ہیں محبوبِ خدا آج کی رات
اللہ اللہ! یہ اعزازِ محمدؐ دیکھو!

عرش پر کون ہوا جلوہ نما آج کی رات
اس طرح پھیلی ہے کچھ روئے محمدؐ کی ضیا

خود طلب کرتا ہے بندے کو خدا آج کی رات
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبیؐ"

ذرۂ خاک بھی مہتاب ہوا آج کی رات
خود یہ کہتا تھا محمدؐ سے خدا آج کی رات

نورِ عرفاں سے مرا دل بھی ہے روشن گوہر
ظلمتِ کفر میں کیسی ہے ضیا آج کی رات

کیا ہوگا؟

(ابوالاشرف شبیر بخاری (ایم اے)

کمالِ عشق کی ناپختگی کا کیا ہوگا؟
زوالِ عشق کی بخیہ گری کا کیا ہوگا؟

چھپا ہے دیدۂ انساں سے جلوۂ رخِ دوست
یہ آگہی ہے تو اس آگہی کا کیا ہوگا؟

نمودِ صبح پہ ہے شب کی تیرگی کا گماں
یہ روشنی ہے تو اس روشنی کا کیا ہوگا؟

رکھی ہے جس کی بنا بیکسوں کی آہوں پر
یہ خواجگی ہے تو اس خواجگی کا کیا ہوگا؟

وطن میں اسوۂ شبیرؓ جس سے عام نہیں
یہ شاعری ہے تو اس شاعری کا کیا ہوگا

تبصرہ

اکبر زمزم

ہم یہ سمجھتے تھے گلستاں میں بہار آنے پر
نظم و ترتیب کا انداز بدل جائیگا
کیا خبر تھی کہ سیاست کے حسیں نغموں کی
نے وہی ہوگی مگر ساز بدل جائیگا

(مولانا محمد علی جوہر)

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

(مولانا رومؒ)

ازدام و دو ملولم وانسانم آرزوست

فردوسِ تغزّل

(رشید کوثر فاروقی)

لمحہ بہ لمحہ دم بہ دم نقص بھی ہے کمال بھی
ایک ہی شے ہے جس کا نام بدر بھی ہے ہلال بھی

غربت کا مارہ بڑی مشکل سے گلشن تک گئے
ہر قفس کی خاک چھانی تب نشیمن تک گئے

اشتیاقِ جلوہ کو جلوہ سمجھ بیٹھا ہوں میں
یہ تو میری ہی نظر کے تار چلمن تک گئے

ہر نگاہِ دوست کی تعبیر کچھ آساں نہ تھی
بارہا ناوک پلٹ کر ناوک افگن تک گئے

حیف ایسے طائروں پر جو قفس کے ہو رہے
یا تری پرواز کی تو شور و شیون تک گئے

اے امیدِ بے عمل تو آج کل کرتی رہی
پھر ترے جھولوں کے دن آ کے ساون تک گئے

(ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانہ زیب - بریلوی)

موج کے ساتھ تلاطم کا سہارا لے کر
کشتیٔ عمرِ رواں شوق سے چل سکتی ہے

جادۂ شوق کے ہر موڑ سے جانِ منزل!
تجھ سے ملنے کیلئے راہ نکل سکتی ہے

نیم پژمردہ یہ کلیاں نہ ہوں مایوس ابھی
رُخ ہوا صحنِ گلستاں کا بدل سکتی ہے

زندگی رنگ بدلتی ہے تو بدلے لیکن
موت بھی زیست کا عنوان بدل سکتی ہے

جب محبت میں کچھ انقلاب آگیا
غم کی دوشیزگی پر شباب آگیا

التفاتِ نظر کی یہ مجبوریاں
مری جانب جو دیکھا حجاب آگیا

تیرے جلووں کا دورِ مسلسل ہے یہ
ماہ و انجم چھپے آفتاب آگیا

(سید آلِ رضا لکھنوی)

کشتِ تشنہ لبی آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل
جو کہیں اور برسنے کو ادھر سے گزرے

(فضلی)

آئی بڑھ بڑھ کے مگر رہ گئی چھو چھو کے قدم
موج نے جب بھی یہ چاہا مرے سر سے گزرے

(نجم آفندی)

گرتے گرتے اُن کا دامن تھام لے
گرنے والے! لغزشوں سے کام لے

(ماہر القادری)

تاروں میں محبت کا جہاں ڈھونڈ رہا ہوں
گزری ہوئی راتوں کے نشاں ڈھونڈ رہا ہوں

سحر اگرچہ ہے دھندلی مگر ہوئی تو سہی
دعائے نیم شبی کارگر ہوئی تو سہی!

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

کراچی میں کچھ شوخ مزاجوں نے "حسینۂ پاکستان" کے انتخاب کے لئے "مقابلہ" کا انتظام کیا تھا۔ کمیٹی بن چکی تھی۔ قریب قریب تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ عوام نے اس پر احتجاج کیا کہ ہم اس بے غیرتی کو برداشت نہیں کر سکتے کہ مسلمان عورتیں حُسن کے مقابلوں میں شریک ہوں اور غیر مرد اُن کے اعضاءِ جسمانی کے تناسب اور حُسن و جمال کی نزاکت و رعنائی کا جائزہ لے کر بہت سی عورتوں میں سے ایک عورت کو "حسینۂ پاکستان" منتخب فرمائیں! غنیمت ہے اور بہت غنیمت ہے کہ عوام کے اس احتجاج کی بروقت شنوائی ہو گئی اور یہ مقابلۂ حُسن روک دیا گیا۔

تماشائی کو اُن شاہدانِ خوبی و رعنائی اور بُتانِ نازو ادا کی تمناؤں پر بڑا ترس آتا ہے کہ جو گھُٹ کر، دب کر، تلملا کر بلکہ زندہ درگور ہو کر رہ گئیں۔ ہائے! یہ دقیانوسی مُلانے! جو پاکستان کو نجانے کیا بنا کر چھوڑیں گے! "ترقی" سے تو اِن کو سدا کا بیر ہے! صاحبو! ان "مُلاؤں" کے احتجاج کا اگر اسی طرح وزن محسوس کیا جاتا رہا اور اُن کی بات یونہی چلتی رہی تو پاکستان کے شراب خانوں اور ناچ گھروں میں ایک دن خاک اُڑتی اور کتنے روتے ہوئے نظر آئیں گے —— اور ہمیں سب سے زیادہ ہمدردی عوامی لیگ کے "پاپائے اعظم" مسٹر شہید سہروردی سے ہے، ان کی راتیں کہاں بسر ہوں گی!

پاکستان کے مغرب زدوں اور "صاحب لوگوں" نے اگر اس خطرے کو محسوس کر کے اس "دقیانوسیت" اور "قدامت پرستی" کا مقابلہ نہ کیا تو وہ دن دُور نہیں ہے کہ ان "مُلاؤں" کی کوششوں کی بدولت پاکستان ایک "خطۂ بے رنگ"، "جہانِ بے ذوق" اور "عالمِ بے کیف و مستی" بن کر رہ جائیگا۔ جہاں نہ لوگ شراب کے جام چھلکا سکیں گے۔ نہ کلب میں باہیں ملا کر عورت مرد رقص کر سکیں گے۔ نہ گھوڑ دوڑ کا جوا باقی رہے گا، نہ کوئی سٹہ کھیل سکے گا۔ نہ عورتیں سڑکوں پر اپنے اسبابِ زینت کی نمائش کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ یہ سب شوخیاں —— رعنائیاں، لذتیں، خلاص —— ایک دم خلاص! یہ نظارہ بازیاں رخصت! ان تفریحوں اور بے باکیوں کا ڈراپ سین!

مگر اس کو کیا کیجئے کہ سنجیدگی کا، شرم و غیرت کا، پاکیزگی اور نیک چلنی کا یہ دَور تو پاکستان میں بہر حال آ کر رہیگا۔ جنھیں یہ تبدیلی ناگوار ہو اور اس انقلاب کو برداشت نہ کر سکیں۔ اُن کو چاہئیے کسی ایسے ملک کا رُخ کریں۔ جہاں اُن کو اس "خشک مُلائیت" سے نجات مل سکے!

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی بالقابہم العالی اگر مسلم لیگ کی حمایت میں کمزوری نہ دکھاتے اور اپنے مُوقف پر سختی کے ساتھ جمے رہتے تو مسلم لیگ کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر تماشائی عرض کرتا ہے کہ وزیر اعظم مسلم لیگ کے وقار کو سنبھالتے یا اپنی وزیر اعظمی کو! ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے! اور پھر ہمارے وزیر اعظم اللہ کے فضل سے بڑے مُدبر ہیں، زیرک اور دانشمند واقع ہوئے ہیں۔ وہ طوفان کی نبض دیکھ کر کشتی کا رُخ بدلتے ہیں۔ طوفان کا رُخ بدلنے کا خطرہ وہ مول لینا نہیں چاہتے۔ وہ تو علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ ؎

تو اگر میرا نہیں بنتا مگر اپنا تو بن

یہ بات وزیر اعظم صاحب نے اپنی گرہ میں خوب کس کر باندھ لی ہے! اور یوں بھی بند مٹھی کا بھرم بڑی چیز ہے!

روایت کی گئی ہے۔ یہ روایت جھوٹی ہے یا سچی اس کا گناہ راوی کی گردن پر ــــ یہ کہ کراچی میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کے لئے ایک صاحب کو ہزار روپے دیئے گئے۔ جلسہ ہوا، اور کیوں نہ ہوتا۔ دو پیسے کے زور پر رنڈیاں ناچ سکتی ہیں تو جلسہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ایک ہزار روپے کا خرچ اور حاضرین کی تعداد کل تیس پانسو! جس میں محلہ کے کچھ نابالغ لونڈے بھی تھے۔ اور کچھ راہگیر۔ روشنی اور شامیانے کو دیکھ کر آ کھڑے ہوئے تھے! تماشائی عرض کرتا ہے کہ کراچی میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کو دیکھ کر دو روپے میں کسی جلسہ کے لئے اگر ایک عدد "حاضرین" ہاتھ لگ جائے تو یہ سودا زیادہ گراں نہیں ہے!

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جب لاہور میں اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اور اسپیکر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا تو اُس وقت سردار عبد الرب نشتر کو لاہور میں ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ سیاسیات میں شخصیتوں کا ذاتی اثر بہت کچھ کام کرتا ہے ــــ مگر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ سردار نشتر صاحب سرحدی پٹھان ہونے کے باوجود "لالہ مزاج" واقع ہوئے ہیں۔ محتاط، دور اندیش! پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے! روز ازل جب "قسمتیں" بٹنے لگیں تو نشتر صاحب کو "جرأت" کی جگہ "مونچھیں" ملیں ــــ گھنی سے گھنی بھی اور لمبی بھی، خاصی پُر رعب! تو جو چیز اُنھیں قدرت کی طرف سے ملی ہے اُس کا وہ مظاہرہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ اور جو چیز اُنھیں دی ہی نہ گئی اُسے کہاں سے لے آئیں۔

تماشائی کہتا ہے کہ اس فتنہ پرور دور میں "مضر پر جرأت مندوں" کے مقابلہ میں یہ "شریف بے جرأت" لوگ پھر غنیمت ہیں!

آقا :- (ملازم سے) اندر سے فقط تکیہ لے آؤ؟

(ملازم اندر چلا جاتا ہے اور بہت دیر ہو جاتی ہے مگر واپس نہیں آتا)

آقا :- (جھنجلا کر) تم ابھی تک تکیہ لے کر نہیں لوٹے؟

ملازم :- حضور! تکیہ تو مل گیا۔ "فقط" نہیں ملا، اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔

تصحیح

صفحہ (۴۴) (فاران ماہ جون ۵۶ء) ــــ اور صفحہ ۵۲ (فاران ماہ جون ۵۶ء)

یہ دونوں مصرعے علی الترتیب :-

ــہ ہر بچہ ایک بیکس کی اساس زندگی

ــہ ہر ورق اس کا دفتر صنعت کردگار ہے

[illegible]

سوال:- (از مجیب الرحمن۔ ضلع گلبرگہ (دکن) زیارتِ قبور۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارتِ قبور کے متعلق تاکید کی ہے کہ قبروں کی زیارت کرو تاکہ موت یاد آئے۔ براہ مہربانی معلوم کرائیے کہ زیارت کس طرح کریں؟ وہاں جاکر کیا پڑھیں؟ اور زیارتِ قبور کے لئے کونسا وقت موزوں ہے؟

جواب:- اللہ کے رسولؐ نے بیشک زیارتِ قبور کو پسند فرمایا۔ لیکن جس وجہ سے پسند فرمایا وہ بھی ساتھ ہی بیان کردی۔ یعنی "تاکہ موت یاد رہے"۔

موت کو یاد رکھنا بجائے خود کوئی عبادت نہیں۔ بلکہ یہ ذریعۂ عبادت اور وسیلۂ خیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ موت کے بعد ہر شخص سے حساب کتاب لیا جائیگا اور اللہ کے رسولؐ نے عذابِ قبر کی بھی خبر دی۔ جب کسی مسلمان کو موت یاد رہے گی تو زندگی میں وہ ایسے بُرے اعمال سے بچنے کی کوشش کرے گا جن کی سزا میں موت کے بعد کا عذاب درپیش ہو۔ بس اسی لئے موت کو یاد رکھنے کا سبق دیا گیا اور قبریں چونکہ موت کے تصور کو دل و دماغ سے وابستہ کرنے میں بہت قوی الاثر ہیں اور قبرستان میں پہنچکر انسان کی بے ثباتی اور دُنیا کی ناپائیداری کا گہرا نقش دل پر کندہ ہوتا ہے، اس لئے قبروں کی زیارت کی ترغیب فرمائی گئی!

لیکن قسم ہے اُس خدائے برتر کی جس کے قبضہ میں ہماری جانیں ہیں اگر رسولؐ اللہ اپنی زندگی میں یہ دیکھ پاتے کہ قبروں کی زیارت کو موت یاد رکھنے کی بجائے شیطان کی خدمت اور بدعتوں کی اشاعت کے لئے اختیار کیا جا رہا ہے تو فرماتے کہ ایک ایک قبر کو زمین کے برابر کردو۔ ایک ایک مرنے والے کا نشان مٹادو۔ قبروں کا رُخ کرنے والوں کو کوڑے مارو۔ اور توحید کو شرک و نکاثر سے بچاؤ!

عبرت کا مقام ہے کہ جو زیارتِ قبور زندگی کی بے ثباتی اور موت کی ہمہ گیری یاد رکھنے کے لئے پسند فرمائی گئی تھی۔ اسے غلامانِ رسولؐ موت کی ہمہ گیری کی دائرے سے مرحوم بزرگوں کو نکالنے اور حیاتِ جاوید کا انوکھا تصور زندہ رکھنے کی غرض سے اختیار فرمائے ہوئے ہیں۔ قبروں پر وہ اس لئے نہیں جاتے کہ موت کی یاد کو ہر دم تازہ رکھتے ہوئے گناہوں سے بچنے کی جدوجہد کریں گے۔ بلکہ اس لئے جاتے ہیں کہ بدکاریوں اور گناہوں سے عذابِ آخرت کا جو خطرہ پیدا ہوگیا ہے، اس میں سفارش و شفاعت کے ذریعہ کچھ کمی کرالیں، اس لئے جاتے ہیں کہ جو خواہشاتِ نفس ہر امکانی کوشش کے باوجود پُوری نہیں ہوسکی ہیں انہیں مرحوم بزرگوں کی وساطت سے پُورا کرلیں۔ اس لئے جاتے ہیں کہ قرآن کے اعلان "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کو جھوٹا ثابت کرتے ہوئے (معاذ اللہ) دُنیا کو یہ بتائیں کہ ہمارے بزرگ مرے نہیں محض پردہ میں۔ انہیں خاک نے نہیں چاٹا نہ قیامت تک چاٹے گی۔ وہ خدائی میں اللہ کے شریک اور طاقت و قوت میں چھوٹے موٹے رب ہیں۔

ناقابلِ حد تک شرم انگیز ہے یہ حقیقت کہ قبروں پر جانے والے موت کی ویرانی اور عبرت ناکی کو ڈھول ڈھماکوں اور ناچ گانوں، ان قریادوں، سجدہ بازیوں اور کن کن خرافاتِ شدیدہ سے ذبح کرکے نہ صرف اپنے فسق و فجور کا کھلا اعلان کرتے ہیں بلکہ قبروں میں مدفون شدہ مرحومین کی شفاعت و سفارش کے بھروسہ پر گناہ و فسق کا نیا عزم و حوصلہ اور تازہ جرأت لے کر لوٹتے ہیں۔ اُن کی عام زندگی نہ تو نماز روزہ تک سے فارغ نظر آئیں گے اور اسلامی اخلاق اُن کو چھو تک نہ گیا ہوگا۔ لیکن قبروں پر ہنگامۂ شیطانی برپا کرنے والے

فقیروں اور قوالوں اور مجاوروں کے قدموں پر ڈالے مدرسے سختے اس طرح جھکیں گے کہ گویا قرآن و حدیث کا سارا نچوڑ یہی ہے اور اسی ذریعہ سے قبروں کے مرحوم بزرگ اُن کے سارے اگلے پچھلے گناہ اللہ سے معاف کرا کے جنّت کا دروازہ کھول دیں گے !

بخدا اس طرح کے عقیدے سے تو اچھا عیسائیوں ہی کا یہ عقیدہ ہے کہ پوپ کے حضور گناہوں کا اعتراف کرلو تو سب گناہ معاف ہوئے - پوپ آخر ایک انسان تو ہے جسے ربّ حی و قیوم سے کم سے کم اُس بے جان خاک سے تو زیادہ مشابہت ہے جو روحوں سے جدا ہو کر قبروں میں پڑی ہے -

افسوس بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی - آپ کا مختصر جواب یہ ہے کہ قبروں پر صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت ہے اور قبروں پر جانے کا واحد مقصد موت کو یاد رکھنا ہونا چاہیئے - اور موت کو یاد رکھنے کا لازمی مقصد نیکی اختیار کرنا اور گناہوں سے بچنا ہونا چاہیئے - بسلسلۂ مقاصد نہیں ہے کہ قبروں پر جانا اور مراقبے جمانا اور الحاج و نذاری کرنا اور عرس منانا سب حرام - خدا کا کلام اور رسولؐ کا فرمان اگر جھوٹا نہیں ہے تو خدا کی قسم قبروں کو عبادت گاہ اور بازیچۂ لہو و لعب بنانے والے قیامت کے دن آگ کی طرف ہنکائے جائیں گے اور فریاد و ماتم کرنے پر اللہ جلّ شانہٗ فرمائے گا کہ جاؤ وہ کھڑے ہیں تمہارے شفیع اور قاضی الحاجات - اُن سے کہو تمہیں بچائیں ! یہ بدنصیب اُن کی طرف دوڑیں گے تو نظر آئے گا کہ جنہیں انہوں نے شفیع اور قاضی الحاجات سمجھ رکھا تھا اُن کا تو یہ حال ہے کہ جلالِ ربّانی کے سامنے آنکھ نہیں اُٹھا سکتے - لب نہیں ہلا سکتے - اس سے بھی آگے وہ دیکھیں گے کہ اُن کے خود ساختہ شفیعوں اور معبودوں سے ہزاروں درجے اُونچے مرتبے والے انبیاء و رسل تک گھبرائے پھر رہے ہیں اور تنہا — پورے میدانِ قیامت میں اکیلا ایک شخص ہے جس کی حالت سب سے جدا ہے جس کے لب بارگاہِ ربّانی میں ہل رہے ہیں - جو جلالتِ خداوندی سے نظر ملانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو آیت مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ کا واحد مصداق ہے — کون ہے سیّد البشر خاتم الانبیاء امام الابرار مرجع الخلائق شفیع المذنبین، محبوبِ ربّ، محمد عربی عبد اللہ و رسول اللہ فداہُ روحی و عیالی و امی و ابی صلی اللہ علیہ وسلّم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ و اہلِ بیتہٖ اجمعین !

ہم کہتے ہیں کہ آج کے دورِ قبر پرستی میں شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے بھی قبروں پر کھلم کھلا جانا اور ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگنا یا فاتحہ پڑھنا ہرگز درست نہیں ہے - جبکہ جہلا اور مبتدعین کا شوقِ مردہ پرستی بہانوں کے انتظار میں رہتا ہے اور جائز چیز دسیوں ناجائز رسوم و عقائد کی آڑ بن جاتی ہے - جو لوگ حضورؐ کے حکمِ زیارتِ قبور کو نظر انداز کرنے سے واقعۃً خوف کھا سکتے ہیں وہ بالیقین وہی ہوں گے جو زندگی کے ہر فعل و حرکت میں قرآن و سنّت کی مکمل پیروی کر رہے ہوں گے - انھیں چاہیئے کہ حکمِ حضورؐ کی اطاعت کرنی ہی ہے تو رات کی تنہائی میں چھپ کر، جبکہ قبر پر جائیں اور خلوت کے سنّاٹے میں موت کی اُس یاد کو تازہ کریں جس کی خاطر حضورؐ نے زیارتِ قبور کی ترغیب فرمائی تھی - یہ کیا کہ جنرل نے تو حکم دیا کہ فلاں سرحد پر جا کر دشمنوں سے لڑو اور سپاہیوں نے سرحد پر جا کر راگ رنگ کی محفل جمالی - اور وہ ساری خرافات شروع کر دیں جنہیں جنرل ہزار بار خلافِ قانون اور ملعون و مردود قرار دے چکا تھا ! وا حسرتا -

(ماہنامہ "تجلّی" دیوبند)

kobai
کوبائی
داد، اکزیما اور دیگر جلدی
امراض کا بہترین مرہم
مہاسوں اور چہرے کے داغوں کا موثر ترین
قیمت:- ایک روپیہ فی ڈبیہ
آئی ساکو (پاکستان) کراچی
(تیار کنندگان ادویہ)
ادریس روڈ گارڈن ۔ ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کرسکتے ہیں
سم
ہر گھر کے لئے بہترین تحفہ
بارہ مجرّب دواؤں کا خزینہ
گھریلو علاج اور اہل محلہ کی طبی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپ کی طبی ضروریات کو پورا کریں گی
آئی ساکو (پاکستان) کراچی
تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳

سید حسن ریاض

کردار

کئی آدمی باتیں کر رہے تھے اور نثار سوچ رہا تھا۔ اس کو اپنے خیال میں اس قدر انہماک تھا کہ اُس نے ان کی گفتگو میں سے بہت کم سُنا، بالآخر رفیع نے ذرا بلند آواز سے کہا:۔

"یہ کیا ہے نثار! تمہیں ایک مسئلہ پر مشورہ کے لئے بلایا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ کسی طرح متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

نثار نے چونک کر جواب دیا: "جس مسئلہ پر تم بلا سوچے گفتگو کر رہے ہو اُسی مسئلہ پر میں بلا گفتگو غور کر رہا ہوں۔"

"اُفوہ! تم نے تو ہماری گفتگو پر سخت طنز کیا۔ ہماری گفتگو اس کے سوا اور کیا ہے کہ میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو رہا ہوں اور میرے دوست میری کامیابی کی تدابیر پر اظہار رائے کر رہے ہیں۔ آپ کے لئے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"جی ہاں میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے موزوں ہیں یا نہیں اور اگر آپ کھڑے ہو جائیں تو آپ کو کامیاب ہونا چاہیئے یا نہیں" نثار نے بڑی متانت سے کہا۔

رفیع کو یہ سُن کر ایک دھکا سا لگا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر کہا "نثار کیا یہ بات تمہارے کہنے کی ہے کہ میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے موزوں ہوں یا نہیں اور اگر میں کھڑا ہو جاؤں تو مجھے کامیاب ہونا چاہیئے یا نہیں۔ تم میرے لڑکپن کے دوست ہو اور میرے عزیز ہو۔ تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ اگر تمہاری بہن سُنیں گی تو انھیں کیسا صدمہ ہوگا۔ میں نے آج ہی کے متواتر تقاضوں سے یہ قصد کیا ہے۔"

نثار نے ہنس کر جواب دیا "وہ یہی باتیں تھیں جو میں سوچ رہا تھا کہ بہن کو صدمہ ہوگا اور بہنوئی کو شکایت ہوگی۔ مگر پارلیمنٹ کی رکنیت نہ میرے باپ کا ترکہ ہے کہ بہن کی خوشنودی کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں اور نہ آپ کے باپ کا ترکہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے بیوی کی رضاجوئی حاصل کریں۔ یہ قوم کی نیابت کا ایک منصب ہے اور خدمت کا ذریعہ۔ آپ نیابت اور خدمت کر سکیں گے یا نہیں، یہ قابل غور ہے۔"

"تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مجھ میں نیابت کی صلاحیت اور خدمت کا شوق نہیں ہے" رفیع نے فخر کے ساتھ کہا۔

"نیابت کی قابلیت آپ میں ہے مگر خدمت کا شوق بالکل نہیں۔ اور اگر سچ کہوں تو آپ میں نیابت کی صلاحیت بھی نہیں۔ محض خطابت اور سیاست میں نکتہ رسی اور نکتہ سنجی نیابت کے لئے کافی نہیں، کردار ان سب پر مقدم ہے۔ وہ آپ میں بالکل نہیں" نثار نے تلخی کے ساتھ کہا۔

رفیع کو نثار کی یہ بات ناگوار تو بہت گزری مگر وہ میدان سیاست کا پُرانا کھلاڑی تھا۔ غصہ کو ضبط کر کے زور سے ہنسا۔ "آج معلوم ہوتا ہے کہ تم گھر سے کسی بات پر برہم ہو کر آئے ہو اور وہ غصہ مجھ پر اُتارنا چاہتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوں اور تم میری مدد نہ کرو اور بیشک یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بغیر تمہاری رضامندی کے یہ فیصلہ کر دوں۔"

نثار نے متانت سے جواب دیا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے تھے کہ اس الیکشن کے لئے آپ نے ایک لاکھ روپیہ الگ رکھ دیا ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہوگی تو آپ وہ مہیا کریں گے۔ آپ کو کیا لالچ ہے کہ اس الیکشن پر اتنا روپیہ ضائع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور یہ روپیہ آپ کس مد میں خرچ کریں گے۔ اور یہ روپیہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟ بظاہر آپ کا اسکیم یہ ہے کہ ووٹ خریدیں گے اور کامیابی کے لئے اگر ضرورت بھی

کافی نہ ہوگی! با اثر لوگوں کو اور عمال اور اہلکاروں کو رشوت دیں گے۔ پھر کامیابی کے بعد وزارت کے لئے کوشش کریں گے، وزیر کی حیثیت سے رشوت لیں گے اور آئندہ الیکشن کے لئے کئی لاکھ روپیہ محفوظ کر دیں گے۔ آپ نے پہلے بھی یہی کیا ہے۔ گویا اس طرح قوم کو آپ جیسے لوگوں سے کبھی نجات نہ ملے گی "

رفیع کو اندازہ ہو گیا کہ نثار کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ مگر نثار بڑا باوسوخ سیاسی کارکن تھا۔ اس کو نظر انداز کرنا بھی دشوار تھا۔ اس لئے اُس نے بڑی نرمی سے کہا۔ "نثار تمہیں عملی سیاست کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تم نے صرف قومی تحریکات میں کام کیا ہے اور قومی لیڈروں کی وہ باتیں سُنی ہیں جو وہ کارکنوں میں جوش خدمت پیدا کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ اور اس جوش کو اپنی کامیابیوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ الیکشن میں ناکام ہونے کیلئے کوئی کھڑا نہیں ہوتا اور کامیابی کے لئے ہر تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ یہ تدبیریں اگر میں نہ کروں گا تو کوئی دوسرا کرے گا اور کامیاب ہو جائے گا۔ بہرحال اس جگہ کے لئے نہ تم کسی صحابی کو لا سکتے ہو اور نہ کسی ولی کو۔ پھر میری مدد کرنے سے گریز کیوں؟ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو ملازمت چاہو گے تو ملازمت دلاؤں گا اور تجارت کرو گے تو اس کے لئے لائسنس دلاؤں گا "

" لاحول ولا قوۃ! یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں! میں اس وقت تہیہ کرتا ہوں کہ اگر آپ الیکشن میں کھڑے ہوئے تو میں آپ کی مخالفت کروں گا"

نثار یہ کہہ کر بڑے غضب سے اُٹھا اور چلا گیا۔ سب لوگ متحیر رہ گئے اور رفیع کو اپنے حامیوں سے ندامت ہوئی۔

نثار نے اطہر کو رفیع کے مقابلہ کے لئے تیار کیا۔ اور اس کی تائید کے لئے مخلص کارکنوں کا ایک گروہ پیدا کیا۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کیلئے اطہر نہایت موزوں تھا۔ ذی علم، خوش فکر، امور سیاست سے خوب واقف اور صاحب کردار۔ وہ بہت دولت مند نہ تھا۔ لیکن دیانت کے ساتھ الیکشن لڑنے کے لئے بہت دولت مند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ نثار نے اس سے یہ صاف کہہ دیا تھا کہ ہارنے کے لئے کھڑا ہو رہا ہے۔ اس وقت صرف یہ مقصد ہے کہ انتخابات میں دیانت کی مثال قائم کر دی جائے۔ با اصول اور ایماندار لوگوں کو دو تین الیکشنوں میں ناکامیاں ہوں گی۔ بالآخر یہ نتیجہ دولت مندوں کے پاس اتنا روپیہ ہی نہ رہے گا کہ ووٹ خریدیں اور رشوتیں دیں۔ "کافر نتواں گشتن ناچار مسلماں شو" کا مضمون ہوگا۔ اپنی حفاظت کے لئے انہیں خود ہی باز آنا پڑے گا۔ اور یہ انہی اصولوں کے مؤید ہو جائیں جن کی یہ آج مخالفت کر رہے ہیں۔

الیکشن کی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ رفیع کو نثار کی مخالفت کی قوت محسوس ہونے لگی۔ رفیع کا روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور اطہر کا سب سے بڑا سرمایہ نثار کی تدابیر، قوت عمل اور دلنشین تقریریں تھیں۔ اطہر کی کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

نثار سے مخالفت کا انتقام لینے کے لئے اور الیکشن کے کام سے اس کو باز رکھنے کے لئے رفیع نے ایک جعلی دستاویز بنوائی اور ایک دوست کو اس پر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ نہایت برہمی کے ساتھ رفیع نے اپنی بیوی سے کہا "آپ دیکھ رہی ہیں کہ آپ کا بھائی میری کیسی مخالفت کر رہا ہے "

"جی ہاں دیکھ رہی ہوں" میمونہ نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"کیا اس کا تدارک آپ کا فرض نہ تھا" رفیع نے سخت لہجہ میں کہا۔

"میں نے بھائی کو بہت سمجھایا مگر وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ میرے کہنے کا اُن پر اثر نہ ہوا۔ میں لاچار ہوں" میمونہ نے لجاجت سے کہا۔

"جی نہیں لاچاری کا عذر کافی نہیں ہے۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں گی یا بھائی کا" رفیع نے تلخ لہجہ میں کہا۔

"اس فیصلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس روز سے بھائی نے آپ کی مخالفت شروع کی ہے اور میری درخواست [illegible]

دیا ہے" میمونہ نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔

" اگر آپ کو میرا ساتھ دینا ہے تو اس سے بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ میں نثار پر ایک لاکھ روپے کے قرضے کا دعویٰ کرا رہا ہوں۔ اس میں آپکو [illegible] کی طرف سے شہادت دینی ہوگی" رفیع نے بے حیائی کے ساتھ کہا۔

میمونہ نے حیرت سے پوچھا۔ "بھائی نے ایک لاکھ روپیہ کب قرض لیا؟ انہیں اس کی کیا ضرورت تھی"

رفیع نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "انہوں نے قرض لیا نہیں مگر میں کہتا ہوں کہ لیا۔ اور میں نے جعلی دستاویز بنوائی ہے۔ تمہیں اس دستاویز [illegible] کے دستخط کرنے ہیں اور پھر عدالت میں شہادت دینی ہے"

" وہ جھوٹا قرضخواہ کون ہے جس کی طرف سے یہ دعویٰ ہوگا" میمونہ نے غم و غصے کو ضبط کرکے سوال کیا۔

" افضل خاں" رفیع نے اختصار سے کہا۔

" ہیں ہیں! افضل خاں۔ یہ تو وہی ہیں جن کو ابا جان کی مدد سے یہ فروت حاصل ہوئی ہے"

" ہاں ہاں وہی افضل خاں۔ تم بھی تو ابا جان کی بیٹی ہو۔ ابا جان کے بیٹے کی نہ سہی وہ بیٹی کی مدد کریں گے۔ یہ بھی تمہارے ابا جان کے [illegible]مانات ہی کا بدلہ ہوگا" رفیع یہ کہہ کر ہنسا اور پھر بولا۔ "قطعی جواب دیجئے آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

"مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ بھائی جان سے ایک مرتبہ اور گفتگو کر لوں" میمونہ نے خوشامد سے کہا۔

رفیع نے ذرا سکوت کے بعد جواب دیا۔ "بہت اچھا مہلت دیتا ہوں، مگر نثار سے صلح کی شرائط یہ ہوں گی کہ وہ اظہر کی امیدواری کی دعوت [illegible] لے لائیں۔ میری مخالفت پر بالاعلان ندامت کا اظہار کریں اور میرے معاون کی حیثیت سے کام کریں"

میمونہ نثار کے ہاں گئی اور رو رو کر بھائی سے اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اور اس کے پیروں پر سر رکھ کر ہچکیوں کے ساتھ بولی۔ "بھائی جان آپکو [illegible] سے کیا فائدہ ہے کہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ خود الیکشن میں کھڑے ہوتے تب بھی ایک بات تھی"

نثار نے میمونہ کو اٹھایا اور شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میمونہ تم جانتی ہو کہ مجھے تمہاری خاطر کیسی عزیز ہے، مگر یہ معاملات بہن بھائی اور باپ بیٹے کی محبت سے متاثر ہونے کے نہیں ہیں۔ [illegible]جتماعی اور قومی معاملات ہیں۔ ہمارا ملک اب آزاد اور خودمختار ہے، اب ہمارے جو دشمن ہیں وہ براہ راست ہمارے دشمن ہیں اور جو [illegible] دوست ہیں وہ براہ راست ہمارے دوست ہیں۔ ہماری خوشحالی اور بدحالی اب براہ راست ہمارے عمل اور طرز عمل پر منحصر ہے۔ اور ہماری [illegible]ترقی اور ہمارا تنزل ہماری ہی سرگرمیوں، کوششوں یا کوتاہیوں کا نتیجہ ہوگا۔ تم جانتی ہو یہ سارا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے؟ بیشک حاکم مطلق [illegible] ہے۔ اور اس کی نیابت کا حق پوری قوم کو ہے۔ مگر پوری قوم کی طرف سے پارلیمنٹ مختار کل ہے اور اس کی وہ پارٹی جو گورنمنٹ قائم [illegible] کی جس کی اکثریت ہو۔

ملک کی معاشی سرگرمیاں، داخلی امن و امان اور عدل قائم کرنا۔ غیر ملکوں سے مالی، تجارتی اور طرح طرح کے معاملات اور معاہدات [illegible] دفاع و تحفظ۔ ان سب کاموں کا اختیار پارلیمنٹ کو ہے۔ اگر پارلیمنٹ میں ایماندار، فرض شناس اور خدا ترس لوگ ہوں تو تمام معاملات عدل [illegible]یانت اور ملک کی فلاح و ترقی کو مدنظر رکھ کر ہوں گے اور اگر بددیانت لوگ چلے جائیں گے تو قوم کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیں گے۔

جس طرح الیکشن میں یہ ووٹ خریدتے ہیں اسی طرح پارلیمنٹ میں وزیروں، تاجروں اور زمینداروں کی اغراض پوری کرنے کے لئے یہ ووٹ

گے، اور حکومت کے کسی شعبہ میں نہ انصاف قائم رہے گا اور نہ دیانت، تھوڑے سے بے ایمان لوگ امیر ہو جائیں گے اور ساری قوم میں
ں ترقی کرے گا اور بالآخر ملک کی تمام دولت اور پورا اختیار چند خاندانوں کیلئے مخصوص ہو جائے گا۔
تم بڑی آسانی سے سمجھ سکتی ہو کہ جو لوگ دس دس ہزار روپے کے نفع کے لئے اجتماعی اور قومی مفاد کو ضرر پہنچا سکتے ہیں وہ دس بیس کروڑ کے
ہاکر سکتے ہیں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ خود غرض افراد نے قوموں کی آزادیاں بیچ ڈالی ہیں۔ یہ کیسی ہولناک بات ہے۔ جو آزادی بچوں
ں اور بوڑھوں کے خون کے بدلے میں خریدی گئی ہو۔ وہ رفیع اور اس جیسے دوسروں کی حرص پر قربان کر دی جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں صرف
ی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ خود غرضوں کے مقابلہ میں مخلصوں کی ایک پوری پارٹی قائم کی گئی ہے۔ وہ الیکشن لڑ رہی ہے اور میں اس کی مدد کر رہا ہوں۔"
میمونہ نے رو کر کہا۔ "تو بھائی جان میں کیا کروں؟"
"تم یہ کرو کہ اس جعلی دستاویز پر دستخط کرو اور عدالت میں یہ شہادت دو کہ میرے بھائی نے افضل خاں سے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا۔ پوری قوم
ے کے مقابلہ میں میرا ایک آدمی کا نقصان بہت چھوٹی سی بات ہے۔ تم اس کا بالکل خیال مت کرو۔ اللہ مددگار ہے۔ وہ میرے لئے کوئی راہ
بے گا۔" نثار نے یہ عزم کے ساتھ کہا۔
میمونہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔" اس نے درد آمیز لہجہ میں کہا۔
نثار نے محبت سے بہن کی کمر تھپکی اور استقلال کے ساتھ بولا۔ "میمونہ! میری بہن ہو کر ایسی کمزوری کا اظہار کرتی ہو۔ جاؤ یہ میرا حکم ہے
ستاویز پر دستخط کرو اور میرے خلاف شہادت دو۔ میں تمہارے گھر کے امن میں خلل انداز ہونا نہیں چاہتا اور اس سے کوئی قومی فائدہ بھی نہیں ہے
ز مضبوطی اور استقلال کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کرو۔"
"بھائی جان آپ کی ساری جائداد بک جائے گی۔ پھر آپ کیا کریں گے؟" میمونہ نے رو کر کہا۔
"میری اور میرے بچوں کی کفالت نہ تمہارے ذمہ ہے اور نہ خود میرے ذمہ ہے۔ اللہ رزاق ہے وہ کفالت کرے گا۔ بس اب تم چلی جاؤ اور اپنے شوہر
سامنے مجھ پر سخت غصہ کا اظہار کرو۔" نثار نے میمونہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر چلا گیا۔
میمونہ اپنے بھتیجوں، بھتیجیوں اور بھاوج سے مل ملا کر خوب روئی اور اپنے خیال میں ہمیشہ کیلئے بھائی کے گھر سے رخصت ہو کر واپس آگئی۔

میمونہ نے نثار کے حکم کی پوری تعمیل کی، بھائی سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور دستاویز پر دستخط کئے۔ مقدمہ دائر ہو گیا۔ مگر نثار کی سرگرمیوں میں اور
یادہ ترقی ہو گئی۔ رفیع کی توقع کے خلاف اس سخت دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔
الیکشن ہوا اور بالکل خلاف توقع اطہر کامیاب ہوا۔ اس سے رفیع کی عداوت اور زیادہ بڑھ گئی۔ افضل خاں کے دعوے کی تائید میں
ر نے بڑی کوشش کی، جب عدالت میں شہادت کی نوبت آئی تو میمونہ نے بھائی کے خلاف شہادت بھی دی۔ نثار نے یہ کہہ کر دعویٰ قبول کر لیا کہ میں اپنی
ہن کی شہادت کی تردید نہیں کروں گا۔ دعویٰ ڈگری ہو گیا۔ نثار کے پاس رہنے کے لئے گھر تک نہ رہا۔
نثار کی پارٹی اور اس کے ساتھیوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا کہ اس نے کتنی بڑی قربانی کی، یہ مسلمانوں کی روایات کے بالکل
طابق ہوا۔ مسلمان نہ کسی کو حسن خدمت کا انعام دیتے ہیں اور نہ قصور کی سزا!!

☆

ہماری نظر میں

بصائر السنہ (حصہ اول) | تالیف:- مولانا سید امین الحق (فاضل دیوبند) ضخامت ۲۹۵ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- سید محمد امین الحق خطیب جامع مسجد شیخوپورہ۔

یہ کتاب "انکارِ حدیث" کے رد میں لکھی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اطاعت" دین و ایمان کا رکنِ اعظم ہے اور حضور کی "اطاعت" قیامت تک کے لئے فرض ہے۔ اور قرآن پر ایمان لانے والا "اطاعتِ رسول" کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ "اطاعتِ رسول" سے جی چراتے ہیں اور حضور کی سنتِ مطہرہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے طرح طرح کے نکتے پیدا کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں!

"بصائر السنہ" میں قرآن و حدیث کے باہمی ربط کو واضح کیا گیا ہے۔ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں حدیث کی کتابت پر تاریخی دلیلیں لائی گئی ہیں۔ تدوینِ حدیث کے اعتراضات کے مسکت جوابات ہیں۔ فاضل مؤلف نے پرویز اور برق کی چوریاں بھی پکڑی ہیں کہ اصل روایات کو یہ فتنہ پرداز کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور ان سے کیسے عجیب و غریب نکتے پیدا کرتے ہیں!

"اگر علی نہ ہوتے تو عمر مارا گیا تھا" (صفحہ ۱۵) یہ "لولا علی لھلک عمر" کا ترجمہ ہے۔ "عمر مارا گیا تھا" کی جگہ "عمر ہلاک ہو جاتا" ترجمہ زیادہ اچھا تھا۔ "ہلاک" میں جو جامعیت ہے وہ "مارا گیا" میں نہیں ہے — صفحہ ۶۲ پر جس آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں "ویزکیھم" کا ترجمہ چھوٹ گیا — "صحابہ اہلِ زبان تھے مگر زبان کی مدد اور ادبیت کے ذوق میں اپنے شبہات کو حل نہ کر سکے" — (صفحہ ۱۶۲) نہ جانے صاحبِ تالیف کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ عبارت بہت گنجلک اور نامستقول کی سی ہے — "اور اس کو قرآن شریف سے وہ استفادہ حاصل نہیں ہو سکتا" (صفحہ ۱۷۸) استفادہ کے ساتھ "حاصل ہونا" زائد ہے کہ "استفادہ" میں خود "حصول" مفہوم پنہاں ہے۔

"خدا کے علم اور اس کی تدبیر میں منہ زبانی قرآن کو یاد کرنا ہے" (صفحہ ۲۳۰) "منہ زبانی" پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لفظ مؤلف کے قلم سے کس طرح نکلا — "اس کا وہم و گمان بھی قرآن سے نہیں ہو سکتا" (صفحہ ۱۹۹) "سے" نے پورے جملہ میں جھول پیدا کر دیا — صفحہ ۱۳۳ پر "ابو بکر رازی حصباص"[1] کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

اپنے موضوع پر یہ کتاب خوب ہے۔ مولانا سید امین الحق صاحب نے جو کچھ کہا ہے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ کہا ہے۔ مؤلف کو رسول سے جو شغف اور ربط ہے وہ کتاب کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے۔

جزاہ اللہ خیر الجزاء

---

[1] صحیح "جصاص" ہے۔

سالنامہ تعمیرِ انسانیت

ادارۂ تحریر:- کوثر نیازی، عبد الحمید - ضخامت ۲۰۰ صفحات - (سرورق رنگین اور دیدہ زیب) اس اشاعتِ خاص کی قیمت دو روپے - عام پرچہ کی قیمت آٹھ آنہ - چندہ سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے - ملنے کا پتہ :- دفتر تعمیرِ انسانیت، کھیر گلی، موچی دروازہ لاہور -

ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" کا سالنامہ بڑے آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے - جیسی اس کی دھوم تھی اللہ کے فضل سے سالنامہ کو ایسا ہی پایا - نو علمی مقالے، گیارہ غزلیں، نو نظمیں اور تین ڈرامے سالنامہ کی زینت ہیں - مضامین متنوع ہیں - ترتیب بھی خوب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سالنامہ کی کوئی تحریر مقصدیت سے خالی نہیں ہے - ادب و اخلاق کو ایک دوسرے میں سمو دینا ایک کارنامہ ہے - جس کی جھلکیاں ہر صفحہ پر نظر آتی ہیں -

پھر آج دل میں اٹھی ہے خلش رہائی کی - (صفحہ ۸۶)

"خلش اٹھنا" پہلی بار نظر سے گزرا اور وجدان تلملا کر رہ گیا -

خرد ایمان رُبا ہو مجھے منظور نہیں   دل کم آگاہ خدا ہو مجھے منظور نہیں (صفحہ ۸۹)

دونوں مصرعے بچکانے ہیں -

اُن کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے   اب تو ناصح بھی پریشان برابر ہوگا (صفحہ ۹۰)

"برابر" نے شعر کو "عجیب" بنا دیا -

"جیسے کسی نے ایک زنّاٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو - اُس کا سارا بدن ٹھٹھر کر رہ گیا" (صفحہ ۹۷) تھپڑ سے "بدن کا ٹھٹھر کر رہ جانا" ایک مضحکہ سے کم نہیں -

"نگہت کو اس پاک محبت کی امانت کے قبیح فعل میں مشغول پایا" (صفحہ ۹۲) یہ آخر کیا اندازِ تحریر ہے ـــــ توبہ!

"اُس نے لڑکپن سے پوچھا" (صفحہ ۱۰۷) شاید یہ کہنا مقصود ہے "اس نے طفلانہ انداز سے پوچھا"

"گیارہ آدمی اور ایک جزیرہ" جس افسانہ کا عنوان ہے اُس میں "ایک کھلکھلاتے بدن" (صفحہ ۱۲۰) "مجسّم شبی رہتے ہیں" (صفحہ ۱۲۲) ـــ "ہڈیوں کو رفیلی نمی کا گھن لگنے لگا" (صفحہ ۱۲۴) جیسی نامانوس ترکیبیں پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور کوفت بھی ہوئی - افسانہ نگار کو اس قسم کی ترکیبیں لکھنے کی اگر چاٹ پڑ گئی - تو اُن کی تحریریں "مضحکہ" بن کر رہ جائیں گی!

مجموعی طور پر سالنامہ کامیاب ہے اور اُس کے مرتبین (جناب کوثر نیازی اور جناب عبد الحمید) ادبی دُنیا کی طرف سے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں - ہوس انگیز لٹریچر کے مقابلہ میں پاکیزہ ادب کو منظرِ عام پر لانا کتنا جرأت مندانہ اقدام ہے - "تعمیرِ انسانیت" کا سالنامہ ادبی بُت کدوں کے لئے اذان اور علمی صنم کدوں میں نعرۂ تکبیر ہے !

حیات حضرت امیر خسرو

از:- خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی، ضخامت ۲۱۲ صفحات مجلد (سرورق رنگین) قیمت دو روپے بارہ آنہ - ملنے کا پتہ :- ٹائمز پریس، صدر، کراچی -

اس کتاب کا آغاز حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی تصویر سے ہوتا ہے اور ہمارے خیال میں یہ "خیالی تصویر" ہے - سرورق کی پشت پر ڈھولک، ستار اور طبلوں کی تصویر نے کتاب کی ثقاہت کو مجروح کر دیا ہے - ہم جو بادرے، تان سین خاں یا عبد الکریم جیسے گویئے کی شہرت صرف گانے بجانے سے وابستہ ہے - اُن کے حالات پر اگر کوئی کتاب لکھی جاتی تو مزامیر کی تصاویر موزوں سمجھی جاتیں - مگر خسرو کے دوسرے کمالات کو خاطر خواہ اہمیت نہ دے کر اُن کے ایک "تفریحی مشغلہ" کو اتنا نمایاں کر دینا" فنِ سیرت نگاری

(بیوگرافی) کے اعتبار سے مکمل خود ہے ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ امیر خسروؒ اُس معلمِ اخلاق اور انسانیت کے محسنِ اعظمؐ کے متبع اور پیرو تھے جو آلاتِ موسیقی کے ایجاد کرنے والے نہیں بلکہ انھیں توڑنے والے تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)

کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:۔

سلسلہ پیدائش، لڑکپن اور تعلیم ـــــ شہرت، عروج اور اعزازِ شاہی ـــــ سلسلۂ بیعت، طریقت اور وفات ـــــ ہندی شاعری، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ـــــ فارسی شاعری ـــــ تصانیف امیر خسرو ـــــ ایجادِ موسیقی ـــــ امیر کے اوصاف۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب، تالیف اور تصنیف میں خاصی کاوش سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اس گلدستہ کو سجانے کے لئے کس کس چمن اور خیابان سے پھول اور کلیاں چنی ہیں!

کتابت کی بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں:۔

(صفحہ ۴) "دیوان غرۃ الکمال" (غرۃ الکمال) (صفحہ ۷۹) "کسافت" (کثافت) (صفحہ ۹۵) "اسے سرت کوم ...... " (اے سرت گردم ......) (صفحہ ۱۰۷) "...... عمر بیاد میدہد" (...... عمر بباد میدہد) (صفحہ ۱۱۲) "...... مغربی آموز" (...... مطربی آموز) (صفحہ ۱۲۵) "ثا مانی" (سامانی) (صفحہ ۸۵) "تخفتہ الصغر" (تحفتہ الصغر)

(صفحہ ۷۷) "حضرت امیر نے الوہیت کے انداز میں انسان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا نقشہ نظم میں ایک خاکہ پیش کیا ہے" یہ "الوہیت کے انداز میں" کیا بات ہوئی؟ "الوہیت" بالکل ایک بے جوڑ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔

حضرت خسرو کی جو غزلیات کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ وہ اُن کی وہی مشہور ترین غزلیں ہیں جن کو قوال گاتے رہتے ہیں مصنف کو چاہیئے تھا کہ وہ خسرو کے پورے کلام کو پڑھ کر اُس سے خود چند اشعار یا چند غزلیں منتخب فرماتے۔

لائق مصنف کو راگ رنگ سے فطری دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کتاب میں اسی چیز کو سب سے زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، کتاب میں بتایا گیا ہے کہ امیر خسرو نے سترہ تالیں ایجاد کیں اور بہت سے راگوں کو ترکیب دے کر نئے راگ بنائے۔ جن میں ایمن اور عشاق بہت مشہور ہیں اور سازوں میں ستار کے علاوہ مردنگ کو ڈھولک میں خسرو ہی نے تبدیل کیا۔

اس آخرت فراموش دور میں جبکہ نفسانی خواہشوں نے راگ رنگ اور لہو و لعب کو انسانیت کیلئے ایک مستقل فتنہ بنا دیا ہے۔ اکابر و اسلاف کے لغزیدہ مشاغل کا ذکر خطرے سے خالی نہیں۔ کہ حیلہ جو طبیعتیں اُس کو حجت بنا کر اخلاقی حدود سے گزر جائیں گی۔ تصوف کا طغرائے امتیاز ساز اور راگنیاں نہیں "تزکیہ نفس" ہے۔ ہم "حیاتِ امیر خسرو" میں اسی کی زیادہ سے زیادہ جھلکیاں دیکھنا چاہتے تھے۔

خضر و مسیحا | مرتبہ:۔ ایم، عبد الرحمٰن خاں۔ ضخامت ۲۲۰ صفحات مجلد (رنگین گرد پوش کیساتھ) قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ نشر المعارف، چوک، ملتان شہر۔

جناب منشی عبد الرحمٰن خاں نے اسلامی، اخلاقی اور قومی نظموں کے انتخاب کا ایک مرقع تیار کیا ہے۔ جس میں مشاہیر اور گمنام سبھی طرح کے شعراء کا منتخب کلام شامل ہے۔ فاضل مرتب کا مقصد تو فی نفسہٖ نیک ہے۔ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق کتابوں سے، رسالوں اور اخباروں سے نظموں کو چنا ہے، اُن کی کوشش مفید اور کامیاب ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ پھولوں کیساتھ خار و خس بھی شامل ہوگئے ہیں۔

اپنوں سے رو ٹھنا نہیں اسلام کا اصول کافر سے میل ہی کہیں اسلام کا اصول (صفحہ ۲۲)

مرکے بھی تم شانِ خودداری نہ دینا ہاتھ سے تم نہ بہہ جانا کہیں سرد تھنوں کی گھات سے (صفحہ ۴۲)

[illegible]

جیسے شعروں کا اس انتخاب میں آجانا مرتب کے مذاقِ شاعرانہ پر انگشت نمائی کرتا ہے۔
جناب اسد ملتانی کے یہ شعر کس قدر پاکیزہ ہیں۔ (نظم کا عنوان ہے "خاتونِ حرم سے")

رنگ بھی نہیں سکتا پاکیزہ جمالی کا ... بیباک نگاہوں سے رہ ندے ہوئے چہروں پر
بیشک تری جلوت کے محرم ہیں نامحرم ... خلوت ہی میں تو رہ کر ملت کی ہے صورت گر
آئینۂ قرآں میں دیکھ اپنی اداؤں کو ... شانہ تری زلفوں کا فرمودۂ پیغمبر!

حقائق و معارف

"حقائق و معارف" مرتبہ:- ایم عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات مجلد (رنگین گردپوش) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ نشر المعارف۔ چہل بیک، ملتان شہر۔

یہ مرقع بھی جناب منشی عبدالرحمٰن خاں کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ تین سو دس عناوین کے تحت مختلف شعراء کے منتخب اشعار درج ہیں۔
بعض "عنوان" ایسے بھی ہیں:۔

آسرا ــ بھروسا ــ عیب جوئی ــ معیشت ــ یگانہ و بیگانہ۔

اس انتخاب میں بلند شعروں کے ساتھ پست شعر بھی ملتے ہیں۔ یہ "شترگربگی" ہر اس شخص کو کھٹکے گی جو صحت مند وجدان اور مذاقِ صحیح رکھتا ہے۔ شعروں کے انتخاب کا معاملہ بہت نازک ہے۔ اس کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ انتخاب کرنے والے کا ذوق شبلی نعمانی کے ذوق سے ملتا جلتا ہو۔ نفاستِ ذوق پر بے مزہ شعر بہت گراں گزرتا ہے۔

جینے کا قصد ہے تو سکوں کی نہ کر تلاش ... یہ زندگی حوادثِ پیہم کا نام ہے (صفحہ ۱۷۴)
مانا کہ عرش سدرہ و طوبیٰ سے ہے بلند ... مومن کا اس فضا سے بھی اونچا مقام ہے۔ (صفحہ ۲۹۱)

ماہر القادری کے ان شعروں کو "زاہد القادری" سے منسوب فرمایا گیا ہے۔
ایک شعر ہے:۔

اپنے دامن کو نہ کر غیر کے آگے تو دراز ... تیرے اسلاف نے خشکی میں چلائے ہیں جہاز

یہ شعر درد کا ہے؟ مگر کون درد؟ اردو میں تو اس تخلص کے ساتھ میر درد ہی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا کہ خواجہ میر درد نے ایسا سپاٹ شعر کہا ہوگا!

اس مجموعۂ انتخاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اخلاق و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو خواتین بھی پڑھ سکتی ہیں کہ بے راہ روی اور آزاد خیالی اور شوخی و بیباکی کی پرچھائیں بھی فاضل مرتب نے کہیں نہیں پڑنے دی!

ہمدرد نونہال

ماہنامہ "ہمدرد نونہال" نگران:- حکیم حافظ محمد سعید دہلوی۔ مرتبہ:- ثریا ہمدرد۔ قیمت فی پرچہ چار آنہ۔ سالانہ ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ "ہمدرد نونہال" ہمدرد منزل۔ کراچی۔

ہمدرد دواخانہ کا نام ہی خود اپنے تعارف کے لئے کافی ہے اور اس کا طبی رسالہ "ہمدرد صحت" بھی ہر حلقہ میں شہرت رکھتا ہے۔ "ہمدرد نونہال" بھی اسی طبی ادارہ کا ماہنامہ ہے جس کا پہلے نام "نونہال" تھا اور اب وہ "ہمدرد" کے اضافہ کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔
"ہمدرد نونہال" کے مضامین بچوں کی نفسیات کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہلکی پھلکی دل چسپ کہانیاں، مزیدار نظمیں اور عام فہم معلوماتی مضامین! اس رسالہ کی اشاعتِ خاص (ایشیا کی کہانیاں) کافی مقبول ہوئی۔ افسانہ و ادب کے ساتھ دینی اور اخلاقی چاشنی کو ذرا تیز کر دیا جائے تو "ہمدرد نونہال" کی افادیت اور بڑھ جائے گی!

رسالہ کی لکھائی چھپائی بھی خوب ہے اور اس کے مضامین اور کارٹونوں میں بچوں کے لئے بڑی جاذبیت ہے۔

ہُود علیہ السلام

مترجم:- عبدالحق- ضخامت ۲۴ صفحات - قیمت چھ آنے-
ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ- ۱۵ لیک روڈ - لاہور-

یہ عربی سے براہ راست ترجمہ کیا گیا ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے[1]۔ قوم عاد پر شرک، بُت پرستی اور اللہ کی نافرمانی کرنے اور اللہ کے پیغمبر حضرت ہُود علیہ السلام کو جھٹلانے پر کیسا دردناک عذاب آیا - اس کتابچہ میں اسی تفصیل کو پیش کیا گیا ہے۔ پوری کتاب عبرت و موعظت سے لبریز ہے۔

صالح علیہ السلام

ترجمہ۔ عبدالحق - ضخامت ۲۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ - ۱۵ لیک روڈ - لاہور
قوم ثمودؑ نے کس طرح اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کی بھیجی ہوئی نشانی (اونٹنی) کو ہلاک کرنے کے بعد اُن پر کس طرح عذاب نازل ہوا - اور حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمودؑ کو راہ راست پر لانے کی کتنی کوشش کی - یہ کتاب اسی عبرت آموز داستان پر مشتمل ہے۔ ترجمہ[2] عام فہم اور رواں ہے۔

سلسلۂ صحت آئی ساکو

(۱) قبض اور اس کا صحیح علاج - (۲) ہمارا طعام و دفع - (۳) نزلہ زکام اور اس کا صحیح علاج —
مرتبہ آئی ساکو (پاکستان) - ناشر:- ڈ بگا رجن فرام فرمیسی کراچی

آئی ساکو کو قائم ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے مگر اس کی طبی خدمات نے (جس میں اس کی بنائی ہوئی قابل اعتماد دوائیں اور طبی مشورے بھی شامل ہیں) کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر لی ہے - آئی ساکو نے سلسلہ کو بالا تین کتابچے شائع کئے ہیں جن کا مطالعہ اور اُن میں دیئے ہوئے مشوروں پر عمل مریضوں اور صحت مندوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

آئی ساکو کا پیش کردہ "سلسلۂ صحت" اس کی دلیل ہے کہ اس معمل اور ادارہ کے قیام کا مقصد صرف تجارت ہی نہیں ہے بلکہ خدمت خلق بھی ہے!

کوکو

تالیف عبدالحق - ضخامت ۲۴ صفحات - قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ - ۱۵ لیک روڈ - کراچی -
"کوکو" یہ عربی کا قاعدہ ہے - جس میں تصویروں کے ذریعہ حروف تہجی اور اُن سے بنے ہوئے الفاظ ظاہر کئے گئے ہیں - مثلاً الف سے "ارنب" (خرگوش) "ز" سے "زیتون" (زیتون) "ض" سے "ضفدع" (مینڈک) "خ" سے "خذروف" (چھچھوندر) "و" سے "وسطی" (ہاتھ کی بیچ کی انگلی) —— عربی سیکھنے کا جو شوق رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ قاعدہ بہت فائدہ مند ثابت ہوگا -

تعلیم قراۃ العربیہ

"مبادی تعلیم القراۃ العربیۃ المصور" مؤلفہ جناب عبدالحق - ضخامت ۴۲ صفحات (بڑا سائز)
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ - کراچی -

یہ بھی عربی کا باتصویر قاعدہ ہے - جس کو جدید اسلوب پر مرتب کیا گیا ہے - مثلاً "وَزَنَ" کے معنی بتانا مقصود ہیں تو تصویر کے ذریعہ ایک دکاندار کو دکھایا گیا ہے جو ترازو میں کوئی چیز تول رہا ہے۔ اس تصویر کے اوپر تین چھوٹی تصویریں بھی ہیں - جن میں "و" سے "ورد" (گلاب کا پھول) "ز" سے "زرافہ" اور "ن" سے "نحلہ" (شہد کی مکھی) کی تشریح کی گئی ہے -

---

[1] (صفحہ ۳) "جس کے مرد و عورت بھاری بھرکم اجسام کی وجہ سے ممتاز تھے" - "اجسام" نے اس جملہ میں جھول سا پیدا کر دیا -
(صفحہ ۱۲) "حضرت ہودؑ نے کہا مانا؟" "حضرت ہودؑ نے اپنے رب کا کہا مانا" ہوتا تو اچھا تھا -
[2] (صفحہ ۱۳) "پیش کردہ قصہ میں ہوت پکڑ لیے" یہ جملہ البتہ کھٹکتا ہے -

اس کتاب کے ذریعہ ایک طالب علم بڑی آسانی کے ساتھ عربی کے سینکڑوں الفاظ کے معنی سے واقف ہو سکتا ہے اور اُس کو متعدد
افعال بھی معلوم ہو جائیں گے جو اپنے اعراب کے لحاظ سے مختلف ہیں ۔ مثلاً :-

نَقَبَ —— یَبسَ —— تَرَکَ ——

عربی لکھنے پڑھنے اور بول چال کے لئے جن ابتدائی باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اُن کو اس کتاب میں آسان انداز پر پیش کیا گیا ہے
مشکل لفظوں کی فرہنگ درج ہے۔

درس العربیہ | تالیف۔ عبدالحق عباس۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔
ملنے کا پتہ :- المکتبۃ العلمیہ ۔ ۱۵ لیک روڈ۔ کراچی۔

عربی سیکھنے کے لئے یہ کتاب جدید ترین اسلوب پر تالیف کی گئی ہے۔ عربی کے انتہائی آسان چھوٹے چھوٹے جملے مبتدیوں کی ضروریات
کے مطابق اسباق میں لائے گئے ہیں اور ان جملوں میں تدریجاً ترقی اور وسعت ہوتی چلی گئی ہے۔
مبتدیوں کو گرامر سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس الجھن کو بڑی خوبی سے رفع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی توجہ کے ساتھ اس
کو پڑھ کر اس کے جملوں پر حاوی ہو جائے تو عربی کی معمولی بول چال کا کام چلا سکتا ہے۔

ذوالقرنین بدایوں نمبر | ایڈیٹر۔ احید الدین نظامی ۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات ، سرورق رنگین ، تاریخی یادگاروں کی متعدد تصاویر
کے ساتھ ، قیمت دو روپے ملنے کا پتہ :- مینیجر نظامی پریس و اخبار ذوالقرنین۔ بدایوں —— پاکستان میں۔
مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور۔

مولوی نظام الدین حسن نظامی مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین جاری کیا تھا اس کو ترپن سال ہونے کو آئے کہ یہ اخبار جب
سے تک ایک ہی انداز پر شائع ہو رہا ہے۔ بانی اخبار کے لائق فرزند جناب احید الدین نظامی نے "ذوالقرنین" کی سلور جوبلی کی یادگار میں
"بدایوں نمبر" مرتب فرمایا ہے۔ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔
"بدایوں نمبر" میں نثر و نظم کے اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔ جن میں علامہ حسن صغانی کا وطن اور بدایوں اسلامی ہند کے دور اول میں ——
دو قیمتی مقالے ہیں —— مورخین بدایوں اور اُن کے کارنامے اور شیخ تاجا اوسط درجہ کے اور بعض دوسرے مضامین سطحی ہیں۔ "بدایوں کا
ماضی و حال" تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ معلومات آفریں مقالہ ہے۔
"بدایوں سے خطاب" (نظم) میں کوئی شعریت نہیں۔ "بدایوں" (ایک غریب الوطن کی نظر میں) یہ نظم نسبتاً اچھی ہے مگر "بدایوں" جس
کی نسبت امیر خسرو علیہ الرحمہ نے اس درجہ عقیدت کا اظہار فرمایا ہے ؎

بجائے سرمہ در دیدہ کشم خاک بداؤں را

اس پر ہم ایک بلند پایہ نظم یا نظمیں پڑھنے کی توقع رکھتے تھے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ "بدایوں نمبر" محنت اور کاوش کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے مگر بدایوں کی علمی ، تاریخی اور روحانی عظمت کے اعتبار سے
"بدایوں نمبر" کو بہت زیادہ متنوع، جامع اور بلند تر ہونا چاہیئے تھا۔ بدایونی شعراء کے ایک مستقل تذکرہ کی ضرورت تھی۔ اور اس کام کو کپل احمد سرور
اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بڑی خوبی سے انجام دے سکتے تھے۔ "بدایوں کی ادبی خدمات" کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ اس ضمن میں ماہنامہ نقیب
اور مجلہ نقاش کی تھوڑی ہوئی خدمات کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ملا عبدالقادر بدایونی پر ایک بسیط تحقیقی مقالہ تو ضرور ہی ہونا چاہیئے تھا۔ جا ہے
"بدایوں کا فرزند جلیل" جس مقالہ کا عنوان ہے، وہ نہ ہوتا۔

بدایوں کے آثار قدیمہ پر بھی ایک تاریخی مقالہ کی ضرورت تھی۔ جیسے سرسید احمد خاں کی "آثار الصنادید" کے انداز پر مرتب کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں اُردو زبان جس نازک دور پر مصائب ذدہ سے گزر رہی ہے اُس کے لحاظ سے "بدایوں نمبر" بہرحال غنیمت ہے۔

برکات الاسلام | "نظامِ اسلامی کی برکات یعنی برکات الاسلام"۔ از:- مولانا عبدالحمید خاں ارشد۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات (بڑا سائز)، کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب) قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ "الصدیق" بیرون بوہڑ دروازہ۔ ملتان شہر۔

اس گرانقدر کتاب میں عقلی و نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اسلام ہی سعادتِ بشر کا واحد ذریعہ ہے" امن ہو۔ عدل و انصاف ہو، فلاح و کامرانی ہو، حق و صداقت ہو، معیشت کے مسائل ہوں یا حکومت کے طریقے، ان تمام عقدوں کا حل اور ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہے! انسانیت کی جلتی ہوئی کھیتی اس وقت تک ہری نہیں ہو سکتی، جب تک اسلام کے ابرِکرم کے چھینٹے اس پر نہ پڑیں۔ پوری کتاب میں عنوانات بدل بدل کر اپنی خیالات کو پھیلایا گیا ہے۔ اس میں تاریخی شہادتیں بھی ہیں۔ اسلامی فتوحات کی چند جھلکیاں بھی ہیں۔ ختمِ نبوت پر بھی جاندار استدلال ہے۔ اور "اسلامی حکومت" کن بنیادوں پر قائم ہونی چاہیئے، اس کی بھی تفصیل ہے۔

اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ فاضل مصنف کے خلوص، دردمندی اور دینی حمیت کی شہادت دے رہا ہے۔

"عبداللہ بن مسعودؓ (مشہور صحابی) کی قرأت "ولکن نبیاً ختم النبیین" کے الفاظ موجود ہیں۔ اب خواہ اسے مستقل قرأت قرار دیا جائے یا خاتم النبیین کی تفسیر" (صفحہ ۲۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن کی آیتوں کے ساتھ اُن کی تشریح بھی کہیں کہیں لکھتے جاتے تھے۔ تو اُن کی اس "یادداشت" میں جہاں جہاں بھی قرآن کی قرأت متواترہ کے مقابلہ میں لفظوں کی کمی بیشی پائی جاتی ہے، اُسے "قرأتِ قرآن" یا "قرأت عبداللہ ابن مسعودؓ" کہنا بڑی خطرناک غلط فہمیوں کا سبب بن جائیگا۔ لوگوں کو "تشریح و یادداشت" اور "قرأتِ قرآن" میں فرق کرنا چاہیئے۔ اگر بعض پچھلے مفسرین کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ ہم بھی اسی لکیر کے فقیر بنے رہیں۔

ترجمانِ خودی | از:- سید محمد عبدالرشید فاضل۔ ایم اے (پروفیسر اُردو کالج۔ کراچی) ضخامت ۲۰۵ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- ادارۂ تحریراتِ ادب۔ ۵۰۵ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی۔

"ترجمانِ خودی" علامہ اقبال کی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ ہم نے قرآن پاک، مثنوی مولانا رومؒ اور دیوان حافظؔ کے اُردو ترجمے پڑھے ہیں اور وجدان کو بعض اشعار سے خاصی اذیت دی ہے۔ مگر "ترجمانِ خودی" کے اشعار پڑھ کر وجدان کو فرحت حاصل ہوئی اور مترجم کے لئے دل سے دُعا نکلی۔

سبزۂ نا رُستہ زیبِ گلشنم — گل بشاخ اندر نہاں در دامنم

ترجمہ

جو اُگا سبزہ نہ اب تک وہ مرے گلشن میں ہے — شاخ پر جو گل نہ آیا وہ مرے دامن میں ہے!

ـــہ (صفحہ الف) "دوسری پرتو" "نصرت السنۃ کی صورت میں پڑی" "پرتو" مذکر ہے۔ اسی صفحہ پر "اسے میرے حبیب" بھی وجدان کو کھٹکا۔

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد — درخورِ ابرِ بہارِ من نشد

ترجمہ

وسعتِ گلزار جس غنچہ کے داماں میں نہیں — وہ مرے ابرِ بہاری کے لئے شایاں نہیں

تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش — نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش

ترجمہ

غنچہ ساں کب تک رہیگا باغ دنیا میں خموش — چاہیئے ہے تا تجھے گل کی طرح نکہت فروش

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

ترجمہ

لاکھوں ابراہیم کو دکھلائیے شعلوں کے باغ — تب کہیں روشن کیا ہے اک محمدؐ کا چراغ

اقبال کے اصل شعر میں "صد ابراہیم سوخت" نے جو قدرے ذم کا پہلو پیدا کر دیا تھا۔ ترجمہ میں "دکھلائیے شعلوں کے باغ" نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ بدل دیا۔ اور پھر لطف یہ کہ معنویت مجروح نہیں ہوئی۔

لیکن اس ہیرے سے وہ پانی نہ حاصل کر سکا — خوب ہی ٹھونگیں لگائیں اور تھک کر رہ گیا

اس قسم کے بے مزہ شعر بھی ترجمہ میں کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

"ترجمانِ خودی" (اسرارِ خودی کے فارسی ترجمہ) سے پہلے اسی مجلد میں اقبال کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری پر پوری ایک باب ہے، پروفیسر عبدالرشید فاضل کو اقبال سے عقیدت ہی نہیں بلکہ اُن کے مزاج و فکر سے خاص مناسبت بھی ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اقبال کے افکار کی روشنی ہی میں لکھا ہے۔ اندازِ تحریر سادہ اور شگفتہ ہے۔ سلجھاؤ، توازن، اور سنجیدگی اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ اقبال نے حافظ شیرازی کے شعروں پر جو کڑی تنقید کی تھی اور اُس پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا "ترجمانِ خودی" میں اُس کی تفصیل بھی ملے گی، اقبال کی شاعری پر جو چھوٹے مضامین رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن کے بعض اہم اقتباسات فاضل مصنف نے درج کر کے کتاب کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا (صفحہ ۲۲)

یہ اقبال کے ابتدائی دور کے اشعار ہیں۔ اقبال آج زندہ ہوتے اور کوئی اُن کو یہ سمجھاتا کہ شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ایک پیغمبر (مسیحؑ) سے کیسے اونچا ہو سکتا ہے؟ تو وہ اپنے شعر کو یقیناً بدل دیتے!

اسی طرح اقبال نے:-

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے — کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

جو کہا ہے تو یہ بھی اُن کے شروع زمانہ کے معتقدات کا عکس ہے۔ ورنہ کسی ولی کی قبر پر جا کر اس طرح عرض معروض کرنا کسی عنوان جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی داتا ہے اور نہ مشکل کشا ہے۔

من حضورِ آں شہِ والا گہر — بے نوا مردے بدربارِ عمرؓ

شاہِ افغانستان کے دربار کو "دربارِ عمرؓ" کہنا تکلیف دہ مبالغہ ہے۔ کم از کم اقبال سے ایسی بےجا طرح خوانی کی توقع نہ تھی!

اقبال کی تحریروں کے یہ اقتباسات کس قدر بالغ نظری، ژرف نگاہی اور فراستِ ایمانی پر مبنی ہیں!۔

"میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ یہ روحانیات یا تصوف بعد کی پیداوار ہے اور ہمارے مذہب کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد "ہمہ اوست" پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور "ہمہ اوست" منفی۔"

"میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"

"تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس جگہ تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے۔ اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر ایک بیانہ تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیودِ شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔"

"اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے، یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں۔ مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں، یہ شرک ہے۔ ہاں وحدۃ الوجود کی ضد کثرت ہے۔۔۔۔۔۔"

"ترجمانِ خودی" اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ پروفیسر عبدالرشید فاضل کی یہ علمی کاوش حوصلہ افزائی اور تحسین و ستائش کی مستحق ہے!

برزخ اور عذابِ قبر

از:۔ مولانا محمد سورتی (سابق استاذ جامعہ ملیہ دہلی) ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلام۔ کشمیری بازار لاہور۔

مولانا محمد سورتی عربی لغت و ادب کے امام تھے۔ اور تحقیق علوم میں بلند پایہ رکھتے تھے، اس کتاب میں مولانا مرحوم نے حافظ اسلم جیراجپوری کے ایک مضمون "برزخ از روئے قرآن" پر بڑی معرکہ آرا اور سیر حاصل تنقید کی ہے اور جیراجپوری صاحب کی فکری اور علمی غلطیوں پر احتساب فرمایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے رسول کی سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن پر غور کرتے ہیں اُن کو قدم قدم پر کیسی خوفناک ٹھوکریں لگتی ہیں!

کتاب الصلوٰۃ

از:۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ۔ مترجم:۔ شیخ علی جواد صاحب۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) ملنے کا پتہ:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ فریئر روڈ۔ کراچی۔

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم نے حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس زندگی کے حالات دیئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے حق گوئی اور حریت و استقامت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اس کے بعد امام موصوف کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نماز تعدیلِ ارکان کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے۔ اور ایسی نماز جو بے دلی کیساتھ بیگار سمجھ کر پڑھی جائے وہ نمازی کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص کوع و سجود پورے طور پر ادا نہیں کرتا وہ نماز کا چور ہے۔۔۔! یہ کتاب کا مطالعہ ہر اعتبار سے مفید اور باعثِ برکت و سعادت ہے!

…رِ شہدائے کربلا | از :- راغب مرادآبادی - مرتبہ :- رعنا ظفر - ضخامت ۴۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ :-
ملنے کا پتہ :- مکتبہ ادب اُردو - بی ۳/۲۱۵ مارٹن روڈ - کراچی - بھارت میں :- جگدیش پرشاد بھٹناگر

…ت نمبر ۹ کارنوٹس اسکوئر نئی دہلی -

" نذرِ شہدائے کربلا " کا پیش لفظ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے - جو گاندھی جی کی بارگاہ میں یہ خراجِ عقیدت …ش کر چکے ہیں :-

" اسلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام "

دیباچہ جناب علی اختر نے تحریر فرمایا ہے - اور راغب صاحب کے شاعرانہ کمال کا پورے انشراح کیساتھ اعتراف کیا ہے -
یہ کتاب سلاموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے جس میں شہیدِ کربلا کے حضور عقیدت کے آنسو پیش کئے گئے ہیں - اہلِ بیتِ کرام
محبت ایک ایک شعر میں جھلکتی ہے -

نہ دشمنی کی غرض سے نہ دوستی کیلئے | جہادِ سبطِ پیمبر تھا دین ہی کے لئے
زمانہ آج بھی گم کردہ راہ ہے راغب | حسینؑ ہی کی ضرورت ہے رہبری کے لئے

ہر سعادت کیلئے توفیقِ یزداں چاہیئے | پوچھیئے حُر سے کہ یہ رتبہ عطا کیونکر ہوا

یاد آتا ہے جو راغب چمنِ آلِ عبا | خندۂ گل بھی طبیعت پہ گراں ہوتا ہے

وہ جو صف آرا ہوئے آلِ عبا کے سامنے | حشر میں کس منہ سے آئیں گے خدا کے سامنے

یہ وہ چند شعر ہیں جن سے ان منظومات کی روانی اور شگفتگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے -

جو اپنے دل میں غمِ کربلا نہیں رکھتے | وہ سطح بیں نگہ آشنا نہیں رکھتے (صفحہ ۹)

" غمِ کربلا " اور " نگہ آشنا " کے درمیان آخر کیا معنوی ربط ہے ! دل میں گداز کا نہ ہونا " سطح بینی " کی دلیل نہیں ہے - کیا تعمقِ …نگاہ اور دردمندی لازم و ملزوم ہیں ؟

بچوں کی تشنگی سے جی کیوں نہ مضطرب ہو | احساس اگر ہے زندہ لازم ہے بے قراری (صفحہ ۳۴)

مصرعِ ثانی میں بڑا " تکلف " پایا جاتا ہے - حالانکہ مصرعِ اولیٰ کے بعد مصرعِ ثانی بیت پُرسوز اور اثر انگیز ہونا چاہیئے تھا -

عام ہے فیضِ شہِ والا مگر دل چاہیئے | جلوہ فرماتے ہیں خود اہلِ عزا کے سامنے (صفحہ ۳۵)

جب " شہِ والا " کا فیض عام ہے تو پھر صرف " اہلِ عزا " کے سامنے جلوہ فرمانے سے اس " فیضِ عام " کی عمومیت کہاں باقی رہتی ہے -

نظروں سے گر گیا ہے ہر اک جلوۂ حیات | جب یاد آگئی ہے مصیبت حسینؑ کی (صفحہ ۴۵)

" جلوۂ حیات " یہاں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے - شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ حضرت حسین علیہ السلام کی مصیبت یاد آتے ہی دنیا کی ہر خوشی اور شادمانی نظروں سے گر گئی -

یعقوب کے بسکٹ
خوش ذائقہ
خوش رنگ
اور
صحت کے لئے فائدہ بخش
سب کی پسند کے بسکٹ
تیار کردہ
سیٹھ محمد یعقوب اینڈ سنز
یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر
اسٹاکسٹ :- زین العابدین برادرس۔ کراچی

مضبوط دھاگا

اور

پائیدار خوشنما کپڑا

تیار ہوتا ہے

آپ پاکستان کو اسی وقت خوشحال بنا سکتے ہیں

چمکدار لیکن

سکون بخش

کراچی
فاران
پاکستان

جلد ۸ نمبر ۵

فاران

اگست ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران ۔ کیمبل اسٹریٹ ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کی اکثریت اللہ کے فضل سے اسلام پسند ہے۔ ان میں اگرچہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق سے بہت ہی کم مطابقت رکھتی ہیں۔ مگر اُن کی دلی تمنا یہی ہے کہ اسلام کو سربلندی حاصل ہو اور اللہ کا دین غالب ہو کر رہے۔ خود بُرائیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود یہ لوگ بُرائیوں کا چلن دیکھ کر دُکھ محسوس کرتے ہیں اور دین و اخلاق کی جہاں سے بھی آواز آتی ہے، اُن کا ضمیر اس پر "لبیک" کہتا ہے۔ یہی حسِ شرافت ہے جو ایک گنہگار انسان کو "توبہ" کی توفیق بخشتا ہے اور کوئی تردامن ہو جائے تو ہو جائے مگر گناہوں کے سمندر میں بالکل ڈوب کر نہیں رہ جاتا!

مگر دوسری طرف پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کی بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی پایا جاتا ہے، جس کے فکر و خیال پر مغربیت کا غلبہ ہے۔ یہ طبقہ زندگی کے مسائل کو یورپ کی دانش گاہوں میں بنی ہوئی عینکوں سے دیکھتا ہے۔ یورپ نے سود و زیاں کی جو قدریں مقرر کر دی ہیں، یہ انہی پیمانوں سے حقائق کو ناپتا ہے۔ اس مغرب زدہ گروہ کو اسلام سے جتنی بھی واقفیت ہے، وہ یورپ کے اربابِ فکر اور تاریخ نگاروں کے واسطے سے حاصل ہوئی ہے! ان "صاحب لوگوں" کی نگاہ میں اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی شخصیتیں اور مایہ ہیرو، رضا شاہ پہلوی اور مصطفےٰ کمال ہیں۔ اسی فکر و کردار کے لیڈروں کے نقشِ قدم اس گروہ کے لئے دلیلِ راہ ہیں!

یورپ سے آواز آئی کہ حجاب و نقاب صنفِ نازک کی آزادی کی توہین ہیں اور عورت گھر کی چاردیواری میں قیدیوں کی طرح محبوس نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کے جواب میں مغرب زدہ طبقے نے عورت کے عارض و کاکل ہی نہیں، گردن، بانہوں اور پنڈلیوں تک کی حرمت کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ۔ ع

چہ گُنہ بے نوا ہمیں دارد ✱

اس "ترقی زدہ گروہ" نے اسی پر بس نہیں کیا۔ یہ گروہ عورت کو تھیٹر کے اسٹیج پر، کرکٹ اور ہاکی کی بازی گاہوں اور پریڈ کے میدانوں میں لے آیا۔ پاکستان کے شراب خانے، ناچ گھر، گھوڑ دوڑ کی شرطیں اور کلب گھروں کی قمار بازی بند ہو سکتی تھی اور بند ہو جانی چاہیئے تھی۔ مگر یورپ کے ان ذہین شاگردوں کی نگاہ میں یہ ترقی کے آثار، تہذیب کی علامتیں اور تمدن کے مظاہر ہیں۔ اس لیئے یہ شیطانی کاروبار ابھی تک پاکستان میں چل رہا ہے!

اس اخلاقی گراوٹ اور غیر اسلامی حرکتوں پر اسلام پسند طبقہ نے انگشت نمائی کی تو مغرب زدہ ٹولی پکار اٹھی کہ یہ رجعت پسندی، قدامت زدگی اور مُلّائیت ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے، نیکی اور بدی کی تعریفیں تک کچھ سے کچھ ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان دقیانوسی ملّاؤں کے فتوے اب نہیں چل سکتے۔ اسلام میں بہت لچک ہے۔ اس لچک سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا!

اسی "اینگلو پاکستان" گروہ نے اسلامی دستور سازی کی راہ روکنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی ہیں۔ کیسے کیسے پینترے بدلے ہیں اور کن ہتھکنڈوں سے کام لیا ہے۔ وہ تو پاکستان کے دن پھرنے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام پسندوں کو عزیمت کی توفیق عطا فرمائی اور وہ سب کے سب ایک محاذ پر اکٹھے ہو گئے۔ ہر طرف سے ایک ہی نعرہ، ایک ہی پکار، ایک ہی مطالبہ:

"اپنا مقصد، اپنی منزل، اسلامی دستور"

جمہور کی بات بڑا وزن رکھتی ہے۔ اکثریت کے مطالبہ کو رد کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اسلامی دستور کی راہ روک دینے والوں کے تمام توڑ جوڑ اکارت گئے، ہر سازش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس مغرب زدہ ٹولی کی تمناؤں اور امیدوں کے علی الرغم کتاب و سنت کو اسلامی دستور کی اساس تسلیم کیا گیا اور ایسا دستور بنا جو بہت سی خامیوں اور چور دروازوں کے باوجود اسلامی حدود سے قریب تر ہے!

جو مغرب زدہ پارٹی دستور کے محاذ پر شکست کھا چکی تھی اسے اپنے عزائم اور خواہشوں کے لئے بہر حال کوئی نئی راہ نکالنی تھی۔ جو نظریئے اور افکار ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے ہیں اور جو عادتیں ان کی زندگیوں میں جڑ پکڑ چکی ہیں ان سے یہ لوگ دستبردار کس طرح ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس ہزیمت اور پسپائی کا "انتقام" "عائلی کمیشن" کی رپورٹ کی شکل میں لیا گیا ہے، اسلامی معاشرے پر یہ تعمیر و اصلاح اور ترقی و آزادی کی آڑ لے کر شبخون مارا گیا ہے۔ یہ دستور کے اسلامی تقاضوں کو بے اثر کرنے کے لئے خطرناک داؤں چلا گیا ہے!

آپ نے دنیا میں یہ انجوبہ بھی دیکھا اور سنا ہے؟ —— کہ کسی علم و فن کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے ایسے لوگ مقرر کئے جائیں، جنہیں اس فن کے مبادی کا بھی اتا پتا نہ ہو اور یہ لوگ صرف اپنی ذہانت اور بہت ہی سرسری اور سطحی معلومات کی بنا پر اس فن کے بنیادی نظریوں کو کاٹ چھانٹ کر کے ایک رپورٹ تیار کر دیں —— کہ یہ ہے اس فن کے منشا کی صحیح تعبیر اور ان مسائل کی ترقی یافتہ تشکیل! اس قسم کے "بے علم مجتہدین" کی ایسی رپورٹ کو زیادہ سے زیادہ شوخیٔ فکر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ علم و عمل کی دنیا میں اس کا کوئی وزن، کوئی حیثیت اور کوئی درجہ نہیں!

"عائلی کمشن" میں غالب تعداد ان ہی ارکان کی تھی جو کتاب و سنت اور فقہ کا نہ کوئی علم رکھتے ہیں اور نہ ان علوم سے ان حضرات کو کوئی مس رہا ہے! ان کے فکر و شعور مغربی علوم کی فضا میں پروان چڑھے ہیں اور مغربی افکار ہی ان کے خوب و ناخوب کا پیمانہ بنے رہے ہیں۔ ان ارکان میں وہ "بیگمات" بھی شامل تھیں جن کی قریب قریب ساری زندگی

تبرج جاہلیت" میں گزری ہے اور جو "اپوا" کا مزاج رکھتی ہیں ـــــ اور "اپوا" کے کارناموں (؟) کو سب ..... جانتے ہیں۔ پاکستان کی عورتوں میں بے حجابی اور آزادی پھیلانے کا ذمہ دار یہی ادارہ (APWA) ہے۔ اسی "اپوا" کے جھنڈے کے نیچے مسلمان لڑکیوں نے مسز روز ویلٹ کے خیر مقدم میں شہر کی گلیوں کا گشت لگا کر اسلامی تہذیب کو سر بازار رسوا کیا ہے۔ پاکستان میں شاہ ایران نزولِ اجلال فرمائیں یا صدر جمہوریہ ترکی، شرق اُردن کے فرمانروا کا ورود ہو یا امریکہ کے کسی بڑے آدمی کی آمد ہو "اپوا" کی ان بیگمات کو خیر مقدم کے جلسوں، پارٹیوں اور دعوتوں میں اپنے حُسن و جمال کی نمائش کے لئے پہنچنا ضروری ہے!

اس مزاج و طبیعت اور فکر و نظر کی عورتوں کو اسلامی مسائل کی کسی کمیٹی میں شامل کرنا کس قدر عجیب و غریب مذاق ہے۔ بلکہ دردناک بھی! جن لوگوں نے یہ کھیل کھیلا ہے وہ بڑے ہوشیار اور کائیاں واقع ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے "عائلی کمیشن" کے ذریعہ پاکستان کی عورتوں کو اسلام پسند طبقہ کے خلاف محاذ قائم کرنے کے اسباب اور مواقع مہیّا کر دیئے ہیں!

اس سے قطع نظر کر نکاح و طلاق کے اساسی مسائل میں کتاب و سنّت کا کیا فیصلہ اور جزئیات میں اجماعِ اُمت کیا ہے؟ پاکستان میں تعدد ازدواج کا رواج اتنا کم ہے کہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح طلاق کے واقعات بھی شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ اور مردوں کا ایک سے زیادہ شادی کرنے اور بیویوں کو طلاق دینے کا رجحان بھی نہیں بڑھ رہا ہے بلکہ قریب قریب مفقود سا ہے۔ ان حالات میں تعدد ازدواج پر پابندی لگا کر، عورت کو طلاق کا حق دے کر اور اسی طرح کے دوسرے شوشے چھوڑ کر بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ کھڑا کر دینا کہاں کی عقلمندی اور دُور اندیشی ہے یہ تو وہی دیہاتی مثل ہوئی کہ:-

"آ بیل مجھے مار"

سب سے زیادہ قابلِ غور و توجہ بات یہ ہے کہ "عائلی کمیشن" کو شریعت کے حدود کے اندر عائلی مسائل کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا، یا اُس کو یہ اختیار بھی تفویض کر دیا گیا تھا کہ وہ پُوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اسلامی شریعت ہی پر ہاتھ صاف کر دے۔ اس کمیشن نے اپنے حدود سے مجرمانہ تجاوز کیا ہے! اس کے ارکان نے کہیں سے یہ سُن پایا ہے کہ اسلام میں "پاپائیت" نہیں ہے ـــــ بیشک اسلام میں "پاپائیت" نہیں ہے مگر اسلام میں "پاپائیت" نہ ہونے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ ہر عامی اور جاہل کو "اجتہاد" کا حق دے دیا جائے اور وہ اپنی فہم و استعداد اور اپنے رجحانات کے مطابق شریعت کے قوانین میں کاٹ چھانٹ کرتا چلا جائے!

عائلی کمیشن کی رپورٹ اس "جاہلانہ اجتہاد" کی بدترین مثال ہے۔ یہ رپورٹ عبرت کا ایک مرقع ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کسی علم و فن میں مہارت و بصیرت کے بغیر دخل در معقولات کے نتائج کس قدر خوفناک ہوتے ہیں اور جہالت جب علم کا دعویٰ لے کر اُٹھتی ہے تو وہ کیسے کیسے فتنوں کا دروازہ کھولتی ہے! یہ رپورٹ غمازی نہیں کرتی بلکہ صاف صاف بتاتی ہے کہ اس کے واضعین اور مُرتبین نے یورپی تہذیب اور مغربی معاشرے کو سامنے رکھ کر رپورٹ مُرتب کی ہے۔ اسلامی شریعت کے تقاضے اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں! انہوں نے نکاح و طلاق کے دینی مسائل کو اس نہج پر مُرتب فرمایا ہے جیسے کوئی کرکٹ اور ہاکی کے قواعد ترتیب دیتا ہے۔ اور کرکٹ اور ہاکی کے قوانین

بنانے والے پھر بھی گزشتہ نظائر اور روایات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مگر ان جدت پسندوں نے تو خود رائی کی حد کردی۔ دین کے ماخذ منبع اور ماضی کی طرف مُڑ کر ہی نہیں دیکھا! اُن کے سامنے مغرب کا عائلی نظام رہا ہے، بس اُسی کو معیار بنا کر اور منزلِ مقصود ٹھہرا کر رپورٹ کی تدوین فرمائی گئی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ شریعت کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل کا "اسلام" کا نام لے کر حلیہ بگاڑا گیا ہے! ؏

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

عائلی کمیشن کی رپورٹ کن رجحانات و میلانات کی حامل ہے، اس کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے کمیونسٹ اخباروں نے اس رپورٹ کو سب سے زیادہ سراہا ہے اور اس رپورٹ کے منظرِ عام پر آتے ہی اشتراکیت پسندوں کی خوشی کے مارے باچھیں کھل گئی ہیں۔ کہ ——— "وہ مارا!" ——— "وہ پڑی دین و شریعت پر خوب کس کر ضرب!" ——— "وہ ہوئی جدت و ترقی کی جیت!" ——— یہ سلسلہ چل پڑا تو پھر اسلام کے ایک ایک اصول کا یہی حشر ہوگا! دُوسری طرف دین میں ناروا جدتوں، دراندستیوں اور ترقی پسندانہ اجتہادات کی تائید کے لئے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پہلے سے بنا بنایا موجود ہے! اُس کے حقِ نمک ادا کرنے کا مناسب وقت تو اَب آیا ہے!

خطرہ — خطرہ! خطرہ!! عائلی کمیشن کی رپورٹ پاکستان کے اسلام پسند طبقہ کو کھُلا چیلنج ہے۔ یہ رپورٹ مغرب زدہ طبقہ کے عزائم کی آئینہ دار ہے کہ یہ حضرات پاکستان میں کس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کا پروگرام کیا ہے؟

وہ لوگ بڑی غفلت میں مبتلا ہیں جو اس رپورٹ کو معمولی سا دستاویز سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ یہ کوئی پٹاخہ اور پھلجھڑی نہیں ہے کہ ذرا سی دیر اپنی نمود دکھا کر ختم ہو جائے گی۔ یہ بارود ہے جو دینی نظام اور اسلامی معاشرے کو اُڑانے کے لئے بچھائی گئی ہے!

اس رپورٹ کے نتائج بڑے دُور رس ہوں گے اور گہرے بھی! اس سے مسلمانوں کا تمام عائلی نظام تہ و بالا ہو کر رہ جائیگا اور رفتہ رفتہ دین کی کوئی قدر بھی ثابت نہ رہ سکے گی! اگر اس رپورٹ کو مؤثر احتجاج کے ساتھ رد نہ کر دیا گیا تو پاکستان کے قوانین پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنے کے لئے جو بورڈ مقرر ہونے والا ہے اُس کے ارکان بھی اسی قماش اور ذہن و فکر کے مقرر کئے جائیں گے اور جس بورڈ کی یہ ہئیتِ ترکیبی ہوگی اُس کے غور و فکر کے جو نتائج ہوں گے اُن کا اندازہ عائلی کمیشن کی رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے!

ترکی کی افسوسناک مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں مغرب زدہ ذہنیت کو جب درازدستی کا موقعہ ملا تو اسلام سے اور اس کے تمام لواحق و متعلقات سے اس قدر بیزاری پیدا ہو گئی کہ عربی رسم الخط تک کو بدل دیا گیا اور حکومت نے اذان پر لسانی پابندی لگا دی۔ اب خدا خدا کر کے "کمالی دَور" کی یہ زیادتی ختم ہوئی ہے ورنہ ترکی کی مسجدوں سے "اللہ اکبر" کی جگہ ترکی زبان کے کلمے بلند ہوتے تھے!

عائلی کمیشن کی رپورٹ کو خدانخواستہ پاکستان میں قانونی حیثیت دے دی گئی تو پھر دین و شریعت کے حدود توڑنے کی بنیاد پڑ جائے گی اور یہ معاملہ صرف نکاح و طلاق ہی تک محدود نہ رہے گا۔ رقص و سرود، شراب نوشی، قمار بازی اور سود خوری کے لئے اسلام ہی کے نام پر نکتے پیدا کئے جائیں گے، دلیلیں لائی جائیں گی اور تاویلیں تراشی جائیں گی۔ ✱

کہا جائے گا کہ اسلام نے اُس "خمر" کو حرام کیا ہے جو نشہ پیدا کر کے آدمی کے عقل و ہوش کو ڈھانک لے اور اس کے حواس پر چھا جائے۔ مگر جو "خمر" صرف طاقت و توانائی کے لئے مقررہ مقدار کے تحت پی جائے اُس پر اسلام پابندی عائد نہیں کرتا۔ جو لوگ "عورت" کو طلاق کا حق دے سکتے ہیں، اُن سے کیا بعید ہے کہ وہ مسلمان عورت کے رقص (DANCE) کو ایک معاشرتی حق (Social Rights) قرار دے دیں کہ تھوڑی دیر ناچ کر اور تھرک کر عورت اپنا دل بہلا لے تو اس میں آخر قباحت کیا ہے؟ زمانہ منقلب ہو چکا ہے، حالات بدل چکے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے عورت کی عفت و حیا کا جو تصوّر مردوں کے ذہن میں تھا، اب وہ نہیں رہا۔ اس لئے ...... رقص .... اختلاط .... اداکاری ...... اور .... سب کچھ جائز بلکہ زمانہ کے تقاضوں کے عین مطابق!

جو کچھ عرض کیا گیا ہے محض خیالی اندیشہ نہیں ہے۔ مصر کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہاں دین سے بیزار اور مغرب پرست طبقہ کو حکمرانی کا موقعہ ملا ہے تو تمام فواحش اور فسق و فجور کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جاتی ہے اور خود حکومت مصر کے صدر جمال ناصر کے قصر میں نیم برہنہ ناچ ہوتا ہے اور شراب کے دَور چلتے ہیں۔ اور ان تمام برائیوں اور گندگیوں کو وہ لوگ تہذیب حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق سمجھتے ہیں!

ایک وہ دَور تھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جب کسی نے اُن کے نسب کا حال دریافت کیا تو آپ نے "اسلام ابن اسلام ابن اسلام" فرمایا یعنی یہ کہ اسلام لانے کے بعد اب کسی قومی، نسلی اور وطنی تفاخر کا تصوّر بھی میرے ذہن میں نہیں رہا۔ اسلام کی محبّت کی ایک تو یہ کیفیت تھی اور دُوسری طرف اسلام بیزاری اور وطن پرستی کا یہ عالم ہے کہ جمال ناصر ڈنکے کی چوٹ "نحن ابناء الفراعنة" (ہم ہیں فرعونوں کی اولاد) کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ ہے وہ جاہلیت جو ایک مسلمان کے دل و دماغ میں اسلام سے وابستگی کے نقوش کو دُھندلا بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اسلام سے دل میں کَد پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا آدمی چاہے تحقیق و اکتشاف کے لئے مریخ و قمر تک پہنچ جائے یا زمین کی تہوں میں اُتر جائے مگر وہ "اسلام" کے کام کا نہیں رہتا!

بیشک اسلام نے غلامی، محکومیت اور ذلّت کی زنجیریں کاٹ کر عورت کو غلامی سے نجات دلائی اور اُسے آزاد بنایا۔ مگر اس "آزادی" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت کو بے مہار چھوڑ دیا گیا کہ اس کا جی چاہے تو لوگوں کے ساتھ راتوں کو ناچ لے۔ اس کا جی چاہے تو غیر مردوں سے ربط و اختلاط تک کو روا رکھے مگر شادی کی پابندی قبول نہ کرے۔ اور شادی کرلے تو جب جی میں آئے شوہر کو طلاق دے کر ازدواجی رشتہ کو توڑ ڈالے! اسلام نے ایسی آزادی عورت کو ہرگز نہیں دی۔ اس قسم کی آزادی جاہلیت کی دی ہوئی آزادی ہے۔ اسلام کی عطا کی ہوئی آزادی نہیں ہے — خود قرآن کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر "قوّام" (سردھرا) بنایا ہے۔ مرد کی اس "قوامیت" پر جو اس کا فطری اور جائز حق ہے جب بھی دست درازی کی جائے گی عائلی نظام برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا!

یورپ کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ مرد کی "قوّامیت" کے بندھن ٹوٹ جانے کے بعد وہاں کا عائلی نظام جانوروں کی معاشرت سے قریب تر ہو گیا ہے۔ وہاں کے ازدواجی تعلقات میں کوئی لطف، کوئی تسکین اور اطمینان باقی نہیں رہا!

عائلی کمیشن کی رپورٹ میں کسی قسم کی اُپج بھی نہیں ہے بلکہ اس میں یورپ کی نقالی کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کا مزاج

اسلامی مزاج کی ضد ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتائج بھی اسلامی تقاضوں کے خلاف ہی رونما ہوں گے۔ اس رپورٹ کے سراہنے والے کمیونسٹ ہیں، مغرب پرست ہیں۔ "اپوا" کی بیگمات ہیں اور امریکہ کے رسالے ہیں! کسی اسلام پسند فرد یا جماعت نے اس کی تعریف یا تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی دستور کے بھی مخالف رہے ہیں اور انہوں نے طرح طرح سے کوششیں بلکہ سازشیں کی ہیں کہ پاکستان کسی عنوان "اسلامی مملکت" نہ بننے پائے! یہی لوگ عائلی کمیشن کی رپورٹ کے مخالفین پر "ملا، تنگ نظر اور قدامت زدہ" کی پھبتیاں چست کر رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے پرانے حربے ہیں۔ جو اگرچہ کُند ہو چکے ہیں مگر یہ اُنھیں برابر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ہر وہ دینی شعار جس کی اسلام پسند طبقہ حمایت کرتا ہے اُس پر "ملائیت" کی طنز کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کا "علم کلام" اسی قسم کی طنزوں اور پھبتیوں کے سہارے قائم ہے!

عزم محکم | ارباب اقتدار بھی کان کھول کر سن لیں اور وہ بھی جو اسلام کے خلاف ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں کہ عائلی کمیشن کی رپورٹ، اسلامی شریعت کی اسپرٹ سے نہ صرف یہ کہ خالی ہے بلکہ اس کی ضد ہے، اسلئے اگر اس رپورٹ کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی گئی تو پاکستان کی اکثریت اسے ہرگز ہرگز قبول نہ کرے گی۔ بہتری اور بھلمنساہت اسی میں ہے کہ خود حکومت اس رپورٹ کو اس کے واضعین کے پاس واپس کردے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو پھر پاکستان کے عوام اس رپورٹ کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ اگر حکومت عوام کے جذبات سے واقف ہے تو اُسے اس کشمکش کا موقع ہی نہ آنے دینا چاہیئے۔ یہ رپورٹ تعمیر و اصلاح کے بجائے ملک میں ایک نئی کشمکش کا دروازہ کھول دے گی!

انگریز کے دور غلامی میں "شاردا ایکٹ" کے خلاف مسلمان اپنے جذبات کا اظہار کر کے اس ایکٹ کو بے اثر بنا چکے ہیں تو یہ رپورٹ جو شاردا ایکٹ کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ غیر اسلامی ہے۔ اُسے مسلمانوں کی وہ اکثریت کس طرح برداشت کرسکے گی جو اللہ کے فضل سے آزاد ہے۔

ضرورت ہے کہ پاکستان میں اس سرے سے اُس سرے تک اس منحوس رپورٹ کے خلاف شدید احتجاج کیا جائے۔ اس احتجاج میں ضبط و نظم اور اسلامی اخلاق کو ملحوظ رکھا جائے کہ اسلام کمیونسٹوں کی طرح انارکی اور بدتمیزی کی اجازت نہیں دیتا۔ عوام کے احتجاج میں بڑی قوت ہے۔ اسلامی دستور سازی میں عوام اپنی قوت کا تجربہ بھی کر چکے ہیں!

ہو سکتا ہے کہ یہ مغرب زدہ گروہ "اپوا" کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں کو اس رپورٹ کی تائید کے لئے میدان میں لے آئے، اس کے توڑ کے لئے اسلام پسند خواتین کو تیار رہنا چاہیئے۔ اُن کو آواز بلند کرنی ہوگی کہ ہم اللہ اور رسُول کے دیئے ہوئے حقوق سے زائد حقوق طلب کر کے ظالم بننا نہیں چاہتیں۔ اور یہ "اپوا" کی بیگمات نہ ہماری نمائندہ ہیں، اور نہ ہماری ترجمان ہیں۔ ہمارے حقوق و وظائف (Rights and Functions) کا فیصلہ اللہ اور رسُول کر چکے ہیں۔ ہم اس فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہیں۔ "اپوا" کے فیصلوں، رپورٹوں اور پروگراموں پر عمل کر کے ہم اپنی دین و دُنیا تباہ کرنا نہیں چاہتیں!

حکومت اگر دانشمندی سے کام لے اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لے تو اس کشمکش کی سرے سے نوبت ہی نہیں آسکتی۔ لیکن اگر حکومت ہی میں کچھ لوگ اس کشمکش کی نمود چاہتے ہیں تو پھر اس ٹریجڈی پر ہم ابھی سے اپنے

ن و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ پہلے کی طرح اب کی بار بھی فتنہ کے یہ بادل
ٹ جائیں اور اسلام کے خلاف ان کوششوں کو نامرادی نصیب ہو!
بہتری اسی میں ہے کہ عائلی کمیشن کی یہ رپورٹ اس کے واضعین اور مرتبین ہی کے ہاتھوں چاک ہوکر ردی کی
ٹوکری کی نذر ہوجائے ورنہ پھر پاکستان کے عوام کو اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس رپورٹ کی قسمت میں
تو چاک ہونا لکھا ہے یا دفن ہونا!

اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا!

ماہر القادری

۱۳ / جولائی ۵۶ء

"فاران" کا معرکہ آرا "سیرت نمبر"

توقع سے زیادہ مقبول ہوا اور ہر طبقہ میں پسند کیا گیا

انگریزی کے مشہور اخبار "ڈان" (DAWN) نے سیرت نمبر کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:۔

"اس کے مضامین کا انگریزی میں ترجمہ کیا جانا چاہیئے"

اس قلم زدہ دور میں ایک دینی رسالہ کا دوبار چھپنا ہی بہت بڑی بات ہے

"سیرت نمبر" کے دوسرے ایڈیشن کی محدود جلدیں دفتر میں موجود ہیں۔

یہ "سیرت نمبر" اس قابل ہے کہ آپ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو تحفہ میں دیں اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔

۳۲۰ صفحات ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں دیا جائیگا۔

"سیرت نمبر" کے بعد ادارہ "فاران" ایک دوسرے "خاص نمبر" کا عنقریب اعلان کریگا

ابومحمد امام الدین رام نگری

خلافت فقر با تاج و سریر است

امیری میں فقیری

(غیر مطبوعہ کتاب "اسلامی حکومت کے والیان وامراء" کا ایک باب)

جو لوگ خدا اور آخرت کو نہیں مانتے یا ماننے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اس عقیدے کے مطابق عمل نہیں کرتے، انسان کی ساری دوڑ دھوپ، جدوجہد اور سعی و کوشش صرف دُنیا کے لئے ہوتی ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں اسی دُنیا کی راحت، آسائش اور عزّت و سرفرازی کے لئے کرتے ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کو جتنی راحت و خوشی اور عزت و جاہ حاصل ہو اور اُن کی زندگی کا معیار جس قدر بلند ہے اُس میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا جائے، دَور حاضر میں انسان کی ساری جدوجہد اور سعی و کوشش اسی محور کے گرد گھوم رہی ہے، دُنیا میں جو فساد برپا ہے اور ملکوں ملکوں، قوموں قوموں، پارٹیوں پارٹیوں اور افراد افراد کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اُس کی تہ میں یہی خود غرضی، عیش پرستی اور نفس پروری کام کر رہی ہے، اگر انسان اس حقیقت کو سچائی کے ساتھ قبول کر لیتا کہ زندگی اس دُنیا کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس کے بعد اس سے وسیع ایک اور زندگی موجود ہے اور سچی راحت و خوشی اور فلاح و کامیابی وہی ہے جو آئندہ زندگی میں میسّر ہو پھر اس عقیدے کی بنا پر وہ دُنیاوی زندگی کا ایک معیار مقرر کر لیتا تو انسانیت بے شمار قسم کی ہلاکتوں اور تباہیوں سے بچ جاتی - اور دُنیا امن و سلامتی کا گہوارہ ہوتی!

خدا نے انسان کے ساتھ اس کی ضروریاتِ زندگی کے سامان بھی پیدا کر دیئے ہیں - اگر انسان اعتدال و توسط اور مساوات و توازن سے کام لے اور ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اُسے غصب کرنے کی خو سے باز آجائے تو جائز اور ضروری سامانِ زندگی کے لئے باہم فتنہ و فساد اور قتل و غارت کی کوئی وجہ باقی نہ رہے، دُنیا کے مختلف حصّوں میں خدا کے جتنے رسول اور پیغمبر آئے انہوں نے معیشت کو کبھی بنیادی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی - معاشی مشکلات تو صرف زندگی کے بنیادی عقائد اور اخلاق کی خرابی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں - اس لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تحریک و دعوت کی بنیاد ہمیشہ خدا پرستی اور فلاح آخرت رہی - اور انہوں نے جو بھی جدوجہد کی انسانی اخلاق و کردار کی بلندی اور تطہیر کے لئے کی - کیونکہ انسانیت کے بناؤ سنوار اور اصلاح و ترقی کی شاہ کلید یہی چیز ہے، اگر انسان کی زندگی کی بنیاد خدا پرستی اور فلاح آخرت کا عقیدہ ہو اور انسان کے اخلاق و کردار پاکیزہ اور بلند ہوں تو اس کے تمام اعمال و اخلاق از خود ہی سنور جائیں گے اور نوعِ انسانی لازمی طور پر انسانیت کا سچا نمونہ بن جائے گی -

اسلام اسی بنیاد پر اپنے پیروؤں کی تربیت کرتا ہے، اسی لئے ایسے تربیت یافتہ معاشرے کے اندر جو حکومت قائم ہوتی ہے اس کے سربراہ کار اور کارکن ذاتی راحت و آسائش اور عیش و آرام کے دلدادہ نہیں ہوتے، وہ امیری کی حالت میں بھی فقیری کی زندگی گزارتے ہیں - خود تکلیف اٹھاتے ہیں اور رعایا کو آرام پہنچاتے ہیں - اور سچ یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ رعایا کے حقوق کے سچے امین اور محافظ ہو سکتے ہیں - اور ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ عوام کو سچی راحت و آسائش اور فراغت و خوشحالی میسّر آ سکتی ہے!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ کے خوش حال اور کامیاب تاجروں میں شمار ہوتے تھے، اسلام لائے تو چالیس ہزار درہم آپ کے پاس نقد تھے، وہ سب آپ نے اللہ و رسول کی خوشنودی کے لئے خرچ کر دیئے، خلیفہ ہونے سے پہلے بھی آپ تجارت کے ذریعہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے، منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد آپ کو بیت المال سے دو چادریں ملتی تھیں، جب پرانی ہو جاتیں تو انھیں واپس کر کے دوسری چادریں لے لیتے - جب اُن کے کپڑے کا یہ حال تھا تو اُن کے کھانے کا کیا حال رہا ہوگا - وہ دنیا سے اس طرح گئے کہ موت کے وقت اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ صدیقہ سے فرمایا کہ مسلمانوں کے مال سے میرے پاس ایک لونڈی اور دو اونٹنیوں کے سوا کچھ نہیں ہے، میرے مرتے ہی یہ عمرؓ کے پاس بھیجدی جائیں - دوسرے بیانوں میں اسی طرح کی دو ایک اور چیزیں بھی بتائی گئی ہیں - جو آپ کی وصیت کے مطابق بیت المال میں جمع کر دی گئیں - اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق فرمایا کہ جو کپڑا اس وقت بدن پر ہے اسی کو دھو کر دوسرے دو کپڑوں کے ساتھ کفن دینا - حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ یہ تو پرانا ہے کفن کے لئے نیا ہونا چاہیئے - فرمایا - مُردوں کی بہ نسبت زندہ نئے کپڑوں کے زیادہ حقدار ہیں - میرے لئے یہی پھٹا پرانا بس ہے - (خلفائے راشدین)

ایک مرتبہ آپ نے پینے کے لئے پانی مانگا - لوگوں نے پانی میں شہد ملا کر پیش کیا - آپ جیسے ہی اُسے منہ کے پاس لے گئے آنکھوں سے آنسو اُمنڈ پڑے، آپ اس قدر روئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی - جب سکون ہوا تو رونے کا سبب پوچھا گیا - آپ نے فرمایا - ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا - آپ کسی چیز کو "دور، دور" کہہ رہے تھے - میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا چیز ہے جس کو دور فرما رہے ہیں مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی" حضورؐ نے فرمایا "دنیا مجسم ہو کر میرے سامنے آئی تھی، میں نے اس کو دور کر دیا" - اس وقت یکایک مجھے وہی بات یاد آگئی اور میں ڈرا کہ شاید میں دنیا کے جال میں پھنس نہ جاؤں - (اسد الغابہ)

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے - ایک روز آپ نے پینے کا پانی مانگا، لوگ شہد لائے، پیالے کو ہاتھ پر رکھ کر تین بار فرمایا - کہ اگر پی لوں تو اس کی مٹھاس چلی جائے گی اور تلخی (عذاب) باقی رہ جائے گی - یہ کہہ کر پیالہ ایک آدمی کو دے دیا اور وہ اسے پی گیا - (اسوۂ صحابہ جلد ۲ صفحہ ۱)

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو یزید بن ابی سفیان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پڑا - معمولی کھانے کے بعد دسترخوان پر عمدہ کھانے لائے گئے تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا - اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم رسول اللہ کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو سیدھی راہ سے منحرف کر دے گا - (خلفائے راشدین)

ایک روز حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے - آپ زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے - آپ نے حضرت عتبہ کو بھی کھانے میں شریک کر لیا - لیکن یہ خشک لقمے اُن کے گلے سے نہ اترے - بولے، امیر المومنین! آپ کو میدے سے رغبت ہے؟ فرمایا، کُل مسلمانوں کو مل سکتا ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں" فرمایا "تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں دنیا ہی میں کھانے پینے کا مزا اُڑا لوں؟"

ایک روز اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے، انہوں نے سالن میں زیتون کا تیل ڈال کر پیش کیا - فرمایا "ایک برتن میں دو دو سالن مرتے دم تک نہ کھاؤں گا"

آپ عرب و عجم اور مصر و شام کے حکمران اور مسلمانوں کے امیر تھے - لیکن آپ کے سامنے کھجوریں رکھ دی جاتیں اور آپ سڑی گلی کھجوریں تک اٹھا کر کھا جاتے - (اسوۂ صحابہ حصہ دوم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جسم مبارک کبھی نرم اور ملائم کپڑوں سے مس نہیں ہوا - بدن پر بارہ بارہ پیوند کا کرتہ - سر پر پھٹا

عمامہ اور پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہوتی تھیں۔ پھر اسی حالت میں قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملتے۔ مسلمانوں کو شرم آتی لیکن کس کی مجال تھی جو آپ کے سامنے زبان کھولتا۔

ایک بار حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے کہا "امیر المومنین! اب خدا نے فارغ البالی عطا کی ہے۔ بادشاہوں کے سفراء اور عرب کے وفود آتے رہتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اپنے طرز معاشرت میں تبدیلی کرنی چاہیئے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "افسوس! تم دونوں امہات المومنین ہو کر دنیا طلبی کی ترغیب دیتی ہو۔ عائشہؓ! تم رسول اللہ کی اس حالت کو بھول گئیں جب تمہارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا۔ جس کو حضورؐ دن کو بچھاتے تھے اور رات کو اوڑھتے تھے۔ اور حفصہ! تمہیں یاد نہیں ہے کہ ایک دفعہ تم نے بستر کو دوہرا کر کے بچھا دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نرمی کے باعث رات بھر سوتے رہے، اور جب بلالؓ نے اذان دی تو آنکھ کھلی۔ حضورؐ نے فرمایا "حفصہ! تم نے یہ کیا کیا کہ بستر کو دوہرا کر دیا؟ میں صبح تک سوتا رہ گیا۔ مجھے دنیاوی راحت سے کیا تعلق؟ بستر کی نرمی سے تم نے مجھے کیوں غافل کر دیا؟"

حضرت عمرؓ نے ایک بار اپنا گزی کا کرتہ ایک شخص کو دھونے اور پیوند لگانے کے لئے دیا۔ اس نے اس کے ساتھ ایک نرم کپڑے کا کرتہ بھی پیش کیا آپ نے اس کا کرتہ واپس کر دیا اور اپنا کرتہ لے کر فرمایا "اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔"

عموماً گزی اور کپڑے ہوتے اور پھٹ جاتے تو پیوند پر پیوند لگاتے، حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ ان کے دونوں شانوں کے درمیان کے کپڑے پر تہ بہ تہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا تو ان کے تہبند پر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک دفعہ لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے رہے، آپ دیر کے بعد اندر سے تشریف لائے۔ معلوم ہوا پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ جو کپڑے بدن پر تھے انہی کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ سوکھ گئے تو پہن کر باہر نکلے!

کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب کے باشندے تھے اور وہ ایک تمدن نا آشنا ملک تھا۔ حضرت عمرؓ کی فوجیں روم اور فارس اور مصر کی سلطنتیں سے نبرد آزما ہو چکی تھیں، اور انہوں نے ان کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ شام کی فتح کے بعد قیصر روم سے حضرت عمرؓ کے دوستانہ روابط بھی قائم ہو چکے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معاشرت کا یہی حال رہا۔ جسم مبارک پر موٹے جھوٹے پیوند لگے ہوئے کپڑے اور دستر خوان پر گیہوں کی بے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی اور زیتون کا تیل یا اسی طرح کا کوئی اور سالن۔ مہمان اور سفراء آتے اور یہی غذا ان کے سامنے بھی پیش کی جاتی۔ وہ ایسی خشک اور سادہ غذا کے عادی نہ تھے اس لئے ان کو کھانے کی تکلیف ہوتی لیکن ان کا پاس و لحاظ بھی حضرت عمرؓ کی معاشرت کو بدل نہ سکا۔ آپ جانتے تھے کہ اس فقیرانہ زندگی کی تہ میں کونسا جذبہ اور احساس کام کر رہا تھا۔ حضرت حفصؓ بن العاص کھانے کے وقت موجود ہوتے تھے لیکن کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ "آپ کے دستر خوان پر ایسی سادہ اور معمولی غذا ہوتی ہے کہ ہم لوگ اپنے لذیذ اور نفیس کھانوں پر اس کو ترجیح نہیں دے سکتے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانوں کی مقدرت نہیں رکھتا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر مجھے آخرت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کی طرح قیمتی اور لذیذ کھانوں کا دلدادہ ہوتا۔ (خلفائے راشدین)

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں دنیا کی زندگی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ آپ کی نظر آخرت پر تھی۔ اوپر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے متعلق حضرت عمرؓ کی گفتگو کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔ اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے سامنے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس اسوۂ حسنہ تھا اور وہی آپ کے لئے چراغ راہ تھا!

حضرت عمرؓ اپنے امراء و عمال کو بھی مصنوعی کروفر کی حالت میں دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ جن لوگوں کو کہیں حاکم یا افسر بنا کر بھیجتے اُن پر یہ شرط عائد کرتے کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا۔ غذا میں چھنا ہوا آٹا استعمال نہ کرنا۔ باریک کپڑے نہ پہننا اور لوگوں کی ضروریات کے وقت اُن کے لئے اپنے دروازے بند نہ رکھنا۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی کام کیا تو اس کی سزا دی جائے گی۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب امارت وقضا)

ایک بار حضرت احنفؓ بن قیس کی قیادت میں عراق پر ایک مہم بھیجی۔ لوگ کامیاب ہو کر مدینہ لوٹے تو اُن کے جسم پر زرق برق پوشاک تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ لوگ آپ کی برہمی کی وجہ سمجھ گئے۔ چپکے سے آپ کی خدمت میں سے اٹھے اور عرب کے سادہ لباس میں دوبارہ حاضر ہوئے۔ آپ ان کو اس لباس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہر ایک سے الگ الگ بغل گیر ہوئے!

بیت المقدس کی فتح کی تقریب میں حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو حضرت خالدؓ بن ولید اور ان کے رسالے کے لوگ دیبا اور حریر کی قبائیں پہن کر آپ کے سامنے آئے۔ آپ ان کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑے اور زمین سے کنکریاں اٹھا کر اُن کی طرف پھینکتے ہوئے غصہ سے بولے ”تم نے دو ہی سال کے عرصہ میں اپنی سادگی ترک کر کے رومی وضع اختیار کر لی“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دولت وثروت سے نوازا تھا اور انہوں نے نازونعمت کے گہوارے میں پرورش پائی تھی۔ لیکن اُن کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی صرف زیب وزینت کے خیال سے کوئی چیز استعمال نہیں فرمائی۔ ایک قسم کا ردی کپڑا جسے قز کہتے تھے اہل عرب کا پسندیدہ لباس تھا۔ ارباب دولت وثروت کے علاوہ متوسط طبقہ میں بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ نہ اپنی بیویوں کو پہنایا۔ زمانۂ خلافت میں بھی آپ کی یہ سادگی قائم رہی۔ مسجد میں چادر سرہانے رکھ کر لیٹ جاتے۔ اٹھتے تو بدن میں کنکریوں کے چبھنے کے نشانات نظر آتے۔ لوگ دیکھتے تو کہتے یہ امیرالمومنین ہیں۔ (اسوۂ صحابہ)

آپ نے عمر بھر کبھی پاجامہ نہیں پہنا۔ صرف شہادت کے وقت ستر پوشی کے خیال سے پہن لیا تھا۔ عموماً تہمد پہنتے تھے، ایک تابعی روایت کرتے ہیں کہ میں نے جمعہ کے روز حضرت عثمانؓ کو منبر پر دیکھا تو جو موٹا تہمد وہ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت پانچ درہم (ایک روپے) سے زیادہ نہ تھی۔ (خلفائے راشدین)

حضرت علی رضی اللہ ہمیشہ دُنیا کی نمود ونمائش اور راحت و آسائش سے دُور رہے۔ خلافت کے زمانے میں بھی آپ کے طرز زندگی میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ زہد وورع کا یہ حال تھا کہ اپنے لئے کبھی اینٹ پر اینٹ اور شہتیر پر شہتیر نہیں رکھا۔ یعنی اپنے رہنے کے لئے مکان نہیں بنایا۔ بیت المال میں جو کچھ آتا اس کو اسی وقت تقسیم کر دیتے، اور کہتے ”اے دُنیا مجھے فریفتہ نہ کر“

لباس نہایت سادہ پہنتے تھے، ایک شخص نے دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک پھٹی پرانی قمیص ہے۔ جب آستین کھینچی جاتی ہے تو ناخن تک پہنچ جاتی ہے اور چھوڑ دی جاتی ہے تو سکڑ کر آدھی کلائی تک آ جاتی ہے۔ اسی سادہ لباس میں فرائض خلافت انجام دینے کے لئے بازاروں میں پھرا کرتے تھے!

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا۔ حضرت علیؓ گاڑھے کا تہبند باندھے ہوئے اور گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے بازار میں پھر رہے ہیں۔ ہاتھ میں درّہ ہے، اور لوگوں کو سچائی اور حسن معاملہ کا حکم دے رہے ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ سادہ لباس بھی بمشکل میسر ہوتا تھا۔ ایک دن منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ میری تلوار کون خریدتا ہے؟ اگر میرے پاس تہبند کے دام ہوتے تو میں اس کو فروخت نہ کرتا۔ ایک شخص نے اٹھ کر کہا ”ہم آپ کو تہبند کی قیمت قرض دیتے ہیں“

سادگی اور خاکساری اتنی محبوب تھی کہ بازار سے اپنا سودا سلف خرید کر خود ہی لاتے تھے۔ ایک دن بازار میں کھجوریں خریدیں،

اور خود اُٹھا کر لے چلے۔ ایک آدمی نے کہا "یا امیرالمومنین الائیے میں پہنچا دوں" آپ نے فرمایا "نہیں، یہ جن بچوں کے لئے ہے اُن کا باپ ہی اُن کے اُٹھانے کا زیادہ مستحق ہے" دربان اور پہرہ دار کا جھگڑا نہیں رکھا تھا، تنہا اُٹھتے اور مسجد کو چلے جاتے تھے۔ (اسوۂ صحابہ جلد ۲)

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ قریش کے نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے بارگاہ رسالت سے آپ کو امین الامت کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جہاد شام کے سپہ سالار اعظم تھے حضرت خالد بن ولید، حضرت یزید بن ابوسفیان، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے اکابر قریش آپ کے ماتحت سپہ سالار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، آپ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے گھر آیا۔ دیکھا تو آپ زار و قطار رو رہے ہیں۔ اس نے متعجب ہو کر پوچھا "خیریت تو ہے۔ آپ اس قدر رو کیوں رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو آئندہ فتوحات دنیوی کا ذکر کرتے ہوئے شام کا تذکرہ فرمایا۔ اور کہا "ابوعبیدہ! اگر اس وقت تک تمہاری عمر وفا کرے تو تمہارے لئے صرف تین خادم کافی ہوں گے" ایک خادم تمہاری ذات کے لئے اور ایک تمہارے اہل و عیال کے لئے اور ایک سفر میں ساتھ جانے کے لئے۔ اسی طرح سواری کے تین جانور کافی ہوں گے ایک تمہارے لئے، ایک غلام کیلئے اور ایک اسباب و سامان کے لئے" لیکن دیکھتا ہوں تو میرا گھر غلاموں سے اور اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، آہ! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ حضور اقدس نے فرمایا تھا کہ وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوگا جو اسی حال میں مجھ سے ملے گا جس حال میں میں اُسے چھوڑ جاؤں گا" (مہاجرین جلد اول)

ایک بار رومی سفیر اسلامی لشکر گاہ میں آیا تو اسے حضرت ابو عبیدہؓ تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ اس نے اپنے سپہ سالار اعظم کو جس شان و شوکت سے دیکھا تھا وہ اسی کو یہاں بھی تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اسے یہاں ہر چیز میں یک رنگی و یکسانی نظر آ رہی تھی۔ بالآخر اس نے حیران ہو کر مسلمانوں سے پوچھا "تمہارے سردار کہاں ہیں؟"

حضرت ابو عبیدہؓ سامنے ہی زمین پر بیٹھے تھے۔ کندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ اور ہاتھ میں تیر تھا جسے آپ الٹ پلٹ رہے تھے۔ مسلمانوں نے کہا "یہ بیٹھے ہیں"

آپ کو اس معمولی حالت میں دیکھ کر اسے یقین نہ آیا۔ اس نے آپ سے پوچھا "کیا واقعی آپ ہی سپہ سالار اعظم ہیں؟" حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا "ہاں" سفیر نے سوال کیا "کیا آپ کا خیال ہے کہ اگر آپ قالین پر بیٹھیں تو خدا آپ سے ناخوش ہو جائے گا۔ اور آپ کو اپنے فضل و کرم سے محروم کر دے گا"

حضرت امین الامت نے جواب دیا "میرے پاس قالین اور مال و دولت کہاں؟ اسلحہ جنگ کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں کل مجھے ایک ضرورت پیش آئی تو میرے پاس ایک حبہ نہ تھا۔ مجبوراً مجھے اس بھائی (حضرت معاذ) سے قرض لینا پڑا" (الفاروق)

آپ کو جب کبھی مال ملتا تھا، آپ راہ خدا میں صرف کر ڈالتے تھے۔ ایک بار حضرت عمر فاروق نے آپ کی خدمت میں چار سو دینار اور چار ہزار درہم بطور انعام بھیجے، انہوں نے تمام رقم فوج میں تقسیم کر دی۔ اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ چھوڑا۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا "الحمد للہ کہ اسلام میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں" (سیرت المہاجرین)

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر شہر کے عیسائی علماء دکا بروں نے اسلامی سپہ سالار سے درخواست کی کہ خلیفہ اسلام تشریف لائیں ان کی موجودگی میں معاہدہ لکھا جائے اور ہم شہر کو مسلمانوں کے سپرد کر دیں۔ عیسائیوں کی اس درخواست کے مطابق حضرت عمر رضی

بیت المقدس تشریف لے گئے۔ شہر کی حوالگی کے بعد افسرانِ اسلام نے باری باری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اپنے خیموں میں مدعو کیا اور ان کی خاطر و دلداری کے خیال سے آپ سب کے یہاں تشریف لے گئے۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کی دعوت نہیں کی، چنانچہ آپ نے ایک روز اُن سے کہا "تمام افسروں نے میری دعوت کی لیکن آپ نے مجھے مدعو نہیں کیا؟"

حضرت ابو عبیدہؓ نے جواب دیا "میں نے اس خیال سے آپ کی دعوت نہیں کی کہ شاید آپ کو میرے ہاں آکر آنسو بہانے پڑیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "نہیں ایک روز اپنے یہاں میری دعوت کیجئے۔"

چنانچہ آپ نے ایک روز حضرت عمرؓ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ فاروقِ اعظم، فاتح شام کے خیمہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ گھر میں گھوڑے کے نمدے کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ یہی نمدا اُن کا بستر تھا اور گھوڑے کا زین تکیہ۔ ایک طاق میں روٹی کے کچھ توکھے ٹکڑے پڑے تھے، فاتح شام نے وہی ٹکڑے، تھوڑا سا نمک اور مٹی کے گلاس میں پانی لاکر آپ کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔

یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کو بے اختیار رونا آگیا۔ آپ حضرت ابو عبیدہؓ کو سینہ سے لگا کر کہنے لگے "تم ہی میرے بھائی ہو۔ تمہارے سوا سب ساتھیوں میں اس کوئی نہیں جس پر دُنیا نے اپنا کچھ نہ کچھ جادو نہ کر دیا ہو۔"

حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا "میں کہتا نہ تھا کہ آپ کو میرے یہاں آکر آنسو بہانا پڑیں گے۔"

حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ حمص کے حاکم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو اس منصب پر مامور کرنا چاہا، تو پہلے اُن نے اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے معذرت چاہی، کہا "امیرالمومنین! مجھے اس فتنہ میں نہ ڈالئے" لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کی بات قبول نہیں کی، کہا "خدا کی قسم! میں تم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تم لوگوں نے میری گردن میں تو خلافت کی ذمہ داریوں کا پٹہ ڈال دیا اور علیحدہ رہنا چاہتے ہو" مجبوراً آپ نے اس عہدے کو قبول بھی کیا تو حالت یہ تھی کہ جو تنخواہ ملتی اُس میں سے معمولی طور پر کھانے کا سامان خرید لیتے اور باقی تنخواہ خیرات کر دیتے۔ بیوی پوچھتیں کہ تنخواہ کی اور رقم کیا ہوئی تو کہتے "قرض دے دیا ہے"۔ قرآن نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرضِ حسنہ قرار دیا ہے۔ حضرت سعید بن عامر کی قرض دینے سے یہی مراد تھی!

آپ کی عسرت اور تنگی کی زندگی کو دیکھ کر ایک دفعہ کچھ لوگ وفد کی شکل میں آپ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ پر آپ کے کنبے والے رشتہ داروں کے بھی حق ہیں۔ آپ کو ان کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔" آپ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فقراء مومنین دوسرے لوگوں سے ستر سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔" (صفۃ الصفوۃ)

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لے گئے۔ حمص پہنچکر وہاں کے سربر آوردہ لوگوں سے ملاقات کی اور شہر کے مساکین کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا۔ فہرست مرتب ہو کر سامنے آئی تو دیکھا سب سے اوپر حمص کے حاکم حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا نام موجود ہے، آپ نے ازراہِ تعجب دریافت فرمایا کہ "یہ سعید بن عامر کون ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا "ہمارے حاکم"۔ اور بھی تعجب ہوا، فرمایا "ان کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی ہے، وہ اس فہرست میں کیسے آسکتے ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا "یہ سچ ہے لیکن انھیں جو کچھ ملتا ہے دوسرے حاجتمندوں پر صرف کر دیتے ہیں، اُن کی فیاضی کچھ باقی رہنے نہیں دیتی۔"

یہ سُن کر حضرت عمرؓ رونے لگے۔ پھر اپنے خط کے ساتھ ایک ہزار دینار حضرت سعید بن عامر کے پاس بھیجے۔ اور قاصد سے کہا میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ امیرالمومنین نے یہ رقم اس لئے بھیجی ہے کہ آپ اسے اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں۔ قاصد نے سعید بن عامر کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عمرؓ کے خط کے ساتھ تھیلی پیش کی۔ دیناروں پر نظر پڑی تو بے اختیار زبان سے نکلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی بیوی کچھ دُور تھیں اُن کے کان میں یہ آواز پڑی تو گھبرا کر بولیں "خیریت تو ہے۔

کیا خدانخواستہ امیرالمؤمنین کی وفات ہوگئی؟" فرمایا "نہیں، اس سے بھی بڑا واقعہ ہے!" بیوی نے پوچھا "کیا خدا کی کوئی نشانی نمودار ہوئی ہے؟" فرمایا "اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آیا ہے" کہنے لگیں "تو کیا قیامت کے آثار نمودار ہوئے ہیں؟" بولے "نہیں، اس سے بھی بڑی بات ہوگئی ہے" انہوں نے کہا "آخر کچھ بتلائیے بھی کہ معاملہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ دیکھو میرے پاس دنیا آگئی ہے، ہائے میرے گھر میں فتنہ داخل ہوگیا ہے"۔

نیک بخت بیوی نے سمجھایا "آپ اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیئے گا اُسے رضائے الٰہی میں صرف کیجئے گا" اس بات سے ذرا دل کو تسلی ہوئی۔ رقم تھیلی میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی۔ کچھ دنوں کے بعد ادھر سے مجاہدین کا گزر ہوا تو یہ ساری رقم اُن کی ضرورتوں پر خرچ کردی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی حکومت میں عام طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جن لوگوں کو اپنے حاکم سے کوئی شکایت ہو وہ بے تامل میرے سامنے شکایتیں پیش کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اہلِ حمص نے حضرت عمر کی خدمت میں حضرت سعید بن عامر کی شکایتیں پیش کیں جن کی تفصیل یہ تھی:-

(۱) جب تک کافی دن نہیں چڑھ آتا۔ آپ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

(۲) رات کے وقت کوئی آواز دیتا ہے تو جواب نہیں دیتے۔

(۳) مہینے میں ایک روز گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

حضرت سعیدؓ بن عامر جیسے فرض شناس، خدا ترس اور خدمت گزار شخص کی نسبت ان شکایتوں کو سُن کر حضرت عمرؓ کو بہت تعجب ہوا لیکن حضرت سعید بن عامر سے ان کے متعلق دریافت کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ طلب کئے گئے۔ وہ حاضر ہوئے، حضرت عمرؓ نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ اے اللہ سعید کے بارے میں میرے نیک گمان کو غلط ثابت نہ کرنا۔ پھر اہلِ حمص سے کہا کہ وہ اپنی شکایتیں پیش کریں۔ لوگوں نے شکایتیں بیان کیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "سعید! تمہارے پاس ان شکایتوں کا کیا جواب ہے؟"

حضرت سعیدؓ بن عامر نے کہا "خدا کی قسم مجھے ان چیزوں کا تذکرہ پسند نہ تھا۔ لیکن اب اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ میں صبح اس لئے دن چڑھے باہر نکلتا ہوں کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے جو گھر کے کاموں میں مجھے مدد دے اور میری اہلیہ تنہا تمام کام انجام نہیں دے سکتی، اس لئے صبح کے وقت میں اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتا ہوں، پھر خمیر اٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے بعد روٹی پکاتا ہوں۔ پھر ہاتھ منہ دھوکر ان لوگوں کی خدمت کے لئے باہر نکل آتا ہوں"۔

دوسری شکایت کے جواب میں آپ نے کہا کہ "میں اس بات کو بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً اس کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں نے دن کو مخلوق کی خدمت کے لئے رکھا ہے اور رات کا وقت اللہ کی عبادت و بندگی کے لئے خاص کر دیا ہے"۔

تیسری شکایت کے جواب میں انہوں نے کہا "میرے پاس کوئی خادم نہیں جو میرے کپڑے دھو دیا کرے۔ نہ میرے پاس دوسرے کپڑے ہیں جنہیں میں بدل لیا کروں۔ اس لئے میں مہینے میں ایک بار اپنے میلے کپڑے دھوتا ہوں اور وہ سوکھ جاتے ہیں تو انہیں پہن کر باہر نکلتا ہوں، اس طرح دن کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے اور میں لوگوں سے مل نہیں سکتا"۔

حضرت سعیدؓ بن عامر کا جواب سن کر حضرت عمرؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ "سعید ابن عامر کے متعلق میری بصیرت نے غلطی نہیں کی"۔

حضرت عمرؓ نے حضرت سعیدؓ بن عامر کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے اور کہلا دیا کہ ان کو اپنی ضرورتوں میں استعمال کریں۔ بیوی نے

یہ رقم دیکھی تو بہت خوش ہوئیں، بولیں: "اس رقم میں سے ایک غلام خرید لیا جائے تاکہ گھر کے کام کاج میں ہمیں آسانی میسر آ جائے۔" حضرت سعید بن عامر نے فرمایا: "میں تمہیں اس سے بھی اچھی ایک بات بتاؤں۔ ہم یہ رقم ان لوگوں کو تقسیم کر دیں جو ہم سے بھی زیادہ محتاج و پریشان حال ہوں۔" بیوی بھی اللہ والی تھیں، اس بات پر رضامند ہو گئیں۔ حضرت سعید بن عامر نے ایک قابل اعتماد شخص کو بلا کر یہ رقم دی اور حکم دیا کہ جا کر اس رقم کو فلاں فلاں بیوہ، یتیم، بیمار اور مسکین کو تقسیم کر دو۔ مال تقسیم کرنے پر سونے کا ایک ٹکڑا بچ رہا۔ حضرت سعید بن عامر نے اپنی اہلیہ سے فرمایا، "اسے خرچ کر ڈالو۔" پھر آپ حسب معمول گھر کا کام کاج کرنے لگے۔ بیوی نے کہا: "یہ مال کیا ہوگا۔ اسی سے ہم ایک خادم کیوں نہ خرید لیں؟" آپ نے فرمایا: "اسے رکھے رہو۔ تمہارے پاس تم سے بھی زیادہ حاجت مند آئیں گے انہیں دیدینا۔"
(صفۃ الصفوۃ۔ ابن جوزی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمیر بن سعد کو عامل بنا کر حمص بھیجا۔ حضرت عمیر کو حمص گئے ہوئے ایک سال کا زمانہ گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے متعلق دربار خلافت کو کوئی اطلاع نہیں دی۔ آخر حضرت عمرؓ نے انہیں خط لکھا اور تاکید کی کہ اب تک جو رقم وصول ہوئی ہو اسے اپنے ساتھ لے کر مدینہ حاضر ہو۔

حضرت عمیر نے زادِ راہ کا تھیلا کندھے پر ڈالا، ہاتھ میں اپنا ڈنڈا لیا اور حمص سے پیادہ پا چل پڑے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو حالت یہ تھی کہ بال بڑھ گئے تھے، چہرہ غبار سے اٹ گیا تھا، اور جسم کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: "تمہارا یہ کیا حال ہے؟"

حضرت عمیر نے جواب دیا: "امیر المومنین دیکھ رہے ہیں کہ بالکل اچھا خاصا ہوں اور میرے ساتھ دنیا ہے جسے کھینچ رہا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا: "آخر تمہارے پاس کیا ہے؟"

عرض کیا: "یہ میرا تھیلا ہے جس میں میرا زادِ راہ ہے، میرا پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں اور جس سے اپنا سر اور کپڑے دھوتا ہوں، ایک چھوٹا سا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں، ایک ڈنڈا ہے جس پر ٹیک لگاتا ہوں اور جس سے ضرورت کے وقت دشمن کا مقابلہ کرتا ہوں۔ آخر انہی چیزوں کا نام تو دنیا ہے؟"

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا: "کیا تم پیدل آئے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا: "جی ہاں۔"

فرمایا: "کیا وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو تمہارے لئے سواری کا انتظام کر دیتا؟"

کہا: "نہ میں نے ان سے سوال کیا اور نہ انہوں نے سواری کا انتظام کیا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "وہ مسلمان کتنے برے ہیں جن کے پاس سے تم آئے ہو۔"

حضرت عمیر بولے: "امیر المومنین! خدا سے ڈریئے، اس نے آپ کو غیبت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ لوگ مسلمان ہیں، میں نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے سوال کیا: "تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کہاں بھیجا تھا اور کس غرض سے بھیجا تھا؟"

جواب دیا: "آپ نے مجھے جہاں بھیجا تھا وہاں گیا۔ وہاں کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور انہیں محاصل کی وصولی کے لئے مقرر کیا اور جو کچھ وصول کر کے لے آئے اسے ان کی ضرورتوں پر خرچ کر دیا۔"

آپ نے مزید کہا: "کہ اگر آپ اس کے مستحق ہوتے تو میں آپ کے پاس بھی اس میں سے لے آتا۔"

حضرت عمرؓ اُن کے جواب سے بہت خوش ہوئے اور چاہا کہ انھیں اُن کے منصب پر قائم رکھیں۔ لیکن وہ دوبارہ اس منصب کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ عرض کیا، "امیرالمومنین! اب میں اس کام سے معافی چاہتا ہوں، نہ آپ کے زمانہ میں یہ ذمہ داری قبول کروں گا اور نہ آپ کے بعد۔ بہت کوشش کی کہ اپنے کو حکمرانی کے جذبہ سے پاک رکھوں۔ لیکن ایک روز ایک نصرانی کے لئے میری زبان سے نکل ہی گیا کہ خدا تجھے خوار کرے"۔

اس کے بعد اجازت چاہی اور گھر واپس گئے جو مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ اُن کے جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک شخص کے ہاتھ سو دینار اُن کے ہاں بھیجے۔ اور کہا اگر اُن کی حالت سے اطمینان و فراغت کا اظہار ہو رہا ہو تو چُپ چاپ واپس چلے آنا اور اگر اُن کی حالت سے عسرت و تنگدستی ظاہر ہو تو یہ رقم اُن کو دے دینا۔ جس وقت حضرت عمرؓ کا آدمی حضرت عمیرؓ کے پاس پہنچا۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھے اپنے کُرتے سے جوئیں صاف کر رہے تھے، بولے "تشریف رکھئے، کہاں سے آ رہے ہیں؟"

قاصد نے جواب دیا "مدینے سے آ رہا ہوں"۔

پوچھا "امیرالمومنین کا کیا حال ہے؟"

کہا "اچھے ہیں۔ اللہ کے احکام و قوانین کا اجرا و نفاذ کر رہے ہیں"۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ کے حق میں دعا کی کہ اے اللہ عمرؓ کی مدد کر، وہ تیری محبت میں بہت سخت ہیں"۔

قاصد نے تین دن تک اُن کے ہاں قیام کیا۔ اُن کی معاشی حالت یہ تھی کہ مشکل سے روٹی کی ایک ٹکیہ میسّر ہوتی جسے وہ مہمان کے آگے رکھ دیتے اور خود فاقے سے رہ جاتے۔ قاصد نے تین دن کے بعد دینار نکال کر پیش کئے اور کہا "انھیں لیجئے امیرالمومنین نے آپ کی ضرورت کے لئے بھیجے ہیں"۔ حضرت عمیرؓ یہ سُن کر چیخ پڑے اور فرمایا "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے" اور وہ ساری رقم محتاجوں اور یتیموں کو تقسیم کر دی۔

قاصد مدینہ منورہ واپس آیا۔ اور حضرت عمرؓ کو سارا حال سُنایا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمیرؓ کو مدینہ منورہ بُلا بھیجا اور انھیں بہت سا غلّہ اور دو کپڑے دینے چاہے۔ انہوں نے غلّہ قبول نہیں کیا۔ عرض کیا، امیرالمومنین! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، دو صاع جو (تقریباً سات سیر) جو گھر پر چھوڑ آیا ہوں۔ البتہ کپڑے لے لئے۔ کہا "میری بیوی ننگی ہے اُس کے پاس تن پوشی کے لئے کوئی کپڑا نہیں"۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت عمیرؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ پیادہ پا گورستان بقیع غرقد تشریف لے گئے۔ جس میں حضرت عمیرؓ دفن کئے گئے تھے۔ ان کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کی اور فرمایا "کاش! کوئی عمیر بن سعد کی طرح مجھے ملتا اور میں اس سے مسلمانوں کے معاملات کی انجام دہی میں مدد لیتا"۔ (صفة الصفوة ابن جوزی)

حضرت سلمانؓ فارسی حضرت عمرؓ فاروق کے زمانۂ خلافت میں مدائن کی گورنری پر فائز تھے۔ آپ زہد و ورع کے اُس مقام پر تھے جس کے بعد رہبانیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانہ میں آپ گورنری کے عہدہ پر متمکن تھے آپ کو پانچ ہزار تنخواہ ملتی تھی۔ اور تیس ہزار نفوس پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی آپ کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے۔ اور اس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے۔ دو اینٹیں جوڑ کر تکیہ بنا لیے تھے۔ لباس میں بھی ایک عبا اور ایک معمولی سی جانگیا ہوتی تھی۔ ایرانی آپ کو اس ہیئت میں دیکھ کر "گرگ آمد۔ گرگ آمد" کہتے۔

ایک مرتبہ اسی امارت کے زمانہ میں اس شان سے نکلے کہ سواری میں بلا زین کا گدھا تھا۔ لباس میں ایک تنگ اور چھوٹی قمیص تھی جس سے گُھٹنے بھی نہ چھپتے تھے۔ ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں، لڑکے آپ کو اس ہیئت میں دیکھ پیچھے لگ گئے۔ لوگوں نے یہ طوفان بدتمیزی

دیکھا تو ڈانٹ کر ہٹایا کہ امیر کا پیچھا کیوں کرتے ہو؟

ایک مرتبہ ایک دستۂ فوج کی سرداری سپرد ہوئی - فوجی امارت کی شان و شوکت کا کیا ذکر، یہاں ایک معمولی سپاہی کی بھی وضع نہ تھی، چنانچہ فوجی نوجوان دیکھ کر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ "یہی امیر ہیں!" ایک بار ایک شخص حضرت سلمانؓ کے یہاں گیا - دیکھا کہ وہ بیٹھے آٹا گوندھ رہے ہیں - پوچھا، خادم کہاں ہے؟ بولے، کام سے بھیجا ہے، مجھ کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دو کاموں کا بوجھ اس پر ڈالوں - اس غیر معمولی سادگی کی وجہ سے لوگوں کو اکثر مزدور کا دھوکا ہو جاتا تھا - ایک مرتبہ ایک شخص نے جانور کے لئے چارہ خریدا، حضرت سلمانؓ کھڑے تھے، ان سے کہا - اس کو گھر تک پہنچا دو - وہ اٹھا کر لے چلے - راستہ میں لوگوں نے دیکھا تو کہنے لگے، لائیے ہم پہنچا دیں، یہ حال دیکھ کر اس شخص نے پوچھا - یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور کہا - آپ تکلیف نہ کیجئے - لیکن انہوں نے فرمایا - اس میں مجھے نیت کا ثواب ہے، اب میں اس بوجھ کو پہنچائے بغیر نیچے نہیں رکھ سکتا -

حضرت سلمانؓ نے عمر بھر اپنے لئے کوئی گھر نہیں بنایا - جہاں کہیں دیوار یا درخت کا سایہ مل جاتا پڑ رہتے، ایک شخص نے اجازت چاہی کہ میں آپ کے لئے مکان بنوا دوں - فرمایا - مجھ کو اس کی ضرورت نہیں - وہ برابر اصرار کرتا رہا - یہ برابر انکار کرتے جاتے تھے - آخر میں اس نے کہا - میں آپ کی مرضی کا مکان بناؤں گا - فرمایا - وہ کیسا مکان ہوگا؟ عرض کیا - اتنا مختصر کہ اگر کھڑے ہوں تو سر چھت سے لگ جائے اور اگر لیٹیں تو پیر دیواروں سے لگیں - فرمایا - خیر - اس میں کوئی حرج نہیں - چنانچہ اس نے ایک جھونپڑی بنا دی -!

حضرت سلمانؓ جو کچھ تنخواہ پاتے تھے پوری کی پوری حقداروں میں بانٹ دیا کرتے تھے - اور خود چٹائی بن کر گزارہ کرتے تھے - اور چٹائی کی آمدنی کا بھی ایک تہائی اصل سرمایہ کے لئے رکھ لیتے - ایک تہائی بال بچوں پر خرچ کرتے اور ایک تہائی خیرات کرتے تھے -

حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں بیمار پڑے - سعد بن وقاص عیادت کو گئے - آپ رونے لگے - سعد نے کہا - ابو عبداللہ رونے کا کونسا موقع ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے خوش خوش دنیا سے اٹھے - تم ان سے حوض کوثر پر ملوگے - بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات ہوگی!

حضرت سلمانؓ نے جواب دیا - خدا کی قسم میں موت سے نہیں گھبراتا اور نہ دنیا کی حرص باقی ہے - رونا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ ہمارا دنیاوی ساز و سامان ایک مسافر کے زادِ راہ سے زیادہ نہ ہو - حالانکہ اس وقت میرے گرد اس قدر سانپ (اسباب) جمع ہیں - سعد کہتے ہیں کہ کل سامان جس کو حضرت سلمانؓ نے سانپ سے تعبیر کیا تھا - ایک بڑا پیالہ ایک لگن اور ایک تسلہ سے زیادہ نہ تھا - (سیر الصحابہ)

یہاں اسلامی حکومت کی پالیسی کا ایک خاص رخ قابلِ ذکر ہے - غیر اسلامی حکومتیں کسی غیر ملک کو فتح کرتی ہیں تو وہاں ایسا حاکم مقرر کرتی ہیں جو لوگوں کے دلوں پر اپنی حکومت کی شان و شوکت اور رعب و وقار کا سکہ بٹھائے - لیکن اسلامی حکومت کو عام طور پر اس پالیسی سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حالات اوپر گزر چکے ہیں - وہ کتنے متواضع، منکسر مزاج اور زہد پسند انسان تھے - حالانکہ مدائن ایرانی سلطنت کا پائے تخت تھا - جس کی تہذیب و ثقافت اور تمدنی شان و شوکت دنیا میں مشہور تھی - حضرت فاروق اعظمؓ نے اسی مدائن کی حکومت پر حضرت سلمانؓ جیسے فقیر منش انسان کو حاکم بنا کر بھیجا تھا - اب مدائن کے دوسرے فاروقی حاکم حضرت حذیفہ بن الیمان کے حالات ملاحظہ کیجئے:-

حضرت ابو حذیفہؓ بڑے مرتبہ کے انصاری صحابی تھے۔ عہدِ فاروقی میں نہاوند کی جنگ میں مجاہدین کی امارت کے منصب پر مامور تھے اور نہاوند انہی کے ہاتھ پر فتح ہوا تھا۔

آپ نے تاریخوں میں حکمرانوں کے غرور اور داخلے کے حالات پڑھے ہوں گے۔ اس موقع پر کیسی شان و شوکت اور کیسے کروفر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس شان سے مدائن میں ورودِ مسعود فرمایا کہ ایک خچر پر سوار تھے۔ جس پر زین بھی نہ تھی صرف ایک پھٹا پرانا چارجامہ پڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، دوسرے میں گوشت کی ہڈی۔ اہلِ مدائن کو خبر ہو چکی تھی کہ آج مدائن کے حاکم تشریف لا رہے ہیں۔ اس لئے اکابرِ شہر آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ آئے اور اُن کے سامنے سے گزر گئے۔ لیکن لوگوں کے تصوّر میں بھی یہ بات نہ گزری کہ والیٔ مدائن اُن کے سامنے سے گزر گئے۔ تصوّر میں آسکنے کی بات بھی نہ تھی۔ اہلِ ایران کی آنکھوں نے کسی حاکم کے ورود کا یہ نظارہ کب دیکھا تھا۔ جب کافی وقت گذر گیا تو انہوں نے مسلمانوں سے دریافت کیا کہ والیٔ شہر آنے والے تھے، اُن کی سواری کیوں نہیں آئی۔ مسلمانوں نے بتایا۔ کہ وہ تو ابھی تمہارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ سُن کر اکابرِ شہر لپک کر حضرت حذیفہؓ بن الیمان کے پاس پہنچے۔ آپ کے ہاتھ میں اب تک روٹی کا ٹکڑا اور گوشت کی ہڈی تھی۔ آپ نے اسی کو لوگوں کی طرف بڑھا دیا۔ بھلا اہلِ شہر ایسے ٹکڑے کو حلق سے کیونکر اُتار سکتے تھے۔ از راہ احترام اُسے لے تو لیا مگر نگاہ بچا کر ایک طرف پھینک دیا۔

حضرت عمرؓ جس شخص کو کہیں کا عامل مقرر کرتے تھے، اس کے فرمانِ تقرری میں اپنے احکام اور اس کے فرائض درج کرتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ کے نام[*] اکابرِ مدائن کے سامنے یہ فرمان پڑھا گیا تو ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ آپ اپنی ضرورتیں بیان کیجئے کہ ہم ان کو پورا کریں۔ حضرت حذیفہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے قدم بقدم چلتے تھے۔ فرمایا۔ مجھے صرف اپنے پیٹ کے لئے کھانا اور گدھے کے لئے چارہ چاہیئے۔ میں جب تک یہاں رہوں گا، مجھے اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔

اسی مدائن میں آپ نے ایک بار پانی مانگا۔ ایک رئیس نے چاندی کے برتن میں لا کر دیا۔ حضرت کی شانِ فقر اس تکلّف کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ اس رئیس کو آپ اس سے پہلے بھی منع کر چکے تھے۔ اس لئے سمجھانے کے بجائے آپ نے جھنجھلا کر پیالہ کھینچ مارا۔ ایک زمانے تک اسی فقر و سادگی کے ساتھ مدائن کی حکومت اور درحقیقت حکومت نہیں رعایا کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں مدینہ طلب فرمایا تو اسی شان سے مدائن سے روانہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اپنی آمد کی اطلاع دے چکے تھے، حضرت عمرؓ اُن کے راستہ میں چھپ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت حذیفہؓ پاس سے گزرے تو دیکھا حکومت و امارت نے اُن پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ وہ جس حال میں مدینہ سے گئے اسی حال میں واپس آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ اپنی جگہ سے نکل کر اُن کے سامنے آئے اور فرطِ محبت سے لپٹ گئے۔ بولے حذیفہ! تم میرے بھائی ہو اور میں تمہارا بھائی ہوں۔" (سیر الانصار جلد ۲)

آج کی دنیا اور آج کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے لوگ ملکوں اور قوموں پر کس طرح حکومت کرتے تھے۔ اور لوگ ان کی حکومت و فرمانروائی کو کیونکر تسلیم کرتے تھے۔ یہ اتنے مستند تاریخی حالات ہیں جن سے زیادہ مستند حالات کسی دوسری قوم اور حکومت کے نہیں ہو سکتے۔ اس کا راز اُن کے پاکیزہ عقیدے اور اُن کی پُرخلوص اور بے ریا سیرت اور خدمتِ خلق میں پوشیدہ تھا۔ اللہ کی زمین پر یہ اللہ کے بندے بن کر رہنا چاہتے تھے۔ اور حکومت و امارت سے دُور بھاگتے تھے۔

---

[*] حضرت حذیفہؓ کے نام جو فرمان تھا اس میں اہلِ مدائن کے نام یہ ہدایت درج تھی کہ ان کا حکم سنو اور ان کی اطاعت کرو اور یہ جو کچھ مانگیں ان کو

اس لئے حکومت و امارت اُن کے قدموں پر قربان ہوتی تھی۔ حضرت حذیفہؓ لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ فتنہ کی جگہوں سے دُور رہیں۔ لوگ پوچھتے کہ فتنہ کی جگہوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرماتے حکام اور امراء کی ڈیوڑھیاں۔ لوگ ان کے پاس جاتے ہیں۔ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور جا و بیجا اُن کی تعریف کرتے ہیں۔

آپ جس اسلامی حکمران کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں گے آپ اُن سب کی زندگی میں بس ایک ہی چیز کو کارفرما پائیں گے۔ خدا ترسی اور اندیشۂ آخرت۔ اور اسی ایک چیز نے ان کی زندگیوں کو انسانیت کے پاکیزہ سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ حضرت حذیفہؓ کے انتقال کا وقت آیا تو انہوں نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا "خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ شان و شوکت کے مقابلہ میں مجھے تواضع و انکسار محبوب رہا۔ میں نے دولت و ثروت کے مقابلہ میں فقر و فاقہ کو پسند کیا"۔

لوگ کفن کا کپڑا لے کر آپ کے پاس آئے۔ دریافت فرمایا۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے پیش کیا۔ عمدہ قیمتی کپڑا تھا۔ دیکھ کر بولے "میرے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ معمولی سفید کپڑے کا کفن کافی ہوگا۔ اگر میرے اعمال اچھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے اچھی پوشاک عطا فرمائے گا"۔

ایک بار حضرت عمرؓ نے صحابہ سے فرمایا "اپنی تمنائیں پیش کیجئے"۔ سب نے کہا کہ زر و جواہر سے بھرا ایک گھر ملتا اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ حضرت عمرؓ کی جوہر شناسی دیکھئے۔ آپ نے فرمایا "میری تمنا تو یہ ہے کہ مجھ کو ابو عبیدہ، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے لوگ ملیں تاکہ میں ان کو حکومت کے عہدے تفویض کروں"۔ (سیر انصار)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا تھا۔ آپ کی زندگی کا ابتدائی دَور نہایت تنگدستی میں گزرا لیکن جیسے جیسے اسلام کو فروغ ہوتا گیا اُن کی تنگدستی میں کمی آتی گئی۔ ان کی ماتحتی میں متعدد مہمیں سر ہوئیں۔ برسوں تک مختلف صوبوں کے حاکم رہے، لیکن ان دونوں حالتوں میں اُن کی ظاہری زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ مال و دولت جمع کیا۔ نہ نخوت و رعونت پیدا ہوئی۔ گورنری کے بعد ایک مرتبہ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری سے ملاقات ہوئی۔ ابوذر فقیر منش آدمی تھے۔ دُنیا سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ حضرت ابو موسیٰ "بھائی بھائی" کہتے ہوئے دوڑ کر لپٹ گئے۔ لیکن ابوذر بار بار یہ کہہ کر اُن کو اپنے سے دُور کرتے تھے۔ "اب تم میرے بھائی نہیں ہو، اس منصب سے پہلے بھائی تھے"۔ دوبارہ جب پھر ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ اشعری پہلے کی طرح لپکے۔ انہوں نے کہا "ابھی ہٹے رہو۔ پہلے میرے سوالوں کے جواب دے دو۔ پھر پوچھا۔ تم نے لوگوں پر حکومت کی ہے؟" ابو موسیٰ نے کہا "ہاں"۔ کہا "عمارتیں تو نہیں بنوائیں؟ زراعت تو نہیں کی؟ جانور تو نہیں پالے؟" انہوں نے سب کا جواب نفی میں دیا۔ تو پھر اُن سے دل کھول کر ملے۔ (مہاجرین)

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ عہد رسالت میں مکہ معظمہ کے عامل تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں آپ کو اس منصب پر قائم رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب کے مصارف کیلئے دو درہم روزانہ مقرر فرمائے تھے۔ آپ اُسی پر قانع رہے۔ فرمایا کرتے تھے "جو پیٹ دو درہم میں نہیں بھرتا۔ اُسے خدا کبھی آسودہ نہ کرے"۔ (سیر الصحابہ جلد ہفتم)

حضرت عمر بن عبد العزیز خاندان بنو اُمیہ کے حکمران گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی پرورش بڑے عیش و تنعم اور راحت و آسائش میں ہوئی تھی۔ خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک زمانہ میں لباس، عیش و عشرت اور عطریات کا شوق ہوا تو میں نے اُسے اتنا پورا کیا کہ میرے علم کے مطابق میرے خاندان بلکہ دوسرے خاندانوں میں بھی ایسی زندگی کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اُن کی شوقینی اور نفاست پسندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کے کپڑوں پر ایک مرتبہ دوسروں کی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر انہیں وہ پرانا سمجھتے تھے۔

ولید کے زمانہ میں ان کو چار چار سو روپے کی قیمت کا کپڑا سخت و کرخت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر چودہ درہم کا کپڑا بھی نرم و ملیح معلوم ہونے لگا تھا۔ خوشبو کے لئے ڈاڑھی پر عنبر نمک کی طرح چھڑکتے تھے۔ رجاء بن حیوٰۃ کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیز سب سے زیادہ خوش لباس، سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ فخر کی چال چلنے والے تھے!

لیکن تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی آپ کی زندگی میں دفعتاً انقلاب ہو گیا۔ عیش و تنعم کے سارے سامان چھوٹ گئے۔ اور عیش پروردہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوذر غفاری اور حسن بصری کا قالب اختیار کر لیا۔ خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے جس طرح دنیا سے دامن جھاڑا اس کے کچھ حالات نیچے لکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ساری املاک بیت المال کو واپس کر دی۔ لونڈی، غلام، فرش فروش، لباس و عطریات اور عیش و تجمل کے جملہ اسباب و لوازم کو بیچ کر اُن کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔ بیت المال سے گزارہ کیلئے چار سو دینار سالانہ لیتے تھے۔ اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ لیتے تھے۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لایموت سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

لباس میں عموماً صرف ایک جوڑا رہتا تھا۔ اسی کو دھو دھو کر پہنتے تھے۔ مرض الموت میں ایک قمیص کے علاوہ دوسری قمیص نہ تھی کہ بدلائی جاتی۔ آپ کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے۔ لوگ عیادت کے لئے آتے ہیں۔ اس لئے دوسری بدلوا دو۔ وہ خاموش رہیں۔ مسلمہ نے دوبارہ کہا۔ فاطمہ نے جواب دیا "خدا کی قسم! اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے" پھر ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا تھا بلکہ اس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ آپ کے بچے بھی اسی تنگی سے بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی بچی کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ آپ کی بہن کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک تھان بھجوا دیا۔ اور منع کر دیا کہ عمر سے نہ مانگنا!

ایک مرتبہ آپ کے صاحبزادے عبیداللہ نے کپڑے مانگے۔ آپ نے فرمایا۔ میرے کپڑے خیار بن رباح کے پاس رکھے ہیں۔ اُن سے جا کر لے لو۔ وہ اُن کے پاس گئے۔ انہوں نے کاڑھے کے کپڑے نکال کر دیئے۔ عبیداللہ نے کہا۔ یہ تو ہمارے پہننے کے لائق نہیں ہیں۔ خیار نے کہا۔ میرے پاس تو امیرالمومنین کے یہی کپڑے ہیں۔ عبیداللہ نے واپس جا کر حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی وہی عذر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے پاس تو یہی ہیں۔ یہ جواب سُن کر وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے واپس بلا کر کہا۔ اگر اپنے وظیفہ سے پیشگی لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ چنانچہ سو درہم دلوا دیئے اور وظیفہ تقسیم ہونے کے وقت کاٹ لئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہونے کے بعد ایک شخص کو آٹھ درہم دے کر فرمایا۔ کہ اُن کے لئے ایک چادر خرید لائے، وہ خرید لایا۔ آپ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا "کیسی نرم ہے!" وہ شخص ہنسا۔ حضرت عمر نے پوچھا "ہنستے کیوں ہو؟" اس نے کہا۔ خلافت سے پہلے آپ نے ایک بار مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کے لئے ریشم کی بیل دار چادر خرید لاؤں۔ میں نے آٹھ سو درہم کی ایک خوبصورت چادر خریدی۔ لیکن جب میں اسے آپ کے پاس لایا تو آپ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا "کس قدر سخت ہے!" اور آج آپ آٹھ درہم کی چادر کو بھی نرم فرما رہے ہیں۔ اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنی صاحبزادیوں سے ملنے جاتے۔ ایک رات تشریف لے گئے تو صاحبزادیوں نے آپ کو دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور استقبال کے لئے دروازہ کی طرف بڑھیں۔ آپ نے اَنّا سے پوچھا۔ "بچیوں کا یہ کیا حال ہے؟" اس نے جواب دیا "مسور کی دال اور پیاز کے سوا کھانے کو اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لئے ہیں کہ منہ سے بو نہ آئے۔" آپ یہ سُن کر رو پڑے اور بولے "میری بچیو! اگر تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارے

کو دوزخ میں جھونک دیا جائے تو اس سے کیا فائدہ ؟"
یہ سُن کر بچیاں بے اختیار رونے لگیں - (مسلمون)
حضرت عمر بن عبد العزیز کی غذا نہایت معمولی اور سادہ ہوتی تھی - روٹی اور روغن زیتون یا دال روٹی کھاتے تھے - آپ کے غلاموں کو یہی ملتا تھا - ایک مرتبہ ایک غلام نے کہا - روز روز دال روٹی - آپ کی بیوی نے جواب دیا - امیر المومنین کی یہی غذا ہے - پھر یہ بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی - آپ کے غلام کا بیان ہے کہ جب سے آپ خلیفہ ہوئے اُس وقت سے وفات تک کبھی شکم سیر کھانا نہیں کھایا -
اگر کبھی کوئی اچھی چیز کھانے کی خواہش بھی ہوتی تھی تو اس کی مقدرت نہ تھی، ایک مرتبہ انگور کھانے کو دل چاہا - اپنی بیوی سے پوچھا - "تمہارے پاس ایک درہم ہے - میں انگور کھانا چاہتا ہوں" - انہوں نے جل کر کہا - "امیر المومنین ہو کر تم کو ایک درہم کی استطاعت نہیں" فرمایا "یہ جہنم کی ہتھکڑیوں سے میرے لئے زیادہ آسان ہے" - (تابعین)
مدینہ کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبد العزیز کو مدینہ میں دیکھا تھا - وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور سب سے زیادہ اکڑ کر چلنے والے تھے - پھر میں نے خلیفہ ہونے کے بعد اُن کو دیکھا کہ ان کا چلنا پھرنا بالکل راہبوں کے چلنے کی طرح ہو گیا ہے - اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انداز رفتار ایک فطری چیز ہے اس میں تغیر ممکن نہیں ہے تو حضرت عمر بن عبد العزیز کا تغیر حال اس دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید ہے - (اسلامی ریاست)
آپ کی معمولی وضع وقطع اور فقیرانہ رہن سہن کو دیکھ کر اجنبی شخص تمیز نہ کر سکتا تھا کہ یہی امیر المومنین ہیں - ایک بار عراق کی ایک عورت اپنی یتیم بچیوں کے لئے وظیفہ مقرر کرانے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی - آپ کے دروازہ پر پہنچی تو لوگوں سے دریافت کیا - کیا امیر المومنین کے یہاں دربان بھی رہتے ہیں - لوگوں نے بتایا کہ دربان وغیرہ کچھ نہیں رہتے - تم جانا چاہو تو اُن کے پاس چلی جا سکتی ہو - عورت گھر میں گئی - حضرت عمر بن عبد العزیز کی اہلیہ بیٹھی روئی ٹھیک کر رہی تھیں - عورت نے سلام کیا - انہوں نے سلام کا جواب دے کر اُسے اپنے پاس بٹھایا - عورت تعجب بھری نگاہوں سے امیر المومنین کے مکان کو دیکھنے لگی - اسے وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی - اُس نے کہا -
"میں تو یہاں اس لئے آئی تھی کہ اس گھر کے فیض سے اپنے خراب وخستہ گھر کی ویرانی دُور کروں گی، لیکن یہ تو خود ویران ہو رہا ہے"
فاطمہ بولیں - "تمہارے ہی جیسوں کے گھروں کو آباد کرنے میں یہ گھر ویران ہوا ہے"
اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز باہر سے آئے اور کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر ڈالنے لگے اور درمیان درمیان میں اپنی اہلیہ کی جانب دیکھ رہے تھے - نووارد عورت نے کہا :-
"بی بی! آپ پردے میں ہو جائیں، یہ مزدور برابر آپ کو گھور رہا ہے"
آپ کی اہلیہ بولیں - "یہ مزدور نہیں ہیں - یہی امیر المومنین ہیں"
اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز سلام کر کے اندر آئے اور مکان کے اس حصہ میں چلے گئے جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے اور اپنی اہلیہ فاطمہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کون خاتون ہیں ؟ انہوں نے کہا - یہ ابھی آئی ہیں - ایک برتن میں تھوڑے سے انگور رکھے تھے - آپ اچھے اچھے انگور چھانٹ کر اپنی اہلیہ کو دینے لگے - پھر نووارد عورت کی طرف متوجہ ہو کر دریافت فرمایا -
"کہ تم کیا چاہتی ہو ؟"

عورت نے کہا۔ "میں عراق کی رہنے والی ہوں۔ میری پانچ بیٹیاں ہیں اور پانچوں بڑی ہی بے شعور اور بے پروا ہیں۔ میں اُن کے لئے آپ کی نگاہ عنایت چاہتی ہوں۔" آپ نے فرمایا۔ "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری سبھی لڑکیاں بے شعور اور بے پروا ہیں ــــ"!

یہ کہتے ہوئے آپ رو پڑے۔ پھر قلم دوات اور کاغذ نکال کر حاکم عراق کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ پوچھا۔ "تمہاری بڑی بیٹی کا نام کیا ہے۔؟" اس نے نام بتایا۔ آپ نے اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے کہا۔ الحمد للہ۔ پھر آپ نے دوسری بیٹی کا نام دریافت کیا۔ نام بتانے پر اس کے لئے بھی وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے پھر الحمد للہ کہا۔ آپ نے تیسری بیٹی کا نام پوچھا۔ اور نام معلوم کر کے اس کے لئے بھی وظیفہ مقرر فرما دیا۔ عورت نے پھر الحمد للہ کہا۔ اسی طرح جب آپ چوتھی لڑکی کے لئے بھی وظیفہ مقرر کر چکے تو عورت اپنی خوشی ضبط نہ کر سکی۔ اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کو دعائیں دینے لگی۔ آپ نے اپنا قلم روک لیا۔ اور فرمایا۔ "تم جب تک خدا کی حمد و ثنا کرتی رہیں جو اس کا حقیقی سزاوار ہے میں تمہاری بیٹیوں کے لئے وظیفہ مقرر کرتا گیا۔ لیکن جب تم مجھے دعائیں دینے لگیں تو اب میں پانچویں کے لئے وظیفہ مقرر نہیں کر سکتا۔ تم اپنی چاروں لڑکیوں سے کہہ دینا کہ وہ اپنے وظائف میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی پانچویں بہن کو بھی دے دیا کریں گی"

عورت حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کا فرمان لے کر عراق واپس چلی گئی۔ جب وہ اس فرمان کو لے کر حاکم عراق کے پاس گئی۔ تو حاکم فرمان کو دیکھ کر بے اختیار رو پڑا۔ بولا "اللہ فرمان لکھنے والے پر اپنی رحمت نازل کرے۔" عورت نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا اُن کا انتقال ہو گیا؟" حاکم نے کہا۔ "ہاں"۔ یہ سُنکر عورت چیخ مار کر رونے لگی۔ حاکم نے کہا۔ "تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں اس فرمان کو رد نہ کروں گا۔" اور اُس نے اس کی بیٹیوں کے وظیفے مقرر کر دیئے۔

(سیرت عمرؒ بن عبد العزیز)

ماہر القادری

پھر تبصرہ

کیا یہ اسلامی تصوف ہے؟

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
(علامہ اقبال)

"فاران" کے پڑھنے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ "فاران" نے جس بات کو حق سمجھا ہے۔ اس کی حمایت میں کسی مصلحت، خوف اور طمع کی پروا نہیں کی، اُس نے ڈنکے کی چوٹ حق کا اعلان کیا ہے؟ دین کے معاملہ میں "فاران" کی یہ پالیسی بلکہ اُس کا مقصدِ اشاعت رہا ہے کہ اللہ کے خالص و سادہ دین کو اُسی انداز میں پیش کیا جائے جس بے میل اور خالص و سادہ انداز میں وہ نازل ہوا ہے، عجمی افکار اور غیر اسلامی تصورات کا جو غبار دین کی قبائے یک رنگ پر جم گیا ہے اُس پر اُنگلی رکھ کر بتلا دے کہ یہ دین میں اضافہ اور زیادتی ہے!

ہم معاذ اللہ! یہ بڑا بول نہیں بول سکتے کہ حق گوئی اور حق شناسی کی اجارہ داری ہمارے حصہ میں آگئی ہے اور ہماری زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عین حق ہوتا ہے۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری رائے، فکر اور زبان و قلم لغزش سے پاک نہیں ہیں۔ مگر اُن بنیادی اور مسلّمہ مسائل میں جن میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، ہم اپنی فکر و معتقدات کے بارے میں کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہمیں اُن کا اسی طرح یقین ہے جس طرح اپنے وجود اور زندگی کا یقین ہے ـــــ مثلاً کوئی شوریدہ سر نعرہ لگائے کہ "میں خدا ہوں" اور اپنی اس بکواس پر پشیمان اور اس کلمۂ کفر سے تائب ہونے کے بجائے، اُلٹا اُسے درست ثابت کرنے کے لئے دلیلوں اور تاویلوں کا انبار لگا دے تو ہم اس کلمۂ کفر کے کہنے والے کو وہی قرار دینگے جس کا وہ مستحق ہے!

خود تراشیدہ تاویلوں کی آڑ میں وجدان و ذوق کی رنگا رنگیوں کے مناظر ان آنکھوں نے بہت دیکھے ہیں۔ طبلہ اور ڈھولک کی تھاپ اور ہارمونیم کی گت پر ایک صاحب "یا صابر" کہہ کر ناچ رہے ہیں۔ مزامیر اور رقص و غنا کے اس طوفانِ بدتمیزی کو "سماع شریف" کا لقب دیا گیا ہے، اور یہ سب کچھ "عرفان و تجلّی" کے نام پر ہو رہا ہے ـــــ ایک صوفی (؟)۔ (دراز دستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں) ہیں کہ ہندوؤں کو اپنی بیعت اور سلسلۂ طریقت میں داخل فرماتے ہیں۔ اور صوفی صاحب کی اس "سعیٔ التباس حق و باطل" کو اُن کے مُرید بہت بڑی کرامت سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب قبلہ نے اپنی کرامت سے شرک و توحید اور کفر و اسلام کو گلے ملوا دیا ہے ـــــ ایک پیر صاحب طوائفوں اور کسبیوں کے جُھرمٹ میں آرام فرما ہیں۔ مگر مُریدوں کو اُنہوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھا رکھی ہے کہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہیں مگر اُن کی عقیدت میں ذرّہ برابر فرق نہیں آتا۔ ان آنکھوں نے آستانوں اور بارگاہوں کے بعض عقیدت مندوں کو قبروں کا طواف اور سجدے کرتے دیکھا ہے۔ مزار کی چوکھٹ پر پیشانی رکھی ہے اور

حب بھر سے مرادیں مانگ رہے ہیں۔ درگاہ معلی کے چراغوں کی ماکھ چاٹ رہے ہیں۔ باجے گاجے کے ساتھ مزار اقدس پر چڑھانے کے لئے
ر آرہی ہے۔ کسی جگہ "صندل شریف" نکل رہا ہے۔ کہیں سے "گاگر" اور "پنکھے" کا جلوس چلا آرہا ہے۔

ایک بڈھا آدمی ہے اتنا بڈھا کہ بھویں تک سپید ہو چکی ہیں۔ خوب گھنی اور لمبی ڈاڑھی مگر ان حضرت نے زنانے کپڑے پہن رکھے
ب، ناک میں نتھ، کانوں میں جھمکے، ماتھے پر ٹیکا، گلے میں موہن مالا۔ اور پیروں میں پازیب! یہ حضرت زنخوں کی طرح ناک پر ہاتھ رکھ کر
ت کرتے ہیں۔ ناچنے والیوں کی طرح ٹھمک ٹھمک کر اور کولھے مٹکا کر خرام ناز فرماتے ہیں اور اس قسم کے مسخروں اور بہروپیوں کو یار
وں نے "سدا سہاگن" کا لقب دے رکھا ہے اور ان کی راہ میں بعض لوگ اپنے دل و نگاہ بچھا دیتے ہیں!

مدک، بھنگ، چرس، سلفہ اور شراب پینے والے شاہ صاحبوں (۹) کو عقیدت مندوں کی اچھی خاصی ٹولیاں ہاتھ آگئی ہیں۔
ـسے طرح طرح کی کرامتیں وابستہ کی جاتی ہیں اور یہ تک کہا جاتا ہے کہ بظاہر تو ان کے تونبوں، زنبیلوں اور بادیوں میں شراب
رتی ہے مگر ان کا ظرف اسے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ جس کا ادراک عوام الناس نہیں کر سکتے۔ ان کے بادیہ کی دی ہوئی شراب کے
یک گھونٹ اور سلفہ کے ایک کش میں نہ جانے کتنوں پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں!

ایک پیر صاحب ہیں کہ کبھی آپ کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ مگر مرید ہیں کہ لوٹے پڑ رہے ہیں اور "حضرت والا" کی
یک ایک ادا پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے ہیں۔ ترک صلوٰۃ کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ حضرت والا کو یقین و عرفان کا مقام حاصل ہو گیا
ہے۔ جس کے بعد ظاہری عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ ہیں کہ شہر کی گلیوں میں برہنہ یا نیم برہنہ پھرتے ہیں، نماز روزے سے کوئی سروکار نہیں۔ عموماً ان کی باتیں
مجذوب کی بڑ ہوتی ہیں کہ ان کی "رموز" ہی بس نکالتے رہیئے۔ اس قسم کے آدمی نے اگر قصداً یہ حالت اختیار کی ہے تو وہ دھوکا باز
ہے اور اگر وہ واقعی ایسا ہی ہے تو پھر غیر مکلف ہے۔ لایعقل ہے اور کسی مرض کے سبب اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے، ایسا مریض
آدمی جس کے حواس تک مسلوب ہو گئے ہوں، وہ کسی کو کیا روحانی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جس طرح ہسٹیریا کا مریض بڑبڑانے لگتا
ہے اور اس کی اس بڑبڑاہٹ کو کوئی ذی ہوش آدمی ذرہ برابر اہمیت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اس قسم کے لایعقل اور مسلوب الحواس
آدمی کے کسی قول و فعل کو وقعت دینا کتنی خطرناکیوں کا سبب بن سکتا ہے۔ مگر عقیدت مند ہیں کہ ان بے ربط اور غیر متوازن
باتوں کی "ملفوظات" تیار کر رہے ہیں۔ اور کسی داخلی یا خارجی مرض کے سبب دل و دماغ اور اعصاب پر مرگی زدوں جیسی
حالت جو طاری ہو گئی ہے، اس کی یہ توجیہہ کی جا رہی ہے کہ حضور والا پر استغراق کا غلبہ ہے اور عالم لاہوت کی سیر میں سرکار
مصروف ہیں۔ اس لئے عالم ناسوت سے تعلق قطع فرما لیا ہے!

ایام جاہلیت میں خود راقم الحروف اس قسم کے لطیفوں پر جھوما ہے کہ گیارھویں شریف کا تبرک ایک شخص کے پیروں
کے نیچے آگیا اور اس بے ادبی پر اس کے ایسی ٹھوکر لگی کہ دانتوں پسینہ آگیا۔ اس نے بارگاہ غوثیت میں معروضہ کیا کہ غلام کی
اس میں کیا خطا تھی، غلام تو بالکل بے خبر تھا۔ جواب ملا کہ ہم کیا کریں غیرت الٰہی اس کو برداشت نہیں کر سکی۔

شرک و بدعت کی رسموں کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک حال پر نہیں ٹھہرتیں، ان میں ہمیشہ نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔
یہ خرافات بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی ہیں کہ بعض عقیدت مند اپنے بزرگوں کی تصویروں کو ہار پہناتے ہیں، لوبان کی دھونی دیتے
ہیں اور ان کے سامنے دوزانو بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہیں۔
اور یہ سب کچھ تصوف، عرفان و تجلی، وجدان و باطن، کشف و القا اور تجرید و تفرید کے نام پر ہوتا ہے اور سب

بڑا ظلم یہ ہے کہ ان تمام لغویتوں کا جوڑ کتاب و سنت سے ملایا جاتا ہے! اپنے قول و فعل پر قرآن و حدیث سے دلیلیں لانا، یہ ہر گروہ، ہر فرقہ اور ہر جماعت کا شیوہ رہا ہے، یہی کتاب و سنت ہیں جن سے خوارج نے دلیلیں تراش کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو (خاکم بدہن گستاخ) گمراہ اور فتنۂ دین کہاہے (معاذ اللہ) اور خلیفۂ راشد سے اس طرح جدال و قتال کیا ہے جیسے کافروں اور بے دینوں سے جہاد کیا جاتا ہے اور دوسری طرف "نُصیری" حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو "خدا" کہتے ہیں اور اس کیلئے بھی وہ وحی و کتاب ہی سے دلیلیں لاتے ہیں۔ معتزلہ، جہمیہ، قدریہ، جبریہ، یہاں تک کہ وہ لوگ جو حلول و تجسیم تک کے قائل ہیں، وہ اپنے عقائد کا ماخذ کتاب و سنت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے خود قرآن پاک نے اپنے بارے میں یہ کہا ہے:۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيرًا ط

(گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ (قرآن میں دی ہوئی مثال سے) بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو)

کفار و مشرکین اور خدا کے باغی بھی کفر و شرک کا ارتکاب اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دلیل و تاویل ہی کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے کو خطاکار اور گمراہ نہیں سمجھتے۔ شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی اس نافرمانی کے لئے دلیل ہی پیش کی تھی — مشرکین مکہ بتوں کو پوجتے تھے اور اپنے اس فعل سے شرک کا عیب دور کرنے کے لئے تاویلیں اور دلیلیں تراشتے تھے۔ کہ ہم نے ان بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں ذریعہ تقرب بنا لیا ہے، ان کی پرستش مقصود تھوڑی ہے!

عیسائیوں نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" بنا ڈالا۔ اقانیم ثلاثہ کا نظریہ تراش کر جس انداز میں توحید و تثلیث کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان تمام فنی اصطلاحوں، معنوی نزاکتوں اور لفظی الجھاووں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ارباب تصوف اور مسلمان متصوفین کے انداز فکر میں کتنی مشابہت پائی جاتی ہے!

منصور حلاج کے "انا الحق" سے جن لوگوں کو دلچسپی رہی ہے ان کے ذوق اور انداز فکر پر کیا عجمیت کا غلبہ نہ تھا؟ کتاب و سنت کی نتھری ہوئی سادہ اور خالص تعلیم سے "انا الحق" اور "قم باذنی" جیسے شطحیات، متشابہات اور خطرناک اقوال کا پیوند جوڑنا اور اس قسم کے اذکار کو "اسرار و غوامض" اور "عرفان و مشاہدہ" کا نام دینا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سیدھے اور بے خطر راستہ سے ایک مسافر کو اٹھا کر بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا جائے!

اب رہی تاویل — تو ہر گمراہ کن قول کی تاویل ہو سکتی ہے، کوئی شخص "انا اللہ" کا نعرہ لگا کر یہ تاویل کر سکتا ہے کہ مجھ پر تجلی ذات بحت کا اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ میری "انا" ذات بحت میں بالکل ہی گم ہو گئی اور جس طرح قطرہ "انا البحر" کا دعویٰ کر سکتا ہے، اسی طرح میں بھی "انا اللہ" پکار اٹھا — تاویل کے ان الفاظ میں بظاہر کس قدر شکوہ، ندرت اور رمزیت دکھائی دیتی ہے مگر کتاب و سنت کے نقطۂ نگاہ سے یہ تاویل سر تا پا خرافات ہے، عیسائیوں کا علم تصوف و کلام اور ہندوؤں کا ویدانت اس قسم کے لطائف اور نکتوں سے بھرا پڑا ہے!

ایک مثال ذہن میں آرہی ہے جو سنجیدہ تو نہیں ہے مگر افہام و تفہیم کی ضرورت کے سبب ہم اپنے قلم کو ذرا سی دیر کے لئے اس سے آلودہ کر رہے ہیں — ایک صاحب کسی دوسرے آدمی سے کہتے ہیں:۔

"تم اُلّو کے پٹھے ہو"

شخص مخاطب طیش میں آجاتا ہے کہ تم نے مجھے گالی دی ہے۔ مگر متکلم اپنے اس قول کی ان لفظوں میں تشریح اور تاویل کرتا ہے:۔

"اے شخصِ مخاطب! تجھے حقیقتِ اشیاء کا علم نہیں ہے، تُو اجسام و روح کے ربط و
لزوم سے نابلد ہے! ارے سادہ لوح! مخلوقات کے تمام اجسام و ابدان میں ایک ہی
روح جاری وساری ہے، کثرتِ ابدان و اجسام کے اعتبار سے مخلوقات میں تفرقہ
و تخالف پایا جاتا ہے۔ مگر وحدتِ روح کے اعتبار سے اُن میں کوئی اختلاف و
تفرقہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا"
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کا ایک ہی نوع اور حقیقت مشترک یعنی
"دابہ" کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ پس تیری [illegible] نگر اجسام پر ہے اور میری
نگاہ "وحدتِ روح" پر ہے۔ اس لئے میرے نقطہ نگاہ سے تیرے "باپ" اور "اُلو"
میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے میں نے تجھے "اُلو کا پٹھا" کہہ کر تجھے گالی نہیں دی بلکہ
وحدتِ روح کی حقیقت کا اظہار کیا ہے!"

خدا کے لئے سوچئے کہ اس اندازِ فکر پر جو "علم" اور "فن" وجود میں آئے گا وہ کس قدر خطرناک، پیچیدہ اور انمل بے جوڑ
ہوگا۔ یہ ہوائی باتیں علمی دنیا میں آکر آدمی کے اعمال و افعال کو کس قدر غیر متوازن اور کاواک بنادیں گی اور سوچنے کا یہ انداز اسلامی
فکر کی سادگی سے کس قدر متغایر ہے!

یہ تاویلات!

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ماہ جون ۱۹۵۶ء کے "فاران" کی تنقید (ہماری نظر میں) کو پڑھیئے۔ جس کے
آغاز ہی میں ماہنامہ "تاج" پر ریویو کیا گیا ہے۔ ہماری اس تنقید کا جواب ماہنامہ "تاج" (ماہ جولائی ۱۹۵۶ء)
نے "تبصرہ پر تبصرہ" کے عنوان سے دیا ہے۔ ہم نے ماہنامہ "تاج" کی جن عبارتوں پر احتساب کیا تھا۔ جواب میں اُن کی اُسی طرح
تاویل کی ہے جس طرح اصل مضمون میں نکتہ آفرینی فرمائی گئی تھی!
ہم نے ماہنامہ "تاج" سے صوفی سید عبدالرحمٰن لکھنوی کی کتاب "کلمۃ الحق" کے اُردو ترجمہ کا اقتباس پیش کیا تھا جس
میں صوفی صاحب نے لکھا ہے:-

"افسوس اور کمال افسوس ہے کہ علماء کبار نے شرق سے لے کر غرب تک، سلف سے لے کر
خلف تک، کیا محدث، کیا مفسر، کیا مجتہد، کیا مقلد، کیا متکلمین [illegible] سب نے
کلمۂ طیبہ کی اس کے مقام سے تحریف کر ڈالی۔ اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف لوٹا دیا
پس انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہہ کر شرک سے بچایا اور لا الٰہ الا اللہ کا اعتقاد رکھ کر
دل سے شرک کیا۔"

اس عبارت میں کوئی اینچ پینچ نہیں اس کی رو سے صوفیاء کی ایک بہت ہی محدود جماعت کو چھوڑ کر سلف سے لے کر خلف تک
تمام عوام مسلمان ہی نہیں بلکہ لاکھوں محدثین، مفسرین اور فقہا (خاک بدہن گستاخ) کلمہ طیبہ کے محرف اور مرتکب شرک قرار
پاتے ہیں!
ہمارے اس احتساب پر ماہنامہ "تاج" نے جو تبصرہ کیا ہے وہ "امکان وحدوث"، "شئون و تجلیات" اور "تکرار و سکون"
جیسی صوفیانہ اصطلاحات سے گرانبار ہے۔ جواب میں دلیلیں دی ہیں مگر اُن میں کوئی وزن نہیں۔ جگہ جگہ ماہر القادری (مدیر فاران)

ی بے علمی اور کم فہمی پر طنز ہے - فرماتے ہیں :-

"کاش ماہر القادری صاحب اگر مضمون کلام کو سمجھنے سے قاصر تھے تو کم از کم مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی پوری تحریر ہی پڑھ لیتے - اسی مسئلہ زیر بحث میں دلائل سے ثابت کرتے ہوئے مولانا نے محترم رحمتہ اللہ علیہ نے صاف لفظوں میں بیان کر دیا کہ تمام علماء و عوام جو کلمہ توحید کے جزو ثانی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں وہ صاحب ایمان ہیں اور اس طرح جزو اوّل لا الٰہ الا اللہ کے بھی تبعاً و ضمناً مصدق ہیں "

اس تضاد کا کوئی ٹھکانا ہے کہ کلمہ کی تصدیق سے بیک وقت دو نتیجے نکلتے ہیں ایک " ارتکاب شرک اور کلمہ کی تحریف " کا اور دوسرا " ایمان و تصدیق " کا ! ـــــ اور سنیئے :-

" ..... یہی حال کلمۂ توحید کی معرفت کا ہے ، لفظی و عامی مفہوم کلمہ بھی حق ہے جس کی تشریح علمائے مفسرین و محدثین کا کام ہے اور اس پاک کلمہ کے وہ مفہومات جو اہل شہود کو دوسرے مقامات پر حاصل ہوتے ہیں ، وہ بھی حق ہیں - دونوں مفاہیم کی غیریت نجات اخروی سے مانع نہیں - غلطی دراصل یہ ہے کہ ایک مقام کے پیمانۂ معرفت کو بلند تر مقام کے لئے بھی معیاری تسلیم کیا جائے .... "

جب اہل تصوف و شہود اور عوام اور ان کے علماء دونوں نے کلمۂ طیبہ کا جو مفہوم سمجھا ہے اپنی اپنی جگہ حق ہے اور سوال صرف راجح اور مرجوح اور بلند و بلند تر ہونے کا ہے تو پھر سلف سے لے کر خلف تک کے عوام ، محدثین ، مفسرین اور فقہا کو کلمہ طیبہ کا محرف اور مرتکب شرک قرار دے ڈالنا ، کتنی غیر ذمہ دارانہ بات ہے ۔ شہود و عرفان کے بعد فکر و رائے میں اور اصابت و تمکین پیدا ہونی چاہیئے نہ یہ کہ زبان و قلم میں اعتدال ہی باقی نہ رہے - اس فکر و خیال کے " قطب عالموں " کو کوئی کچھ کہے تو خانقاہوں میں شور مچ جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کے ساتھ یہ دشمنی برتی جا رہی ہے !

خالق و مخلوق میں تعلق " صفت خلق " کا ہے " عینیت " کا نہیں ہے - " ہمہ اوست " کا عقیدہ عجمی افکار کی پیداوار ہے - وحدت الوجود دین و شریعت اور ایمان و اسلام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے - اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جس طرح آجکل سائنس داں کہتے ہیں کہ تمام کائنات میں " توانائی " کام کر رہی ہے - اس قسم کے خیالات :-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں مشاہدہ ہے کس حساب میں

شاعرانہ شوخیٔ فکر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ، ان پر توحید و ایمان کے کسی نظریہ کی عمارت قائم کرنا اللہ کے دین کو بازیچۂ شعر و افسانہ بنانا ہے - دریا کا موج و حباب سے جو ربط ہے ، خالق و مخلوق کے باہمی ربط کا اس پر قیاس کرنا اسلامی اندازِ فکر کی عین ضد ہے - یہ مجوسیت ، ویدانت اور باطنیت کے افکار و نظریات ہیں جو عجمی تصوف کے قالب میں ڈھل گئے ہیں !

قرآن کی اس آیت " ھو الاول والاخر والظاھر والباطن .... " کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اوّل و آخر اور ظاہر و باطن ، خالق و رب ہے - لیکن اگر کوئی اس کے ٹھیٹ لفظی ترجمہ و مفہوم " اوّل ہے ، وہی آخر ہے -

ہر ہے اور وہی باطن ہے" ـــــ ہی کی معقولیت پر اصرار کرے تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "متشابہات" ہیں اور محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے وہی لوگ لگتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے ـــــ یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ قرآن اس پر شاہد ہے!

"....... یہ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ تقرب حق کے بعد ارادۂ قدرت بندۂ مقرب کے ذریعہ سے بھی کائنات میں نافذ العمل ہوتا ہے اور بقول مولانائے رومؒ سے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

لہٰذا بندۂ مقرب کے اختیارات دراصل اللہ بزرگ کے اپنے اقتدار کا اظہار ہے" (ماہنامہ "تاج")

مگر قرآن کیا کہتا ہے:۔

- "قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ"

(اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مالک اپنے لئے بُرے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے اللہ)

- "قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝

(اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے۔ میرے اختیار میں نہیں تمہارا نقصان و ضرر اور نہ راہ پر لانا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اللہ کی بارگاہ میں اور کس کو تقرب حاصل ہو سکتا ہے۔ جب حضورؐ کے اختیار و قدرت کی یہ حیثیت ہے تو پھر دنیا میں وہ کونسا اللہ کا چہیتا ہے جو کائنات میں مختار و متصرف ہونے کی قدرت رکھتا ہے!

اس جگہ اہلِ بدعت کی طرف سے "ذاتی" اور "عطائی" کی تفریق پیدا کی جاتی ہے۔ مگر اس خیالی شیش محل پر بھی قرآن کاری ضرب لگاتا ہے:۔

- قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ......"

(اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے.....")

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر اُن لوگوں کو جو حضورؐ کی خاک پا کے بھی برابر نہیں ہیں، ہم کس طرح داتا۔ مالک و مختار اور شہنشاہ ہفت اقلیم مان لیں۔ قرآن پاک کے اس دو ٹوک فیصلہ اور اللہ تعالیٰ کے اس محکم ارشاد کے بعد ہم کسی کی تاویل اور نکتہ آفرینی کو ذرّہ برابر وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں!

ماہنامہ "تاج" میں بابا تاج الدین ناگپوری سے یہ بات منسوب کی گئی تھی کہ انھیں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"۔ "فاران" میں اس پر گرفت کی گئی۔ اس کے جواب میں ماہنامہ "تاج" نے قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں کہ "قرآن میں "رسول" اور "مرسل" قاصد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یقیناً عربی میں قاصد کو "رسول" کہتے ہیں، مگر ہمیں اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ بابا تاج الدین ناگپوری کیا عربی مصطلحات میں گفتگو فرمایا کرتے تھے؟ پھر اُردو روزمرہ میں "پیغامبر" اور "پیغمبر" میں بھی فرق کیا جاتا ہے۔ "پیغامبر" تو قاصد اور پیام رساں کے معنی میں بولتے ہیں۔ مگر "پیغمبر" بول کر اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی اور رسول ہی مُراد لئے جاتے ہیں۔ اور بابا تاج الدین صاحب ناگپوری سے جو قول منسوب ہے اس میں "پیغامبر" نہیں "پیغمبر" استعمال کیا گیا ہے ـــــ اصل عبارت یہ ہے:۔

"قوس ولایت میں بابا کی تربیت جناب سیدہ نے فرمائی تو آپ مرتبہ ولایت پر فائز ہوئے۔

پھر اس مرتبہ ولایت سے آپ کو جناب سیدہؓ نے اتنی ترقی عطا فرمائی کہ اپنا پیغمبر بنا کر عالمِ مخلوق میں مامور فرمایا۔"

"ولایت" کے مرتبے سے ترقی دے کر "پیغمبر" کا رتبہ عطا فرمایا۔ اس عبارت کو پڑھ کر قاری کا ذہن کیا ڈاکیہ اور قاصد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یا اس "پیغمبر" کی طرف جو روحانی اعتبار سے ولی سے بلند تر ہوتا ہے اور جس کے معروف معنی رسول اور نبی کے لیے جاتے ہیں!

پھر اس عبارت کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو وفات پائے ہوئے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زائد مدت ہونے کو آئی اور آپ جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ کیا آپ قبر و برزخ اور علیین سے لوگوں کی تربیت فرماتی رہتی ہیں۔؟ یہ آخر کیا عقیدہ ہے؟ یہ کس دین کی ترجمانی ہے؟ یہ کیا لطیفے ہیں؟

پورے قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ کسی نبی اور رسول نے یا اس کے صحابیوں نے وفات پانے کے بعد کسی امتی کی روحانی تربیت فرمائی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ایسی نہیں ملتی کہ آپ کے اصحاب اور اہلبیت دنیا سے اٹھ جانے کے بعد مسلمانوں کی یا کسی ولی کی روحانی تربیت فرمایا کریں گے۔

کیا ماہنامہ "تاج" کے فاضل مدیر بتا سکتے ہیں کہ وفات کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس کی روحانی تربیت فرمائی تھی۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس مسلمان کو "ولی" کے عہدہ سے ترقی دے کر "اپنا پیغمبر" مامور فرمایا تھا۔ اور پھر دوسرے اصحاب اور اہلِ بیت دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کس کس کے روحانی مربی تھے؟

اس قسم کے لغو عقائد کی تردید قرآن اس طرح کرتا ہے:۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ○ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ○ (النحل)

(اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں۔ بلکہ مخلوق ہیں، مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا!)

اس آیت کی "تفہیم القرآن" میں کتنی مطابقِ معنی تفسیر کی گئی ہے:۔

"یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور سے جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے، یا جن یا شیاطین یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں۔ ان پر "اموات غیر احیاء" کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لئے "مَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ" کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ سے مراد وہ انبیاء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریادرس، غریب نواز اور گنج بخش اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے

تو ہم عرض کریں گے کہ جاہلیت عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے، کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل ربیعہ، غسان، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، کعب و کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے۔ اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے۔ جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ودّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد میں لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے، اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عزیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا عقیدہ بھی روایت میں آیا ہے کہ لات اور عزیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے یہاں اور گرمی عزیٰ کے یہاں بسر کرتے تھے۔
سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون۔"

"تیری شریعت تجھے مبارک" یہ ماہر صاحب نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جیسے وہ نہیں جانتے ہوں کہ قرآن مجید میں بہت سے واقعات موجود ہیں جن میں صاحب الہام ولی یا نبی کو ظاہر احکام شرعی سے تجاوز کرنا پڑا ہے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ قرآن میں پڑھیں۔" (ماہنامہ تاج)

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ بیان کر کے اللہ یہ بتانا نہیں چاہتا کہ صاحب الہام ولی یا نبی شرعی احکام کو کبھی کبھی توڑ بھی دیا کرتے ہیں۔ ہم بے علموں کی بات اگر ان صاحبان معارف و غوامض کے نزدیک قابل سماعت ہو تو عرض کیا جاتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عالم تکوین کے بعض واقعات و احکام کا مشاہدہ کرایا تھا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ اس دنیا میں بعض واقعات بظاہر اس انداز سے رونما ہوتے ہیں کہ عقل اُن پر معترض ہوتی ہے اور ظلم و زیادتی کا فتویٰ لگا دیتی ہے۔ مگر حقیقت میں اُس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں!

اللہ تعالیٰ نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ۔

(یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا وہ اُن سب میں پورا اُترا)

انہی میں ایک "ذبح عظیم" کا واقعہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی خود ستائش فرما رہا ہے تو پھر اس واقعہ پر "خلافِ شرع" ہونے کا گمان کرنا حدودِ شریعت کے توڑنے کے لئے حیلہ اور جواز تلاش کرنے کی سعی نامسعود کے سوا اور کیا ہے؟

اُم موسیٰ نے جو موسیٰ کو تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا، اُس کا اللہ تعالیٰ نے جب ان لفظوں ذکر فرمایا ہے:-

"واوحینا الی ام موسیٰ"

تو پھر اُمّ موسیٰ کے اس فعل کو خلافِ شرع کہنا کتنی بڑی جسارت ہے! شارع جب خود ایک کام کے لئے حکم صادر فرمائے تو وہ "خلافِ شریعت" کیوں ہونے لگا۔ وہ تو "عین شریعت" ہے!

بے نمازی صوفیوں اور شریعت کی حدود کو توڑنے والے پیروں کی غلطیوں کو سندِ جواز دینے کے لئے خود قرآن سے "شرعی احکام سے تجاوز" کے نکتے نکالنا "اربابِ شہود و استغراق" ہی کو سزاوار ہے۔ ہم گنہگار عامی اور بے علم تو ایسی جرأت کر نہیں سکتے!

"مُسلمہ طور پر اولیاء اللہ کو تمام اُمت عند ارسیدہ تسلیم کرتی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ میں اُن کی مقبولیت کا اعلان ہوچکا ہے اور اہلِ ایمان کے قلب میں اُن کی محبت و مقبولیت ودیعت کی گئی ہے آپ اس راستہ کو اختیار کیجئے ..... (ماہنامہ تاج)

اولیاء اللہ کا راستہ توحید اور کتاب و سنت کے علاوہ کوئی اور راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس راستہ میں توحید پر حرف آرہا ہو۔ اور اللہ کا دین بازیچۂ شوخیٔ افکار بن رہا ہو وہ "صراطِ مستقیم" نہیں کوئی اور پگڈنڈی ہے؟

ماہ جولائی کے ماہنامہ "تاج" میں ایک اور عبارت نظر سے گزری اور خدا جانتا ہے دل لرز گیا:-

"---- راقم نے بمقام کوٹھی چند نیاں علیگڑھ ۱۹۳۹ء شغلِ برزخ کی کیفیات اس عنوان سے عرض کیں:-

"اے ذہین! ابن فراقی من نیم اعلانیم ظاہرم عبدالکریم و باطنم رب الکریم"

ارشاد ہوا --- "مبارک"! (صفحہ ۷)

"تاج" کے مدیر اعلیٰ جناب ذہین شاہ تاجی صاحب "شغلِ برزخ کی کیفیات" اپنے پیرو مرشد بابا محمد یوسف شاہ تاجی کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں۔ عبارت سے صاف طور پر نہیں کھلتا کہ کہنے والے نے خود اپنے کو (باطن) "رب الکریم" کہا ہے یا اپنے مرشد کو! بہرحال جس کے لئے بھی کہا ہے، غلط کہا ہے۔ اور "غلط" تو بلکہ سے ہلکا لفظ ہے جو ہم نے استعمال کیا ہے۔ پھر مرید کی لغو بیانی پر پیرو مرشد "مبارک" کہہ کر اس بیہودہ گوئی پر مہرِ تصدیق ثبت فرما دیتے ہیں!

اگر "تصوف" ایسے ہی مقامات سے اپنے طالبوں کو گزارتا ہے تو ان "مقامات" سے ہزار بار خدا کی پناہ! یہ جنید و شبلیؒ کا (اسلامی) تصوف ہرگز نہیں ہے یہ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ جو سادہ طبیعت مسلمان اس قسم کی "تعلیمات" کا شکار ہیں۔ اُن کے حال پر ہمیں بڑا ترس آتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ بارالٰہا! انہیں ان پھندوں سے جلد چھٹکارا دلا دے (آمین!)

ایک نظر!

"تاجی تصوف" کی رنگ رلیاں آپ دیکھ چکے، اس کے بعد ایک دوسرے "خانوادۂ عرفان و تجلی" کی بوقلمونیاں بھی ایک نظر دیکھ ہی لیجئے!

حیدرآباد دکن میں ایک صاحب صدیق دیندار چن بسویشور گزرے ہیں۔ جو دیندار جماعت کے بانی تھے۔ بلدہ حیدرآباد میں قیام تھا۔ اُن کی خانقاہ کا نام "خانقاہ سرورِ عالم" تھا۔ اُن کی وفات ابھی حال ہی میں چند سال پہلے ہوئی ہے! چن بسویشور صاحب زیادہ تر ہندوؤں میں تبلیغ کرتے تھے اور اُن کا دعویٰ تھا کہ ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اُن کے ظہور کی پیش گوئیاں اور علامتیں درج ہیں وہ اپنے کو "مثیلِ یوسف" بھی کہتے تھے حالانکہ وہ ذرا بھی خوبصورت نہ تھے!

ہندوستان کی تقسیم کے بعد جس طرح دوسرے مہاجرین کے ساتھ جنوبی ہند سے مہدوی، میمن سے جعفری، آغاخانی بوہرے ہجرت کرکے پاکستان میں آگئے ہیں۔ اسی طرح صدیق دیندار چن بسویشور کے معتقدین بھی پاکستان میں آکر بس گئے ہیں۔ اس جمعیت (دیندار انجمن) کے لوگ ہرے عمامے باندھتے ہیں اور رنگے ہوئے کرتے پہنتے ہیں۔ لانبی ڈاڑھیاں اور پراگندہ مُو! لارنس روڈ پر اس جمعیت کا مکتبہ ہے، اس سال انہوں نے مولانا صدیق دیندار چن بسویشور صاحب کا عُرس بھی کیا تھا۔ اُن کے لوگ مسلمانوں کے پاس جا کر انفرادی طور پر بھی تبلیغ کرتے ہیں اور اُن کے یہاں سے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کتاب[1] ——— معراج المومنین ——— کے علاوہ اُن کے دو کتابچے (اسلام اور عصر حاضر ——— اور پیام خلافت) ہمارے یہاں آئے ہیں جن میں مسلمانوں کو متفق و متحد ہونے، پاکیزہ زندگی اختیار کرنے اور مجاہد بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ فکر و بیان میں "تصوف" کی خاصی جھلک ہے!

سات سال کا عرصہ ہوتا ہوگا کہ "دیندار انجمن" کے ایک صاحب دفتر "فاران" میں تشریف لائے تھے اور راقم الحروف سے دریافت کیا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو رفعت و ترقی سے بدلنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جا سکتی ہے ——— میں نے اُن کی خدمت میں اپنی فہم و استعداد کے مطابق چند معروضات کئے۔ اس پر انہوں نے خاصی طول طویل تقریر فرمائی اور اُن کی تلقین و تبلیغ کی تان اس پر آکر ٹوٹی کہ جب تک کسی "مامور وقت" کی اتباع نہ کی جائے گی مسلمانوں کی پراگندگی دور نہیں ہو سکتی۔ اُن کا اشارہ صدیق دیندار صاحب چن بسویشور کی طرف تھا۔ اس پر میں نے انھیں اچھی طرح پھٹکارا۔ اس دن کے بعد وہ صاحب پھر میرے پاس آنے کی جرأت نہ کر سکے!

اس کتاب (معراج المومنین) کا پیش لفظ مولوی ابو احمد دستگیر صاحب نے لکھا ہے۔

"جس طرح جہاد مردوں پر فرض ہے اسی طرح قرآنِ کریم ذاتِ وحدت الوجود رحمۃ للعٰلمین پر فرض ہے۔"

"قرآنِ کریم ذاتِ وحدت الوجود رحمۃ للعٰلمین پر فرض ہے"۔ یہ کیا "رمز" اور انداز بیان ہے۔ ہمارے تو کچھ پلے پڑا نہیں۔

"اسی حقیقت کے اظہار میں اللہ تعالیٰ جب کبھی روح کے نزول کا ذکر کرتا ہے تو وحدت کا اظہار کرتا ہے۔"

خوب! اور جب اللہ روح کے نزول کا ذکر نہیں کرتا تو وحدت کی جگہ "کثرت" کا اظہار کیا کرتا ہے۔ یہ آخر کیا چیستاں ہے؟

اس کے بعد "صاحب پیش لفظ" اپنے مافی الضمیر اور معتقدات کا کچھ اتا پتا دیتے ہیں۔

"ایسے زمانہ میں حضور منبع انوار صلی اللہ علیہ وسلم کا رہنا ضروری ہے تاکہ اپنا دربار گرم کریں۔ اس دربار مبارک کی شان بھی فرضیت قرآن سے ظاہر ہے . . . ."

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ابدیت تو کتاب و سنت سے ثابت ہے یہ "حضور منبع انوار" کس "شخصیت" کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے دربار مبارک کی شان کی فرضیت بھی قرآن سے ظاہر ہے!

یہ "دیندار انجمن" کیا ہے اس کا تعارف خود اسی انجمن کے اکابر (نقرار مبلغین اسلام) نے بانی تحریک کے ارشادات و

[1] یہ دفتر "فاران" میں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔ [2] یعنی اسی سے ملتا جلتا ہوا کوئی لفظ بولا گیا تھا۔

ملفوظات سے کرایا ہے۔

"ان کا ہر فرد جب تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ بولتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عالموں نے کبھی بھی نہیں سُنا تھا ......"

اس زمانہ کے بیچارے "علماء" کی رسائی بس کتاب وسنت تک ہے۔ اس سے "ماورا حقائق" کو یہ غریب کس سے سنتے اور کہاں سُنتے ؟

"تمام روئے زمین کے عالم ان کے سامنے گونگے ہیں۔ قرآن کریم کی جو بات بولتے ہیں وہ اپنی ذمہ داری سے بولتے ہیں، کلیم نے کلام سکھلایا ہے......"

ہم نے تو آج تک "دیندار انجمن" کے کسی رکن یا فرد کی تقریر و وعظ کا شہرہ نہیں سُنا۔ خود بانی تحریک صدیق دیندار صاحب اپنی خانقاہ میں جو جلسہ کیا کرتے تھے تو قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم اور دُوسرے علماء کو تقریر کے لئے بلایا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی ان جلسوں میں نظمیں پڑھی ہیں۔ اگر اس انجمن کے بانی اور اس کے عمائد ایسے ہی فصیح البیان اور طلیق اللسان تھے کہ روئے زمین کے تمام علماء اُن کے سامنے گونگے ہیں تو اپنے جلسوں کو مقبول بنانے کے لئے دُوسرے علماء اور مقررین کو بلانے کی کیا ضرورت تھی !

ان "مبلغین دیندار انجمن" کے مبلغ علم کا حال بھی لگے ہاتھوں سُن لیجئے :-

"یہ غریب لوگ کون ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کو قرآن نے فقراء[1] ان کی ٹوپی میں اپنا علمی جامہ پہنایا تھا جن کا لباس فقیرانہ ہے، بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بازاروں میں جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں، جھگیوں میں رہتے ہیں۔ ظاہری علم سے بے بہرہ، نہ ان کے پاس تفسیروں کا خزانہ ہے نہ فقہ و احادیث کا ذخیرہ ہے......"

ظاہر ہے کہ قرآن کے یہ عجیب و غریب مفسر(؟) اور دین کے مُبلغ جو نہ علم تفسیر سے واقف ہیں اور نہ فقہ و حدیث میں درک رکھتے ہیں۔ جب تقریر فرمائیں تو تفسیر و حدیث اور فقہ کے جاننے والوں کی اسی میں سلامتی ہے کہ یہ بیچارے سکوت اختیار کرلیں۔ ہائے ! قرآن اور دین کی مظلومیت !!

"اللہ تعالیٰ نے محض قدرت دکھلانے کے لئے اس زمرۂ وارث انبیاء کو کھڑا کیا ہے۔ قرآن کریم کی بشارت "النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین" ان سے پوری ہوئی ہے۔" (ص۲۲)

یہ مبالغہ آرائیاں، یہ خودستائیاں، یہ خوش اندیشیاں ـــ کوئی کہے تو کیا کہے !

"اہل اللہ پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ بشارت دیتے ہیں۔ اگر اُن کے دل میں کوئی بات ہوتی ہے تو پوری ہوکر رہتی ہے۔" (ص۲۳)

حالانکہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ انبیاء کرام تک کی بعض دل کی باتیں، تمنائیں اور دعائیں پُوری نہیں ہوئیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تو یہ قول بہت مشہور ہے کہ "میں نے اپنے رب کو ارادے کے لوٹ جانے سے پہچانا"۔

---

[1] اصل عبارت میں "فقر" لکھا ہوا ہے مگر سیاق و سباق بتاتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اصل لفظ "فقہ" ہونا چاہیئے۔

محمد صدیق دیندار صاحب کا یہ ارشاد ہے :۔

"ان (اہل اللہ) کا ارادہ خدا کا ارادہ ہوتا ہے ...." (صفحہ ۳۴)

اگر "اہل اللہ" کا ارادہ خدا کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ ناکام اور فسخ کس طرح ہو جاتا ہے۔ کیا اللہ کا ارادہ ٹوٹ سکتا ہے ؟ بلکہ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ اہل اللہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کا تابع ہوتا ہے اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی لگے رہتے ہیں !

"یہ (اہل اللہ) اہم معاملات میں قرآن و حدیث میں غور کر لینے کے بعد خداوند کریم کے دربار میں مشورہ کرتے ہیں ......" (صفحہ ۳۴)

اس راز کی پہلی مرتبہ پردہ کشائی ہوئی کہ "اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی بزمِ مشورت اور اسٹینڈنگ کمیٹی بھی قائم ہے" جہاں "اللہ" مشورہ فرمایا کرتے ہیں —— توبہ !

"معلوم ہوتا ہے کہ مامورِ وقت یعنی فنا فی الرسول ظاہری علوم میں مشہور و معروف نہیں ہوتا ......" (صفحہ ۳۶)

یہ "مامورِ وقت" کون ہے؟ اس کا کچھ اتا پتا صدیق دیندار صاحب کے اس دعوے سے مل سکتا ہے :۔

"فقیر نے گاندھی جی اور محمد علی مرحوم سے کہا تھا کہ تم سب میری اطاعت کر لو انشاء اللہ دس سال کے اندر سوراج دلاتا ہوں ...." (صفحہ ۳۷)

یہ نہیں فرمایا کہ تم "میرا ساتھ دو" یا میری اسکیم اور مشورے پر عمل کرو۔ بلکہ اپنی "اطاعت"[۳] کے لئے دعوت دی تھی !

"معلوم ہوتا ہے کہ مامورِ وقت یعنی فنا فی الرسول انسان ظاہری علوم میں مشہور و معروف نہیں ہوتا اور وہ سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر مامور نہیں ہوتا۔ وہ خدا کا مقرر کردہ انسان ہوتا ہے دربار سرکار میں اُس کی عزت نہیں ہوتی۔ وہ ایک پردہ میں رہتا ہے تاکہ اللہ کے کام کے لوگ ہی اُس کے قریب آسکیں۔" (صفحہ ۳۶)

"خدا کا مقرر کردہ انسان" اور "پردہ نشین" بن کر بیٹھ جانے —— یا للعجب ! پھر یہ "فنا فی الشیخ" ۔ "فنا فی الرسول" اور "فنا فی اللہ" کی اصطلاحیں کتنی خطرناک ہیں! کسی رسول اور نبی نے اپنے کو "فنا فی اللہ" نہیں کہا۔ کسی صحابی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں —— "فنا فی الرسول" ہوں! یہ کیا مزاج، افتادِ طبع اور اندازِ فکر ہے، جو ذہنوں کو ابہام، دہریت، الجھنوں اور خطرناک نزاکتوں کی طرف لے جاتا ہے !

اس کتاب میں امام مالک، امام احمد بن حنبل اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ منصور حلاج کا بھی ذکر کیا گیا ہے! حالانکہ امام مالکؒ نے "جبری بیعت" کے خلاف کلمۂ حق بلند فرمایا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے "فتنۂ خلقِ قرآن" کے خلاف جہاد کیا تھا اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مغلیہ حکومت کی غیر [illegible] رسوم و قوانین کو چیلنج کیا تھا —— کیا "انا الحق" بھی اسی قبیل کی کوئی دینی ضرورت، تبلیغی کوشش تھی۔ اور کسی غیر اسلامی رسم و قانون کے مقابلہ میں کلمۂ حق کا اعلان تھا !

---

[۳] ایک بزرگ کے اس دعوے کو بھی یاد کیجئے کہ مجھے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

جو لوگ منصور حلاج کی اتنی عظمت اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہوں اور "انا الحق" کو تصوف و عرفان کا " [illegible] " سمجھتے ہوں، اُن سے اظہار و بیان میں جو بے احتیاطی بھی سرزد ہو جائے، تھوڑی ہے۔

"لم یکن شیئاً مذکوراً" ظاہر کرتا ہے کہ ایک وقت انسان کا ایسا بھی گزرا ہے کہ اس کا بیان انسانی طاقت سے باہر ہے یعنی ذات واجب الوجود احدیت کے مقام پر تھا۔ جب اس ذات مذکور نے اپنی ذات واجب الوجود سے مل کر شہادت میں آنے کا ارادہ کیا، عقلِ کل میں آ کر ٹھہری، عقلِ کل سے عالم ارواح کا روپ لیا۔ پھر وہی ذات عالمِ امثال میں آئی، پھر عالمِ اجسام یا شہادت کا جامہ پہنا، رحمۃ للعٰلمین کی صورت اختیار کی۔" (ص۳۱)

اس قسم کی خیالی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو کر اگر کسی کو سلامتی کی راہ مل جائے تو اسے ایک معجزہ سمجھنا چاہیئے، انسان کی تخلیق یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و بعثت کی ایسی تشریح کتاب اللہ میں، احادیث میں یا صحابہ کے اقوال میں، کہیں ملتی ہے؟ یہ یونان و عجم کی عقلی اور فکری نکتہ آفرینیاں ہیں جن کا اسلام سے جوڑ ملایا جاتا ہے!

"السلام علیک ایہا النبی والسلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصٰلحین"۔ یہ لوگ زندہ ہیں۔ (ص۳۲)

حالانکہ قرآنِ پاک میں بار بار اس حقیقت کو دُہرایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک اور فنا ہونے والی ہے، انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لئے "میت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، صالحین اور اولیاء اللہ کو یہ کہنا کہ "یہ لوگ زندہ ہیں" قرآن کو جھٹلانا نہیں تو اور کیا ہے!

"یہ لوگ زندہ ہیں، یہ جسم کثیف بھی نہیں، یہ جسم لطیف بھی نہیں، ارادہ و عقل بھی نہیں، اطمینان بھی نہیں۔ یہ کل ایک دوسرے کے ماتحت ہیں یہ کسی کے ماتحت نہیں۔ یہ کل ضائع ہونے والے ہیں۔ یہ فنا سے خالی ہیں، خودی کو غائب کر کے مظہر خدا بنے ہیں ......" (ص۳۲)

یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ہیں —— توبہ! نعوذ باللہ من شرور انفسنا!

اس قسم کی باتیں کہنے میں کسی علم و تفکر کی ضرورت نہیں، کسی ذمہ داری کا احساس نہیں —— میں کسی فکر و تامل کے بغیر بداہتہً بلکہ ارتجالاً یہ عبارت لکھ رہا ہوں:-

"میں کیا ہوں، نہ کلام ہوں نہ کلیم، نہ جسم ہوں نہ روح، نہ بساطت ہوں نہ ترکیب، نہ ارادہ ہوں نہ خیال، یہ میرا نام اور لقب (منظور حسین ماہر القادری) در اصل میرے "غیر" کا نام ہے میری "عین" کا نام نہیں ہے "عینیت" اسماء کی قید قبول ہی نہیں کر سکتی۔ میں جب بھی تھا، اب بھی ہوں، اور رہوں گا۔ میرے عالمِ وجود میں خلا ہی خلا ہے خلاء کا نام نہیں۔ اعتبار کیفیت کا ہے نہ کہ کمیت کا نہیں، اسقاطِ اضافات و اعتبارات ہی میری حقیقت کی کُنہ ہے۔"

عجمی افکار کا یہ سلسلہ چلتے دکن سے چلا ہو یا نسی ہی سے، اسلوب و انداز سب کا ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ اسلام فلسفیوں، راہبوں اور کاہنوں کے جس "مکتبۂ فکر و نظر" کو مٹانے کے لئے آیا تھا افسوس ہے کہ مسلمانوں میں وہ فتنے "کشف و وجدان" اور "عرفان و شہود" کے ناموں سے داخل ہو گئے! کوئی خدا کا بندہ ان باتوں پر ٹوکتا ہے تو اُس پر بے علم، بے ذوق، وہابی اور اولیاء اللہ کے دشمن ہونے کی پھبتی چُست کی جاتی ہے، کیا اولیاء اللہ کی محبت اور دوستی کا تقاضا اُسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ کوئی "باطنیت" کی تعلیم میں غرق ہو کر رہ جائے؟

پیشکش

عبدالکریم ثمرؔ

قلبِ سلیم و دیدہ بینا بھی کر قبول
آئینہ ساز سختیٔ خارا بھی کر قبول

مانا کہ خامشیٔ محبت ہے مستجاب
اے بے نیاز عرضِ تمنا بھی کر قبول

بخش گئی ہے مجھ کو کلیمی ترے لئے
اے حسن میرا ذوقِ تماشا بھی کر قبول

وہ شرحِ صدر جس پہ زمانہ کو ناز تھا
اس کی تجلیوں کا تقاضا بھی کر قبول

تو نے حقیقتوں کو فسانہ بنا دیا
لیکن حقیقتوں کا فسانا بھی کر قبول

ساحل کی راحتوں میں کہاں گوہرِ حیات
اے ناخدا تلاطمِ دریا بھی کر قبول

ہے انتظار ہی میں نہاں لذتِ حیات
اے دل نواز وعدۂ فردا بھی کر قبول

ایک نظر؟!

ماہرؔ القادری

عورت پہ یہ تہذیب کے ڈالے ہوئے گھیرے
کرگس کے ہیں جنگل میں ممولوں کے بسیرے

اب فلم کے نغموں سے ابھرتی ہیں شعاعیں
ہوتے تھے کسی وقت نمازوں میں سویرے

خاتونِ حرم کے لئے گھر ہی میں اماں ہے
جس دیس میں ہر سمت ہوں عصمت کے لٹیرے

اِن اہلِ سیاست کے فریبوں میں نہ آنا
سانپوں کو لئے پھرتے ہیں جیبوں میں سپیرے

باتوں سے بھی بدلی ہے کسی قوم کی تقدیر
جگنو کی چمک سے کہیں جاتے ہیں اندھیرے

تہذیبِ فرنگی کے یہ سفاک شکنجے!!
زلفوں کے بھی سائے نہیں ہوتے ہیں گھنیرے

اربابِ حکومت کے نہ وعدوں پہ لگا آس
اے دوست! یہ سائے تو نہ میرے ہیں نہ تیرے

اس دورِ پُر آشوب میں باطل کے مقابل
کچھ کم ہی ہو مگر ڈال دیئے ہم نے بھی ڈیرے

جنتِ ابلیس

شبنم رومانی

تضادِ فکر و نظر کی بہار ہے دُنیا ۔۔۔ کسی کا گیت کسی کی پکار ہے دُنیا
شہیدِ جنبشِ ابروئے دوست کوئی نہیں ۔۔۔ ہلاکِ گردشِ لیل و نہار ہے دُنیا
جو سوچئے تو ہنسی آئے اپنی آنکھوں پر ۔۔۔ جو دیکھئے تو سراپا نگار ہے دُنیا
حقیقتوں کو فسانہ بناتی جاتی ہے ۔۔۔ حقیقتوں کی فسانہ نگار ہے دُنیا
سمجھ سکا نہ زبانِ دل و نظر کوئی ۔۔۔ فریبِ لفظ و بیاں پر نثار ہے دُنیا

دلوں کے نازک و حساس آبگینوں پر
نہ جانے کب سے یونہی سنگ بار ہے دُنیا

ذکی زاکانی

بہارِ رنگ و بُو کچھ بھی نہیں ہے ۔۔۔ یہ سب تیرا کمالِ خوش نگاہی
بھروسہ گر نہیں شانِ کرم پر ۔۔۔ گنہگاری سے بدتر ہے گناہی
کہاں ہیں منزلیں شام و سحر کی ؟ ۔۔۔ یہ کس جانب بڑھے جاتے ہیں راہی؟
کوئی سمجھا نہ رازِ جستجو کو ! ۔۔۔ محبت بن گئی سترِ الٰہی

ہے دُنیا بے خبر شانِ جنوں سے
یہاں ہر دین دینِ خانقاہی

رشید ارشد

بڑھا ہے نام خدا لے کے کاروانِ ادب ۔۔۔ رواں دواں ہیں بصد شان رہروانِ ادب!
نئی اُمنگیں، نئے ولولے جلو میں لئے ۔۔۔ بنا رہے ہیں جواں سال کہکشانِ ادب!

وقار صدیقی

نکہتِ گل تو نہیں ہوں جو کسی محفل میں ۔۔۔ لوگ محسوس کریں میرا پریشان ہونا !
اک اچٹتی سی نظر کا بھی کسی عالم میں ۔۔۔ میں نے دیکھا ہے بہ تدریج رگِ جاں ہونا

رخصت اے عقل کہ اندیشہ صفت ہے تیری
مجھ کو منظور نہیں دشمنِ ایماں ہونا

شعلہ و شبنم

راہی بلند شہری

خواب نہ دیکھو رنگ محل کے　　رنگ محل ہیں اب کوئی پل کے
ساحل ساحل چلنے والے　　دیکھ کبھی موجوں پر چل کے
چوٹ لگی اور دل بھر آیا　　ٹھیس لگی اور ساغر چھلکے
کون اب شمع کے آنسو پونچھے　　خاک ہوئے پروانے جل کے

شاعر فتحپوری

ظاہر ہمہ جلوہ ہے باطن ہمہ تاریکی　　کعبہ ہے نگاہوں میں دل میں ہیں صنم خانے
طوفان کی موجوں سے ٹکرا کے تو بچ نکلا　　ساحل پہ سفینہ کا انجام خدا جانے
رنگین نظر آتے ہیں سب خونِ تمنا سے　　وہ درد کے قصے ہوں یا شوق کے افسانے
کیا طرفہ تماشہ ہے میخانۂ عالم میں　　میخوار تو پیاسے ہیں گردش میں ہیں پیمانے
کعبہ کی زیارت سے کیا فیض تجھے زاہد　　دل میں تو ہزاروں ہیں پوشیدہ صنم خانے
نظریں کبھی پہنچیں اسرارِ حقیقت تک　　دنیا کی زباں پر ہیں افسانے ہی افسانے

یوگیندر پال صابر۔ ایم اے

بھاگا کوئی دنیا سے دنیا پہ مٹا کوئی　　ہر فرض ہزاروں میں کرتا ہے ادا کوئی
ناقدریٔ دنیا کے حالات سناتے ہیں　　ہم آپ کی فطرت کا کرتے ہیں گلہ کوئی

شفقت کاظمی

شبِ فراق میں ہم نے بیادِ جلوۂ دوست
تصورات کے ایوان سجائے ہیں کیا کیا
کچھ اپنے جوشِ محبت میں فرق آ نہ سکا
وہ ترکِ شوق پہ بھی یاد آئے ہیں کیا کیا
کسی کی یاد نہ جب تک شریکِ حال ہوئی
رہِ وفا میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
مری وفا کا نہیں اُن کو اعتبار ابھی
یقین اپنی طرف سے دلائے ہیں کیا کیا
پڑا نہ صبر مری بیکسی کا آخر کار
سرشکِ غم تری آنکھوں میں آئے ہیں کیا کیا

عارف سنبھلی

ایک کی شوخ نگاہ تک ایک سے دل ہے مطمئن
پھول کی بات اور ہے زخم کا کام اور ہے

ناز شاہجہاں پوری

قیودِ رسم کہن توڑ دینا کوئی مشکل تھا
مگر اتنے جواں ہمت نہ تم نکلے نہ ہم نکلے
خوشی نہیں نہ سہی غم تو ہے شریکِ حیات
ذرا سی بات پہ ہم جی بُرا نہیں کرتے

رشید کوثر فاروقی

کبھی غربت میں ایسا وقت بھی پڑتا ہے انساں پر
چمن کیسا، خیالِ آشیاں بھی بار ہوتا ہے

روح انتخاب

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوا
ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ
هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۚ (الانعام)
مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے۔ بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے!

اس بات کے وہ (مشرکین) خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اُگاتا ہے۔ نیز ان جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا تصور یہ تھا کہ اُن پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنّات اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سلف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو اُن پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصّے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا۔ اس شکریہ میں کہ اُس نے یہ کھیت اور جانور انھیں بخشے اور دوسرا حصّہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا۔ تاکہ اُن کی مہربانیاں اُن کی شاملِ حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کئے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں۔ ان میں یہ دوسروں کی نذر و نیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے کیا ہے، دوسروں کی یہ مداخلت اور اُن کے توسط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریہ کے استحقاق میں اُنھیں اُس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ شریک کرتے ہو!

ان توہمات کی اصل جڑ کیا تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لئے نکالتے تھے۔ وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صرف کیا جاتا تھا۔ اور جو حصہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لئے نکالتے تھے وہ یا تو براہ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لئے ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ خدا کے حصہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر "خدا کے پیاروں" کے حصہ میں کمی نہ آنی چاہیئے!

(تفہیم القرآن — ابوالاعلیٰ مودودی)

عارف سہارنی

موڑ

نوجوانی کے بعد جوانی نے جب اپنا کاروبار سنبھالا تو اُسے اپنے اردگرد بہت سے خلا نظر آنے لگے۔ اگلی شورشوں میں کچھ سنجیدگی بلکہ تھوڑا سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ وہ جو اب تک رنگ و بو کا دلدادہ تھا۔ اب پھولوں کو دیکھ کر محسوس کرتا کہ یہ رنگتیں ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اُن کے پیچھے کوئی چیز چھپی ہوئی ہے۔ چڑیوں کی چہکار کتنی رسیلی ہے مگر ان کے اندر بھی ایک سوز نہاں ہے۔ ایک بے نام سوز! اور یہ بلبلیں صرف تفریح کی خاطر چہکتی نہیں پھرتیں، یہ کسی باطنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہیں!

وہ رات کے سناٹے میں دُور سے ندی کی آواز سُن کر کسی سوچ میں ڈوب جاتا، اور اُس آواز کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتا۔ وہ اب بھی سیر شام پنگھٹ کی طرف نکل جاتا، سُندر پنہاریاں سروں پر گاگریں رکھے ہوئے اب بھی اس سے دوچار ہوتیں مگر اس کے دل میں وہ پہلی سی بے چینی پیدا نہ ہوتی۔ شاید یہ دلِ وحشی اپنے وحشی پن کو بھول چکا تھا۔ اب اُسے اُن گلابی آنکھوں میں پسِ پردہ کوئی حسرت جھلکتی نظر آتی۔ اور حسین و شاداب رخساروں کی تہ میں ایک موجِ اضطراب دکھائی دیتی — اور بہت جلد اُسے محسوس ہونے لگتا کہ ہر چیز کے ظاہری روپ میں کوئی اور روپ مستور ہے۔ اس زندگی کی تہ میں کوئی اور زندگی پائی جاتی ہے — اس کائنات کے اندر کوئی دوسری کائنات چھپی ہوئی ہے — کوئی اور منزل — کوئی اور مقام!

اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ جیسے کسی تھکے ہارے مسافر کا دل منزل کا نام سُن کر اُوپر نیچے ہونے لگے۔ ایک عالمِ جستجو اور جذبۂ تلاش و منزل رسی!

اُس پر یہ بھید کھلتا سا جارہا تھا کہ یہ دنیا — نشانِ راہ ہے — مگر — منزل نہیں ہے! اُس کے کان کبھی آپ ہی آپ بجنے لگتے جیسے وہ آوازِ جرس کو سُن رہا ہے! چاندنی راتوں میں اُس کی آنکھ کھل جاتی، اور کوئی احساس جاگ اُٹھتا۔ وہ متجسس نگاہوں سے اُفق کے آس پاس گھورنے لگتا۔ پھر اُسے چاند کی کرنوں سے درد سا چھنتا نظر آتا۔ ہوائیں اُسے درد بھرے گیت سُناتیں۔ اور ایک نئی منزل کی طرف قافلہ مڑتا ہوا سا — وحشت و انس کا ملا جُلا احساس! ایک دوراہہ جہاں سے یقین و توہم کے راستے پھٹتے تھے!

اور کبھی راتوں کی تنہائی میں اُسے رُخسانہ کا حسین چہرہ نظر آتا۔ رُخسانہ — اُس کے نوجوانی کے خوابوں کی ملکہ! سر تا بقدم حُسن و رعنائی!

وہ حسن رنگیں، وہ قد موزوں عالم ہی عالم، منظر ہی منظر

اور ع

عارض ہیں وہ نازک کہ پسینہ سے گرانبار

مگر اس احساس کے جاگتے ہی اُس کے چہروں سے کچھ خشونت سی جھلکنے لگتی — وہ سوچنے لگتا — مجھے جانا کہاں تھا!

○

نکل کہاں گیا - ہائے ! وہ نادان جو سانپ کے پھن کو پھول سمجھ کر چوم لے !

چاندنی راتوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے فلک بوس عمارتیں ہوتیں - یہ شبستان ، یہ زمین کی جنتیں - کاش ! میرے پاس بھی دولت کے ڈھیر ہوتے - کبھی وہ سوچتا کہ اگر کہیں سے دو چار کروڑ روپیہ اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ کیا کیا کرے —— کوٹھیاں اور بنگلے —— نئی کاریں —— کئی اسکولوں اور یتیم خانوں کے سنگِ بنیاد اُس کے ہاتھوں سے نصب ہوں - جن پر اُس کا نام کندہ ہو !

کبھی وہ اپنے خیال کی دُنیا میں "جہانگیر" ہوتا - اُس کے دروازہ پر زنجیر عدل لٹکی ہوتی - کبھی وہ "ڈاکٹر" ہوتا - ہر وقت مریضوں کا ہجوم - آمدنی کی کوئی حد و نہایت نہیں - سچ مچ روپے کی بارش !

خیالوں کے محل - ہوا کے قلعے - خیالوں کے چمن - یہی اُس کی دُنیا تھے - مگر ان جھوٹی تسلیوں سے وہ مطمئن نہ تھا - اپنے اندر ایک شدید اضطراب اور اُکساہٹ سی محسوس کرتا تھا !

ایک دن وہ گھر سے چل کر درختوں کے جھنڈ میں پہنچا - وہاں ندی بہ رہی تھی - اُس نے نیلی چٹان پر بیٹھ کر ندی میں پیر لٹکا دیئے - موجیں اُس کے تلووں کو سہلاتے ہوئے گزر رہی تھیں - بڑا دلکش سماں تھا مگر وہ اب بھی بے چین تھا - اُس کی نگاہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں - دریا کی کوئی موج پارس پتھر اُس کے قدموں کے پاس لاکر ڈال دے کہ وہ اس کے اثر سے سینکڑوں من سونے کا مالک بن جائے - مگر ..... دولت ..... بہت ناپائدار ..... "کمالِ ہنر سے آدمی بڑا بنتا ہے - دولت کو ہر آن زوال کا خطرہ - مگر "کمال" کو کوئی خطرہ نہیں - ایک ابدی حقیقت !

ہوائیں ایک ایکی تیز ہوگئیں - ندی کی پیشانی پر عتاب آمیز سلوٹیں اُبھر آئیں - طوفان تند و تیز ہوتا جا رہا تھا - اُس نے چٹان سے اُٹھنے کے لئے جنبش کی ہی تھی کہ اُس کے [illegible] میں ایک دردناک آواز آئی :-

"میرے اللہ ! مجھے بچا ...."

وہ چونک پڑا - اُٹھا اور چٹان کے قریب جہاں سے آواز آرہی تھی ، آن کی آن میں پہنچ گیا -

اُس نے دیکھا ، ایک بوڑھا آدمی ہے ، ٹانگ سے خون بہ رہا ہے اور اس کی مٹھیاں شدتِ درد سے بھنچی ہوئی ہیں -

"بابا ! تم کون ہو ؟" اس نے بوڑھے کو سہارا دیتے ہوئے اُس سے پوچھا -

"میرے اللہ ! تو کتنا کارساز ہے کہ اس طوفانی اور سنسان رات میں میری مدد کر سکتا ہے - اور ہاں میرے بیٹے تم کتنے اچھے ہو" بوڑھے نے جواب دیا -

اُس نے اپنے کرتہ کے دامن کو زور سے جھٹکا دے کر چاک کیا اور اُس سے ایک دھجی لے کر بوڑھے کی ٹانگ پر باندھ دی -

"بابا ! تم یہاں کہاں ؟" اُس نے دریافت کیا -

"میرے بیٹے ! میں بستی کے باہر ریوڑ چرا رہا تھا - کہ طوفان آگیا - اگر میں چاہتا تو بھیڑوں کو چھوڑ کر بستی کی طرف بھاگ جاتا - مگر میری غیرت نے اسے گوارا نہ کیا کہ جس کا نمک کھاتا ہوں اُس کی امانت (بھیڑوں کے گلہ) سے بے وفائی کروں - میرے بیٹے ! میں کہاں ہوں - ہم کہاں ہیں - بستی کتنی دُور ہے - نہ جانے میری ننھی غزالہ کس حال میں ہوگی - میری پیاری بچی ، میری زندگی کا سہارا - اپنے بوڑھے باپ کو طوفانی رات میں گم کر کے کیا کیا سوچ رہی ہوگی - نہ جانے سحر

ہونے تک ...... وہ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے !

بوڑھا چلنے کے قابل نہ تھا - راستہ بھی ناہموار تھا - بڑھاپا ، ٹانگ کا تناؤ گھاؤ - پُرشور ہوائیں - ! اُس نے بوڑھے کو کاندھے پر اُٹھا لیا - اور بستی کی طرف چل پڑا -

درختوں کے کنج میں پگ ڈنڈیوں سے گزر کر کھیتوں میں پہنچا - وہاں سے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کی دیوار کے نیچے بوڑھے کی جھونپڑی تھی - اُس نے بوڑھے کو ایک ٹوٹی سی کھاٹ پر لٹا دیا - غزالہ اپنے باپ سے چمٹ گئی اور بوڑھے نے اُسے گلے لگا لیا ــــ مسکراہٹ اور آنسو ملے جُلے !

صبح تباشیر بکھیرتی ہوتی نمودار ہوئی - اور مسجد سے "اللہ اکبر" کی صدا آئی - وہ مسجد کی طرف بے اختیار جا رہا تھا - زندگی میں پہلی بار اُس کے دل کو سکون حاصل ہوا - "اللہ اکبر" ہاں ! بیشک اللہ ہی بڑا ہے - اُس کے لب ہلنے لگے !

ہماری نظر میں

زرِگل از:- کوثر نیازی۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

جناب کوثر نیازی اقامتِ دین کی تحریک میں اُس وقت سے شامل ہیں جبکہ اُن کی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں۔ یوں سمجھئے خیر و تقویٰ اُن کو گھٹی میں پلائے گئے ہیں۔ پھر دوسری طرف انہوں نے مزاج شاعرانہ پایا ہے۔ نوجوانی کی منزل سے وہ ایک ہتھیلی پر "جامِ شریعت" اور دوسری ہتھیلی پر "سندانِ عشق" لئے ہوئے گزرے اور کامیاب گزرے ؎

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

کوثر صاحب کا چہرہ مہرہ اور اُن کا ایک ایک انداز بتاتا ہے کہ ہوسناکیوں سے اُن کا عملاً سابقہ نہیں پڑا۔ اس لئے اُن کے کلام میں اُس چٹخارے کی تلاش فضول ہے، جو بے اعتدالیوں، ہوسناکیوں اور جوانی کی لغزشوں کے سہارے پروان چڑھتا ہے اور جس سے بڑے بڑے شاعروں کے دامن آلودہ ہیں!

کوثر کی "محبت" میں پاکیزگی اور وقار ہے، اُس میں تاک جھانک، ہوس کی دراز دستیاں اور نفس کی چوریاں نہیں۔ اس چیز نے اُن کی غزل کو شوخ سے زیادہ معصوم بنا دیا ہے ؎

کوثر شبیہہِ یار ہے اشکوں کے درمیاں
یا چاند آ گیا ہے ستاروں کی گود میں

"غمِ جاناں" کس شاعر کا موزوں نہیں رہا؟ مگر کوثر کے اس شعر کی "بے پناہی" بھی تو دیکھئے ؎

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں؟
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

قارئین کے وجدان کی تواضع کے لئے۔ کچھ اور ؎

چھیڑے سناؤں تو آنسو ذرا تھمیں ہمدم — وہ روئیدادِ چمن ہے قفس کی بات نہیں
ملی جو مفت کی زاہد نے بھی ذرا چکھ لی — کچھ اس میں ورنہ ہوا و ہوس کی بات نہیں

روشنی سے لئے یہ گُل کھلائے ہیں — ہر طرف ظلمتوں کے سائے ہیں

تھوڑی ہی کسر بس باقی ہے دنیا کے جہنم بننے میں — ماحول گواہی دیتا ہے حالات اشارا کرتے ہیں

وہ راہرو ہوں کہ خود اُڑ کے منزلِ مقصود مرے حضور بہ شکلِ غبار آئی ہے

مجھ کو غم ہے کہ انھیں دیکھنے والے ہیں بہت اُن کو شکوہ ہے یہاں ذوقِ نظر عام نہیں

دلِ ناشاد میں یوں آج تری یاد آئی جیسے جگنو کوئی ظلمت میں چمک جاتا ہے

ہائے! یہ بیچارگی خود باغباں کا حکم ہے باغ میں رہنا ہے تو بے بال و پر ہو جائیے

جب جوانی تھی اُمنگوں پہ بڑھاپا آگیا اب بڑھاپا ہے تو ہر خواہش جواں ہونے لگی
اللہ اللہ! تیرے دیوانوں کی راحت کا خیال ریگِ صحرا بھی حریر و پرنیاں ہونے لگی

اک ذرا دیکھ کے لے جرأتِ ایماں کہ یہاں قابلِ عفو ہے ہر جرم صداقت کے سوا
اور موضوعِ سخن بھی تو ہیں اے فن کارو! زلف و رخسار کی پامال حکایت کے سوا

ہزار چوٹ لگے لاکھ طنز ہو کوثر! جو اہلِ عشق ہیں وہ دل کشادہ رکھتے ہیں

رُکاوٹیں تو رہِ شوق میں ضروری ہیں قدم بڑھاؤ رفیقو! سفر کی بات کرو

زہے نصیبِ محبت! قبول ہو جائیں ترے حضور مرے آنسوؤں کے نذرانے
کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثر اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے

تمہارے ساتھ ہی یہ حادثہ نہیں گزرا سنو کہ دوست ہمارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

یہ بات کیا ہے کہ فصلِ بہار سے پہلے مجھے چمن پہ گمانِ قفس کبھی ہوتا ہے

کیا ارادے ہیں قافلے والو! دُور منزل ہے رات کالی ہے

کوثر نیازی کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبی "مقصدیت" ہے۔ یہ "مقصدیت" سپاٹ اور ہموار نہیں ہے اس میں ولولہ ہے، جوش ہے، مد و جزر ہے اور باطل کو مٹانے کا عزم ہے!
اپنی نئی نویلی دُلہن کو قید خانہ سے شاعر یہ پیام دیتا ہے ؎

ہنسی خوشی میں ہر اک غم کی چوٹ کھاؤں گا — ترے فراق کے ہوتے بھی مسکراؤں گا
وفا و عشق کی قدریں نئی بناؤں گا — خدا کی راہ میں تجھ کو بھی بھول جاؤں گا

اس "واردات" اور "آپ بیتی" میں کوثر نیازی کا حریف کوئی شاعر نہیں - ایثار و صداقت کا یہ سنگِ میل ہر شعر و ادب کی شاہراہ میں نصب کر دیا گیا ہے !

"نذر" - "اے سیدؐ لولاک" - "مقبرے" بھی اچھی نظمیں ہیں۔ "نیا آئین بننے پر" کوثر نے کس جرأت کے ساتھ پوری قوم کے ی کی ترجمانی کی ہے ؎

صرف تبدیلیِ آئین نہیں ہے کافی
ابھی اس باغ کے مالی بھی بدلنے ہوں گے

دوسرا رُخ :-

زندانیو! گھبراؤ نہ اس جور و جفا سے — سر جبر کا اکڑا ہوا خم ہو کے رہے گا (ص۲۰)

مصرعہ ثانی میں لفظوں کے دروبست نے خاصہ "کھردراپن" پیدا کر دیا -

سینوں میں دیکھ اُن کے کوئی بد دعا نہ ہو — اے دہر! غم زدوں سے تو بے جا خفا نہ ہو (ص۲۸)

پورا شعر بے مزہ ہے۔ "اے دہر!" کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے !

سرکارِ دوؐ عالم کو کوئی جا کے بتائے — سب ہم نے بھلائے جو سبق تُو نے سکھائے (ص۳۲)

"تُو نے" کی جگہ "تم نے" کا محل تھا۔ اس قسم کے بھرتی کے شعر کوثر صاحب کو چھانٹ دینے چاہئیں تھے۔

کوثر در و دیوار سے کرتا ہوں میں باتیں — ڈستے ہیں مجھے جب بھی شبِ ہجر کے سائے (ص۳۵)

"ڈسنے" کی تکلیف کا صرف یہ اثر کہ شاعر در و دیوار سے بس باتیں کرتا رہتا ہے۔ خوب ؟؟؟

کشمکش ایک زمانے سے کئے جاتے ہیں — تیرے کچھ بے سروسامان رسولِ عربیؐ (ص۷۹)

"زمانے سے کشمکش کئے جاتے ہیں"۔ روزمرہ اور محاورہ کے اعتبار سے محلِ غور ہے۔

ابنِ آدم کو ڈسیں ہر سو زر و سیم کے ناگ — اور میں سکّوں کی جھنکاریں لکھ پایا ہی رہوں (ص۸۹)

"ہر سو" کا "واؤ" کس بُری طرح دب رہا ہے! توبہ!

جب میں گزرا ہوں کسی شہر کے چوراہے سے — مجھ کو محسوس مرے دل میں گھٹن ہوتی ہے (ص۹۱)

"مرے دل" نہیں "اپنے دل" کہنا چاہیئے تھا -

اے ابرِ مشکلات! محیطِ حیات ہو — دل میں ہے پھر سے چند سہاروں کی آرزو (ص۱۳۵)

آورد ہی آورد - اور تکلف ہی تکلف !

میں جب یہ کہتا ہوں دُنیا تہس نہس ہو جائے — تو اس میں اہلِ جہاں پر ترس بھی ہوتا ہے (ص۱۵۱)

"زرِ گل" میں اور ایسا بے رنگ شعر۔ شاعر کے ذوقِ انتخاب سے فریاد !

"زرِ گل" پر مولانا امین احسن اصلاحی کے تعارف نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے - اتنے جاندار و اثر انگیز "تعارف" "پیش لفظ" بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مکتبۂ تعمیرِ انسانیت نے کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی ہے اور سرورق تو اتنا

حسین ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے!" زندگی" ایک جواں سال شاعر کے واردات وجذبات کا دلکش مرقع ہے!

شرح لوائح جامی | از:۔ سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے۔ لیکچرار شعبۂ فارسی اُردو کالج کراچی۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات (قیمت درج نہیں) کتاب مصنف سے مل سکتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نورالدین جامی رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور کتاب " لوائح جامی " کا سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے معانی اور غوامض کے اعتبار سے بہت ادق ہے۔ ہر فارسی جاننے والا اس کے معانی کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ جناب فاضل فارسی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ تصوف کا خاصہ ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ اس لئے " لوائح جامی " کے ترجمہ میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

کتاب کے شروع کے تیس صفحات میں مولانا جامی علیہ الرحمتہ کے سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر اجمالی تبصرہ ہے ——" لوائح جامی" کا جو نسخہ نول کشور پریس (لکھنؤ) میں چھپا ہے۔ فاضل شارح نے اُس کی کتابت کی غلطیوں کو درست کیا ہے۔ اور اس کتاب میں اُن کی فہرست دے دی ہے۔ یہ کام خود اپنی جگہ ایک مفید کارنامہ ہے!

ترجمہ کا ایک نمونہ:۔

اے طبع ترا گرفتہ وسواس سخن ‌‌ ‌ میدار اگر اہل دانشی پاس سخن

مکشائے زباں بکشف اسرار وجود ‌ ‌ ‌ کیں دُر نشود سفتہ با لماس سخن

(اے وہ کہ تیری طبیعت کو شعر وسخن کا سودا ہو گیا ہے۔ اگر عقلمندوں میں ہے تو سخن کا پاس رکھنا چاہیئے (وہ اس طرح کہ سخن کے ذریعہ اسرار وحقائق بیان کرنے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ اس سے اسرار وحقائق بیان نہ ہو سکیں گے اور اس طرح عزتِ سخن جاتی رہے گی۔ لہٰذا سخن سے ایسا کام نہ لینا چاہیئے۔ جو اُس کے بس کا نہ ہو۔

(وجود کے اسرار بیان کرنے میں زبان نہ کھول۔ کیونکہ یہ موتی سخن سے نہیں پروئے جا سکتے۔ (سخن کے ذریعہ حقائق کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!)

کتاب کے آخر میں خاص الفاظ کے معنی اور تصوف کی عام اصطلاحات کی شرح درج ہے جو بڑے کام کی چیز ہے۔ ایک نمونہ:

حال:۔ حق تعالیٰ کی جانب سے واردات سالک کے دل پر وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً قبض وبسط، حزن وطرب، حقیقت و اُنس یا مستی وبے خودی وغیرہ " حال" کہلاتی ہیں اور حال اچانک وارد ہوتا ہے اور بہت جلد کسی غفلت کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے۔

مقام:۔ جب حال دائمی ہو کر سالک کا ملکۂ راسخ بن جاتا ہے تو مقام کہلاتا ہے۔ حال سے سابقہ اصحابِ تلوین کو رہتا ہے اور مقام سے اصحابِ تمکین کو! اس لئے حال سے مقام کا مرتبہ بلند ہے!

فاضل شارح نے " انتساب" کے آخر میں یہ شعر لکھا ہے ؎

ہم نے جامی تھی اس سے قدر سلف

اُن پہ ایمان لائے گا اب کون

شعر بہت پھیکا ہے۔ کوئی پُر جوش اور ولولہ انگیز شعر فارسی سے لیا جا سکتا تھا!

" اُس وقت مولانا کی عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولانا کے والد اُن (مولانا سعدالدین کاشغری)

کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا کو بھی ساتھ لے گئے۔ خواجہ صاحب نے ان کو التفاتِ خاص سے نوازا اور چلتے وقت ایک سیر مصری عطا کی۔ گویا مذاقِ تصوف کی تخم ریزی کی گئی۔" (ص۴۰)

"گویا مذاقِ تصوف گھٹی میں پلایا گیا" ہوتا تو عبارت کتنی برجستہ ہو جاتی!

"مگر تیری ذات وجودِ صرف اور ہستیٔ بحت ہے۔" (ص۵۲)

"وجودِ محض" شاید "صرف" کے مقابلہ میں ذات کی شانِ تجرد و تفرد کی زیادہ بہتر ترجمانی کرتا ہے!

"الفقر اذا تم ہو اللہ این است۔" (ص۴۸)

جس رباعی کا آخری مصرعہ ہے، یہ رباعی حضرت سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منسوب کی جاتی ہے۔ لائق شارح کو اس سے بحث ضرور کرنی تھی کہ اس رباعی کا کس سے انتساب درست ہے اور اس کے وجوہ کیا ہیں؟

ای عشق کہ ہست جزو لاینفک ما　　حاشا کہ بود بعقل مدرک ما (ص۴۲)

اس شعر کا ترجمہ ہونے سے رہ گیا۔

مولانا جامی قدس سرہٗ پر "وحدت الوجود" کا غلبہ ہے۔ لہٰذا "لوائح جامی" کے بعض مقامات خاصے محلِ غور ہیں۔ مثلاً:۔

آنرا کہ فنا شیوہ و فقر آئین است　　نے کشف و یقین نہ معرفت نے دین است

رفت او زمیان ہمیں خدا ماند خدا　　الفقر اذا تم ہو اللہ این است

کی معنویت سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نری شاعرانہ تو جیہ نکتہ ہے!

لائحہ شانزدہم: "ذات من حیث از ہمہ اسماء و صفات معرّیٰ ست و از جمیع نسب و اضافات مبرا۔۔۔۔"

یہ "معطلین" کے عقائد ہیں۔ جو اپنے خود ساختہ نظریہ "تعطیل" کے زد میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ "اللہ" کو ہم "احد و واحد" بھی نہیں کہہ سکتے کہ "ایک" کہہ کر ہم ذاتِ بحت کو مقید کرتے ہیں۔ مگر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ خود اپنے اسمائے صفات بیان فرماتا ہے!

فقیر:۔ بعض کے نزدیک وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور بعض کے نزدیک اللہ کا بھی محتاج نہیں رہتا کیونکہ احتیاج صفت موجود ہے۔ حالانکہ فقیر بحرِ نیستی میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور اپنی ہستی سے گزر جاتا ہے۔ جب ہستی ہی نہ رہی تو احتیاج کیسی۔" (ص۱۰۹)

پروفیسر سید عبدالرشید صاحب فاضل سے صوفیا کی اس "تعریفِ فقیر" پر ہم اختلافی نوٹ کی توقع رکھتے تھے۔ بندہ ہر حال بندہ رہتا ہے۔ چاہے وہ عرش سے بھی اونچا ہو جائے اور "فقر" بندہ کی وہ صفت ہے جو اس سے کسی حال میں جدا نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام مضامین لطائف اور نکتے جو عبد و معبود کے فرق کو مٹاتے ہیں یا شبہ میں ڈالتے ہیں۔ یکسر باطل ہیں۔ اس معاملہ میں کسی بڑے سے بڑے صوفی کی بھی بات نہیں مانی جا سکتی!

ہماری کتاب (قاعدہ تسہیل) | مرتبہ۔ افضل حسین ایم اے، ایل ٹی۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جماعتِ اسلامی　رامپور (بھارت)

بچوں کیلئے یہ قاعدہ جدید اسلوب پر مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی فکر کی اس درجہ فراوانی ہے کہ ابجد کا پہلا حرف "اللہ" سے شروع ہوتا ہے۔ حرفوں سے الفاظ اور الفاظ سے جملے بڑے سائنٹیفک انداز میں بنائے ہیں۔ جن سے بچوں کی استعداد میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے!

ہادیٔ اعظمؐ

(۱) ہادیٔ اعظمؐ (حصہ اول) از:- ابوخالد ایم اے۔ ضخامت ۸۴ صفحات۔ قیمت پانچ آنہ۔
(۲) ہادیٔ اعظمؐ (حصہ دوم) از:- ابوخالد ایم اے۔ ضخامت ۹۵ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (بھارت)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس لائف انتہائی آسان، عام فہم اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں پیدائش سے لیکر ہجرت تک کے حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ہجرت سے لے کر حجۃ الوداع تک کے واقعات اور حضورؐ کے اقوال و عادات کا ذکر ہے۔ دونوں حصے اس قابل ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی گھرانا ان سے خالی نہ رہے۔ اسلوبِ نگارش سادہ و سلیس ہی نہیں پُرجوش بھی ہے "فتح مکہ" کی کیفیت جس انداز میں پیش کی ہے اُسے پڑھ کر ایمان تازہ ہوجاتا ہے!

اسلامی دستورِ مملکت

مرتبہ:- مولانا عرفان رشدی (مجلس علمائے پاکستان) ضخامت ۵۶ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- سیکرٹری مجلس العلماء پاکستان۔ ۲۵ دیو سماج روڈ۔ لاہور

اس کتاب کے پہلے حصہ کے اہم عنوانات یہ ہیں:-
اسلام کا نظامِ حکمرانی ——— بنیادی اصولِ سیاست ——— امورِ شرعیہ ——— جدوجہد آزادیٔ ہند ——— امورِ شرعیہ ——— مطالبۂ پاکستان ———

دوسرا حصہ، امورِ شریعت کے شعبوں اور طریقِ نفاذ پر مشتمل ہے ——— کوئی شک نہیں پوری کتاب دینی فکر اور اخلاص و دردمندی سے لبریز ہے۔ پاکستان کے دستور کو خالص اسلامی دستور ہی ہونا چاہیئے۔ ایک زمانہ انشاء اللہ آئے گا کہ پاکستان کے دستور میں اسلامی اور جمہوری نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں رہ گئی ہیں، وہ دُور کردی جائیں گی۔

اس کتاب میں ایک خط چودھری محمد علی صاحب وزیرِ اعظم پاکستان کے نام ہے۔ جہاں تک دینی فکر و رجحان کا تعلق ہے دوسرے اربابِ اقتدار کے معاملہ میں چودھری محمد علی صاحب پھر غنیمت ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات شاید معلوم ہے کہ چودھری صاحب موصوف اگر چاہتے تو پاکستان کا دستور دینی اور جمہوری اعتبار سے اس قدر تہی مایہ نہ ہوتا جتنا اب ہے!

امراضِ چشم

"امراضِ چشم معہ ضروری تشریح اور مجربات چشم" از:- ڈاکٹر حکیم محمد فاروق۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔
قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ تعمیر انسانیت، موچی دروازہ لاہور۔

اس کتاب میں امراضِ چشم سے بحث کی گئی ہے۔ ان چند عنوانات سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جاسکتا ہے:-
آنکھ کی حفاظت کے اصول ——— اعصابِ چشم ——— شرائین و عضلاتِ چشم ——— طبقاتِ چشم ——— امراض اور اُن کا علاج ——— عوارضِ چشم اور مجرباتِ چشم ......!
آنکھ کے امراض کی تشریح کے ساتھ اُن کے اسباب بھی بتائے ہیں اور طریقِ علاج بھی۔ کتاب کے آخری حصہ میں آنکھ کی دواؤں کی تفصیل درج ہے۔ ایک مثال:-

---

[illegible] (ص ۱۰) "بڑبڑاتے ہوئے اونٹ" اونٹ کی آواز کو اردو میں "بلبلانا" کہتے ہیں۔ (ص ۱۷) "حامی نہ بھری" ڈپٹی نذیر احمد [illegible] کی کتابوں میں "ہامی" لکھا ہے۔

کحل نوشادر:- پھٹکری بریان- نوشادر سفید، ہموزن سرمہ بنالیں اور رات کو سوتے وقت دو سلائی لگائیں شب کوری
ہ مفید ہے۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید ہے اور زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

ت دین کی ضرورت

از:- مولوی شیداقادری- ضخامت ۲۴ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر انسانیت- ۵۰۲ گوجر گلی- موچی دروازہ- لاہور۔

اس کتاب میں مسلمانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے- کہ ہمارا مذہبی طبقہ تک اقامتِ دین کے تقاضوں سے کس قدر
ر ہے اور اسی بے خبری اور بے نیازی کا یہ سبب ہے کہ نمازوں، روزوں اور اذانوں اور تکبیروں کے باوجود اللہ کا دین غالب
ہونے پاتا- یہ کتابچہ اپنے موضوع پر خاصہ اثر انگیز ہے!

ع الوتین من لبشیر الدین

از:- مولانا عنایت اللہ اثری وزیرآبادی- ضخامت سولہ۱۶ صفحات- (بڑا سائز) قیمت صرف دو آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مولوی عبدالرحمٰن صاحب ناظم انجمن اہلِ حدیث، سرکلر روڈ، گجرات۔

اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریروں سے پندرہ سوالات قائم کئے گئے ہیں- اور اُن کا جواب میاں محمود احمد سے
ب کیا ہے؟ ان سوالات سے مرزا غلام احمد قادیانی کے تضاد، غلط بیانیوں اور جھوٹی پیش گوئیوں کی پول کھلتی ہے کہ اس جھوٹے
نے کیسی کیسی غلط باتیں کہی ہیں- (لعنۃ اللہ علیہ وعلی ذریاتہ)

لے نبیؐ کے صحابہؓ

از:- اعجاز الحق قدوسی- ضخامت ۱۰۷ صفحات- قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ فلاحِ انسانیت- آرام باغ روڈ- کراچی۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے بڑے دل نشین، عام فہم اور شگفتہ انداز میں صحابہ کرامؓ کے اعمال و وظائف- مثلاً عبادات،
لاق، سخاوت، بہادری، انصاف، علم، معاشرت .... کو جمع کیا ہے- کتاب کی ایک ایک سطر حرزِ جان بنانے کی
حق ہے- ایک ایک صفحہ پر اخلاق و پاکیزگی کے موتی بکھرے ہوئے ہیں- مسلمان گھرانوں میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ
عت ہونی چاہیئے کہ جب تک ہماری سوسائٹی میں صحابہ کرامؓ کے معاشرے کی جھلک پیدا نہ ہوگی ملت کے مقدر کا ستارہ
دش ہی میں رہے گا! فاضل مؤلف کی یہ کوشش کتنی بامقصد ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

انوس

از:- شفیق جون پوری- ضخامت ۱۸۰ صفحات- قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- دفتر بزم و اخبار نئی دنیا جون پور (بھارت)

جناب شفیق جون پوری کے کلام کا تازہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے- جس میں غزلوں کے ساتھ نظمیں، رباعیاں اور قطعات
ی شامل ہیں- کتاب کے شروع کے چالیس صفحوں پر خود شاعر کے قلم کا لکھا ہوا مقدمہ پھیلا ہوا ہے- فنی اعتبار سے یہ
مقدمہ" خاصہ وزنی ہے اس سے شاعر کے ادبی اور قومی و سیاسی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

شفیق صاحب نے "فانوس" کو اپنے جواں بخت اور جواں سال بیٹے صلاح الدین مرحوم سے منتسب کیا ہے- جوان اور
ہونہار بیٹے کی موت نے شفیق کی دُنیا ویران کر دی مگر اس صدمہ نے اُن کے دل میں کتنا سوز اور گداز پیدا کر دیا جس کی جھلک
"فانوس" میں جگہ جگہ نظر آتی ہے!

جنابِ شفیق کا یہ مجموعہ کلام اُن کی قادر الکلامی کی بولتی ہوئی شہادت ہے- وہ نازک سے نازک خیال کی

ترجمانی کرتے ہیں۔ مگر شعر میں اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ زبان کی صحت کا بھی وہ خیال رکھتے ہیں اور الفاظ کا ٹھیک طرح سے برتنا بھی اُن کو آتا ہے۔ اُن کی شاعری قدیم و جدید شاعری کا برزخ ہے۔ شفیق کی غزلوں میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ قصیدہ کا ساشکوہ بھی ملتا ہے۔ حُسن و محبت کی شاعر نے ترجمانی کی ہے۔ مگر ۔ ؏

دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے!

کی نچی سطح تک شاعر نہیں اُتر سکا۔ ان چند منتخب شعروں کو پڑھیئے اور لطف اُٹھائیے:۔

چمن میں تازگی پاتے ہیں گل ہائے خزاں دیدہ خوشا تیری ہوائے نازِ لے دامانِ جنبیدہ

نہ صراحی نہ سبو اور نہ ساغر دیتا رند خطرے میں ہے ساقی! مجھے خنجر دینا

تو نے اے پستی ہمت مجھے برباد کیا راہ کی دھوپ سے گھبرا کے وطن یاد کیا

ساغر و مینا پہ پھر رونق نہ آئی میرے بعد میرے ساقی نے بہت محفل سجائی میرے بعد

بے گناہی خود لیا کرتی ہے اپنا انتقام آج تک دُکھتی ہے قاتل کی کلائی میرے بعد

کس نے کہا ہمارے گل و یاسمن نہیں کہہ دو کہ ہم نہیں تو بہارِ چمن نہیں

تری چشمِ عنایت کے بہانے کا تو کیا کہنا کئے دیتی ہے دیوانہ نگاہِ بے کرم مجھ کو
گئے وہ دن کہ جب شبنم کے قطروں پر قناعت تھی کہ اب اے ذوقِ سیرابی سمندر بھی ہے کم مجھ کو

زہے! وہ رات کہ یادِ حبیب آئی ہو دراز اور بھی عمرِ شبِ جدائی ہو
بچائے کون اسے لے ہوئے دامنِ دوست کہ جس چراغ کو تو خود بجھانے آئی ہو

بڑی قیمت پہ بک جاتے ہیں چند آنسو ندامت کے جمالِ بیگناہی بن کے چمکا جرمِ بخشیدہ

نہ چھیڑ اے دوست! اب مجھ کو اسی مشکل میں رہنے دے نگاہ و دل کا افسانہ نگاہ و دل میں رہنے دے

مسیحا و خضر سے پوچھئے اُس وقت کی قیمت مجاہد جس گھڑی خیمے میں زخموں سے نڈھال آئے

بہار تجھ کو بھی یارانِ صبح پیارے ہیں — کہ یاد آئے نہ آوارگانِ شام کبھی

ہمیں زمانہ کے رخ پہ چلنا کسی طرح بھی نہیں گوارا — ذرا سنبھل کر قدم اٹھائے تو آدمی خود زمانہ گر ہے

ہزار عفو کے قابل مری خطا نہ سہی — جب اُن کے لب پہ ہنسی آگئی تو کیا غم ہے

درِ قبول نہیں بند مانگنے والے — دعا کی بے اثری ہے زباں کی بے اثری

قسم ہے ایسی بیداری کو بیداری نہیں کہتے — کہ آنکھیں جاگتی ہوں آدمی کی روح سو جائے

تمہاری جنبشِ دامن کا پوچھنا کیا ہے — ذرا چلو تو بدل دو ہوا زمانے کی

مدت ہوئی آئے تھے وہ کھولے ہوئے گیسو — اب تک در و دیوار سے نکہت نہیں جاتی

پھول کی نکہت سے شکوہ ہو کہ ہوتی ہے جدا — پھول سے پوچھو کہ گنجائش بھی پیراہن میں ہے

جب تک جبیں پہ خاک ترے آستاں کی تھی — میری فتادگی پہ نظر دو جہاں کی تھی

خوشا فصلِ بہار و ہم شبِ ماہ — بدستم جام و یارم در کنارے

دوسرا رخ:-

بلائے کار آخر جذبۂ اُلفت نواز آیا! — کوئی بیمارِ غم کی نعش پر بہرِ نماز آیا (صـ۱۵)

"جذبۂ الفت نواز" نے اوّل تو شعر میں خاصہ تکلف پیدا کر دیا۔ پھر "بیمارِ غم کی نعش" بھی محلِ غور ہے۔ "پامالِ غم" ہوتا تو یہ کھٹک جاتی رہتی۔

افسوس خزاں جب دور ہوئی، گلچیں کی نظر مغرور ہوئی — ہم نے تو چمن کو صدیوں کی مسموم ہوا سے پاک کیا (صـ۵۲)

یہ وہ "ابہام" ہے کہ جسے بس معنی ہی پہناتے رہیئے۔

برافگن پردہ از باب حریمِ دلربا روزے — صبا! در اشتیاقِ یک نگاہِ یار می گردم (صـ۶۱)

"صبا" کا مصرعِ ثانی میں یہ رنگ تعقید آنا کس قدر اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے!

آشنا بھی نظم دو .. — تہذیبِ چیخ اٹھے یہ ہمارا چلن نہیں (صـ۶۵)

ایسے سطحی شعر "فانوس" میں ہرگز نہ رہنے چاہیئے تھے۔

تقسیم ہے پہ جنگ تو خالی ہے ظرف کی — حد دلیل غیریت انجمن نہیں (صفحہ ۶۴)

آخر یہ کیا بات ہوئی ؟ دوسرا مصرعہ تو بالکل بچکانہ ہے !

موت کے نام سے کانپ اٹھتے ہیں دنیا والے — کون سمجھائے کہ جینا بھی اہم ہوتا ہے (صفحہ ۸۰)

" اہم " نے پورے شعر کو بے مزہ بنا دیا۔

کلیسا پر نہیں کچھ ختم مسجد ہو کہ بت خانہ — جہاں جاؤ وہاں پھیلی ہے جنگِ زندگی کاتی (صفحہ ۹۲)

" پھیلی " کی جگہ " برپا " کا محل تھا۔

کوئی تو راستہ محفوظ ہوتا ! — قفس تک بوئے گل آتی کہاں سے (صفحہ ۹۴)

یہ پہلی بار سننے میں آیا کہ " بوئے گل " کے آنے جانے کے لئے محفوظ راستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کسی خاص مضمون کیلئے خالص استعارہ ہے تو اس میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔

ہم آندھیوں سے بھی اپنا وجود منوالیں — ذرا درست ہو ترتیب آشیانے کی (صفحہ ۱۰۱)

یہ خیال کس قدر کھٹکھلا اور عجیب ہے !

" فانوس " میں نظم کا حصہ بھی جاندار اور وقیع ہے۔ " سچی اشتراکیت " غالباً سب سے اچھی نظم ہے۔ " ہولی " پر ایک قطعہ ہے۔

یار اور آشنا نہیں ملتا — دل سے دل بر ملا نہیں ملتا

کیا کہیں ہم بھی کھیلتے ہولی — ہم کو رنگِ وفا نہیں ملتا

" سوبھاش چندر بوس " پر جو نظم ہے اس کا یہ شعر کس قدر واقعاتی اور اثر انگیز ہے :-

نکلے تو پھر چمن کی طرف رخ نہ کر سکے — اتنا بھی بوئے گل کو نہ آزاد کیجئے

افسوس ہے کہ شاعر نے اپنے کلام کے انتخاب کی ذرا سی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ جو اُن کے قلم اور زبان سے نکل گیا ہے اُسے بلفظہٖ چھاپ دیا گیا ہے۔ انتخاب ہو جاتا تو اس " فانوس " میں روشنی ہی روشنی ہوتی دھواں نہ ہوتا۔ " فانوس " اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے !

ہماری دُنیا ہماری دُنیا حصہ اوّل۔ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت نو آنہ۔ ہماری دُنیا حصہ دوم ضخامت ۷۲ صفحات قیمت بارہ آنہ ہماری دُنیا حصہ سوم۔ ضخامت ۷۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔

یہ تینوں جغرافیہ کی کتابیں ہیں۔ جن کو جناب افضل حسین صاحب ایم۔اے، ایل ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند نے بالکل جدید اسلوب پر مرتب فرمایا ہے۔ جغرافیہ پر یہ کتابیں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان سے زیادہ دلنشین اور عام فہم کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ زبان تو اس قدر منجھی ہوئی اور شستہ و رواں ہے کہ جغرافیہ جیسے خشک موضوع کو باغ و بہار بنا دیا ہے۔ طبعی جغرافیہ کے ساتھ ارضی جغرافیہ بھی ہے۔ ملکوں اور شہروں کے حالات ہیں۔ دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی تفصیل ہے۔ تاریخ کی نادر شخصیتوں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ موسم کیوں بدلتے ہیں۔ دن رات کیوں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں ؟ اس کو نقشوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جغرافیہ جیسے مضمون میں دین کا رنگ سمو دیا ہے۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے طالب علم صرف جغرافیہ ہی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور خلاقیت

کا یقین محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۱۰ (حصہ سوم) پر ہندوستان کے کاغذ کے ملوں کا جو تذکرہ ہے اس میں دکن کے کاغذ کے بہت بڑے کارخانہ (سرپور ٹانڈور پیپر مل) کا نام چھوٹ گیا۔

صفحہ ۱۶۷ (حصہ سوم) پر ابن بطوطہ کے وطن کا نام تنجیر لکھا ہے۔ یہ نام تنجیر نہیں غالباً طنجہ ہو!

ان کتابوں کی ترتیب و تالیف پر فاضل مؤلف تعلیمی دنیا کی طرف سے سپاس و ستائش کے مستحق ہیں۔ ان کتابوں نے حقیقت میں "علم جغرافیہ" کی سطح کو بلند کر دیا ہے۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور (یوپی) سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔

پ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کر سکتے ہیں
رن گھر کے لئے بہترین تحفہ
بارہ مجرّب دواؤں کا خزینہ
لیے علاج اور اہل محلہ کی طبّی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبّی ضروریات کو پورا کر دینگی
بخار کھانسی۔ درد نمونیہ اختلاج قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض
ال پیچش درد شکم خرابی جگر تے متلی بدہضمی ہیضہ درد سر نزلہ زکام
بر کا اسیر خونی درد دنداں درد گوش حاملہ کی تکلیفات بچوں کی جلد
یات خارش فساد خون چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج
ان ہی مختصر دواؤں سے کیا جاسکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس
سا کو (پاکستان) کراچی
تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳

ملک کا استحکام صنعتی ترقی پر منحصر ہے
ملکی اشیاء کی
سرپرستی کیجئے
ٹرسٹ انڈسٹریز کے ادارے:۔
(۱) ٹرسٹ پمپ فیکٹری
(۲) ٹرسٹ سرمیک انڈسٹریز
(۳) ٹرسٹ کلے ورکس
(۴) ٹرسٹ ریفریکٹری پروڈکٹس
(۵) ٹرسٹ سائیکل فیکٹری
ٹرسٹ انڈسٹریز
لانڈھی ——— کراچی

آپ کا پسندیدہ
سگریٹ
شاہین
دس سگریٹ کے پیکٹ کی قیمت تین آنلے
-/3/-
پریمیئر ٹوباکو کمپنی پاکستان کراچی

یعقوب کے بسکٹ
• خوش ذائقہ
• خوش رنگ
اور
صحت کے لئے فائدہ بخش
سب کی پسند کے بسکٹ
تیّار کردہ
سیٹھ محمد یعقوب اینڈ سنز
یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر
اسٹاکسٹ:- زین العابدین برادرس، کراچی

اپنے ملک
پاکستان کی صنعت
کو
ترقی دیجئے
اور اپنے
لائلپور کاٹن ملز
لائلپور کا بنا ہوا مضبوط کپڑا خرید کر ملک و قوم کو مضبوط تر بنائیے
پروپرائٹر
دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ

ماہر القادری

نمبر ۶

جلد ۸

ماہنامہ فاران

ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء

ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

قرآنِ پاک پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن ـــ نور ہے، شفا ہے، عدل کی ترازو ہے، ہدایت و رحمت ہے، نصیحت و بشارت ہے اور حق کو باطل سے جُدا کرنے والا ہے ـــ اور یہ صرف "صحیفۂ تبریک" ہی نہیں ہے، مکمل ترین ضابطۂ حیات اور منشورِ اخلاق و اعمال بھی ہے، اسی سرچشمہ سے ہدایت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور اسی آفتاب سے سب روشنی پاتے ہیں۔ اس مقدس کتاب کا ایک ایک حرف حق ہے، جس میں کسی قسم کا تذبذب نہیں۔ یہی اور صرف یہی وہ الہامی کتاب ہے جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک جن حرفوں اور لفظوں میں نازل ہوا تھا، ہو بہو اور حرف بحرف اُسی اپنی شکل و صورت میں موجود ہے۔ اس میں ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی! دُنیا کی کوئی کتاب، کوئی مصحف کوئی مجلّد قرآن کریم کی طرح "لاریب فیہ" نہیں ہے!

قرآن، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین اسلوب پر نازل کیا گیا ہے، ایسے اسلوب پر جس کی ایک آیت کی بھی نقل کرنا اور مثال لانا ممکن نہیں، مگر وہ "شعر" نہیں ہے۔ اس میں غیب کی باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے، مگر وہ "کہانت" نہیں ہے، اُس میں قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مگر وہ "افسانہ" نہیں ہے۔ اور وہ اس لئے کہ کاہن، افسانہ نگار، قصہ گو اور شعرا بہت سی باتیں اپنے دل سے بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ خیالی تیر تکّے لڑانا اُن کا شیوہ ہوتا ہے۔ اصلیت اور حقیقت پر جب تک نزاکتِ خیال اور جدتِ فکر کا رنگ و روغن نہ ہو، اُن کا کوئی کارنامہ "آرٹ" نہیں بن سکتا۔ مگر قرآنِ پاک میں ذرہ برابر ظن و تخمین اور خیال آرائی نہیں۔ اس کی ایک ایک آیت اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جا سکتے ہیں، مگر قرآن کی پیش کی ہوئی کسی حقیقت کو جنبش نہیں دی جا سکتی! جو نظام ہائے حیات اور علوم و فنون قرآنی تعلیمات سے

دُور ہیں، وہ حقیقت میں فوز و فلاح سے دُور اور خسران و گمراہی سے قریب تر ہیں !

شاعروں کے کلام کے ساتھ تو یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے کہ اپنے ذوق اور پسند کے شعر لوگ چُن لیتے ہیں اور باقی اشعار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مگر قرآن کے ساتھ کوئی مسلمان یہ سلوک نہیں کر سکتا کہ جو باتیں اُسے اچھی معلوم ہوں اور سہل العمل نظر آئیں اُن کو تو وہ قبول کرلے بلکہ اُن پر جمے رہنے ہی کو "عین دین" سمجھے اور قرآن کے دُوسرے احکام اور تقاضوں کو پسِ پُشت ڈال دے ! قرآن کے احکام و اوامر کی تعمیل و اطاعت کا تعلق فرد و جماعت کے ذوق، وجدان اور رجحان سے نہیں ہے۔ قرآن کا کوئی حکم چاہے کسی کے ذوقِ طبیعت اور مزاج پر کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے اس کی تعمیل بہرحال کرنی ہوگی اور مزاج و طبیعت کو قرآنی اوامر و احکام کے مطابق بنانا ہوگا۔

نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی طرح "جہاد" بھی اہلِ ایمان پر فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے روحِ جہاد کا مسلمانوں میں نہ صرف یہ کہ باقی بلکہ تازہ رہنا ضروری ہے۔ اب اگر کوئی مذہبی جماعت مسلمانوں کے فکر و خیال اور کردار و عمل کی اس نہج پر تربیت کرے کہ "جذبہ جہاد" کی پرچھائیں بھی اُس کے تربیتی پروگرام پر نہ پڑنے پائے اور اس معاملہ میں یہاں تک احتیاط برتی جائے کہ کسی "منکر" کو ہوتے دیکھ کر اُس جماعت کے ارکان "منکر" کو ٹوکنے اور اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے تک کو سیاست اور دُنیاداری کا کام سمجھیں، تو ایسی جماعت کے تربیت کئے ہوئے افراد اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کس حد تک مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں؟ وہ صلاحیت جس میں غلبۂ دین کا جذبہ اور جہاد کی خُو بو نہ ہو رہبانیت سے کس قدر قریب تر ہے !

قرآنِ پاک میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بعد سب سے زیادہ تفصیل حضرت سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات و حالات کی ملتی ہے۔ قرآن اس پر شاہد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف عبادت گاہ ہی تک تبلیغِ دین کو محدود نہیں رکھا اور عوام کے مجمعوں پر ہی حق پیش کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ آپ نے وقت کے سب سے بڑے با جبروت بادشاہ کے دربار میں جا کر باطل کو دعوتِ مقابلہ دی۔ پھر اقامتِ دین کا یہی تقاضا فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں "ضربِ کلیمی" کا فرض انجام دیتا ہوا نظر آتا ہے ! وقت کے فرعونوں کو ٹوکنا بلکہ اُن سے مجادلہ کرنا اور باطل کی قوت کا جواب حق کی طاقت سے دینا۔ یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئے ہوئے اُن واقعات و حالات کا خلاصہ جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے !

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر قرآن نے تفصیل کیساتھ کیا ہے ! اور قرآن حضرت خلیلؑ کا پہلا تعارف اس طرح کراتا ہے کہ آپ بُت پرستی کی صرف زبانی مذمت و تردید اور توحید کی لفظی تبلیغ ہی کا حصار باندھ کر نہیں بیٹھ جاتے۔ آپ بت خانہ میں پہنچتے ہیں اور دستِ خلیلؑ پوری قوت کے ساتھ بُت شکنی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پوری قوم ایک طرف ہے اور یہ مردِ مجاہد ایک طرف ہے۔ بُت خانہ کے بعد ایک قدم اور آگے اُٹھتا ہے اور توحید کا یہ علمبردار قصرِ شاہی میں خود شہنشاہ سے دو بدو مجادلہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی قوتِ استدلال اور عزم بیباک کے آگے کفر حیران و ششدر رہ جاتا ہے ! اور پھر ـــــ کفر و باطل کی قوتیں ظلم و ستم پر اتر آتی ہیں۔ مزاجِ شاہانہ برہم ہو جاتا ہے اور باطل پرست قوم حق کی اس آواز کو نہ صرف یہ کہ دبانا بلکہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہتی ہے !

وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قبائے خُلّت پہنائی تھی اور جس سے زیادہ مُعزز آدمی اُس وقت کی دُنیا میں کوئی دُوسرا نہ تھا۔ اُس کے لئے آتش کدہ بھڑکایا جاتا ہے! بڑا سخت امتحان تھا، سو فیصدی جان جانے کا خطرہ ہی نہیں بلکہ پُورا یقین۔ مگر اللہ کا یہ بندہ اور رسُول کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لئے بےخطر آگ میں کود پڑا!

زمانہ کے جابر حاکموں کو ٹوکنا۔ "منکر" کو قوت سے مٹانا اور حق کی خاطر ہر طرح کے خطرے سے دوچار ہونا — یہ ہے "انبیائی تعلیم"۔ "انبیائی کردار" اور "انبیائی طریقِ تبلیغ"! مضمون نگار اپنی طرف سے یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ قرآن کا بیان ہے، یہ کلامِ الٰہی کی شہادت ہے اور یہ وہ حقیقت محکم ہے جس میں دُو رائیں نہیں ہوسکتیں!

قرآن پاک میں حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر بھی کافی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے اور اُس میں قرآن پڑھنے والے کو یہ نظر آتا ہے کہ حکومتِ مصر کے تختِ اقتدار پر حضرت یوسفؑ جلوہ افروز ہیں اور تمام اختیارات کی کُنجیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ قرآن ہی اس کی شہادت بھی دیتا ہے کہ حضرت سیدنا داؤدؑ اور حضرت سیدنا سلیمان علیہما السلام نے نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت بھی کی ہے۔ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:-

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ......

اے داؤدؑ! ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے! (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ)

قرآن پاک ہی اللہ کی زمین کو "صالحین" کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین کے غلبہ کی خاطر کافروں سے جنگیں کی ہیں، قوموں کو حلیف اور معاہد بنایا ہے۔ بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی ہے، مجرموں پر حدود جاری کی ہیں، مالِ غنیمت تقسیم فرمایا ہے۔ سفارت کے آداب اور صلح و جنگ کے اصول ہوں یا تجارت و زراعت کے اخلاقی حدود، غرض حکومت و معیشت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس پر حضورؐ کی طرف سے کوئی ہدایت موجود نہ ہو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کے مؤسس بھی تھے اور حاکمِ اعلیٰ بھی تھے۔ اور اپنے بعد حضورؐ نے ایک ایسی منظم حکومت کو چھوڑا جس کے طول و عرض پر اسلامی نظام کا غلبہ اور تسلط تھا اور جہاں کتاب و سنّت کا قانون چلتا تھا۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر اسلام کا مزاج شناس اور صاحبِ زہد و تقویٰ اور کون ہوسکتا ہے۔ اگر حکومت دُنیا داری کا کام ہوتی اور دین سے اس کا کوئی علاقہ نہ ہوتا۔ تو صحابہ کرام حکومت سے علیحدگی اختیار فرما لیتے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کرام نے اسلامی حکومت کا کاروبار عبادت سمجھ کر چلایا ہے اور اُن کی عزیمت نے اسلامی حکومت کی حدود کو وسیع سے وسیع تر بنایا ہے!

یہ جمود!

اگر کوئی مذہبی جماعت اس انداز پر لوگوں کے ذہن و فکر کی تربیت کرے کہ یہ لوگ سیاست و حکومت کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھتے رہیں اور اللہ کے دین کے غلبہ کی خاطر اسلامی حکومت کے قیام کی تڑپ اُن کے اندر پیدا نہ ہو۔ نظامِ کفر کے بدلنے کے لئے تیاری کرنا اُن کے نزدیک دُنیا داری کا کام ہو اور اسلام کے بڑے سے بڑے شعار کی پامالی پر اُن کی زبانوں سے شکوہ و احتجاج کا ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ تو قیامت کے دن یہ دیندار لوگ دین کی اتنی بڑی کوتاہیوں پر کیا یہ معذرت پیش کرکے چھوٹ جائیں گے کہ فلاں بزرگ نے ہمیں تبلیغِ دین کا یہی طریقہ بتایا تھا اور فلاں "حضرت جی" پر اسی قسم کے انکشافات ہوئے تھے!

کیا اس معذرت کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہا جائے گا کہ ہم نے قرآن کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ اقامتِ دین کا یہ طریقہ ہے۔ اپنے نبیوں کی زندگیاں ہم نے تمہارے سامنے پیش کردی تھیں۔ تاکہ وہ تمہارے لئے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

ن ہدایتوں، نمونوں اور زندگیوں کو چھوڑ کر "بزرگوں" کے طریقوں پر چل پڑنا اور اُنہی طریقوں کو "اللہ کا راستہ" سمجھ لینا، کیا تمہار
ے زیبا تھا جبکہ تم کتاب و سنت ہی کو حق و باطل کا آخری معیار سمجھتے تھے! اُحد کے میدانِ جنگ میں تمہارے نبیؐ کا چہرہ
لہولہان ہوا تھا۔ حق و باطل کے کسی معرکہ میں تمہارے پاؤں پر کوئی خراش بھی آئی؟ ہم نے اپنے دین کو مکمل فرما کر اور ہدایت و
فلاح کے تمام طریقے بتا کر محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نبوت کو ختم فرما دیا تھا اور وحی کے سلسلہ کو بند کر دیا تھا۔ پھر کسی
بزرگ کے ذاتی انکشاف کو اتنی اہمیت دے دینا کتنی بڑی زیادتی تھی کہ "سبیل اللہ" کی بے پناہ وسعتوں کو بس تبلیغ نماز کے
سفر اور گشت تک محدود کر دیا جائے۔ تمہاری یہ کوشش ہماری راہ میں "ایک قدم" تھا۔ یہ منزل نہ تھی اور وہ مسافر بڑا ہی نادان
اور آرام طلب ہے جو ایک دو قدم چل کر ہی یہ سمجھ بیٹھے کہ اس منزل کی مسافت بس اتنی ہی ہے!

جو لوگ "اقامتِ دین" کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں اور چند اوامر و معروف ہی کو "کُل دین" اور "روحِ اسلام"
سمجھے ہوئے ہیں اور اس اپنے کھینچے ہوئے حصار سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ اُن سے قیامت کے دن اسی قسم کی بازپرس ہوگی
جس کی ایک جھلک اوپر پیش کی گئی ہے!

نہ جانے یہ کس قسم کی دینداری ہے جو مسجد سے باہر کی دُنیا پر نظر ڈالنے کو دُنیا داری کا کام سمجھتی ہے۔ کسی بزرگ
پر اس قسم کی تنگ و محدود دین داری (؟) کا انکشاف ہوا ہو تو ہوا ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں تو
ہم کو یہ ملتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے حدود پر دشمنوں کی فوج کے جمع ہونے کی خبر سن کر حضورؐ، صحابہ کرام کے جرار لشکر کو لے کر
تبوک جا پہنچتے ہیں اور اہلِ ایمان کے قشونِ قاہرہ کو دیکھ کر دشمنوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ آج خود اللہ کا دین نرغے
میں ہے، اس پر شبخون مارے جا رہے ہیں، اس کی مدافعت کے لئے جس حوصلے، جس عزیمت، جس جوش اور جس حرکت کی
ضرورت ہے جب وہ کسی جماعت کے نظامِ عمل ہی میں شامل نہ ہو، اُس کی پرچھائیں سے بھی لوگوں کے ذہن و فکر کو دُور رکھنے
کی کوشش کی جائے تو یہ روش، یہ اندازِ فکر اور یہ طریقۂ تبلیغ کیا دین کی مظلومیت کو کم کر رہا ہے...... یا......!

"اکرامِ مُسلم" کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم مگر صرف "اکرامِ مُسلم" ہی مُسلمِ مظلوم کی حمایت اور معاونت نہیں! جن
دین دار لوگوں نے "اکرامِ مسلم" کو نمایاں طور پر اپنے نظامِ عمل کا جُزو بنایا ہے۔ جب اُن کی طرف سے مراکش و الجزائر کے
مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی اور اس قسم کے جماعتی احتجاج سے گریز کیا جاتا ہے کہ یہ سب سیاست کی
باتیں ہیں ـــــ تو پھر دماغ سوچنے لگتا ہے اور دل لہولہو ہو جاتا ہے کہ یہ کیسا "اکرامِ مُسلم" ہے جس نے اسلامی اخوت کے
رشتہ کو استوار کرنے کے بجائے اُسے اتنا ڈھیلا بنا دیا ہے۔ حکم یہ دیا گیا تھا کہ مشرق کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا
چُبھے تو اس کی کھٹک مغرب کے مُسلمان کو محسوس کرنی چاہیئے۔ مگر یہ عجیب قسم کا "اکرامِ مُسلم" ہے کہ مسلمان کافروں کے
ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں اور مُسلم آبادیوں پر دھڑا دھڑ بمباری ہو رہی ہے مگر دین داروں کی
ایک جماعت ہے کہ مسلمانوں کی اس قتل و تباہی اور مظلومیت کا نوٹس تک نہیں لیتی اور احتجاج کے محکمہ طریقوں میں سے
کوئی ایک طریقہ بھی استعمال نہیں کرتی!

مشرقِ وسطیٰ کی سب سے زیادہ فعال دینی جماعت (اخوان المسلمین) پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور اُن کو
"اقامتِ دین" کے جرم میں لرزہ براندام عقوبتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر تہجد گزاروں اور تسبیح خوانوں کی اس جماعت
میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ کیا عبدالقادر عودہ اور فرغلی کا خونِ ناحق اور سید قطب اور ہضیبی کی مظلومیت اسی

نہ "اکرامِ مسلم" کی بے حسی اور جمود کی نذر ہو کر رہ جائے!

بیح و تہلیل اور اللہ کا ذکر بہت اچھی چیز ہے ہر مسلمان کی زبان اس سے تر رہنی چاہیئے۔ مگر "ذکر اللہ" مسلمان
بے حس نہیں حسّاس بناتا ہے۔ جامد نہیں متحرک کرتا ہے۔ اس میں انفعالیت نہیں عزیمت کے جذبہ کو ابھارتا ہے
للہ" کے بعد کسی مسلمان کے قلب کی ایسی حالت ہو جائے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مظلومیت کی خبریں سُن کر
اضطراب ہی پیدا نہ ہو۔ تو پھر یہ "ذکر اللہ" نہیں بلکہ ایک غفلت ہے جو اُس پر طاری ہو گئی ہے اور ایک بیماری
ے دل کو لگ چکی ہے، جسے اس نے شفا سمجھ رکھا ہے!

کو تعدیلِ ارکان اور حضورِ قلب ہی کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔ نماز کی درستی کے لئے جد و جہد بہت بڑی نیکی
ز کی درستی کے بعد قلب کی اگر ایسی حالت ہو جائے کہ نظامِ کفر کے غلبہ کو دیکھ کر اس کو بدلنے کا کوئی
بے کا ندر پیدا نہ ہو۔ کفر کی عدالتوں کے فیصلوں پر دل مطمئن رہے اور کتاب و سنّت کو عملی طور پر
نے کے لئے سرے سے دوڑ دھوپ ہی نہ کی جائے تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ نماز درست نہیں ناقص ہے اور اگر
ے تو پھر تنہا نماز کی درستی ان دینی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر سکتی۔ کوئی اگر زکوٰۃ نہ دے، روزے نہ رکھے
حج ادا نہ کرے تو نماز سے ان کوتاہیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اقامتِ دین کے لئے جد و جہد نہ
اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے کہ نماز اتنی بڑی غفلت اور کوتاہی کی تلافی کر دے گی، تو یہ اس کی بہت بڑی
—— نماز اُن کی درست تھی اور وہ صلوٰۃ کے اثرات اور نتائج کو پہچانتے تھے کہ جو راتوں کے راہب لیکن دن
سوار تھے اور جن کی عزیمت نے روم و مدائن کی باطل حکومتوں کے دھوئیں اُڑا دیئے تھے۔ اور جنہوں نے
کومت کو اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر دنیا پر یہ حقیقت منکشف کر دی تھی کہ اسلام میں یہ دوعملی نہیں ہے
قیصر کا حصہ اور کلیسا کو کلیسا کا حصہ دیا جائے۔ اسلام اپنے مزاج سے ایک وحدت ہے جس کا کوئی
ے جزو سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ مال میں نجاست ہے، نہ سیاست پلید ہے اور نہ حکومت ناپاک
ن کو اقامتِ دین کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ تمام چیزیں سراپا نظافت و طہارت ہیں! خود انبیاء
نبوت اور تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چلایا ہے۔ اسلامی حکومت تو اللہ کے دین کے غلبہ کا
یادہ نمایاں مظہر اور محسوس شہادت ہے!

شک مال و حکومت میں خطرے بھی ہیں، مگر انہی خطروں اور آزمائشوں ہی سے گزارنا تو مشیت کا مقصود ہے۔
نے مال و حکومت کا غلط طور پر استعمال کیا ہے اُن کی اس غلط کاری کے سبب مال و حکومت نجس اور ناپاک
ئے؟ اگر کوئی نادان تلوار سے اپنی گردن کاٹ لے تو کیا تلوار کا استعمال ہی ہمیشہ کے لئے ممنوع ٹھہرا دیا
اور جس کے ہاتھ میں تلوار ہو گی اُسے دیکھ کر یہی قیاس کیا جائے گا کہ یہ شخص لازماً خودکشی کر کے ہی رہے گا اور
"آلۂ خودکشی" کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

خرم | ہم قوتوں کے تناسب اور ظروف و حالات کی تدریج اور اس کی نوعیتوں کے منکر نہیں ہیں۔ "منکر" کو
قوت سے بھی بدلا جا سکتا ہے۔ زبان سے بھی بُرا کہا جا سکتا ہے۔ اور دل میں بھی بُرا سمجھا جا سکتا
آخری درجہ سب سے پست درجہ ہے جو کوئی حالات کے سبب اس پستی میں مبتلا ہو جائے اُسے

دُوسرے درجہ تک پہنچنے کی جدوجہد کرنی ضروری ہے۔ اور جو دُوسرے درجہ میں ہو اس کا فرض ہے کہ "منکر" کو بدلنے کے لئے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ہمارا رونا ہے تو اس تعلیم و تربیت کی طرف سے ہے جو مومن کو "اضعف ایمان" کے تیسرے درجہ میں ہی سدا رہنے دے اور اُسے اس پستی سے نکلنے کے لئے تیار ہی نہ کرے!

مکی زندگی کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے، شعب ابی طالب کی سختیاں بھی اپنی جگہ مسلّم ہیں مگر اسلام کو غلبہ مدنی زندگی کے ذریعہ حاصل ہوا۔ مدینہ میں پہنچ کر حالات سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ مردانِ مجاہد نے لات و ہبل کی جھوٹی خدائی کے ساتھ صنادید قریش کے زور کو بھی توڑ مروڑ کر رکھ دیا!

حق و صداقت کی شاہراہ صفہ سے گزر کر بدر و احد اور فتح مکہ تک پہنچی ہے۔ کوئی جماعت صفہ پر پہنچ کر ہی ڈیرا ڈال دے اور بدر و احد کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو یہ اس کی آرام طلبی اور سہولت پسندی ہے! اصحاب صفہ کے ساتھ اصحاب بدر و حنین بھی تیار کیجئے۔ یا کم سے کم اُن لوگوں سے بیزاری اور برأت بلکہ نفرت کا اظہار تو نہ فرمائیے جن کے پاؤں بدر و احد کی راہ میں غبار آلود ہوتے رہے ہیں۔ آپ میں اگر عزیمت کی کمی ہے تو صاحبانِ عزیمت پر سیاست بازی اور دُنیاداری کی پھبتیاں تو چست نہ کیجئے۔ دُنیا میں اس کا ڈھنڈورا تو پیٹئے کہ اصحاب صفہ اور اصحاب بدر و حنین میں نظریات کا شدید اختلاف ہے!

فراستِ مومن یقیناً حالات کا اندازہ کر کے اہتمام کار اور تدبیر امر کرتی ہے۔ امریکہ میں تبلیغ نہ جانے کتنے دن تک کلمہ پڑھانے، نماز روزے کی تعلیم اور تزکیہ کی تلقین تک ہی محدود رہے گی۔ ہندوستان میں جہاں چار کروڑ مسلمان بستے ہیں وہاں تبلیغ کا انداز اس حد سے آگے بڑھ کر ہوگا۔ اور پاکستان اور انڈونیشیا میں جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے وہاں تبلیغ حق میں فعالیت کا رنگ غالب ہوگا۔ اور اقامتِ دین کے لئے ہر ممکن تدبیر اور طاقت سے کام لیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی جماعت تبلیغ کا ایسا پروگرام بنا دے جو مسلمانوں کی قلتِ تعداد کی کمزوری اور کثرتِ تعداد کی قوت میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہ کرے۔ ہر ماحول کے لئے ایک ہی اندازِ تبلیغ اور ایک ہی اسلوبِ تربیت" تو ایسی جماعت کی بدولت "اقامتِ دین" کے کیسے کیسے موزوں مواقع ضائع ہو جائیں گے اور اُمت پر نہ جانے کب تک مظلومیت کی گھٹائیں چھائی رہیں گی!

پاکستان میں برسوں منظم کشمکش جاری رہی ہے کہ یہاں لادینی حکومت قائم ہو یا اسلامی حکومت! مگر ایک مذہبی جماعت نے دین کے اتنے عظیم الشان کام کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ وہ اس کشمکش سے اس طرح الگ تھلگ رہی ہے جیسے یہ کوئی گندہ کام اور ناپاک تحریک ہے جس سے دامن کشاں رہنا ہی زہد و تقوی کا تقاضا ہے۔ حال ہی میں عائلی کمیشن نے نکاح و طلاق کے مسائل میں کتاب و سنت کے بنیادی اصولوں تک کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر ایک مذہبی جماعت ہے کہ دینی قدروں کی اس پامالی کو سرے سے قابلِ اعتناء اور لائقِ توجہ ہی نہیں سمجھتی! اُس کے پاس تو بس ایک پروگرام ہے۔ جس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ عراق ہو، راجستھان ہو۔ مصر و شام اور نجد و حجاز ہوں یا پاکستان ہو۔ اُن کا پروگرام ہر جگہ کے لئے ایک ہی ہے، حالات کا چاہے کوئی تقاضا ہو، واقعات کسی رُخ پر کیوں نہ جا رہے ہوں۔ حق و باطل کے درمیان کیسی ہی شدید کشمکش برپا ہو۔ اس جماعت کا طریق کار نہیں بدل سکتا! جن بزرگوں نے اپنے ذاتی انکشافات کی بنیاد پر لوگوں کو دین داری کی اس تنگ و محدود راہ پر ڈال دیا ہو۔ کیا قیامت کے دن اُن سے ان کوتاہیوں کی بازپرس نہ ہوگی؟

دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کے پاس تسبیح و تہلیل کی زیادتی ہے اور وہ نماز حُسن و خوبی کیساتھ ادا کرتی ہو اور فواحش و معاصی سے بچی رہتی ہے۔ بس یہی اس کی کائنات ہے۔ "اقامتِ دین" کی جد و جہد اُس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے، یا یُوں سمجھئے کہ نماز روزے کی تبلیغ و ادائیگی ہی کو اُس نے اقامتِ دین سمجھ رکھا ہے۔ دُوسری جماعت کے پاس تسبیح و تہلیل کی اتنی کثرت نہیں ہے اور بر سبیلِ تنزل اس کو مان لیا جائے کہ یہ جماعت نماز تو پُوری پابندی کیساتھ ادا کرتی ہے مگر پہلی جماعت کے مقابلہ میں اُس حُسن و خوبی کے ساتھ ادا نہیں کرتی۔ فواحش و معاصی سے بھی وہ مجتنب ہے مگر اس کے علاوہ "اقامتِ دین" اس کی جد و جہد کا موضوع ہے۔ وہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ کفر و باطل کی جگہ اسلامی نظام قائم ہو۔ منبر و محراب سے لے کر بازاروں، دانش گاہوں اور قصر و ایوان تک کتاب و سنّت کا قانون چلے۔ حکومتوں کی زمامِ کار فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں سے نکل کر صالحین کے دستِ حق پرست میں آجائے، یہ جماعت تقریر و تحریر، شعر و افسانہ، معیشت و اقتصاد اور فلسفہ و دانش کے ہر محاذ پر باطل کا مقابلہ کر رہی ہے !

پہلی جماعت کے پاس نماز روزے کا حُسنِ اہتمام ہے مگر "اقامتِ دین" کی جد و جہد سرے سے ہے ہی نہیں۔ دُوسری جماعت کے پاس نماز روزے کی پابندی تو ہے مگر پہلی جماعت کے برابر حُسنِ اہتمام نہیں ہے لیکن اس کیساتھ "اقامتِ دین" کی جد و جہد میں وہ مقدمۃ الجیش بنی ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں کونسی جماعت دین کیلئے زیادہ مفید ہے، کس کے یہاں کس صفت کی کتنی کمی ہے اور کس کے یہاں کس چیز کا فقدان ہے !

دو دینی جماعتیں ہیں جن کے ارکان شراب کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ شراب نوشی سے مجتنب بھی رہتے ہیں۔ دوسری جماعت صرف شراب سے اجتناب ہی پر قانع اور مطمئن نہیں ہے، وہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ شراب نوشی کو قانون اور طاقت کے ذریعہ بند کرادیا جائے۔ دُنیا فیصلہ کرسکتی ہے کہ کس جماعت سے اخلاق، نیکوکاری اور اسلام کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دُوسرے اوامر و نواہی پر بس اسی طرح قیاس کرلیا جائے تو دونوں جماعتوں کا مَوقف کھل کر سامنے آسکتا ہے!

اب رہا روحانیت اور مجاہدۂ نفس کا معاملہ تو خدا کے وہ صاحبِ عزیمت بندے جو محض حق پرستی کی پاداش میں پھانسی گھر تک دیکھ چکے ہوں اور سزائے موت سن کر جن کی پیشانیوں پر شکن تک نہ آئی ہو۔ اگر صاحبِ روحانیت اور اہلِ دل نہیں بن سکتے تو پھر رُوحانیت ایک عنقا صفت حقیقت کا نام ہے کہ اسم تو موجود ہے مگر مسمّیٰ کا کہیں پتہ نہیں !

ہم میں فرشتہ کوئی بھی نہیں ہے، کسی میں کوئی نہ کوئی خامی اور کوتاہی ضرور پائی جاتی ہے۔ ان سطور کا راقم سب سے پہلے اپنی کوتاہیوں اور نفس کی دراز دستیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ کوتاہی اور خامی کو حُسن و خوبی اور کمال سمجھنا یہ نفس کا بہت بڑا خطرناک فریب ہے!

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو نیک ہیں انھیں نیکی کو قائم کرنے کی توفیق بھی عطا ہو اور جو نیکی کو قائم کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنے نفسوں سے غافل نہ رہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم !

ماہر القادری

سید عبدالقدوس ہاشمی

چین اور مذہب

ایک طالب علم کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف نظریاتِ زندگی کو اگر موقع مل سکے تو عملی شکل میں بھی ضرور مطالعہ کرے اس کے بغیر کسی نظریہ کی خوبیوں اور خرابیوں کا اکثر حصہ آنکھوں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ میں نے مطلق العنان شاہی، محدود شاہی، پارلیمانی طرز حکومت، جمہوریت اور عمومیت کو یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں برسر کار دیکھا تھا لیکن یہ شوق ایک مدت سے موجود تھا کہ کمیونسٹ نظریۂ حیات کو بھی عملی شکل میں دیکھوں۔ یہی شوق تھا کہ جب مجھے جمعیتہ اسلامیہ چین کی طرف سے چین آکر وہاں کی سیر کرنے کے لئے دعوت دی گئی تو میں نے فوراً قبول کر لیا۔ حالانکہ میرے جیسے غریب اور روزی کمانے والے مشغول آدمی کے لئے اتنے طویل سفر کی فرصت پیدا کر لینا کچھ آسان کام نہ تھا۔

بہرحال میں ۹۔ مئی ۵۶ء کو بذریعہ طیارہ کراچی سے براہ ہانگ کانگ کمیونسٹ چین کو روانہ ہوا۔ اور ۱۲۔ جون کو واپس کراچی پہنچا۔ اس مدت میں چین کے وسیع ملک میں پوری طرح دیکھنے اور سمجھنے کا دعویٰ تو کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں! جنوب سے شمال مغرب تک چین کو تقریباً عبور ضرور کر لیا۔ آٹھ مشہور شہر دیکھے اور دو تین دیہاتوں کی سیر کی۔ جمعیتہ اسلامیہ چین اور حکومت چین نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کیں۔ بڑی پُرتپاک میزبانی رہی۔ اس کے لئے ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں۔ چینی زبان سے ناواقفیت نے سرکاری ترجمان کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے کانوں کو وہ آسانی میسر نہ تھی جو آنکھوں کو حاصل تھی۔ لیکن یہ شکوہ بیجا ہوگا کہ آزادی کے ساتھ مطالعہ کا موقع حاصل نہ تھا۔ ہم بازاروں میں جاتے تھے اور ہمیں کوئی نہ روکتا تھا۔ کچھ مقامات وہ دکھانے پر اصرار ضرور کرتے تھے۔ لیکن ہم جو دیکھنا چاہیں اس کے دکھانے سے وہ انکار نہ کرتے تھے۔

شہری آزادیاں کسی کمیونسٹ نظام میں جمہوری ممالک کی طرح شہری آزادیاں نہیں ہوا کرتی ہیں۔ نہ جلسوں اور جلوسوں کی آزادی، نہ ہڑتال اور اسٹرائیکوں کی۔ نہ پریس اور پلیٹ فارم کی۔ نہ تحریر، تقریر، اظہار رائے اور نہ ریڈیو کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے کی۔ ملک کے دستور اساسی میں چاہے یہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہو۔ مگر عملاً نہ کوئی غیر سرکاری اخبار ہوتا ہے اور نہ کوئی ادارہ، نہ سفر و مہاجرت کی آزادی ہوتی ہے اور نہ اختیارِ پیشہ کی۔ اس لئے یہ شکایت ایک قسم کی تحصیل حاصل ہے کہ چین بھی اسی طریقۂ کار کا پابند ہے۔ اور ایک کمیونسٹ ملک ہے۔

جو لوگ علمی اور عملی صورت میں کمیونزم کو سمجھنے پر کافی وقت صرف نہیں کرتے۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم صرف ایک معاشی نظریہ یا معاشی نظام ہے۔ اس کا جوڑ کسی دوسرے نظریۂ حیات کے ساتھ بھی لگایا جا سکتا ہے، لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ کمیونزم ایک مربوط نظام زندگی ہے جو سوشلسٹ سوسائٹی پیدا کرنے کے لئے زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتا ہے۔ اعمال پر بھی اور عقائد پر بھی۔ یہ زندگی کی ایک ایسی تعبیر ہے جو انسانی زندگی کو عالمِ محسوس سے باہر

کی طرف سے بالکلیہ نابینا بنا دیتی ہے۔ نہ جذباتِ روحانی کے لئے اس میں کوئی گنجائش ہوتی ہے اور بعد الطبیعات و بعد الممات کے کسی فکر و نظر کی۔ یہ نظام فوری طور پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک ایسی قوم پیدا کر دیتا ہے جو زندگی کی اس تعبیر کو بطور عقیدہ قبول کر لیتی ہے اور شدت کے ساتھ ان تمام آثار و اعمال کو مٹا دیتی ہے جو روحانی و ما بعد الطبیعاتی تعبیرات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ نظام یکا یک کہیں قائم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایک یا دو نسل اس کے پوری طرح تد بہ عمل آنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔

چین میں ابھی یہ نظام اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ اس لئے روس سے جہاں ۱۹۱۷ء سے اس کا رواج ہے مختلف شکل رکھتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف طریقۂ کار اور عبوری دَور کا اختلاف ہے۔ منزلِ مقصود کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چین میں بھی تعلیم و تربیت جبری ہے اور تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت مارکس کے نظریہ کو حاصل ہے۔ خدا سے بیزاری، اور مذہب سے انکار کو ہر تعلیم گاہ اور ہر تربیتی ادارہ میں اوّلین و اہم ترین مقام حاصل ہے۔ مارکس، اینجلز، ماؤ، لینن اور اسٹالن کی بڑی بڑی شاندار تصاویر اور تمثالوں سے ہر ادارہ مزین ہے۔ اور اندرونِ مسجد کے سوا کوئی جگہ حتیٰ کہ مسجد سے ملحق مکتب بھی ان تصاویر سے خالی نظر نہیں آتے۔

چین کے معاشی و معاشرتی حالات ایک الگ مقالہ کے متقاضی ہیں۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں میں صرف ایک موضوع کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ موضوع ہے "چین اور مذہب"۔ اس موضوع سے پہلے چند الفاظ میں چین کا جغرافیائی تعارف پیش کر دوں تو شاید آئندہ کی تحریر سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ یہ حصہ بہت ہی مختصر ہوگا تاکہ بار خاطر نہ ہو جائے۔

تعارف چین آبادی کے اعتبار سے دُنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی تقریباً ساٹھ کروڑ ہے۔ صحیح طور پر مردم شماری نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ کہنا آسان نہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ۲۱ ستمبر کو تقریر کرتے ہوئے چین کے صدر جناب ماؤزی تنگ صاحب نے کہا تھا کہ چین کی آبادی ۴۷ کروڑ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں چین کے دوسرے اہم لیڈر نے پیرس میں کہا کہ ۵۵ کروڑ ہے۔ اور ۳۰ مئی ۱۹۵۶ء کو ہماری ملاقات کے دوران میں چین کے وزیر اعظم جناب چو ئن لائی صاحب نے فرمایا کہ چین کی آبادی ساٹھ کروڑ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک سات سال میں باہر سے اندرونِ ملک کو منتقل ہوئے بغیر کوئی آبادی ۴۷ کروڑ سے ساٹھ کروڑ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جبکہ اس مدت میں کروڑوں نہیں تو لاکھوں کی آبادی چین سے نکل کر دُنیا کے مختلف حصوں میں زیادہ تر ہانگ کانگ، سنگاپور، ملایا اور تھائی لینڈ میں، جا بسی ہے۔ اس لئے یہ سمجھئے کہ یہ سب اعداد قیاسی ہیں — بذریعہ شمار حاصل کردہ اعداد نہیں ہیں۔ بہر حال ایک محتاط اندازے کے مطابق چین کی آبادی کو ۵۵ کروڑ سمجھئے۔ جس میں سے ۲۲ لاکھ برطانوی مستعمرہ ہانگ کانگ میں ہے، جس کا رقبہ ۳۹۱ مربع میل ہے۔ اور تقریباً ۶۵ لاکھ جزیرہ فارموسا میں ہے جس کا رقبہ ۱۳۸۹۰ مربع میل ہے۔ یہ جزیرہ نیشنلسٹ چائنا یعنی کومنتانگ حکومت کے ماتحت ہے اور چین کا شیخ (چیانگ کائی شیک) اس پر حکمران ہے۔ باقی سارا ملک چین جس کا رقبہ تقریباً ۴۸ لاکھ مربع میل ہے، ہند چینی کی سرحد سے منچوریا تک اور شنگھائی سے سنکیانگ کی مغربی سرحد یعنی افغانستان و کشمیر کی [illegible] منقسم

چینی طرزِ حکومت کے بموجب صوبہ جات کو تو صرف انتظامی تقسیم ہی سمجھیے۔ البتہ نیم خودمختار علاقوں کی حیثیت ذرا مختلف یعنی روسی علاقہ قازقستان و تاجیکستان وغیرہ کی سی سمجھ لیجئے۔

طبعی طور پر چین حسب ذیل تین حصوں پر منقسم ہے:-

(۱) جنوبی حصہ۔ سرحد ہند چینی سے دریائے ینگ تک۔ جہاں شہر اوشان واقع ہے، اس علاقہ میں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ گرم و تر آب و ہوا۔ چاول اور مونگ پھلی کی کثیر پیداوار۔ چین کی سب سے زیادہ آبادی اسی حصہ میں ہے۔ مسلمانوں کی آبادی اس حصہ میں بہت ہی کم ہے۔ شہروں میں چار پانچ ہزار اور دیہی آبادی میں دُور دُور پر ایک یا دو چھوٹے چھوٹے گاؤں مسلمانوں کے پائے جاتے ہیں۔ مشہور شہر کینٹون اسی حصہ میں واقع ہے۔

(۲) وسطانی حصہ:- دریائے ینگ سے لے کر چین کی مشہور دیوارِ عظیم تک بارش کافی، پیداوار مکئی، گیہوں اور روغنی اجناس خصوصاً سویابین۔ مشرقی حصہ زرخیز، مغربی اکثر کوہستان۔ دارالحکومت پیکنگ اسی حصہ کے زرخیز قطعہ میں واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی جنوبی حصہ سے زیادہ ہے اور بعض علاقوں میں تو مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ مسلمان شہروں میں بھی آباد ہیں اور دیہاتوں میں بھی۔

(۳) شمالی و مغربی حصہ:- دیوار چین سے شمال اور دریائے ہوانگ سے مغرب کا حصہ۔ یہاں بارش کم ہوتی ہے۔ میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کوہستانی ہے۔ قیمتی معدنی اشیاء یہیں سے برآمد ہوتی ہیں۔ اس علاقہ کے مغربی حصہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔ یہاں تک کہ صوبۂ سنکیانگ میں ۸۲ فیصد مسلمان آباد ہیں۔ اورومچی، کاشغر، ختن، یارقند، وغیرہ مشہور شہر اسی صوبہ میں واقع ہیں۔

مختصر تاریخ اس مختصر سے بیان سے دُنیا کے اس بڑے ملک کی جغرافیائی کیفیت کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے کے بعد یہ مناسب ہوگا کہ چند سطریں آپ کے سامنے اس کی مختصر تاریخ خصوصاً تاریخ جدید کی بھی پیش کردی جائیں۔ تاکہ "چین اور مذہب" کے موضوع پر جو کچھ عرض کیا جائے اس کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو۔

چینیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کی تہذیب دُنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہندوستان کی طرح تاریخ کی عدم موجودگی سب سے بڑی دلیل ہے۔ افسانہ ہی افسانہ ہے نہ کوئی ناطق شہادت ہے اور نہ صامت۔ بہرحال چین کے متعلق یہ البتہ کسی قدر زیادہ قابلِ وثوق انداز میں معلوم ہو سکا ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال سے یہاں کوئی ایک حکومت نہ تھی۔ ہر زمانہ میں یہ ملک مختلف مطلق العنان شاہیوں میں تقسیم رہا ہے۔ تاریخی ادوار کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے:-

۲۹۵۳ق م تک	عہد نامعلوم۔	
۲۵۹۶	" "	افسانوی عہد۔
۲۲۵۵	" "	پانچ بادشاہیاں۔
۱۷۶۶	" "	ہیا خاندان کی بادشاہی۔
۲۰۶	" "	متعدد مختلف بادشاہیاں۔

۲۲۱ ق م میں مشہور دیوارِ چین کی تعمیر مکمل ہوئی جو تقریباً ۱۴۴۰ میل طویل ہے۔

سنہ ۶۱۸ء تک　یہ ملک کبھی چھ اور کبھی گیارہ بادشاہیوں میں منقسم رہا۔
سنہ ۹۰۶ء　۔۔　تانگ شاہی، چین کے اکثر حصہ پر حکومت رہی۔ اور چینی فنونِ لطیفہ اور ادبیات کی ترقی کا سب سے بہترین زمانہ یہی تھا۔
سنہ ۹۶۰ء　۔۔　طوائف الملوکی۔
سنہ ۱۲۲۳ء　۔۔　سونگ بادشاہی کے ماتحت چین کا دو تہائی حصہ رہا۔
سنہ ۱۲۷۶ء　۔۔　اکثر حصہ ملک پر منگولوں کی حکومت رہی۔
سنہ ۱۶۴۴ء　۔۔　اکثر حصہ پر مِنگ خاندان کی حکومت رہی۔
سنہ ۱۹۱۲ء　۔۔　چِنگ (مانچو) خاندان کی بادشاہی۔ اس دور میں چین کے مختلف حصوں میں بہت سی بادشاہیاں پیدا ہوتی اور مٹتی رہیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں آخری فردِ شاہی خاندان مانچو کا قتل کر دیا گیا۔ رانی بھاگ کر یورپ چلی گئی۔ اور ڈاکٹر سن یات سین کی سرکردگی میں جمہوری حکومت چین کے ایک بڑے حصہ پر قائم ہو گئی۔

تحریکِ آزادی چین کو شاہی مظالم سے نجات دلانے کی ابتدائی تحریک مسلمانوں ہی نے شروع کی تھی۔ اور اُن ہی نے اپنے خون سے سینچ کر آزادی کی بیل کو سرسبز رکھا۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۴ء میں صوبہ کانسو میں شاہی کے خلاف علم اٹھایا۔ اس کے بعد صوبہ شینسی میں سالار تحریک شروع ہوئی۔ پھر سنہ ۱۸۷۳ء میں ایک پنچایتی حکومت مسلمانوں نے قائم کی۔ پھر دوبارہ صوبۂ کانسو میں سنہ ۱۸۹۵ء میں شاہی اقتدار سے مسلمانوں نے انکار کر دیا۔ اور پھر یعقوب بیگ کی تحریک صوبۂ سنکیانگ میں شروع ہوئی۔ اگرچہ ان تمام تحریکوں کو بادشاہی فوجوں نے نہایت بے دردی سے کچل دیا۔ حضرت یعقوب بیگ کی تحریک کو ایک خاصی مدت اصلاح و ترقی کی مل سکی۔ لیکن اس کا اقرار چین کے غیر مسلموں کو بھی ہے کہ چین کی مطلق العنان بادشاہی کے خلاف سارے چین میں زندگی کی لہر ان ہی تحریکوں نے پیدا کی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک چھوٹی سی جمعیۃ نے کینٹون میں ڈاکٹر سن یات سین کو صدر منتخب کر کے جمہوریہ قائم کر لی تھی۔ اور سنہ ۱۹۱۲ء میں آخری فرمانروا کو پیکنگ سے نکال دینے کے بعد اکثر حصۂ چین جمہوریت کے ماتحت ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ماتحتی حقیقتاً ایک لفظی بندش سے زیادہ نہ تھی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں فوجی جنرلوں کی مطلق العنان شاہیاں قائم ہو گئی تھیں۔ مضبوط مرکز قائم نہ تھا اور مرکزی حکومت ایک بے بس حکومت تھی۔ اس انقلابی جماعت کو جس نے یہ جمہوریت قائم کی تھی "کومنتانگ" کہتے ہیں۔ کومنتانگ خود مختار فرمانروا جنرلوں کا ایک کمزور سا اتحاد تھا۔ شمال مشرقی حصہ پر جاپان کا اثر تھا۔ اور جنوب مغربی حصہ پر یورپین تاجروں کی تجارت ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک حکومت بھی تھی۔ ان ہی جنرلوں میں ایک چیانگ کائی شیک بھی تھے۔ یہ صورت حال ڈاکٹر سن یات سین کی وفات نومبر ۱۹۲۵ء بلکہ ۱۹۲۷ء میں جاپان کے حملہ تک قائم رہی۔

سن یات سین کے بعد تھوڑا سا وقفہ دوسرے لیڈر کا گزرا اور اس کے بعد چیانگ کائی شیک کومنتانگ کے لیڈر ہو گئے۔ سن یات سین کی بیوی اور چیانگ کائی شیک کی بیوی شنگھائی کے ایک مشہور دولت مند بینکر کی بیٹیاں اور حقیقی بہنیں ہیں ——— مادام چیانگ کائی شک نے امریکہ میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اُن کا اپنے شوہر پر غیر معمولی اثر ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جو جلسہ عام کومنتانگ کا ہوا، اس میں اس جماعت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ چیانگ کائی شک [illegible]

رکھتے تھے کہ چین کی اقتصادی تباہی کا علاج امریکہ اور یورپ کا بیرونی سرمایہ ہے۔ اسی طرح تعمیر نو کی جائے۔ اور انتہا پسند نوجوانوں کی جماعت جس کا لیڈر ماؤزے تنگ تھا۔ یہ چاہتی تھی کہ ملک کی تعمیر نو روس کی امداد سے کمیونسٹ انداز میں کی جائے۔ اسی جماعت کا ساتھ مسز سن یات سین نے دیا اور دونوں بہنیں دو متحارب جماعتوں کی رہنما بن گئیں۔
اس کے بعد ایک حصہ ملک میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔ پھر بہت سے خونی مقابلوں کے بعد جس میں ملک کو بڑی عظیم الشان جانی و مالی تباہیوں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر ۱۹۴۹ء میں چین کائی چک اور ان کی جماعت چین کے باہر ایک چینی جزیرہ فارموسا میں محدود ہو گئی۔ اس طرح چین کا تقریباً سارا حصہ کمیونسٹ حکومت کے ماتحت آ گیا۔ اور ایک مرکزی حکومت کلی اختیارات کے ساتھ قائم ہو گئی جس میں صوبہ جات کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

چینی مذاہب

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ چین ایک بہت وسیع ملک ہے۔ بہت بڑی آبادی رکھتا ہے۔ جنوبی چین کو شمال مغربی چین سے بجز مرکزی حکومت کی ماتحتی میں اشتراک کے اور کوئی رابطہ مربوط نہیں کرتا۔ مثلاً سنکیانگ کو صوبہ کوانتنگ یا کنٹون سے کوئی چیز مربوط نہیں کرتی۔ نہ کوئی نسلی اشتراک ہے۔ اور نہ لسانی۔ کھانا، لباس، وضع قطع، رسم و رواج، روایات، صورت شکل، قد و قامت، کہیں کوئی اشتراک نہیں ہے۔ چینی زبان جاننے والے تو سنکیانگ کے بڑے شہروں میں دو چار مل بھی جاتے ہیں۔ مگر دیہاتوں میں تو ایغوری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں چلتی۔ یہ زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور تاتاری زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ اس کے اپنے ادبیات ہیں، اخبارات اور رسائل ہیں۔ بالکل اسی طرح چین میں مذہب کا معاملہ ہے۔ چین کے مختلف صوبوں میں ہر زمانہ میں مختلف مذاہب رہے، اور آج بھی ہیں۔ لیکن چین کے لوگ مذہب کے بارے میں ہمیشہ سے غیر یقینی اور مبہم سا تصور رکھنے کے عادی رہے ہیں۔ بلکہ بڑی حد تک انہیں مذہب کے معاملہ میں بے پروا کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آج بھی چین میں لامذہبوں کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ ملاقات کے دوران میں خود جناب چو ئن لائی صاحب وزیر اعظم چین نے یہ بیان کیا کہ چین کی ساری آبادی کسی نہ کسی مذہب کا عقیدہ رکھتی ہے۔ اور ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے عقیدہ خالق سے انکار کر کے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کر لی ہے نو لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ دنیا میں سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ لیکن چینیوں کی غیر یقینی کا یہ عالم ہے کہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ایک چینی ایک ہی وقت میں اپنے آپ کو تاؤ، شنتو، بدھ اور عیسائی چار مذاہب کی طرف منسوب کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ البتہ مسلمان ایسے نہیں ہیں۔ وہ واضح طور پر اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ عقیدہ و عمل میں دوسروں سے الگ ایک جماعت ہیں۔ وہ شادی بھی دوسروں میں نہیں کرتے۔ کھانے پینے میں حرام و حلال کے پابند ہیں۔ چینی نام کے ساتھ ایک عربی نام بھی ضرور رکھتے ہیں۔ اور بعض صوبوں میں صرف عربی نام ہی رکھتے ہیں۔ مقامی یا چینی نام نہیں ہوتے۔

قدیم مذاہب

ابتداءً چینی لوگ عجائب پرست اور اوہام پرست تھے۔ پھر تاریخ کے نا یادگار زمانوں میں یہاں تمدن کی نشوونما ہوئی تو مختلف زمانوں میں بڑے بڑے فلسفی یہاں پیدا ہوئے اور ان فلسفیوں کے خیالات سے تاؤ ازم، شنتو ازم، کنفیوشس ازم، اور مانی ازم کے مذاہب پیدا ہو گئے۔ اگرچہ ان مذاہب کے

خالقِ کائنات کا کسی نہ کسی قدر تصور ضرور موجود تھا۔ لیکن چند اخلاقی نصائح کے سوا اوامر و نواہی اور انفرادی، عائلی واجتماعی احکام و مواعظ سے یہ سب مذاہب یکسر خالی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہ استثنائے منگو لیا و سنکیانگ جہاں ان مذاہب کا کوئی اثر نہ کل تھا اور نہ آج ہے پوری چینی نسل اپنے مورثِ اعلیٰ کی اطاعت اور اُسی کے بُت کی پوجا کے سوا مذہب کا اور کوئی مطلب سمجھ ہی نہ سکی۔ چینی ہمیشہ سے ایک علیحدگی پسند نسل تھے۔ دوسروں سے آمیزش انھیں کچھ بہت زیادہ پسند نہ تھی۔ اس لئے یہ اپنے مزاج کے مطابق ایک مبہم سا عقیدہ خالقِ کائنات کا رکھتے رہے اور چونکہ خدا کی صفتِ خالقیت کا ظہور باپ دادا کے وجود میں انھیں نظر آیا اس لئے ہر خاندان نے اپنے مورثِ اعلیٰ کی پوجا شروع کردی اور اسی پر وہ اب تک قائم ہیں۔

بُدھ دھرم

بدھ مذہب ہندوستان کے صوبۂ بہار میں بمقام گیا پیدا ہوا۔ یہ حقیقتاً کوئی ایجابی تعلیم نہ تھی بلکہ برہمنوں کے مذہبی تسلط کے خلاف روحِ انسانی کی بغاوت تھی۔ اس میں تپسیا اور ترکِ لذائذ کی تعلیم دی گئی تھی۔ کئی سو سال تک یہ مذہب پھولتا پھلتا رہا۔ حکومت و قوت نے اس کی امداد کی۔ لیکن جب پھر برہمنی دَور کا آغاز ہندوستان میں ہوا تو برہمنوں نے اس مذہب کو سخت بے رحمی کے ساتھ یہاں سے ختم کردیا۔ یہی زمانہ ہے کہ بدھ دھرم نے مشرق کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ اور برما۔ سیام، ہند چینی سے گزر کر جنوبی چین میں داخل ہوگیا۔ چینی مذہب کے معاملہ میں لاپروا تو تھے ہی۔ انہوں نے اپنے باپ دادا کے بتوں کے ساتھ ایک بُت مہاتما بدھ کا بھی رکھ لیا بہت سے لوگ تیاگ اور تپسیا کے بھی قائل ہوگئے۔ بعض نے تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ مگر ہندوؤں نے اُن کے ساتھ بڑے دردناک سلوک کئے۔ ان ناروا مظالم کی داستانیں اب تک جنوبی چین کے ہر گھر میں سُنی اور سُنائی جاتی ہیں۔ ان کی قصہ کہانیاں ان دردناک مظالم کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔ جو ہندوؤں نے چینی فقرا اور یاتریوں پر کئے تھے!

یورپ کی اقوام چونکہ تجارت اور نفع اندوزی کے لئے چین کے جنوبی حصہ ہی میں داخل ہوئیں اور وہاں انہوں نے مہاتما بدھ کے بعض ماننے والوں کو دیکھا۔ اُن کی تصانیف سے واقفیت پیدا کی۔ اس لئے یہ فیصلہ کردیا کہ چین کا عام مذہب بھی برما، اور سیام کی طرح بدھ مذہب ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ نہ آج چین میں بدھ دھرم کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور نہ کبھی تھی۔ بلکہ تاریخ کے کسی دَور میں بدھ دھرم کو چین میں قبولیتِ عام نہیں حاصل ہوسکی تھی۔ میں نے جنوب سے شمال مغرب تک چین کو عبور کیا۔ مجھے بدھ مذہب کے بہت تھوڑے آثار نظر آئے۔ شمال مغرب میں تو اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وسطانی علاقہ تک کچھ اثرات ہیں۔ مقامی روایات میں بھی بدھ دھرم کے محیط اثر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بدھ ایسوسی ایشن چین نے جو کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ڈھائی کروڑ بدھسٹ وہاں موجود ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعداد کبھی نہ تھی۔ تانگ خاندان کے بادشاہ (سنہ ۹۰۷ء تک) اگرچہ بدھ نہ تھے مگر بدھ دھرم کے سرپرست ضرور تھے۔ ان کے زمانہ میں بدھ دھرم کو پھیلاؤ کا موقع ملا۔ لیکن اس کا دائرہ جنوبی علاقۂ چین سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اسلام

اسلام چین میں دو راستوں سے داخل ہوا۔ شمال مغربی سرحد سے جبکہ تانگ خاندان کے بادشاہ نے مسلمان تاجروں کے ایک وفد کو ۶۲۷ء میں اپنے دربار میں بُلایا تاکہ اُن کے ذریعہ حضرت عثمانؓ سے

تجارتی معاہدہ کرے۔ اور چینی ریشم کی تجارت عربی ممالک میں اور مصر میں اسی طرح جاری رہے جیسے پہلے تھی۔ اس بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ اپنے یہاں سے بھی کچھ لوگ بھیجے تھے۔ اس کے بعد مسلمان تاجر شمال مغربی چین میں آتے رہے، یہاں تک کہ چین میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوگیا۔ اور ۷۱۲ء میں قتیبہ کی سرکردگی میں مسلمان مجاہدین کاشغر اور ختن پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس وقت معاہدہ ہوگیا اور شہر ہاتی کے قریب حدود قائم ہوگئے۔ لیکن مسلمانوں سے میل جول کا موقع چینیوں کو ملتا رہا اور آہستہ آہستہ اسلام صوبہ یون نان۔ اور صوبہ کانسو میں پھیلتا رہا۔ دوسرا راستہ بحری تھا۔ مسلمان تاجر کنٹون سے اسّی میل مغرب کی طرف دریائے شم چون کے کنارے آئے، اور یہاں انہوں نے طویل عرصہ تک قیام کیا۔ اس طرح جنوبی حصہ کے لوگ اسلام سے واقف ہوسکے۔ یہ زمانہ خلیفہ ولید کا تھا۔ اور ۷۱۲ء کے قریب کا کوئی وقت ہوگا۔ چین ایک وسیع ملک ہے جس کا اکثر حصہ کوہستانی ہے۔ بیچ بیچ میں ذخار دریا راستوں میں حائل ہیں۔ آج ترقی کے اس دور میں بھی آپ چین کو شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً ریلوے کے ذریعہ عبور نہیں کرسکتے۔ کئی کئی سو میل ریلوے لائن بننا باقی ہے۔ تو آپ خیال کرلیں کہ آج سے بارہ سو سال قبل جبکہ راستے بھی مامون نہ تھے، اور چین طوائف الملوکی میں گرفتار تھا۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ مسلمان جنوب سے شمال تک چار ہزار میل کی طویل سرزمین پر آسانی سے پھیل جاتے۔ اس لئے دریاؤں کے کنارے کنارے مسلمان پھیلتے رہے اور صوبہ کوانچو میں تقریباً بیس لاکھ مسلمان پائے جاتے ہیں۔

مرحوم علامہ شکیب ارسلان کی تحقیق جو انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ سید عمر الاجل آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اور پہلی صدی ہجری کے بالکل آخری سالوں میں تجارت کرتے ہوئے دربار چین میں آئے اور یہیں بس گئے۔ اُن کے صاحبزادے سید مسعود کے ذریعہ چین میں اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔

حضرت ابو وقاص شہر کینٹون میں مسلمانوں کی آبادی صرف پانچ ہزار ہے، اُن کی چار مسجدیں ہیں۔ اُن میں سے ایک مسجد کو یہ لوگ مسجد ابی وقاص کہتے ہیں۔ شہر سے باہر حضرت ابی وقاص کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ جہاں لوگ عید کی شام کو زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ ہم بھی وہاں گئے تھے۔ عید کی نماز بھی ہم نے مسجد ابی وقاص میں ادا کی تھی۔ اس مسجد کے امام جناب یوسف اسحاق صاحب کہتے تھے کہ یہ بزرگ ابی وقاص صحابہ میں سے تھے۔ یوسف اسحاق صاحب کوئی محقق آدمی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی ثبوت اس کا پیش کیا۔ اور نہ عربی تواریخ سے کہیں کوئی ایسی بات ثابت ہوتی ہے۔ مسجد کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ دو تین سو سال کی بنی ہوئی ہے، مگر جگہ وہی ہے جہاں حضرت ابی وقاصؓ نے مسجد بنوائی تھی۔ اس لئے اسے مسجد وقاص کہا جاتا ہے۔ مقبرہ بھی نو تعمیر ہے، کوئی ڈیڑھ سو سال کی تعمیر ہوگی۔ کوئی کتبہ بھی موجود نہیں۔ کوئی چینی کتاب ایسی جو اس بیان کی تائید کرے۔ اس لئے ان حضرت ابی وقاص کو صحابی قرار دینا میرے لئے ممکن نہیں۔ البتہ صوبہ کانسو اور سنکیانگ میں بعض قدیم مساجد دیکھیں جن کے آثار و کتبات انہیں گیارھویں صدی عیسوی تک قدیم ثابت کرتے ہیں۔

صوبہ سنکیانگ کے دار الصدر اُورومچی سے ہم نے کاشغر جانے کا عزم کرلیا تھا۔ مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے طیارہ پرواز نہ کرسکا۔ اور یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ شاید کاشغر کے گرد و نواح میں زیادہ قدیم آثار مل جاتے۔ تاریخی قیاس یہ چاہتا ہے کہ کاشغر اور اس سے مغرب کے حصہ میں ابتدائی دور کے اسلامی آثار رہ سکتے ہیں۔ مسلمان تین چار سو سال تک مقبرے اور درگاہیں نہیں بنایا کرتے تھے۔ بلکہ قبروں کی حفاظت کو بھی ایک مہمل کام سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ تو امید نہیں کہ وہاں کوئی قدیم مقبرہ مل جاتا۔ لیکن مساجد کے آثار۔ اور چونکہ بارش زیادہ نہیں ہوتی اس لئے بعض دوسرے تعمیری نقوش کا مل جانا

قرین قیاس ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی چین کے مسلمانوں اور جنوبی چین کے مسلمانوں کے مابین کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اور دونوں حصوں میں الگ الگ اسلامی نور پھیلتا رہا۔ ۱۸۶۲ء میں مِنگ بغاوت کے بعد سے مسلمانوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور ان کی نوآبادیاں شمال مغربی حصہ سے آگے بڑھ کر وسطانی علاقہ میں بھی قائم ہوگئیں۔ اب اس وقت چین کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی کثیر آبادیاں ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ سنکیانگ، کانسو، شینسی، یون نان، کوانگ چو، چونگ کنگ (زی چوان) ان کے علاوہ سارے چین میں شہروں اور دیہاتوں میں مسلمان موجود ہیں۔

چینی مسلمانوں کی تعداد چین میں مسلمانوں کی جملہ تعداد بھی ایک عجب طرح کا اختلافی مسئلہ ہے، اور اس لئے اختلافی ہے کہ چین میں مکمل طور پر مردم شماری نہیں ہوسکی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جو ناقص مردم شماری ہوئی ہے اُس میں مذہب کا خانہ نہ تھا۔ اس لئے جو اعداد پیش کئے جاتے ہیں وہ مقامی معلومات سے ماخوذ ہیں۔ یہاں مردم شماری نسلی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اس لئے وہ نسلیں جو تمام تر مسلمان ہیں مثلاً ہوئی، تاجیک، قازق، تاتار، اویغور وغیرہ اُن کی تعداد تو مل جاتی ہے۔ باقی جن نسلوں میں مسلمان کم ہیں اور غیر مسلم زیادہ۔ اُن کے متعلق صرف واقفِ حال حضرات کا بیان ہی واحد ذریعہ ہے مثلاً ہان نسل۔ منگ نسل وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ جناب چوین لائی صاحب وزیر اعظم چین بنڈونگ کانفرنس میں چینی مسلمانوں کی تعداد پوری چینی آبادی کا ۱۰ فیصد یعنی تقریباً سوا سات کروڑ بتلاتے ہیں۔ انگریز ماہرین اپنی ڈائرکٹریوں میں ساڑھے پانچ کروڑ کہتے ہیں۔ امریکہ کے ماہر حضرات پرنسٹن یونیورسٹی کے شائع کردہ اطلس تاریخ اسلامی بابت ۱۹۵۲ء میں چار اور پانچ کروڑ کے درمیان بتاتے ہیں۔ چین کے جنوبی یا وسطانی حصہ میں کسی سے پوچھئے تو وہ صرف ایک کروڑ بتلائے گا۔ کیونکہ وہ صرف اپنے علاقہ کو پورا چین قرار دے گا۔ اور اگر صوبہ کانسو کے دار الصدر لنگچاؤ میں پرنسپل صاحب سے پوچھئے تو وہ ساڑھے چھ کروڑ بتائیں گے۔ سنکیانگ میں دریافت کیجئے تو پورے سات کروڑ جواب ملے گا۔ ہم ان تمام بیانات اور عینی مشاہدات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر چین میں مسلمانوں کا صحیح شمار ہوسکے تو ان کی تعداد سات کروڑ اور ساڑھے چھ کروڑ کے درمیان ثابت ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چین میں بسنے والی نسلوں میں سے حسب ذیل نسلیں تمام تر مسلمان ہیں:۔

(۱) خوئی۔ (۲) اویغور۔ (۳) قازاق۔ (۴) کرغیز۔ (۵) تاجیک۔ (۶) تاتار۔ (۷) اوزبک۔ (۸) تونگسیاں (۹) سالار۔ (۱۰) پوآن۔

ان میں سے خوئی ہر جگہ موجود ہیں۔ پوآن جنوب مغربی علاقوں میں۔ تونگسیان وسطانی مغربی حصوں میں۔ اور باقی مغربی حصہ ملک میں آباد ہیں۔

ان نسلوں کے علاوہ ہان نسل میں (جو چین کی اکثریتی نسل ہے اور چین کی تقریباً ۷۵ فیصد آبادی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے) کافی تعداد مسلمانوں کی ہے جو "ہان مسلم" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح منگ اور تانگ نسلوں کے بھی لاکھوں ہی گھرانے مسلمان ہوگئے اور مختلف علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے حالات چین میں مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی حالت عام چینیوں سے کمتر نہیں، بلکہ اکثر جگہ بہتر ہے۔ یہ لوگ علم پڑھنے لکھنے، کام کاج کرنے، اور محنت مزدوری میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ سرکاری کارخانوں میں

جگہ خصوصاً شنگھائی میں میں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو کام سے لگانے میں غیر مسلم افسر کسی قدر غیر ہمدرد ہیں۔ لیکن یہ غالباً مقامی افسروں کی شرارت ہے۔ چین کے مسلمان سب کے سب فقہ حنفی کے پیرو اور متصوفانہ خانوادوں سے ناواقف ہیں۔ وہاں قادری، اور چشتی قسم کے لوگ نہیں ہیں۔ مسلمانوں، بلکہ ہر شخص کو عبادت کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق تخصی قوانین نہیں ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے بڑی قربانیوں کے بعد مسلمان مرد و عورت کا نکاح غیر مسلم مرد یا عورت سے قانوناً ناجائز منوا لیا ہے۔ چینی مسلمانوں میں پردہ کا رواج نہ آج ہے اور نہ کبھی تھا۔ بعض علاقوں میں مسلمان عورتیں سروں پر سیاہ رومال کساوے کے طور پر باندھ لیتی ہیں۔ لیکن بہت کم۔ عام طور پر مسلمان عورتیں بھی کوٹ پینٹ پہنے اور کھلے سر زندگی کے ہر شعبہ میں کارگزار نظر آتی ہیں۔

عیسائیت

چین میں سب سے زیادہ جدید آنے والا مذہب، عیسائیت ہے۔ عیسائیت کا اثر جنوبی علاقہ چین سے آگے نہیں۔ شنگھائی اور کنٹون میں دو تین ویران گرجے ملے۔ عیسائیت یہاں یورپین تاجروں کے ساتھ داخل ہوگئی۔ اور جب تک اُن کا اثر رہا پھلتی پھولتی رہی۔ لیکن کبھی ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ تعداد عیسائیوں کی اس ملک میں نہ ہو سکی۔ اور آج تو پتہ بھی نہیں کہ عیسائی کہاں بستے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مرکز شنگھائی تھا۔ وہاں دو تین لاکھ بھی اب عیسائی موجود نہیں ہیں۔ کانسو، شینسی، اور سیان وغیرہ علاقوں میں عام آبادی عیسائیت سے بالکل ناواقف ہے۔

اس وقت چین کی مذہبی تقسیم آبادی تقریباً اس طرح کی ہے:-

۱۔ تاؤ۔ شنتو۔ اور کنفوشش	=	تقریباً	۴۰ کروڑ
۲۔ بدھ	=	"	ڈھائی کروڑ
۳۔ مسلمان	=	"	چھ کروڑ ۷۵ لاکھ
۴۔ عیسائی	=	"	پچاس لاکھ
۵۔ لامذہب	=	"	۴ کروڑ
۶۔ کیمونسٹ	=	"	۹۰ لاکھ

حکومت اور مذاہب

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کیمونسٹ تمام مذاہب کے شدید ترین مخالف ہوتے ہیں۔ اور اس میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ چین میں کیمونسٹوں ہی کی حکمرانی ہے۔ پھر یہ بھی کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں کہ ہر معاملہ میں چین کی رہنمائی کے فرائض روس کے کیمونسٹ ہی انجام دے رہے ہیں — معاشیات میں بھی اور اندازِ حکمرانی میں بھی۔ چین کے ہر شہر میں روسی کلچر سینٹرز بڑے شاندار پیمانہ پر قائم ہے۔ جہاں روسی ترقیات کی نمائش، روسی طرزِ زندگی کی طرف دعوت۔ اور روسی موسیقی و مصوری کے کمالات پیش کئے جاتے ہیں۔ روسی اکابر کی عظمت کا نقش دل پر بٹھا دیا جاتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود چین کی کیمونسٹ حکومت نے مذاہب کے خلاف اس قدر

لے۔ فاضل مقالہ نگار نے پوری تحقیق کے ساتھ واقعات کو لکھا ہے مگر اس سلسلہ میں جناب ارشاد احمد صاحب مدیر ہفتہ نامہ "تسنیم" (لاہور) کے تاثرات بھی پڑھ لئے جائیں تو واقعات اور زیادہ نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صاحب موصوف نے چین کے کسی ایک صوبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں مسلمان عورتیں ایسے پہلے پردہ کی پابند تھیں۔ (م۔ق)

شدید جارحانہ طریقۂ عمل نہیں اختیار کیا جیسا کہ روس میں اختیار کیا گیا تھا۔ بظاہر یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ چین نے مذہب کے خلاف لازمی تعلیم، اور مسلسل پروپیگنڈے ہی پر کیوں اکتفا کی۔ اور تمام مذہبی ذوگوں کو آزادیٔ عبادت، اور خصوصاً مساجد اور کلیساؤں میں اجتماعی عبادت کی آزادی کس طرح عطا کردی۔ یہ صحیح ہے کہ چین میں مسلمانوں، عیسائیوں، بدھوں اور تمام مذاہب کو اس قدر آزادی ضرور میسر ہے۔ لیکن اس قدر آزادی بھی تو روس کے طریقۂ کار کے موافق نہیں ہے!

کمیونزم خود ایک مذہب ہے۔ جس کی بنیاد حیات بعد الممات سے قطعی انکار پر قائم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مذہب چاہے کوئی ہو اس کی بنیاد حیات بعد الممات کے یقین پر قائم ہے۔ اس لئے یہ یقین رکھئیے کہ کمیونزم چاہے روس میں ہو یا چین میں، پولینڈ میں ہو یا یوگوسلاویا میں، اس کی اولین سعی یہی ہوگی کہ مذہب کا نام و نشان مٹ جائے۔ پھر بھی روس اور چین کے طریقۂ کار میں جو فرق ہے وہ اس صورتِ حال سے پیدا ہوا ہے جو ان دونوں ممالک میں کمیونزم کی ابتداء کے وقت موجود تھی!

روس میں جب کمیونزم نے عملی شکل اختیار کرنے کی ابتداء کی تو اس کا مقابلہ ایک ظالم شہنشاہیت سے پڑا۔ کلیسا کا پورا مذہبی نظام جس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس لئے روسی کمیونسٹوں نے جہاں زار کو نیست و نابود کر دیا وہاں اس کے حامی کلیسا سے بھی ایک دن کی رعایت روا نہ رکھی۔ پھر یہ نفرت روز بروز شدت اختیار کرتی گئی۔ اور کوہ یورال کے مشرق میں بسنے والے مسلمان بھی اس کے شکار ہو گئے۔ اس کے برخلاف جب چین میں کمیونزم کے پیرو اقتدار کے والی بنے تو انھیں یہاں کسی شہنشاہیت سے واسطہ نہیں پڑا۔ چین کی بادشاہی ایک ربع صدی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ انھیں کوئی کلیسائی مذہبی نظام چین میں مدمقابل نظر نہ آیا۔ کیونکہ عیسائیوں کی تعداد قابلِ اعتنا بھی نہ تھی۔ تاؤ یسٹ، اور کنفیوشش مذاہب کی کوئی تنظیم ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ کوئی اجتماعی عبادت بھی ان مذاہب میں نہیں ہے، ان سے کیا خطرہ تھا، بدھ بیچارے نہ کسی کے مخالف تھے اور نہ منظم۔ مسلمانوں سے مقابلہ پڑتا۔ لیکن آزادی پسندی میں مسلمان ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ کنٹون کے اس کنفیوشش مندر میں جہاں موجودہ چین کے زعماء کی خفیہ تربیت ہوئی تھی، آج بھی ابتدائی دور کے مسلمان حریت پسندوں کے کھانے کی کھردری سی میزیں اور بنچیں موجود ہیں۔ جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ جہاں تک آزادی، خود مختاری اور معاشی فراغ بالی کے حصول کا تعلق ہے، مسلمان غیر مسلموں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اکثر مواقع پر امام و رہنما تھے!

اسی وجہ سے چینی کمیونسٹوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ روس کی طرح مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف فوری طور پر کوئی جارحانہ کارروائی کی جائے، وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر ہم آئندہ نسل کو اتنا تیار کر لیں گے کہ یہ خود ہی باپ دادا کی بنائی ہوئی مسجدوں، کلیساؤں اور پگوڈوں کو ختم کر دیں گے۔ چینی مسلمان بھی اس کو سمجھ رہے ہیں۔ اور گھر کے ذریعہ اپنی آئندہ نسلوں کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ مساجد میں عربی خطبہ کے سوا وعظ و پند تو ممنوع ہے مساجد کے ساتھ مدرسوں میں قرآن مجید پڑھانے کی مساعی بہرحال جاری ہیں۔ مسلمان محلوں میں بچوں کو کلمہ اور ابتدائی عقائد کی تعلیم بھی اسکول سے خارج اوقات میں دی جاتی ہے۔ اور سرکاری اسکولوں میں انھیں لامذہبی کی لازمی گھٹی ملتی ہے۔ غرض یہ کہ مسلمان کوشاں ہیں کہ اپنی اولاد کو مسلمان رکھیں اور حکومت ساعی ہے کہ انھیں ملحد بنا سکے۔

پروفیسر اطہر احمد سہارنپوری

اِس زندگی کے بعد......

آج کل کی مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں اگر آپ کو کوئی چیز غائب نظر آئے گی تو وہ مابعد الطبیعیات کے مسائل ہیں۔ اِس زمانے کے حکمار نے ان مسائل کو اس لئے ترک نہیں کردیا ہے کہ وہ ان کو کماحقہ حل کر چکے ہیں اور اب ان پر کچھ لکھنے لکھانے کی گنجائش یا ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ برخلاف اس کے انہوں نے ان مسائل کو اس لئے ترک کیا ہے کہ وہ باوجود اپنی تمام عقلیاتی کوششوں کے، تمام علم وفضل کے ان عقدوں کو حل کرنے سے عاجز ہوگئے ہیں۔ اب تک انہوں نے اپنی اس عاجزی کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اس اعتراف پر مجبور ہوگئے ہیں۔ گویا اب اس درجہ پر پہنچے ہیں جہاں پہنچ کر کسی عارف نے کہا تھا کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے دلکش انداز میں اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے ؎

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا　　　جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا!

نبی کریم صلعم کے زمانہ میں بھی کچھ لوگوں نے اس قسم کے مسائل اٹھائے تھے۔ لیکن انھیں اس قسم کا جواب دیا گیا کہ "بعض مسائل ہماری زندگی کے متعلق ایسے ہیں جن کو عقل کی بنیاد پر سمجھنا مشکل ہے اور انسانی عقل کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ اُن کا کامل طور پر احاطہ کرسکے اس لئے ان معاملات میں اعتقاد سے کام لینا چاہیئے"۔ اور ان مسائل کی توجیہ اللہ اور اس کے رسُول نے جو کچھ کردی ہے اس کو قبول کرلینا چاہیئے۔ وہی توجیہ ہماری ضروریات اور قوائے عقلی کے لحاظ سے بہترین توجیہ ہے۔ اگر اس سے زیادہ ہم ان مافوقی مسائل کے پیچھے پڑیں گے تو گمراہی کا خطرہ ہے اور حاصل کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ اس وقت کے مسلمانوں نے ان مسائل کو اللہ اور رسُول کے فرمان کے مطابق سمجھنے کی اور اُن پر اعتقاد رکھنے کی کوشش کی اور مطمئن ہوگئے۔ لیکن جنہیں اپنی عقل وحکمت پر ناز تھا وہ ان مسائل کے پیچھے پڑے رہے اور زور آزمائی کرتے رہے۔ لیکن اب ہزاروں برس کی سعیٔ ناشکور اور کاوش بے ثمر کے بعد آخر اسی نقطہ پر جاکر ٹھہرنا پڑا کہ یہاں عقلِ انسانی عاجز ہے ؎

ہر چہ دانا کند، کند ناداں　　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

لیکن بعض دَورِ جدید کے حکماء اس قسم کے بھی ہیں کہ جنہوں نے عجز کا اظہار کرنے کے بجائے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے اور اب ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس دُنیا کے علاوہ کوئی دُوسری دُنیا سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے مافوقی مسائل کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہے صرف یہی ہماری دُنیائے آب وگل ہے۔ اسی میں سے ہم اتفاقاً پیدا ہوگئے اور مرکر اسی میں مل جائیں گے۔ اس لئے ہماری زندگی کے مسائل جو کچھ ہیں اسی دُنیا کے ہیں۔ اس کے کسی دوسری دُنیا کا تصوّر حماقت ہے۔ بلکہ بعض حضرت نے تو اس قدر کہنے کی جرأت کرڈالی ہے کہ یہ باتیں

ثابت ہو چکی ہے کہ خدا، یا حیات بعد الموت، یا حساب و کتاب، یا روح وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو وہ کہتے ہیں کہ خدا یا حیات جاودانی کے نہ ہونے کا ثبوت مہیا ہو چکا ہے۔ لیکن اس ثبوت کا ذکر نہیں کرتے کہ آخر وہ ثبوت کیا ہے۔ جس نے یہ ثابت کر دیا کہ مافوقی مسائل کا وجود ہی نہیں۔ دراصل ثبوت تو یہ اس قسم کے پیش کرتے ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ خدا اور روح وغیرہ کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن جب نتیجہ نکالتے ہیں تو یہ کہ ان کا عدم وجود یا نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ میں یہ کہوں کہ خدا کا ہونا ثابت نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے وہ موجود ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ لیکن ایک یہ کہ میں یہ دعویٰ کروں کہ خدا کا نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ گویا اس کے نہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہ رہا۔

میں یہاں اس قسم کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ جس میں ایک مشہور مغربی مصنف نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ حیات جاودانی کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔ لیکن نتیجہ یہ نکالا کہ حیات جاودانی کے عدم کو ثابت کر دیا گیا۔ مسٹر اسپنسر اپورٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

> "مسلمانوں اور عیسائیوں کی دنیا میں بہت سے لوگوں نے موت پر فتح حاصل کرنے کی کوشش حیات بعد الموت میں اعتقاد قائم کر کے کی ہے۔ لیکن چونکہ کوئی فلسفیانہ یا سائنسی امکان اس بات کا نہیں ہے کہ حیات بعد الموت ایک حقیقت ہے اور چونکہ فلسفیانہ دلائل جو اس معاملہ میں پیش کئے گئے ہیں وہ محض ناقص اور کمزور ہیں جو کہ صرف انہی لوگوں کو تسلی دے سکتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ بہر صورت اس کے معتقد رہیں گے۔ اس لئے آدمی کو اس بارے میں قدرتی طور پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیا نفسیاتی طاقت ہے جو اتنے لوگوں کو حیات بعد الموت پر اعتقاد رکھنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔" لے

اس دعوے میں آپ یہ آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی بات یونہی سرسری طور پر کہہ دی ہے اور ان دلائل کی قطعی نشان دہی نہیں کی جن سے مصنف نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حیات جاوداں کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے یہ کہ کہا تو کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا جس سے ہم یہ مان سکیں کہ حیاتِ جاوداں کوئی چیز ہے۔ لیکن نتیجہ اس قسم کا نکلا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا ثبوت مل چکا ہے کہ حیات جاوداں کوئی چیز نہیں ہے۔ دعوے اور دلیل میں کتنا فرق ہے۔ پھر اتنے بڑے دعوے کے ساتھ کچھ دلائل تو ہوتے۔ سرسری طور پر ہی سہی!

میرے خیال میں یہاں یہ بہتر ہوگا کہ میں مصنف ہی کے ہمعصر اور ہم پلہ لوگوں کے کچھ قول پیش کروں۔ جنہوں نے واضح طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر حیاتِ جاودانی کا وجود ثابت نہیں ہو سکا تو اس کے عدم کو بھی ابھی تک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ سب سے پہلے میں ایک چوٹی کے انگریز فلاسفر رسل کا قول پیش کروں گا۔ جنہوں نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ ابھی ہم کائنات کے راز ہائے سربستہ میں سے ایک ذرے کے برابر بھی معلومات حاصل نہیں کر سکے ہیں

لے - Ideals of life . P. 26

مافوق مسائل کے متعلق کوئی کیا فیصلہ کرے۔

"سائنسدانوں کے لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کائنات کے متعلق ابھی ہم اقل قلیل معلومات حاصل کر سکے ہیں اور یہ کہ ناقابل شمار دَور ایسے گزر گئے جن میں کسی قسم کا علم نہیں تھا۔ اور غالباً آئندہ بھی بے شمار زمانہ ایسا گزرے گا جس میں ہمیں آگاہی حاصل نہ ہوسکے گی۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ سائنس جو نتائج نکالتی ہے وہ محض امکانات ہوتے ہیں" (یقینی نہیں ہوتے) [۱]

یہاں رسل نے بالکل واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سائنسی نتائج کوئی یقینی چیز نہیں بلکہ محض امکانی بات ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے۔ اور یہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ آج اصول قائم ہوتا ہے کل اس کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی شخص یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے کہ چونکہ سائنس کے ذریعہ سے حیات بعد الموت کو ثابت نہیں کیا جا سکا اس لئے وہ کوئی چیز نہیں۔ اوّل تو سائنس خود امکانی چیز ہے۔ دوسرے سائنس نے اگر اس کا وجود ثابت نہیں کیا تو عدم بھی تو ثابت نہیں کر سکی۔ اگر کہیں عدم ثابت کر دکھایا ہو تو بلاشبہ آپ اس ثبوت کی طرف نشاندہی کریں تاکہ اس کو صحت کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے!

اس کے بعد میں ایک اور فلسفی کا قول پیش کروں گا جو کہتا ہے کہ حیات بعد الموت کا مسئلہ گو بہت مشکل ہے لیکن کسی چیز کے مشکل ہونے کے یہ معنی کہاں ہوتے ہیں کہ اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ لکھتا ہے:-

"حیات جاوداں کے وجود کے خلاف جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی افادیت کا منکر ہو۔ جس چیز کی یہ مخالفت کرتے ہیں وہ اس کا امکانی وجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اشکالات کسی چیز کے وجود کو ناممکن نہیں بنا سکتے۔ اس لئے سائنس صرف اتنا کر سکتی ہے کہ اس مسئلہ کے مقدمات وجود کی ضرورت کو طلب کرلے" [۲] (یعنی وجود کو ثابت کرنے کے لئے جن مقدمات کی ضرورت ہے ان کا ثبوت طلب کرے)

جان کیٹلے نے بغیر کسی پس و پیش کے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ انسان کسی طرح ان ماورائی مسائل کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے ان کے متعلق رائے زنی کرنا بیکار ہے۔ کہتا ہے:-

"ہم ان مسائل میں خود کو کیوں اُلجھائیں جن کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکتے ہیں؟" [۳]

غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ فلسفہ اور سائنس ہماری زندگی کے متعلق چند مسائل کو ابھی تک حل کر نہیں سکے ہیں۔ اس لئے کسی شخص کا یہ دعویٰ کر دینا کہ ان مسائل کا وجود ہی نہیں اور یہ کہ ان کا نہ ہونا ثابت ہو چکا ہے ایک قسم کی عالم فریبی اور خود فریبی ہے، بلکہ یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ خاصی دیدہ دلیری ہے۔

---

[۱] Human Knowledge. Its Scope and Limits

[۲] The Realm of Ends. By James Ward. P. 381

[۳] Collected Essays. V.1 P.16

ان مسائل کی مشکلات کی وجہ سے ہی مختلف مذاہب میں اور خصوصاً اسلام میں ان کو حسب ضرورت حل کر کے پیش کر دیا ہے اور یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ اس معاملہ میں خالص عقل پر ہی بھروسہ نہ کریں بلکہ ایمان بالغیب سے بھی کام لیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے دوسرے مسائل میں بھی آگاہی و علم سے زیادہ اعتقاد کام کرتا ہے اور ہمارے بڑے بڑے سائنسداں اور فلسفی اس پر اعتقاد کرتے ہیں اور دُنیا کے بہت سے مسائل کو اس کی روشنی میں حل کرتے ہیں اور باقاعدہ اس کو ایک سائنٹیفک طریقہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ان مسائل نے کیا قصور کیا ہے کہ یہاں اعتقاد کو سرے سے داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

جیمس وارڈ نے اس مسئلہ کو بڑی خوبصورتی سے حل کیا ہے اور اُس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہماری زندگی کے ارتقار میں ہر جگہ پیش قدمی اعتقاد نے کی ہے نہ کہ علم و آگاہی نے (اس علم و آگاہی سے مراد وجدانی آگاہی نہیں بلکہ کسبی آگاہی ہے) وہ کہتا ہے:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے ارتقار میں جو قدم آگے بڑھایا گیا ہے وہ اعتقادی فعل تھا نہ کہ علمی۔ پیش قدمی کرنے والا اپنے وجدان کے زور پر آگے بڑھا ہے حالانکہ علم اس کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا"

علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آگے چل کر وارڈ اس کی ایک مثال ڈارون کے مسئلہ ارتقار سے موافقت کرتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ مثلاً:۔

"جس وقت کہ ایک پرندے نے پہلی مرتبہ ہوا میں پرواز کرنے کی کوشش کی ہوگی یقیناً اُس وقت اس کے علم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو اس کی گردن کو گر کر ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ضمانت ہوسکے۔ حالانکہ جب اس نے ہمت کر کے عملی طور پر اڑنا شروع کر دیا تو اس کے بعض اعضار بڑھ کر اس کے پر بن گئے۔ اور وہ رینگنے والے جانور سے اڑنے والا پرند بن گیا"

(مسئلہ ارتقار یہی کہتا ہے کہ رینگنے والے بعض جانوروں نے اڑنے کی کوشش کی اور کوشش کرتے ہی اُن کو یکایک اتفاق الامر سے پر مہیا ہو گئے۔ اُن کے اعضار میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو گئی)

"اس میں شک نہیں کہ جب ہماری آگاہی مکمل ہو جائے گی تو یہ باتیں بدل جائیں گی لیکن اُس وقت تک جب تک کہ ہماری معلومات محدود ہیں اعتقاد کے لئے ہمیشہ گنجائش موجود ہے اور اس کی ہر وقت ضرورت بھی ہے۔ اعتقاد کسی ایسی چیز کی تردید نہیں کرتا جس کو سائنس تسلیم نہ کرے لیکن جس چیز کے متعلق سائنس نہ تو حتمی طور پر انکار کرسکے نہ اقرار اور اس کے وجود کا امکان تو بہرحال ہو ہی سکتا ہے اور یہ امکانات ہی ہماری زندگی کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور اسی مفہوم میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک خدا پرست اعتقاد کی روشنی میں راہ چلتا ہے نہ کہ آنکھوں سے

دیکھ کر۔ گو اس کو عین الیقین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا (جیسا کہ اکثر کا خیال ہے) لیکن
وہ بہتری کی توقع ضرور رکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے" [1]

اب میں چاہتا ہوں کہ حیات جاوداں پر اس پہلو سے گفتگو کروں کہ ہماری اخلاقی زندگی کے لئے یہ عقیدہ کس قدر ضروری اور ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا، حیات بعد الموت اور احتساب عمل کا عقیدہ نہ ہو تو ہماری اخلاقی بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک ایک تار منتشر ہو جائے۔ دوسرے قسم کے اصول تو حکومت کے ذریعہ سے رائج کئے بھی جاسکتے ہیں۔ لیکن اخلاقی قوانین اگر کوئی حکومت چاہے بھی تب بھی بہت کم اس کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ آج تک تو ان کی گریز پائی مشہور ہے۔ آئندہ معلوم نہیں کیا صورت ہو۔ اخلاقی قوانین کے نفاذ کا زیادہ تر ذریعہ یہی اعتقادات (خدا۔ حیات بعد الممات وغیرہ) ہوتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتقاد صحیح اور پختہ ہو تو یہ وسائل بڑے کامیاب ہیں۔ اگر ان اعتقادات کا خاتمہ کر دیا جائے تو کوئی شخص کبھی اپنی روزانہ زندگی میں خصوصاً جہاں اس کا مفاد خطرے میں ہو، ان اخلاقی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اور جہاں جہاں ان اعتقادات کو بالکل اٹھا دیا گیا ہے وہاں آپ دیکھ لیجئے کہ کیسا نفسی نفسی کا عالم پیدا ہو گیا ہے۔ کون سے اخلاقی اصول ہیں جن کو دن رات پامال نہیں کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان میں اگر ذرا سی بھی معقولیت باقی ہے تو وہ ہماری معاشرتی زندگی کے لئے اخلاقی قوانین اور ان کے مؤثر اجراء کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کانٹ کہتا ہے :-

"روح کا تصور ایک اخلاقی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اخلاقی زندگی کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاقی قوانین باہمی خیر سگالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور ایسی خیر سگالی جس کا عمل ہمیشہ ایک ایسے طریقہ پر ہو جس کو کم از کم فطری طور پر عالمگیر قرار دیا جاسکے۔ یہ خیر سگالی قابل عمل ہونی چاہیئے۔ لیکن انسان کلیتہً نیک کم از کم اس فانی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی نہیں ہو سکتا" [2]

حیات ابدی کا تصور ہمارے کردار میں بلندی، انضباط اور مضبوطی پیدا کرتا ہے۔ اور ہم مصائب دنیا کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اگر خدا اور آخرت پر اعتقاد قائم کر لیں۔ خدا کی ہمہ بینی کا تصور ہمیں کبھی صحیح راستے سے نہ بھٹکنے دے گا۔ ہم آخرت میں اجر و انعام پانے کی توقع میں بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی خاطر تکالیف اٹھا سکتے ہیں۔ راہ حق کے لئے جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ خدا اور آخرت کا تصور ہمیں کبھی زندگی سے اس قدر مایوس نہیں ہونے دے گا کہ ہم خودکشی پر آمادہ ہو جائیں۔ اور خودکشی کی واردات میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارا خدا پر اعتقاد اور اس کے رحیم و کریم ہونے پر اعتماد کُل باقی نہیں رہا۔ ہم یہ تصور نہیں کرتے کہ اگر کسی مصلحت خداوندی سے ہمیں اس زندگی میں تکلیف پہنچی ہے تو اس کا اجر ہمیں خدا

---

(1) The Realm of Ends. By james ward P.415, 416, 417 .
(2) The Basic Teachings of great philosophers . P. 187

دوسری زندگی میں شرمندہ ہے گا۔

یہ ابدی زندگی کا تصور ہی ہے جو انسانوں کو دوسرے جانداروں کے مقابلے میں فوقیت دیتا ہے۔ اگر یہ تصور نہ ہے تو انسان اور حیوان ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں۔ اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہم دنیا کے مشہور لوگوں کی زندگی میں سے بہت سی مثالیں ایسی پیش کر سکتے ہیں جہاں دوسری زندگی کے تصور نے ان لوگوں کے قدم کو لغزش سے بچالیا۔ مثال کے طور پر سقراط کو ہی لے لیجئے کہ کس آسانی اور خوشی سے زہر کا پیالہ محض اس امید پر پی گیا کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی سے بہتر ہوگی۔ اس سلسلہ میں رسل لکھتے ہیں:-

> "سقراط نے موت کا جس طرح مقابلہ کیا ہے اس کی بڑی اخلاقی اہمیت ہے۔ لیکن اس کا آخری وقت کا سکون محض اس کے اس اعتقاد کی وجہ سے تھا جو اس کو ابدی زندگی کے متعلق حاصل تھا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں وصیت کی تھی کہ "اپنی زندگی اور اپنے بچوں کی زندگی کا پہلے اور انصاف کا بعد میں خیال نہ کرو۔ بلکہ انصاف کا ان تمام چیزوں سے پہلے خیال کرو۔ تاکہ تم معصومیت کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو سکو ایک مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ایک ظالم کے طور پر۔ مجھے عالم بالا سے کچھ ایسے نغمے سنائی دے رہے ہیں جیسے کہ کسی عارف کو سنائی دیتے ہیں۔" اسے اپنی موت کا اس لئے کوئی افسوس نہ ہوا کہ "مجھے یقین ہے کہ میں ایسے خداؤں کے پاس جا رہا ہوں جو کہ عقلمند اور مہربان ہیں۔ اور دوسرے ان لوگوں کے پاس جا رہا ہوں جو کہ یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور جو ان لوگوں سے بہتر ہیں جن کو میں یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"[1]

پھر میں یہاں ذرا ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کردوں تو بیجا نہ ہوگا۔ ضعیفی کی عمر میں جبکہ آدمی کو موت بہت قریب نظر آتی ہے اور اس دنیا سے تمام رشتے منقطع ہوتے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے اور سوائے موت کے انتظار کے کوئی دوسرا کام باقی نہیں رہتا اس وقت زندگی کا سب سے بڑا اور عزیز ترین سہارا یہی حیات بعد الموت کا ہوتا ہے۔ وہ اس سختی کے الم انگیز زمانہ کو آئندہ زندگی کے تصور سے اگر خوش آئند نہیں تو گوارا ضرور بنا لیتا ہے۔ ذرا ان بوڑھوں کے دلوں سے پوچھئے جنہیں اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا کوئی سہارا نہیں کہ وہ موت آنے کے وقت کو کس قدر کرب و بے چینی کے عالم میں گزارتے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا۔ ہر طرف تاریکی۔ کہیں سہارے کے لئے روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ ہر طرف یاس، ہر سمت مایوسی۔ العیاذ باللہ! خدا ہم سب کو اس دل شکن آزار سے محفوظ رکھے۔ اس کے برخلاف میں نے ایسے بوڑھوں کو بھی دیکھا ہے کہ آخری دم تک مسکراتے رہے ہیں۔ اور محبوب حقیقی کی ملاقات کے شوق میں متبسم لبوں سے موت کا استقبال کیا ہے اور مرنے کے بعد بھی ان کے ہونٹوں پر تبسم کا خفیف سا خم باقی رہ گیا ہے۔ کیا واقعی یہ موت پر ایک عظیم فتح نہیں ہے؟ کیا محترم پرویز صاحب جنہوں نے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں پر طنز کرتے ہوئے

---

(1) History of Western philosophy. By Russell. P. 154-156

کہا ہے کہ ان لوگوں نے حیاتِ ابدی کے اعتقاد سے موت کو شکست دینے کی کوشش کی ہے، اس کو کم از کم اس دُنیا کے لحاظ سے حیاتِ ابدی کے معتقدین کی موت پر مکمل فتح نہیں تسلیم کریں گے؟

ہماری زندگی میں جو ایک ہمہ گیر قسم کا انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کا بھی ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خدا اور آخرت کے تصوّر کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کوئی کمزور اور نادار کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس قربانی اور حُسنِ سلوک کا کوئی اجر ملنے کی اُسے توقع نہیں۔ وہ کس ترغیب و تحریک پر نیکی کرے۔ اُس کی اپنی سینکڑوں خواہشات اور آرزوئیں ہیں جن کی تکمیل سے اُسے فرصت نہیں، وہ کسی دوسرے کی طرف کیوں نظر اُٹھا کر دیکھے اور کیوں اپنا نقصان کرے، اس نقصان کو برداشت کرنے کیلئے کوئی تحریص کوئی تشویق ضرور ہونی چاہیئے۔ یہ دُنیا عالمِ اسباب ہے اس میں کوئی چیز بغیر سبب کے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح نیکی کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیئے ورنہ نیکی ہرگز پیدا نہ ہو سکے گی۔ جو لوگ اس خیال میں مگن ہیں کہ نیکی بغیر سبب کے بھی پیدا ہو سکتی ہے وہ احمقوں کی خیالی جنت میں رہتے ہیں اور انسانی نفسیات اور اس کے اجزائے ترکیبی سے سخت جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس خیال میں ہیں کہ بغیر اخلاقی تعلیم و تربیت کے وہ زندگی کو بھلائی کے ساتھ گزار لے جائیں گے، بڑی نادانی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بقول مسٹر کیرل کے :-

"ذہانت کی صحت مندی اور اخلاقی انضباط کا تاثیری احساس اور روحانی ترقی یہ تمام چیزیں اتنی ہی ضروری ہیں جتنی کہ ہماری جسمانی تندرستی، اب انسان کو اپنی ذات کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ کرنی چاہیئے۔ اور ان اسباب کی طرف بھی جنہوں نے اس کی ذہانت اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ واقعی بالکل مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایک ایسے طرزِ معاشرت کو ترقی دیتے چلے جائیں جو کہ ہماری اخلاقی تباہی کا باعث بن رہا ہو اور ہماری ذات کے اچھے اجزائے ترکیبی کو غارت کر رہا ہو۔ یقینی بات ہے کہ مشینی اور کیمیاوی ترقیاں ہمیں اخلاقی انضباط، اعصابی توازن، امن اور سکون عطا نہیں کر سکتیں۔" [1]

اس دُنیا کے علاوہ کسی دوسری زندگی کی امید نہ ہونے کی وجہ سے اور اس دُنیا کی زندگی میں مصائب و آلام کے ہجوم دیکھ کر رسل جیسا ٹھنڈی طبع کا بنا ہوا فلسفی بھی انتہائی مایوسی کے عالم میں چیخ اُٹھتا ہے "آدمی ایسے اسباب کی وجہ سے وجود میں آیا ہے جن پر اس کا کوئی قابو نہیں چلتا اور جن کو خود نہیں معلوم کہ وہ اس کو پیدا کر کے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی آفرینش، اس کا نشو و نما، امید و بیم، اس کی محبت اور عقائد محض چند ذرات کے ایک خاص طرح سے مل جانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کسی قسم کی دلیری، تخیل کی بلند پروازی، حکمت آموزی، شدتِ جذبات اس کو مرنے کے بعد زندگی نہیں عطا کر سکتی اور یہ صدیوں کی کاوشیں، تمام عبادات، تمام تحریکیں، تمام انسانی عبقریت، فنا ہو جانے کیلئے مقدر کی جا چکی ہیں اور یہ کہ تمام انسانی فتوحات ایک دن اس دُنیا کی گرتی ہوئی عمارت کے کھنڈر کے ملبے کے نیچے دب جائیں گی۔ اس لئے انہیں حقائق کی مایوس کن بنیادوں پر ہم روحانی بقاء کی عمارت کو بھی قائم کر سکتے ہیں۔" [2]

اور یہ رسل کی خطا نہیں بلکہ خدا کے اور حیاتِ ابدی کے وجود سے انکار ہر شخص کے دل میں اس قسم کے مایوس کن جذبات و تخیلات پیدا کر دیتا ہے، اس کو ہر طرف تاریکی نظر آتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ لیکن جو شخص خدا کے عفو و کرم پر بھروسہ رکھتا ہے۔ حیات بعد الموت کا قائل ہے وہ موت کو چنداں خاطر میں نہیں لاتا۔ اور کہتا ہے ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

یا پھر ہیبر کے الفاظ میں یوں کہئے کہ ؎ موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

---

(1) Man The Unknown. By Alexis Carrel. (2) The Revolt against reason. Arnold Lunn P 17.

ابو منظور شیخ احمد
(ناندیڑ۔ دکن)

ایک خوشگوار یاد

نواب بہادر یار جنگ[1] مرحوم کا آخری درسِ اقبالؒ

نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور حیدر آباد دکن کی نہایت قابلِ قدر اور مشہور و مقبول ہستی تھے۔ آپ نے مذہبی، سیاسی، علمی، تنظیمی اور تبلیغی بہت سی بے نظیر خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کی علمی خدمات میں ایک نمایاں اور نہایت مفید خدمت درسِ اقبالؒ کی مجلس کا قیام تھا۔ آپ اقبال کے کلام کے عاشق و شیدائی تھے۔ اس کو خوب گہری نظر سے دیکھا تھا۔ اور اقبال فہمی میں اونچے اور ممتاز مقام کے مالک تھے۔ آپ کو اقبال کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے۔ جنہیں اپنی پُر اثر تقریروں میں بر محل نہایت روانی و برجستگی کے ساتھ استعمال کر کے تقریروں کی اثر انگیزی کو شراب دو آتشہ بنا دیتے تھے۔ آپ کو حضرت اقبالؒ کی ذاتِ گرامی اور اُن کے کلامِ معجز نظام سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اکثر فرماتے تھے:۔

"کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو میرا مہدی اقبال ہے۔"[2]

اقبالؒ سے اسی عاشقانہ تعلق کا نتیجہ تھا کہ آپ کی روح نے جب جسم سے جُدائی اختیار کی تو اُس وقت بھی آپ کلامِ اقبال پر گفتگو فرما رہے تھے۔ آپ نے اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے، اپنی قوم کے نوجوانوں کو اُن کی تعلیمات کی صحیح اسپرٹ سے واقف کرانے اور لوگوں کے دلوں میں اُن مجاہدانہ ولولوں کو پیدا کرنے کے لئے، جن کی تمنا میں اقبال زندگی بھر تڑپتے رہے۔

---

[1] نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا اصلی نام "بہادر خاں" تھا۔ نظامِ دکن کی موجودگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر آپ نے ایک ایمان افروز اور بصیرت آفریں تقریر فرمائی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر نظام نے آپ کو "بہادر یار جنگ" کا خطاب دیا تھا۔ اس خطاب کے علاوہ آپ حکومت کی جانب سے بہت سے اونچے اعزازات و امتیازات سے بھی بہرہ ور تھے۔ لیکن اس کے باوجود مرحوم ان تمام چیزوں سے فقیرانہ بے نیازی برتتے تھے۔ اور اگر کوئی اُن کے خطاب یا اعزاز پر کبھی کچھ زور دیتا تو وہ فرمایا کرتے کہ پیدا ہوتے ہی میرے ماں باپ نے میرا نام "بہادر خاں" رکھا تھا میں صرف "بہادر خاں" ہوں اور کچھ نہیں۔ اور قیامت میں بھی "بہادر خاں" کے نام ہی سے پکارا جاؤں گا۔ میری تمنا ہے کہ مجھے موت آئے تو اس حالت میں کہ میں ان تمام بوجھل بیڑیوں سے آزاد رہوں۔ چنانچہ وفات سے پہلے انہوں نے اپنی جاگیر، اپنے منصب اور اپنے اعزازات کے ساتھ اپنا خطاب بھی حکومت کو واپس کر دیا تھا اور وفات کے وقت وہ صرف "بہادر خاں" تھے، اس کے باوجود آج تک نواب بہادر یار جنگ کے نام سے ہی متعارف و مشہور ہیں۔

[2] یہاں یہ بات لائقِ تذکرہ ہے کہ اگرچہ مرحوم نسلی اور خاندانی طور پر فرقۂ مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے اور وفات کے بعد بھی انھیں ان کے خاندانی قبرستان ہی میں دفن کیا گیا۔ لیکن اپنے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی بنا پر وہ ان غالیانہ معتقدات سے بیزار تھے جن کی بنا پر فرقۂ مہدویہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے الگ ایک مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

درسِ اقبال کی ایک مجلس ترتیب دی تھی اور اس کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب فرمایا تھا۔ طرز یہ تھا کہ جناب غلام دستگیر صاحب رشید (پروفیسر ادبیات فارسی نظام کالج حیدرآباد) اقبال کا کلام پڑھتے اور الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کرتے۔ پھر مضمون پر گفتگو شروع ہوتی۔ تاریخی واقعات کی تشریح ڈاکٹر یوسف حسین خاں (پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ) کرتے۔ طبعیات اور جدید علوم و فنون سے متعلقہ مسائل پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق پروفیسر ریاضیات وطبعیات جامعۂ عثمانیہ) روشنی ڈالتے۔ نواب مرحوم اگرچہ ہر موضوع و مضمون پر تقریر فرماتے۔ مگر بالخصوص قرآن کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات کے تعلق سے جب کلام اقبال کی تشریح فرماتے تو حدیث نبوی ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا کے مضمون کی جیتی جاگتی تصویر لوگوں کی نگاہوں میں پھر جاتی۔ اقبال کا حکیمانہ کلام اور بہادر خاں کا ساحرانہ بیان جب دونوں اکٹھے ہو جاتے تو غالب کے مشہور مصرعہ" ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا!" کا رنگ پیدا ہو جاتا اور حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ اس درس کی نسبت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے حسب ذیل الفاظ حقیقت بیانی کا جامع مظہر ہیں:-

> "بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر "نمک مرچ لگانا" شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دُنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے۔ اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کبھی یقیناً کہیں اور نہیں ہوا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور اُن کی تمناؤں کا مجسّم نمونہ تھے۔ اور درسِ اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔" (اخبار "تنظیم" حیدرآباد، قائد ملت نمبر)

یہ درس ہفتہ واری تھا۔ ہر اتوار کو شام کے وقت مرحوم کی ڈیوڑھی پر تعلیم یافتہ اور اہل ذوق حضرات کا اجتماع ہوتا۔ اور اگرچہ کلام کی تشریح میں اساتذہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ سامعین بھی حصہ لے سکتے تھے۔ لیکن جب استاذ الاساتذہ نواب بہادر یار جنگ بہادر اپنے مخصوص اور پُر اثر انداز میں تشریح فرمانے لگتے تو حاضرین ہمہ گوش ہو جاتے اور ایک ایک بات پر سر دُھنا کرتے، اس درس میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" دو کتابیں بہ تمام و کمال پڑھی گئیں۔ جب رموز ختم ہوئی تو نواب نے حاضرین سے مشورہ لیا کہ اب کون سی کتاب شروع کریں؟ حاضرین نے مختلف کتابوں کے نام لئے، نواب نے فرمایا کہ میری رائے میں اقبال کا آخری چھوٹا سا رسالہ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!" شروع کرنا چاہیئے۔ کسی نے کہا کہ نواب صاحب! یہ مثنوی تو اقبال کی آخری مثنوی ہے۔ اسے اس ابتدائی مرحلہ میں پڑھنا تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ نواب نے فرمایا "اسے بلاتشبیہ یوں سمجھئے کہ پارۂ عم قرآن کا آخری پارہ ہے۔ لیکن بچوں کو پہلے یہی پڑھایا جاتا ہے۔" یوں بھی نواب مرحوم سے زیادہ بہتر انتخاب اور کس کا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی "پس چہ باید" شروع ہوئی۔ اس کتاب کے ابتدائی چار اشعار بعنوان "بخوانندۂ کتاب" سمیت دو نظمیں بعنوان "تمہید" و "خطاب

---

[1] نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی کا نام "مہدوی منزل" تھا مگر آپ نے اسے "بیت الامت" سے بدل دیا۔ نام کی یہ تبدیلی مرحوم کے عقائد کی تبدیلی کا پتہ دیتی ہے۔ [2] - کوئی اور تشبیہ دینے تو مناسب ہوتا (م۔ق)

یہ مہر عالمتاب" پڑھی جا چکی تھیں۔ تیسری نظم بعنوان "حکمت کلیمی" کا درس نواب مرحوم و مغفور کی زندگی کا آخری درس تھا۔ ہم اسی آخری درس کی روداد مختصر الفاظ میں یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اولاً اُن تمام اشعار کو یکجا درج کردیتے ہیں۔ جو اس وقت زیر درس تھے، پھر اُن کا لفظی ترجمہ بھی لکھ دینگے۔ "حکمت کلیمی" کے زیر عنوان اقبال فرماتے ہیں:-

۱۔ تا نبوت حکم حق جاری کند — پشت پا بر حکم سلطاں می زند

۲۔ در نگاہش قصر سلطاں کہنہ دیر — غیرت او بر نتابد حکم غیر

۳۔ پختہ سازد صحبتش ہر خام را — تازہ غوغائے دہد ایام را

۴۔ درس او اللہ بس باقی ہوس — تا نیفتد مرد حق در بند کس

۵۔ از دم او آتش اندر شاخ تاک — در کف خاک از دم او جان پاک

۶۔ معنی جبریل و قرآن است او — فطرت اللہ را نگہبان است او

۷۔ حکمتش برتر ز عقل ذو فنوں — از ضمیرش اُمتے آید بروں

۸۔ حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج — بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

۹۔ از نگاہش فرودیں خیزد زدے — دُرد ہر خم تلخ تر گردد زمے

۱۰۔ اندر آہ صبحگاہ او حیات — تازہ از صبح نمودش کائنات

۱۱۔ بحر و بر از زور طوفانش خراب — در نگاہ او پیام انقلاب

۱۲۔ درس لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ می دہد — تا دلے در سینۂ آدم نہد

۱۳۔ عزم و تسلیم و رضا آموزدش — در جہاں مثل چراغ افروزدش

۱۴۔ من نمی دانم چہ افسوں می کند — روح را در تن دگرگوں می کند

۱۵۔ صحبت او ہر خزف را دُر کند — حکمت او ہر تہی را پُر کند

۱۶۔ بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز — ہر کہن معبود را کن ریز ریز

۱۷۔ مرد حق! افسون این دیر کہن — از دو حرف رَبِّیَ الْاَعْلٰی شکن

ترجمہ:۔ جب نبوت حکم حق جاری کرتی ہے تو حکم سلطاں کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اس کی نگاہ میں شاہی محل ایک پرانا بت خانہ ہے۔ اس کی غیرت غیر کے حکم کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کی صحبت ہر خام کو پختہ بنا دیتی ہے۔ زمانہ کو تازہ ہنگامہ دیتی ہے۔ اس کا سبق یہ ہے کہ اللہ بس باقی ہوس تاکہ مرد حق کسی کے جال میں نہ گرے۔ اس کی دم سے شاخ تاک میں آگ بھر جاتی ہے۔ کف خاک میں اسی کے دم سے جان پاک آتی ہے۔ جبریل و قرآن کے معنی ہے وہ اور فطرت اللہ کی نگہبان ہے وہ۔ اس کی حکمت عقل ذو فنوں سے برتر ہے۔ اس کے ضمیر سے ایک اُمت باہر آتی ہے۔ ایسا حکمراں کہ جو تخت و تاج سے بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کلاہ ہے، نہ فوج، نہ خراج۔ اس کی نگاہ سے ٹھنڈک اسے (فرودیں دگری) اُٹھتی ہے۔ ہر خم کی تلچھٹ شراب سے بھی زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ اس کی آہ صبحگاہ میں زندگی ہوتی ہے۔ اس کی صبح نمود سے کائنات تازہ ہے۔ اس کے زور طوفاں سے بحر و بر میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔

اُس کی نگاہ میں انقلاب کا پیام ہے۔ وہ لاخوف علیہم کا درس دیتا ہے تاکہ سینۂ آدم میں ایک دل رکھ دے۔
اُسے عزم اور تسلیم و رضا سکھاتا ہے۔ دُنیا میں چراغ کی طرح اُسے چمکاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا افسوں
کرتا ہے جو جسم میں روح کو دگرگوں کر ڈالتا ہے۔ اُس کی صحبت ہر ٹھیکرے کو موتی بنا دیتی ہے۔ اُس کی حکمت
ہر تہی کو پُر کر دیتی ہے۔ بندۂ درماندہ سے کہتا ہے کہ اُٹھ اور ہر پُرانے معبود کو ریزہ ریزہ کر ڈال۔ اے
مردِ حق! اس دیرِ کہن کا افسوں رَبّیَ الاعلیٰ کے دو حرف سے توڑ ڈال[1]

نظم میں آگے مزید اشعار ہیں مگر سترھویں شعر پر پہنچکر مرحوم نے فرمایا کہ بس یہیں ٹھہر جائیں اور کتاب لے کر اس شعر کے پاس حاشیہ میں دستخط کر دیئے اور تاریخ لکھ دی۔ اس آخری درس کا تاثر خود اس درس کے ایک مُدرس جناب غلام دستگیر صاحب رشید کے قلم سے پڑھنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حسبِ معمول ۲۵۔جون ۱۹۴۴ء اتوار کے دن شام کو "بیت الامت" (دولت کدۂ
بہادر یار جنگ مرحوم) میں درسِ اقبال کی حکمت آموز اور دل سوز صحبت جاری تھی
حلقۂ اقبال کے بانی اور حکمتِ اقبال کے شیدائی، قائدِ ملت، لسان الامت،
بہادر خاں مرحوم جن کی سراپا جہاد زندگی خود "درسِ اُو اللہ بس، باقی ہوس" کے
مصداق تھی۔ اپنی تہی کو پُر اور خزف کو دُر کرنے والی شرکت سے اس میں ؎

پختہ ساز و صحبتش ہر خام را   تازہ غوغائے دہد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔
جب میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی جلال آفریں نظم "حکمتِ کلیمی"
کے اس شعر ؎

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن   از دو حرفِ رَبّیَ الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو فرمایا "رشید صاحب! یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں ہیں
آج یہیں ٹھہر جائیں"۔ میں نے کہا "بہت خوب!" آہ! کسے خبر تھی کہ یہ مردِ حق دو ایک
ہی گھنٹوں کے اندر اس دیرِ کہن کے افسوں کو توڑ کر اپنا ترانۂ عشق شعرِ اقبال سناتے
ہوئے ربّی الاعلیٰ سے جا ملیگا اور تعلیمِ اقبال کا یہ پیکرِ گل اپنے حریفانِ بادہ پیما کو ؎

غیرتِ او برنتابد حکمِ غیر   قہرِ سلطاں در نگاہش کہنہ دیر

کے مظاہرے سے تا قیامت محروم کر دے گا!"   (داستانِ اقبال) ص ۹۲

---

[1] حق یہ ہے کہ اقبال کا کلام جامعیت و بلاغت کی رُو سے اتنا معیاری کلام ہے کہ وہ ترجمہ کا کسی طرح متحمل نہیں سکتا۔ اس کے لئے یا تو ترجمانی درکار ہے یا تشریح و تفسیر۔ لیکن اس کے باوجود راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ کلام کا اکثر و بیشتر حصہ ان کا بھی متحمل نہیں، ترجمانی و تشریح جس درجہ کی بھی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشعار کا اصلی حُسن نکھرنے اور نمایاں ہونے کی بجائے غارت ہو جاتا ہے۔ بہتر اور صحیح تر یہی ہے کہ کلام کو اس کے اصلی رنگ ہی میں دیکھا جائے اور اصلی الفاظ ہی میں پڑھا اور سمجھا جائے۔ تاہم یہاں محض غیر فارسی دانوں کیلئے لفظی ترجمہ کر دیا ہے تاکہ اُن مضامین کا سرسری اندازہ ہو جائے جن پر اقبال کا کلام مشتمل ہے!

۲۵ جون ۱۹۴۴ء مطابق ۳- رجب ۱۳۶۳ھ کا دن درسِ اقبال کا آخری دن بھی تھا اور خود مرحوم کی زندگی کا بھی آخری دن تھا- جب وقت مقررہ پر شائقین جمع ہوگئے تو رشید صاحب نے اشعار پڑھنے شروع کئے- سیدھی طرف کے صوفہ پر نواب صاحب تشریف فرما تھے- سامنے پُورا کمرہ بھرا ہوا تھا- صرف دو صوفے جو سب سے پیچھے رکھے ہوئے تھے خالی تھے- آخری قطار میں ماہر القادری صاحب بھی تشریف رکھتے تھے- تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر رضی الدین صاحب بھی تشریف لائے اور خود نواب صاحب نے سلام میں پہل کی- پھر نواب صاحب کی نظر ماہر صاحب پر پڑی تو فرمایا کہ "اہا! نہیں معلوم ماہر صاحب کیوں پیچھے چھپکے سے بیٹھے ہوئے ہیں- آپ نزدیک! میں نے آپ کو عصر کی نماز میں دیکھا تھا- پھر یکایک غائب ہوگئے اور اب نظر آرہے ہیں"- ماہر آٹھے اور جاکر صدر صوفہ پر رضی الدین صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے- جب چوتھا شعر پڑھا گیا تو نواب مرحوم نے اس کی تشریح میں صحابہ اور اولیاء کے بہت سے واقعات سنانے شروع کئے اور فرمایا کہ دیکھئے یہ حضرات کس طرح "اللہ بس باقی ہوس" کی زندہ تصویر تھے- ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن آپس میں گفتگو کر رہے تھے- جنگ بدر یا جنگ احد میں حضرت عبدالرحمن کافر لیے کی طرف سے لڑنے آئے تھے- انہوں نے اس واقعہ کی یاد دلاتے ہوئے اپنے باوا سے کہا کہ اُس جنگ میں آپ میری زد میں تھے- چاہتا تھا کہ ایک ہی وار میں کام تمام کردوں مگر محبتِ پسری غالب آگئی- اس پر حضرت صدیق نے اہا ہا کیا جواب دیا تھا- فرمایا- "ارے وہ تیری محبتِ پسری نہیں تھی بلکہ تیرے کفر کا ضعف تھا- اگر تو میری زد میں ہوتا تو ایمان کے سامنے میری محبتِ پدری ہرگز جوش نہ کھاتی اور ایسا بھرپور ہاتھ مارتا کہ تسمہ لگا نہ رہتا"

مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک اللہ اور اُس کی محبت ہی کافی تھی- اس کے سوا ہر چیز کو وہ ہیچ سمجھتے تھے- حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بڑے زبردست اور مالدار صحابی تھے اور تاجر تھے- ایک بار آپ کے مالِ تجارت کے سلسلہ میں غالباً پانسو اونٹ آئے- جن سے مدینہ میں ایک ہلچل مچ گئی- حضرت عائشہؓ نے جب یہ ہنگامہ دیکھا تو حال دریافت کیا- لوگوں نے حضرت عبدالرحمن کا ذکر کیا- ام المؤمنین نے فرمایا- "مجھے حضور رسالتؐ مآب کا ایک ارشاد یاد آتا ہے کہ میرے تمام اصحاب جنت میں جائیں گے لیکن بعض گھسٹتے ہوئے جائیں گے- جب عبدالرحمن کے پاس اتنا مال ہے تو اُن کے دل میں اللہ کے لئے کیا جگہ رہی ہوگی"

کسی نے یہ بات عبدالرحمن سے آکر بازار میں کہہ دی- آپ بہت متاثر ہوئے- اور فوراً ایک بلند مقام پر کھڑے ہوکر لوگوں کو قریب بلانا شروع کیا- چونکہ ملک التجار تھے اور بازار کے نرخ یہی بیان کیا کرتے تھے- اس لئے لوگ جوق جوق آنے لگے اور انہوں نے سمجھا کہ بازار کے اُتار چڑھاؤ سے واقف کرانا چاہتے ہیں- جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے کہا کہ "میں نے اپنا یہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیا- جس کا جو جی چاہے اٹھا لے" اور فوراً ام المؤمنین کے پاس پہنچکر عرض کیا کہ یا ام المؤمنین! میرے دل میں سوائے اللہ کے کسی کی جگہ نہیں ہے-

غرض یہ حضرات عشقِ الٰہی اور عشقِ نبوی میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ دوسری ساری چیزیں ہیچ "ہوس" نظر آتی تھیں- عشقِ نبوی کا ذکر کیا تو حضرت عمرؓ کا واقعہ سنایا- ایک بار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا تھا کہ جب تک کسی کے دل میں رسُول کی محبت ہر چیز سے زیادہ نہ ہو وہ کامل مسلمان نہیں ہوسکتا- حضرت عمر نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! مجھے آپ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہیں بجز میری جان کے- اس پر حضور نے

حضرت عمرؓ کو نزدیک بلایا اور اُن کے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ گویا عمرؓ کی قلب ماہیت کردی۔ اُن کی روح کو بدل دیا۔ اور اُس میں قوت و نورِ ایمانی کا ایک دریا بہادیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ قسم خدا کی اب بجز آپؐ کے دُنیا کی کوئی چیز مجھے عزیز نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرید نے ایک خوبصورت جڑاؤ کٹورا آپ کو نذر دیا تھا۔ جس کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ اس سے پانی پیتے تھے۔ ایک دن وہ چوری گیا۔ اس کی خبر آپ کو دی گئی تو آپ نے اپنے دل کی طرف توجہ کی اور الحمدللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ لیکن اس وقت پاسِ ادب سے خاموش ہو رہے۔ کوتوال شہر آپ کے مُریدوں میں سے تھا۔ اُس نے تفتیش کی اور کٹورا برآمد کر لیا۔ جب کٹورا سامنے آیا تو آپ نے پھر دل کی طرف توجہ کی اور الحمدللہ کہا۔ لوگوں نے دونوں وقت الحمدللہ کہنے کا سبب پوچھا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ جب کٹورا گم ہو گیا تو میں نے یہ دیکھنے کے لئے دل کی طرف توجہ کی کہ کہیں غم کے آثار تو وہاں نہیں پائے جاتے۔ جب معلوم ہوا کہ غم کا کچھ اثر نہیں ہے تو خدا کا شکر ادا کیا۔ اسی طرح کٹورا مل جانے پر جب دل میں خوشی کا اثر نہیں پایا تو خدا کا شکر بجا لایا۔

یہ تھے مومن، ان لوگوں کا دل صرف اللہ ہی کا تصور و تخیل رکھتا تھا۔ اس کے سوا کوئی چیز اس میں جگہ نہ پا سکتی تھی۔

چھٹے شعر میں فطرۃ اللّٰہ کا لفظ تھا۔ اس کی تشریح اپنے لاجواب انداز میں کی۔ فرمایا۔

"ہر بچّہ اپنی فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے، ماں باپ کا اثر قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہندو کی اولاد ہندو ہی بن کر اٹھتی ہے اور آج ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہم "خاندانی مسلمان" بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم صرف اس وجہ سے مسلمان ہیں کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے۔ ورنہ عمل دیکھئے تو مسلمانی کا فقدان ہی فقدان ہے۔ اگر بچّے کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھ کر پرورش کیا جائے تو وہ بالکل فطرتِ صحیحہ پر رہے گا اور اس کی فطرتِ صحیحہ خود اس کو خدا کا ادراک کرا دے گی لیکن فطرتِ صحیحہ کا ایک افضل و بلند مقام بھی ہے اور وہ ہے خارجی اثرات اور ماحول کی مخالفت کے باوجود اپنی فطرتِ صحیحہ پر قائم رہنا۔ یہ مقامِ ابراہیمی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل کافرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ لیکن اُن کی طبعِ سلیم و عقلِ سلیم نے انہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دیا۔ اور وہ برابر سیدھی راہ پر بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ خدا تک پہنچ گئے اور اِنّی وجّہت وجھی ..... الخ پکار اُٹھے فطرۃ اللّٰہ افراط و تفریط کے درمیان ہوتی ہے۔ فطرۃ اللّٰہ ہی اسلام ہے اور اسلام ہی فطرۃ اللّٰہ ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات عین مطابقِ فطرت ہیں۔"

نویں شعر میں "فروردیں" اور "دے"[1] کا ذکر آیا تو نواب صاحب نے ایرانی مہینوں اور موسموں پر بھی سیر حاصل بحث کر ڈالی۔ اور کہا کہ ایران میں مہینے فروردی سے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں حیدرآباد میں بھی جب یہ مہینے رائج کئے جانے لگے تو فروردی ہی سے رائج کئے گئے۔ لیکن اس سے یہاں کے موسم ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے اور تیر میں سردی آتا

---

[1] مہینہ کا نام

اس لئے غالباً آبان سے شروع ہونے لگے۔ لیکن اس صورت میں بھی موسموں پر صحیح نہ بیٹھنے سے آخر مختار الملک کے زمانہ سے آذر سے سرکاری سال کا آغاز ہوا۔

دسویں شعر میں "آہِ صبحگاہ" کا ذکر آیا تو علامہ اقبال کا مشہور شعر پڑھا کہ:۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی !

اور اُن سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے کہ اقبال دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا اور تعارف کرایا کہ "میں حیدر آباد سے آیا ہوں"۔ کہنے لگے "مجھے تم سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں، صبح کب اُٹھتے ہو؟" میں نے کہا "نماز کے لئے"۔ فرمایا "بس کافی ہے، نماز کے بعد سیدھے چلے آنا"۔ چنانچہ دوسرے دن صبح نماز کے بعد پہنچا۔ وفادار ملازم علی بخش نے کہا "آپ چپکے سے کرسی پر بیٹھ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اشعار لکھ رہے ہیں"۔ میں نے دیکھا کہ سر اقبال چادر اوڑھے تخت پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں کاغذ ہے اور اشعار لکھ رہے ہیں۔ میری طرف نظر پڑی تو کاغذ رکھ دیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ اسی صحبت میں اقبال نے فرمایا تھا کہ وہ کبھی طلوعِ آفتاب کے بعد نہیں اُٹھے !

بارھواں اور تیرھواں شعر زیرِ درس آیا تو آیتِ کریمہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی تفسیر نہایت ہی بلیغ و فصیح پیرایہ میں کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے لئے سب سے زیادہ اسبابِ حزن و ملال پیدا کرتا ہے لیکن وہ ان کو متاثر نہیں کرسکتے اور نہ اُن پر غالب آسکتے ہیں۔ اللہ کے قرب کا مقام بھی بڑا نازک مقام ہے کیونکہ جہاں انعام و اکرام ہوا کرتا ہے وہاں نزدیک ہونے سے موردِ عتاب و خفگی ہونے کا بھی ہر دم اندیشہ رہا کرتا ہے، بلا تشبیہ بادشاہ کے قرب کا بھی یہی حال ہے۔ جس دن ہارون نے برمکی کو قتل کروایا تھا اسی دن صبح میں اس کے پاس ایسے تحائف بھیجے تھے کہ زندگی بھر کبھی نہ بھیجے تھے۔ اللہ کے مقبول بندے صرف اللہ کی رضا کے طالب ہوا کرتے ہیں۔ وہ اس سے اسی کو مانگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا جس کا ہوگیا اسے پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی۔ ایک بادشاہ تھا، ایک دن خوشی کی ترنگ میں حکم دے دیا کہ ہمارے خزانے کھول دو اور اعلان کر دو کہ جو شخص جو چاہے مانگ لے، اُسے مل جائیگا۔ چنانچہ ہر شخص اپنی اپنی پسند کی چیزیں اُٹھانے لگا۔ اتنے میں ایک لونڈی آئی اور ہر چیز سے اپنا دامن بچاتی ہوئی بڑی احتیاط سے بادشاہ کے قریب پہنچی۔ اور اُسے آہستہ سے چھوکر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے اُسے دیکھا اور کہا کہ کھڑی کیوں ہے۔ کوئی چیز اُٹھا کیوں نہیں لیتی؟ لونڈی نے کہا۔ میں کوئی چیز کیا اُٹھاؤں، میں نے اِن چیزوں کے دینے والے ہی کو لے لیا۔ یہ عشق کی بلند ترین منزل ہے۔ اور اللہ و رسول کے عاشقوں کی یہی شان ہوا کرتی ہے۔ عشقِ رسولؐ کی کیفیت سے مرد تو مرد عورتیں تک متکیف رہی ہیں۔ چنانچہ حضورِ انورؐ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان خاتون جو غالباً مکہ میں تھیں یہ سُن کر کہ لڑائی میں حضورؐ کام آئے، بے تحاشہ مدینہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ راستہ میں کچھ لوگ ملے اور انہوں نے کہا کہ تمہارے بھائی جنگ میں ختم ہوگئے۔ اِن خاتون نے کہا کہ الحمدللہ۔ مگر یہ بتاؤ کہ رسول اللہؐ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ اچھے ہیں۔ خوش ہوکر آگے بڑھیں۔ کچھ اور لوگ ملے اور انہوں نے ان کے شوہر کے شہید ہونے کی خبر سنائی۔ مگر اس پر بھی اِن خاتون نے الحمد للہ کہا اور رسول اللہؐ کی خیریت دریافت کی۔ یہاں تک کہ جب مدینہ پہنچیں تو رسولِ اکرمؐ کو زندہ اپنے سامنے دیکھ کر پکار اُٹھیں "یا رسول اللہ! دنیا کے سب مصائب آپ کے سامنے ہیچ ہیں"۔ یہ مقام ایمان کی بیش قوتی اور یقین کی پختگی کا ہے اور یہی مقام لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص مجسم عشق و یقین بن جاتا ہے وہ [illegible] کے

سامنے ناقابلِ شکست چٹان اور پہاڑ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ دوسرے خود اُس کی پناہ لے کر بچ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ غالباً غزوۂ احزاب میں ایسے زور کا رَن پڑا کہ خود میرے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حضورؐ نے جو یقین و ایمان کا انسانی پہاڑ تھے اپنے قریبی صحابی غالباً حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ "ارے یہ لوگ بھاگے کیوں جاتے ہیں، ان کو روکو، میری آواز بھاری نہیں ہے اس لئے تم انھیں پکارو کہ محمدؐ یہاں ہے، اور نعرہ لگاؤ کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ چنانچہ ان صحابی نے آواز دی۔ اور سب لوگ آپؐ کے اطراف جمع ہو گئے۔ لڑائیوں میں جب کبھی حالات ناساز گار ہو جاتے تو تمام صحابہ حضورؐ ہی کے اطراف پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ خود صحابہ فرماتے ہیں کہ "ہم خواہ کتنے ہی خوفزدہ ہوتے لیکن آپؐ کے نزدیک پہنچتے ہی ہم میں پھر سے یقین و ایمان کی زبردست قوت پیدا ہو جاتی"۔

نواب صاحب یہ واقعات سُنا رہے تھے اور اشعار کی تعریف بھی فرماتے جا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اعلیٰ شاعر ایسا ہوتا ہے کہ جس کا دل "عزم و تسلیم و رضا" کے جذبات سے معمور ہوا کرتا ہے۔ اصل میں اس کا دل مومن ہوتا ہے۔ پھر ماہر کی طرف اشارہ کر کے مزاحاً فرمایا۔ "کہ یہ تو نہیں لیکن ان کے گروہ کے لوگ عجیب ہیں۔ ان کے دل تو جہاں چاہتے ہیں، اٹک جاتے ہیں"۔ پھر ہنستے ہوئے کہا کہ "ایک صاحب تو بے دل ہی ہیں"۔ اس پر مجلس میں خوش طبعی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حاضرین میں سے ایک بڑے میاں نے کہا کہ "نہیں نواب صاحب! ماہر صاحب کو خدا اچھا رکھے، یہ ایسے نہیں ہیں"۔ نواب صاحب نے فوراً کہا کہ میں انھیں کب کہتا ہوں۔ میں تو ان کے گروہ سے متعلق کہہ رہا ہوں"۔

سولھواں شعر پڑھا گیا تو نواب صاحب مرحوم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام رسولؐ عمداً بے سروسامانی میں پیدا کئے گئے تاکہ یہ بتایا جائے کہ کس طرح بے سروسامانیوں میں سے سامان و اسباب پیدا کر کے اور مفلوج، مفلوک اور مغلوب لوگوں میں سے ہادی و پیغمبر کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ انھیں دوسری اقوام پر غلبہ و تسلط بخشتا ہے۔ ابراہیمؑ اپنے بُت تراش چچا کے گھر میں بڑھتے ہیں۔ گھر کا ماحول ہی بتوں کا ہے۔ لیکن وہ بتوں کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر خدا نہیں ہو سکتے۔ تاروں اور سورج چاند کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ غروب اور غائب ہونے والی چیزیں خدا نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح فطرتِ صحیحہ پر قائم رہتے ہوئے "فطرۃ اللہ" کو پا لیتے ہیں اور ایسے اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ دُنیا کی امامت انھیں سونپی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اپنے دشمن کے گھر میں پَل کر جوان ہوتے ہیں، بڑے ہو کر ایک قبطی کو طمانچہ مارتے ہیں۔ جس سے وہ مر جاتا ہے۔ پھر بھاگ کر کنعان میں بارہ سال غائب اور پناہ گزیں رہتے ہیں۔ (غالباً اُس زمانہ کا قانون یہ تھا کہ بارہ سال کے بعد قتل کی سزا معاف ہو جایا کرتی تھی۔ یا پھر غالباً یہ خیال تھا کہ لوگ بھول گئے ہوں گے) بارہ سال کے بعد بیوی کو لے کر نکلتے ہیں اور راستہ میں آگ لینے جاتے ہیں اور پیغمبری لے کر آتے ہیں۔ لیکن پریشان ہیں کہ میں اکیلا باغیوں اور طاغیوں کا مقابلہ کس طرح کر سکوں گا۔ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار و وزیر بنا دے۔ غرض یہ بے سروسامانیاں تھیں لیکن اللہ ان کو صرف ایک ڈنڈا دیتا ہے کہ جاؤ یہ تمہاری کافی مدد کرے گا۔ حضرت عیسیٰؑ عین بے سروسامانیوں میں بے باپ کے پیدا ہوتے ہیں۔ ماں بیچاری اکیلی اور بے سہارا ہے اور لوگوں کی دشنام طرازی سے پریشان۔ لیکن انہی بے سروسامانیوں میں پَل کر وہ جوان ہوتے ہیں اور اسرائیلی بھیڑوں کو سیدھی راہ پر لانے کا کام انھیں سپرد کیا جاتا ہے۔ حضورؐ اکرم باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ماں اور دادا چھوٹی سی عمر میں مر جاتے ہیں۔ چچا بیچارا جس کے خود "لوکری بھر بچے" تھے۔ حتی الامکان مدد کرتا ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کرتے ہیں لیکن وہ برابر بڑھے جاتے

ہیں۔ اور اپنے مشن کو پورا کر دکھاتے ہیں۔ بہرحال تمام رسول جن کو اپنی شریعت دے کر بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح بے سروسامانی میں پیدا کئے گئے اور اسی میں سے اُن کے لئے سامان و اسباب فراہم کیا گیا۔ بجز اُن چند پیغمبروں کے جن کی اپنی شریعت نہیں تھی۔ بلکہ وہ سابقہ پیغمبروں اور رسولوں کی تعلیم کی تجدید کے لئے بھیجے گئے تھے، انھیں بے سروسامانیوں میں پیدا نہیں کیا گیا۔ مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ

مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا اس لئے رشید صاحب اشعار پر سے جلد جلد گزر رہے تھے۔ نواب صاحب نے فوراً کہا کہ "جناب! یہ اشعار اتنے جلد گزرنے کے نہیں۔ آج پڑھ لیجئے۔ انشاء اللہ آئندہ صحبت میں اُن پر بحث کریں گے"۔ چنانچہ درس ختم ہو گیا — گزشتہ اتوار کو مدراس کے ایک صاحب (جو حیدرآباد میں لیکچرار تھے) ایک تقریر لکھ کر یہاں پڑھنے کے مقصد سے آئے تھے۔ یہ تقریر انہوں نے مدراس میں پڑھنے کے لئے تیار کی تھی اور یہاں انھیں غالباً رضی الدین صاحب یا رشید صاحب ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب انہوں نے یہاں یہ عامیانہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو مرعوب ہو گئے۔ اور چونکہ دیر بھی ہو گئی تھی اس لئے نواب صاحب نے فرمایا کہ "آج تو خیر دیر ہو گئی ہے۔ لیکن انشاء اللہ آئندہ اتوار اسے ضرور سنیں گے بلکہ افتتاح اسی سے ہوگا"۔ پھر اُن صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ "دیکھئے! آپ بچ نہیں سکتے کیونکہ ایسے معاملوں میں ہم سُود در سُود وصول کرنے کے عادی ہیں"۔ مگر وہ اس اتوار کو نہیں آئے تھے اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب کی زبانی کہلوا دیا تھا کہ اجی جناب اُن جیسے قابلوں میں تو میں کچھ تقریر نہیں کر سکتا اور اب آنا بیکار ہے کیونکہ اصرار ہوگا اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ جب نواب صاحب سے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات کہی تو نواب صاحب ہنسے اور صوفہ سے اُٹھتے ہوئے کہا "بھوت اچھا حضت بھوت اچھا"[۱] اب نماز مغرب کے لئے سب باہر نکل چکے تھے۔ پہلو کے کمرہ میں نماز کا انتظام ہو رہا تھا۔ نواب صاحب اُس وقت ہلکا جوتا، چوڑی دار پاجامہ اور ناسی رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے تھے جو کفن پہنانے تک جسم پر رہی۔ سر کھلا تھا۔ اس وقت چہرہ عجیب طور پر نورانی اور رعب دار معلوم ہوتا تھا۔ کلامِ اقبال کا نشہ سر میں سمایا ہوا تھا اور اقبال کے حسب ذیل اشعار اور مصرعے بار بار نہایت ذوق سے پڑھ رہے تھے:۔

"کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی"

"تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول"

"ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!"

اور یہ مصرعہ کہ "حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں"۔ بار بار عجیب پُر اثر انداز میں پڑھتے جاتے تھے بلکہ دو چار روز پہلے ہی سے یہ مصرعہ وردِ زبان تھا۔ جس کی معنویت اور حقیقت چند ہی گھنٹوں کے بعد ظاہر ہو گئی۔ جب یہ ذوقِ سفر کا شیدائی قیدِ حیات سے آزاد ہو کر سفرِ آخرت اختیار کر گیا —— نماز کے لئے سب کھڑے ہو گئے تھے، جانمازیں کم ہوئیں تو

[۱] یعنی بہت اچھا حضرت بہت اچھا۔ نواب صاحب مرحوم کبھی کبھی بطور مزاح عوامی بولی خصوصاً حیدرآبادی عوام کی بولی ایسی روانی اور بے تکلفی سے بول جاتے تھے کہ معلوم ہوتا جیسے سچ مچ دیہاتی ہی ہیں اور انھیں شہر کی ہوا تک نہیں لگی۔ مرحوم کو دیہاتی اُردو اور اُس کے محاوروں میں بھی ایسا کمال حاصل تھا کہ گھنٹوں وہ اسی زبان میں تقریر کر سکتے تھے۔ اور انہوں نے بعض دیہات میں تقریریں کی ہیں۔

نواب صاحب نے اندر سے اپنی جانماز اور چادر منگوائی اور ایک صاحب کو جو وہاں اکثر مغرب کی نماز پڑھایا کرتے تھے، امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا۔ نواب صاحب نے دیسی رومال سے جو اکثر ساتھ رہتا تھا "پٹھانی طریقہ" پر اپنا سر لپیٹ لیا اور صفِ اوّل میں شریک ہوگئے ــــ یہ مرحوم کی حیاتِ دُنیوی کی آخری نماز تھی ــــ نماز کے بعد نو دس آدمیوں کے سوا سب چلے گئے۔ رُک جانے والوں میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب، رشید صاحب اور ماہر القادری بھی تھے۔ اہندیہ سب برآمدہ میں چھوٹی میز کے اطراف کھڑے تھے اور متفرق گفتگو میں کر رہے تھے۔ جن میں بعض شہر کے مقامی مسائل سے متعلق تھیں۔

اسی دوران میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے اخبار "اقبال" ہفتہ وار مورخہ یکم رجب ۱۳۶۲ھ کی طرف نواب صاحب کی توجہ مبذول کرائی۔ اس اشاعت میں ایک نوٹ کے ذریعہ نواب صاحب کو جاگیر کی واپسی پر مبارکباد دی گئی تھی۔ نواب صاحب نے اس نوٹ کو باآواز بلند پڑھنا شروع کیا:۔

"ذاتِ شاہانہ نے قائدِ ملت کے گزرانے ہوئے اعزازات کو واپس فرماکے نہ صرف قائدِ ملت بلکہ ملک پر ایک احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ حکیم السیاست سلطان العلوم اپنے خادموں کے اعمال، ان کی خدمات اور ان کے احساسات کو بلا امتیازِ مذہب و ملت قدر کی نگاہ سے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اور جب کوئی خادم کسی غلطی کا مرتکب ہو رہا ہو یا حد سے تجاوز کر رہا ہو تو فوری تنبیہ فرماکے اُس کو صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں ــــ (جب یہاں پہنچے تو مسکراتے ہوئے مزہ لے کر کہا کہ "ایں! میں نے غلطی کیا کی؟ اسے تو مجھ کو قصور وار بھی قرار دے دیا ہے") تاکہ زمانہ کی اندھا دھند تقلید سے وہ سپید و سیاہ میں کھو کر کہیں اپنے مقام سے نہ ہٹ جائے۔

وہ قائدِ ملت جو اپنے اندر ایک تڑپتا ہوا دل اور ملک و مالک کا درد رکھتا ہو اور جو تختِ آصفی کی بقا کے لئے جانی و مالی قربانی سے مُنہ موڑنا کفر و الحاد تصور کرتا ہو۔ اُس کی عقیدت مندی اور گفتار و کردار کو کچھ اس کا مالک ہی بہتر سمجھ سکتا ہے (اس جملہ کو پڑھ کر فرمایا کہ "خوب! مجھ سے مقاماتِ سلوک بھی طے کروائے گئے ہیں") دُور سے دیکھنے والے ان حقائق سے کس طرح صحیح طور پر واقف ہوسکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے سچ فرمایا ہے:۔

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ــــ پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

ہم ان اعزازات کی واپسی پر قائدِ ملت کو نہیں بلکہ سارے ملک کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔

توقع ہے کہ بہادر خاں، بہادر یار جنگ کے روپ میں پھر سے جلوہ گر ہوکر اپنے سوئے ہوئے طبقہ جاگیرداراں میں احساسِ خدمت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں جو مقامی اخبارات اور حکومتِ وقت کی روش سے متعلق تھیں۔ اب ساڑھے آٹھ بلکہ نو بج گئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم بالعموم اس وقت زنانے میں تشریف لے جاتے تھے لیکن آج انھیں میر ہاشم علی خاں صاحب جج ہائیکورٹ کے ہاں رات کے کھانے پر جانا تھا اس لئے زنانہ میں جانے کی بجائے وہ باہر ہی سے چل پڑے۔ شوفر سے کہا کہ شاید مجھے واپسی میں بہت دیر ہوجائے، تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی اور خود موٹر چلاتے ہوئے دعوت میں تشریف لے گئے۔ یہ دعوتِ طعام

نہ تھی، اصل میں دعوتِ مرگ تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر اصحاب پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ کھانے میں کچھ دیر تھی، گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ کلامِ اقبال ہی کا تذکرہ تھا۔ مرحوم اپنے انوکھے انداز میں اُس کے محاسن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اس دوران میں ایک حقہ مرحوم کے قریب رکھ دیا گیا۔ ابھی دو ایک کش بھی نہ لے سکے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوا۔ اور اس کے معاً بعد ایک تشنجی دورہ بھی۔ حقہ کی نے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سر نیچے آگیا۔ ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ روح نے بدن کو چھوڑ دیا اور یہ "مردِ حق"۔ دیرینہ "کے" افسوں" کو توڑ کر ربی الاعلیٰ سے جا ملا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ !

انتقال کی اطلاع بہت سے لوگوں کو رات میں مل گئی اور بہت سے لوگوں کو صبح اس کی خبر ملی۔ مولانا عبدالجبار صاحب (سابق واعظ سرکار عالی) کا بیان ہے کہ انہوں نے شبِ وفات ایک خواب دیکھا۔ کسی بڑے ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال بے قراری اور بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں، چہرہ سے بے حد رنج و ملال ٹپک رہا ہے۔ موصوف نے دریافتِ حال کی تو علامہ نے فرمایا کہ "میرے بچے کا انتقال ہوگیا ہے"۔ یہ کہہ کر علامہ ایک طرف چلے، موصوف بھی ساتھ ہوگئے۔ سامنے ریل کے ڈبہ میں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ سب سوگوار و غمگین تھیں۔ اس کے معاً بعد خواب ختم ہوگیا۔ بیدار ہوتے ہی مولانا موصوف کا ذہن علامہ اقبال کے فرزند جاوید کی طرف منتقل ہوا اور وہ اسی فکر و پریشانی میں صبح تک جاگتے رہے۔ لیکن فجر کی نماز کے بعد انہیں بہادر خاں کی وفات کی دلخراش و جگر شگاف خبر ملی اور معلوم ہوا کہ آخری وقت وہ اپنے روحانی باپ ہی کا ذکر کر رہے تھے !

اللہ تعالیٰ ان دونوں روحانی باپ بیٹوں اور استاد شاگردوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اُن پر اپنی رحمتِ کاملہ نازل کرے ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان کی باقیات الصالحات سے مسلمانوں کو مستفید ہونے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین !

ماہر القادری

صبحِ نو

بارک اللہ! یہ طلوعِ سحر
سامنے ہے نشانِ راہگزر
چشمِ نرگس بھی ہو گئی بیدار
دیکھ کر بوئے گل کو گرمِ سفر
نبضِ خس میں بھی روح دوڑ گئی
دلِ شبنم میں جاگ اٹھے ہیں شرر
بلبلوں کی چہک میں سوزِ یقیں
طوطیوں کو کلامِ حق ازبر
شاخ لچکی ہوا کے نغموں سے
سبزہ جاگا ہے زمزمے سن کر
صبح دم اوس کے سکوروں میں
خندۂ گل نے گھول دی ہے شکر
بادۂ پرتگال کے بدلے
لائے کوزوں میں زمزم و کوثر
شرم و غیرت کے ہیں لطیف حجاب
مہ وشوں کے حسین چہروں پر
سادگی بھی وقار و عصمت بھی
ایک سے ایک قیمتی زیور

اپنی محفل ہے اپنے جلوے ہیں
رخصت اے رونقِ متاعِ دگر
اپنے معدن ہیں اپنے گلشن ہیں
اپنے پھول اور اپنے لعل و گہر
ایک کشتی کے سب مسافر ہیں
ایک ہے ایک سب کا نفع و ضرر

بوریا، تخت کے مقابل ہے
اب نہیں کوئی طغرل و سنجر

یہ محبت کے ناوک و فتراک
یہ خلوص و وفا کی تیغ و سپر
عزمِ بیباک کی کمندیں ہیں
جوشِ خود دار کی زرہ بکتر
ہر مجاہد کی ہیں نگاہوں میں
بدر و یرموک و خندق و خیبر
ہمرکابی میں عزت و اقبال
ہیں جلو میں نشانِ فتح و ظفر

جاگ اٹھا ہے عزمِ ابراہیم
اب نہ ابھرے گی صنعتِ آذر
تجربہ نے یہ راز کھول دیا
بے یقینی ہے مرگِ قلب و نظر
جلوہ گر ہیں نشان سجدوں کے
اہلِ اخلاص کی جبینوں پر
اپنے اللہ پہ بھروسا ہے
اب کسی کا نہ خوف ہے نہ خطر
کوئی عشوہ نہ دے سکے گا فریب
اب نظر ہے کتاب و سنت پر
ہر نفس میں ہے نعرۂ تکبیر!
دل کی دھڑکن ہے یا اذانِ سحر

☆

شعلہ و شبنم

قابل اجمیری

وہ خیالوں میں کہیں شعلہ کہیں شبنم رہے
ایک اندازِ کرم کے مختلف عالم رہے

بات بھی تشنہ رہی الفاظ بھی مبہم رہے
عہد و پیمانِ نظر لیکن بڑے محکم رہے

سینہ چاکانِ چمن سے پوچھیے شانِ حیات
مسکرا کر بھی شریکِ گریۂ شبنم رہے

نو بہ نو انداز سے آتا ہے ظالم سامنے
آدمی آخر کہاں تک بے نیازِ غم رہے

ربطِ خاطر کی نزاکت کو سمجھ سکتا ہے کون
آرزو کی آپ نے، محوِ تجسس ہم رہے

ہر نفس بھی حادثہ ہر آرزو بھی حادثہ
حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے

انقلابوں سے ہماری سخت جانی پوچھیے
مٹتے مٹتے بھی نشانِ عظمتِ آدم رہے

مجھ سے ہمدردی تو ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو
میری آنکھیں سوکھ جائیں تیرا دامن نم رہے

جلوہ گاہِ ناز سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ
جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم رہے

قابلؔ اپنا دردِ محرومی سمجھ سکتا ہے کون
عمر بھر طوفاں سے کھیلے تشنۂ شبنم رہے

کوثر نیازی

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد! کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے

کیا چیز ہے اللہ رے وہ شوخ تبسم
اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے

اب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز
اب حسن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے

صیاد نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

راحی بلند شہری

جس پہ گزرا ہی نہ ہو مرحلۂ گیسو و قد
وہ بھلا مرحلۂ دار و رسن کیا جانے

جس کے شانوں پہ نہ بکھری ہوں گھنیری زلفیں
وہ بھلا سایۂ شمشاد و سمن کیا جانے

جس نے لوٹی ہی نہ ہو جلوۂ عارض کی بہار
وہ بھلا جلوۂ گلرنگِ چمن کیا جانے

کوئی پُر کیف نغمہ چھیڑ مطرب!
یہ رنگیں شام پھر آئے نہ آئے

رات ڈھلنے کو ہے بجھنے کو ہیں محفل کے چراغ
اور کچھ دیر ذرا دور چلے اے ساقی

رُوحِ انتخاب

جو شخص کہتا ہے کہ اسلام آجانے کے بعد بھی ادیانِ سابقہ کا اتباع درست ہے، وہ دراصل اسلام سے دعوتِ عام کا حق چھینتا ہے۔ کیونکہ جب اسلام کے سوا دوسرے طریقوں سے بھی ہدایت ممکن ہو تو تمام اقوام و ملل کو اسلام کی طرف دعوت دینا ایک فضول حرکت ہوگی اور جو شخص کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر زمانہ کی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے حذف و ترمیم اور اصلاح و اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ دراصل اسلام سے دوام کا حق سلب کرتا ہے۔ کیونکہ جو دین ناقص ہو اور حذف و اضافہ کا محتاج ہو وہ ہمیشہ کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کا دعویٰ کرے تو اُس کا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔ پھر جو شخص کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انبیاء کے آنے کی گنجائش ہے وہ درحقیقت اسلام کے استحکام پر ضرب لگاتا ہے۔ نبوّت کا دروازہ کھلا رہنے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی جمعیت ہمیشہ پراگندگی اور تفریق کے خطرہ میں مبتلا رہے! ہر نئے نبی کے آنے پر کفر و اسلام کی ایک نئی تفریق ہو اور ہر ایسے موقع پر بہت سے وہ لوگ اسلام سے خارج ہوتے چلے جائیں جو خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والے ہیں!

پس اسلام میں نبوت کا فتح باب درحقیقت فتنے کا فتح باب ہے، اسلام کی بیخ کنی کے جتنے اسباب ممکن ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام میں نبوت کا دعویٰ کرے!

اُمتِ مسلمہ کا نظامِ جمعیت اسی بنیاد پر تو قائم کیا گیا تھا جو لوگ محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ سب مسلم اور مومن ہیں، ایک ملت ہیں، ایک قوم ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں، رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں، اب اگر کوئی شخص آئے اور کہے کہ محمدؐ اور قرآن پر ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ جو مجھ پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اگرچہ وہ محمدؐ اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔ پھر اسی بناء پر وہ مسلمانوں میں کفر و اسلام کی تفریق کرے اور اس قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کردے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم بنایا تھا، ان لوگوں کے درمیان برادری کے رشتے کو کاٹ دے، جنہیں قرآن نے

"انما المؤمنون اخوۃ"

کہہ کر بھائی بھائی بنایا تھا، اُن کی نمازیں الگ کردے، اُن کے درمیان مناکحت کے تعلقات توڑ دے، حتیٰ کہ اُن میں عیادت و تعزیت اور شرکتِ جنازات کا تعین بھی باقی نہ رکھے، تو اس سے بڑھ کر اسلام، اسلامی قومیت، اسلامی تہذیب اور اسلام کے نظامِ جماعت کے ساتھ اور کیا دشمنی ہو سکتی ہے!

(اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

سحر البیان | از:- اختر زبیری لکھنوی۔ ضخامت ۷۲ صفحات (بڑا سائز) سرورق جاذبِ نظر، کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ فی جلد ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ۲/۷ زیارت لائنس ملیر کینٹ کراچی ۱۹۔

جناب اختر زبیری اسلام پسند شاعر ہیں۔ حمد، نعت اور مناقب اہلبیت و صحابہ اُن کی شاعری کا موضوع رہے ہیں۔ موصوف کئی سال سے قرآن پاک کے ترجمہ کو اُردو نظم کا لباسِ موزوں پہنانے میں مصروف ہیں۔ پارۂ عم (تیسویں پارے) کا ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ جس کو مشاہیر علماء نے سراہا ہے اور یہ تمام آراء "سحر البیان" کے آخر میں درج ہیں۔

قرآن پاک کے اُردو میں چند منظوم ترجمے ہوئے ہیں۔ پچھلے شاعروں میں آغا شاعر دہلوی کا منظوم ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اور دورِ حاضر میں جناب اختر زبیری لکھنوی کا منظوم ترجمہ بہت خوب ہے بلکہ بعض خصوصیات میں یہ تمام منظوم ترجموں پر فوقیت رکھتا ہے:-

وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ

فلک جس وقت پھٹ جائے، ستارے جبکہ گر جائیں
سمندر "جوش میں" جس دم حدوں سے اپنی بہہ نکلیں

فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ

تِرے اعضا کو پھر شانِ تناسب بخش دی اُس نے
خصائل میں ترے کامل ہم آہنگی رکھی اُس نے

قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ

دھڑکتے ہوں گے کتنے قلب اُس دن خوف و دہشت سے
جھکی ہوں گی نگاہیں کس قدر فرطِ ندامت سے

ایک مصرعہ ہے:-

تمام عالم کی روحیں اور فرشتے سارے صف بستہ (صفحہ ۵)

تقطیع میں عالم کا "ع" گر جاتا ہے۔

فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ

بس اُن پر قہر کا کوڑا چلایا آپ کے رب نے (صفحہ ۲۹)

اُردو روزمرہ "کوڑا گھمانا" ہے۔

اسی صفحہ ۲۹ پر "فاما الانسان" میں "ن" لکھنے سے رہ گیا۔ آئندہ ایڈیشن میں کتابت کی اس بھول چوک کی تصحیح کر دینی ضروری ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۙ

تمہیں غافل بنایا ہے بہ ہر تقدیر کثرت نے یہاں تک کہ تم اپنے مرقدوں تک ہو پہنچ جاتے (ص ۲۴۴)
ترجمہ میں "کثرت" پڑھ کر "قلّت و کثرتِ تعداد" کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ ترجمہ قریب قریب اس انداز پر ہونا چاہیئے تھا:-

ہوس اور حرص کی کثرت نے غافل کردیا تم کو یہاں تک کہ تم اپنی قبریں اپنی آنکھ سے دیکھو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ "

"ہم نے نہیں سکھایا (محمدؐ رسول اللہ) کو شعر اور یہ (شاعری) اس کے شایانِ شان بھی نہیں ہے"

جس چیز (شاعری) کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں نفی فرمائی ہے اور جسے نبوّت کے شایانِ شان نہیں سمجھا اُس (قرآن) کا شعر میں ترجمہ کرنا کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ ترجمہ بہ ہرحال قرآن ہی کے لفظوں اور آیتوں کا ترجمہ ہے۔ لہٰذا جب متن اور اصل سے شاعری کی نسبت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے تو اُس کے ترجمہ سے بھی یہ نسبت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہو سکتی! حیرت ہے کہ بعض مفکّر علماء تک کی نگاہ اس طرف نہیں گئی اور انہوں نے اپنی رائے کے اظہار میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا!

دُوسری بات یہ ہے کہ شاعری میں حُسنِ خیال اور نزاکتِ تصوّر کو بہت کچھ دخل ہے اور ترجمہ میں اور وہ بھی قرآن پاک کے ترجمہ میں شاعر کی فکر و تخئیل اپنے جوہر نہیں دکھا سکتی اس لئے منظوم ترجمہ لازماً "شعریت" سے خالی ہوگا۔ پھر اُس کے ترجمہ سے کیا فائدہ؟

منظوم ترجمہ کا نام ــــ سحرالبیان ــــ بھی محلِ اعتراض ہے۔ قرآن کے ترجمہ کو "بیان کا جادو" کہنا کسی طرح موزوں نہیں۔ قرآن کا ترجمہ اور اس سے "شاعری اور سحر" کی نسبتیں! توبہ۔ توبہ! پھر میر حسن دہلوی کی مثنوی "سحرالبیان" اُردو زبان میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اس مشہور نام کو اس طرح لے لینا اگر توارد ہے تو کس قدر جرأت آمیز توارد ہے!

تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ از:- علامہ سید ابنِ حسن رضوی جارچوی۔ حصہ دوم۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت مجلّد تین روپے غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ حصہ سوم، ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت مجلّد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ انیس، لالوکھیت، کراچی۔

جناب مولانا سید ابنِ حسن رضوی جارچوی ایک خوش بیان خطیب اور وسیع المطالعہ عالم ہیں۔ موصوف نے "تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ" کے عنوان سے تاریخ کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی تین جلدیں اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ علامہ جارچوی کا اندازِ نگارش دل نشین ہے۔ کتاب میں جا بجا تاریخی حوالے دیئے ہیں۔ مگر اُنہی حوالوں ــــ (Reference) ــــ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جن سے شیعی نقطۂ نگاہ کی تائید ہوتی ہے!

"آنحضرتؐ نے ابوطالب کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ اللہ نے یہ موقع دیا کہ چچا کے احسان کا کچھ بدلا ادا ہو جائے"۔ (ص۔۔)

اگر یہ عبارت لکھتے وقت مصنف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ابوطالب کی عظمت اور محبّت کا غلبہ نہ ہو جاتا تو وہ ان الفاظ میں کہ "چچا کے احسان کا کچھ بدلہ ادا ہو جائے" اپنے مفہوم کا اظہار نہ کرتے!

"آنحضرتؐ اگر کوئی اور کام نہ کر سکتے اور صرف علیؑ ہی کو چھوڑ جاتے تو دُنیا بجا طور پر کہہ سکتی تھی کہ انہوں نے
علوم و فنون اور تمدن و معاشرت کو ایک گراں بہا عطیہ دیا اور انسانیت کو ایسا کامل نمونہ چھوڑا کہ جس کی
نظیر ملنا دشوار ہے۔" (ص۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جہاد فرماتے، نہ قرآن کی تعلیم دیتے، نہ صحابہ اور اہلِ بیت کا تزکیہ نفس کرتے.....
بس صرف "علیؑ" ہی کو تنہا چھوڑ جاتے تو بھی...... ! یہ عقیدت کی کس قدر مبالغہ آمیزی ہے!

"مگر بر سرِ اقتدار لوگ فوجوں کا رُخ آس پاس کے ملکوں کی طرف موڑے ہوئے تھے اور عرب کے
پُرانے لُوٹ مار کے جذبہ کی تسکین روم و ایران کے خزانوں سے کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
تھوڑے عرصہ میں سلطنت کے حدود بڑھ گئے اور حکمرانی کے حوصلہ نکالنے کے لئے ایک وسیع
میدان مل گیا....." (ص۱۴)

عہدِ خلافتِ راشدہ میں کفار سے جو جہاد کیا گیا تھا اُسے "لُوٹ مار" کہنا کتنی کھلی ہوئی ناانصافی، کج بحثی اور دھاندلی
بلکہ قساوتِ قلبی کا ثبوت ہے۔ شاید مجوسیت کی تباہی اور ایران کی فتح کا زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا؟ تاریخ اسلام کے
درخشندہ ترین دور پر اس قسم کی بے جا طنز کرنا خود تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ مہ و انجم پر جو یہ صدیوں سے خاک اڑائی جا رہی
ہے اُس سے خاک اڑانے والوں کے چہرے ہی گرد آلود ہو گئے، اُن روشن ستاروں کا کچھ نہیں بگڑا! (موتوا بغیظکم)

انجمن ترقی اُردو پاکستان کے آرگن "اُردو" میں معرکۂ کربلا کو "سیاسی اقتدار کی جنگ" لکھ دینے پر ایک وفد
پاکستان کے اربابِ اقتدار سے جاکر ملا تھا اور اس مضمون کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس احتجاج میں ہم عقیدت مندانِ
حسینؑ اور حلقہ بگوشانِ اہلِ بیت کی تمنائیں بھی شریک تھیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت
کی جنگوں کو جو مسلمانوں سے نہیں کافروں سے لڑی گئی تھیں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں اُن کو "لُوٹ مار"
کہہ دینے سے نہ کسی شخصیت کی توہین ہوتی ہے، نہ کسی کا دل دکھتا ہے اور نہ کسی کی عقیدت کو ٹھیس پہنچتی ہے!!!
کیا انصاف ہے؟

حصہ سوئم میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ ظاہری طور پر تو موٹا جھوٹا لباس پہنتے تھے مگر
اس کے نیچے ملائم لباس ہوتا تھا۔ یہ صاحبِ کافی کی نری دروغ بافی ہے۔ سفیان ثوری اُن چند علماءِ امت میں سے ہیں
جن کا زہد و تقویٰ ضرب المثل بن چکا ہے اور اُن پر کسی نے بھی ریاکاری کا الزام نہیں لگایا!

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے صاحبزادے محمد المنتظر کی غیبتِ صغریٰ اور غیبتِ کبریٰ کا عقیدہ اور یہ کہ یہی
امام مہدی ہیں جو قیامت سے پہلے ظہور بالسیف فرمائیں گے ـــــ خالص شیعی عقیدہ ہے اور اس کی جو تفصیل "تذکرہ محمدؐ
و آلِ محمدؐ" میں درج ہے اُس میں تاریخ سے زیادہ افسانہ و حکایت کا رنگ غالب نظر آتا ہے!

"آٹھ مہینے پلک جھپکتے ہوئے گزر گئے۔" (ص۸)، "ہوئے" اس میں زائد ہے۔

(ص۱۱ حصہ دوم) "فرزدق" کی جگہ "فرزوق" (بجائے "دال" کے "واو") کتابت کی غلطی ہے۔

"حضرت اسمٰعیل، امام جعفر صادقؑ کے بڑے بیٹے تھے۔ اُن کا انتقال ہو گیا تو لوگ تعزیت کے لئے
آنا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ عیون الاخبار میں لکھتے ہیں

کہ حضرت اسمٰعیل کی وفات کے دوسرے دن کچھ لوگ تعزیت کے لئے آئے تو حضرت نے اُن کیلئے کھانا منگوایا اور خود بھی سیر ہو کر کھانا کھایا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لوگوں کو تعجب تھا کہ چہرے پر غم کے آثار بالکل نمایاں نہ تھے۔ بعض لوگوں نے جرأت کر کے سوال کر ہی لیا کہ جوان بیٹے کی موت کا آپ پر کچھ اثر نہیں۔ فرمایا۔ موت برحق ہے، جلد یا بدیر سب کو مرنا ہے۔ جو دُنیا کی ناپائیداری سے واقف ہیں موت ہر وقت اُن کے سامنے رہتی ہے۔ اللہ جس کو چاہے اور جس وقت چاہے اُٹھالے، ہم خالقِ اکبر کے سامنے سر جھکانے ہیں۔" (ص ۱۳۱-۱۳۲ حصہ سوم)

بیشک صبر وضبط اور تسلیم و رضا ہی اہلبیتِ کرام کی سنت رہی ہے، جزع، فزع، سر و سینہ کو ہاتھوں سے پیٹنا، شارع عام پر سینہ کوبی کا مظاہرہ، بلکہ کرایہ پر لوگوں سے چھریوں اور چاقوؤں کا ماتم کرانا۔ گھوڑوں پر لہو چھڑک کر اور اُن کی زینوں میں تیر چھید کر گلی گلی گھمانا اور لاشے، جھولے اور مہندیاں نکالنا سب بدعات ہیں۔ اہل بیت نے یہ کام کبھی نہیں کئے۔ قیامت کے دن اہل بیت کرام اس قسم کے غیر اسلامی عقائد اور مظاہروں سے اپنی برأت فرمائیں گے!

علامہ سید ابن حسن جارچوی معتدل شیعی عالم ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے معتقدات کو نسبتاً نرم لہجہ میں ظاہر فرمایا ہے۔ مگر جو غالی ہیں وہ یہی باتیں "سب وشتم" کے انداز میں کہتے ہیں! یہ کتابیں تاریخی اعتبار سے ایک خاص فرقہ کی ترجمان بن کر رہ گئی ہیں!

اسلام کا نظامِ حکومت تالیف :- مولانا حامد الانصاری غازی۔ ضخامت ۵۶۴ صفحات۔ سفید چکنا کاغذ۔ کتابت جلی، طباعت دیدہ زیب۔ جلد پر کتاب کا نام سنہری حرفوں میں منقوش ہے۔ خوبصورت گرد پوش، مجلّد سات روپے، غیر مجلد چھ روپے۔ ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

یہ کتاب سہ روزہ مدینہ (بجنور) کے سابق مدیر شہیر مولانا حامد الانصاری غازی کی گرانقدر تالیف ہے۔ اور اُردو زبان میں اپنی جامعیت اور وسعتِ معلومات کے اعتبار سے اُونچے درجہ کی کتاب ہے۔ "اسلامی نظامِ حکومت" سے شغف لائق مصنّف کو اپنے والد علامہ منصور انصاری مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ کتاب غازی صاحب کے سالہا سال کے غور وفکر اور تحقیق وتفحص کا حاصل ہے۔ تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ اور لغت کی بیسوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ ایک کتاب تالیف کی گئی ہے۔ شاید ہی کتاب کا کوئی صفحہ کتابوں کے حوالوں سے خالی ہو۔ اس چیز نے کتاب کے وزن کو اور بڑھا دیا ہے۔ کتاب کے چند اہم عنوانات :-

حکومت کا مفہوم — حکومت کی پہلی تقسیم — حکومت کا قیام — زمانۂ تاریخ کی حکومتیں — شاہی، دستورشاہی، اعیانی، عمومی اور جمہوری حکومتیں — فیڈرل حکومتیں — فطری حکومت — اسلام سے پہلے کی تاریخی حکومتیں — اسلام اور حکومت — قرآن عظیم کے نظریات — اقتدارِ اعلیٰ — قانونی تشریحات و نظائر — انتخاب کے بنیادی اصول — قانونِ حکومت — رئیسِ حکومت کے فرائض واختیارات — فوج کی تشکیل — اسلامی حکومت کا موازنہ قدیم حکومتوں سے —!

کتاب کا مقصد تالیف عوام وخواص کو یہ بتانا ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام اور اس کے لئے جد وجہد کرنا

کوئی دُنیاداری کا کام نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت کے عین منشاء کے مطابق ہے اور اسلامی حکومت زمین پر خدائے عرش عظیم کی قوّتِ قاہرہ اور قدرتِ عادلہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسلامی حکومت کس اساس پر قائم ہوتی ہے؟ اُس کے چلانے والوں کی قابلیت اور کردار کیسے ہونے چاہئیں؟ خلفائے راشدین نے کس طرح حکومت کی؟ اسلامی حکومت کے محکمے اور صیغے اور اُن کے فرائض کیا ہیں؟ یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ملتی ہیں۔

زبان و انشاء کا انداز یہ ہے:۔

"حضرت عمرؓ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے صحابہ نے خود بخود قبول اسلام کا شرف حاصل کیا اور آپ کا اسلام لانا پیغمبرِ اسلام کی آرزوؤں میں سے بجائے خود ایک آرزو تھی۔"

تبلیغی جماعت کے اکابر اگر سرگرمیں نہ ہوں تو چند اقتباسات اُن کی نذر کئے جاتے ہیں:۔

— "بظاہر نماز کی امامت کا منصب سیاسی امامت سے زیادہ اہم ہونا چاہیئے، لیکن ہمارے فقہاء اور علماء کسی ایک رائے کے اختلاف کے بغیر یہ کہتے ہیں کہ نماز کی امامت سے سیاسی امامت بڑی چیز ہے، اول الذکر امامتِ صغریٰ ہے اور ثانی الذکر امامتِ کبریٰ۔"

— "قرآن میں حکومت کے لئے امانت کا لفظ بھی موجود ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو انسان کو یہ سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے کہ حکومت انسان کے ہاتھ میں ایک سنگین امانت ہے۔" (شاہ ولی اللہؒ دہلوی)

— "امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق حکومت کرے، امانت کو ادا کرے، جب امام اس طرح حکومت کا فرض انجام دے تو عوام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کو سُنیں اور اطاعت کریں، جب وہ میدانِ عمل میں بلائے تو اس کی آواز پر لبیک کہیں۔" (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

— "جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ، رسُول اور مسلمانوں کے حق اور اُن کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔" (فاروق اعظمؓ)

پوری کتاب اس کلیسائی نظریہ کی کہ "دین وسیاست جُدا جُدا ہیں" نفی کرتی ہے بلکہ اس راہبانہ تصوّر پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ یہ کتاب اس مقدس جذبہ کو اُبھارتی ہے کہ اللہ کی زمین کے حقیقی وارث صالحین ہیں اور جس جس جگہ خدا کے نافرمانوں اور باغیوں کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہے، وہ "غصب" ہے اور مالِ مغصوبہ کو غاصبین سے چھین کر اس کے حقداروں کے ہاتھوں میں پہنچا دینا دین ہی کا کام ہے بلکہ دین کا تقاضا ہے!

کتاب کا وہ حصّہ بہت اہم ہے جس میں قدیم وجدید حکومتوں سے اسلامی حکومت کا مقابلہ کرکے اُن کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ "اسلام کا اشتراکی دستور" یہ عنوان البتہ کھٹکا۔ مگر اسلامی حکومت اور اشتراکیت میں جو فرق دکھایا گیا ہے اس نے اس خلش کی تلافی کردی!

صفحہ پر "ذی الاکناف" کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح "ذی الاکتاف" ہے، ("ت" کے ساتھ) "بنو غسان نے شام کو ڈیرہ آباد کیا" (صفحہ) "ڈیرہ لگانا" محاورہ ہے۔ شوریٰ سے "شورائی" کے بجائے بعض مقامات پر "شوروی" پڑھ کر طبیعت نے اجنبیت سی محسوس کی!

کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے خوب ہے، یہ دُوسرا ایڈیشن ہے، کتاب غالباً دس بارہ سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ کتاب اب لکھی جاتی تو اس عرصہ میں عربی اور اُردو میں "اسلامی حکومت" پر جو معلومات آفریں کتابیں آچکی ہیں، وہ فاضل مؤلف کی نظر سے گزر جاتیں تو استدلال زیادہ نکھر جاتا اور معلومات میں بھی خاصہ اضافہ ہو جاتا۔
ندوۃ المصنفین نے یہ کتاب چھاپ کر ادب و انشاء، دین و اخلاق اور علم و انسانیت کی مفید خدمت انجام دی ہے۔!

تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی | از:- منشی عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات۔ مجلّد، رنگین گردپوش کیساتھ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- ادارۂ نشر المعارف، چہل بیک، ملتان شہر۔

اس کتاب کے آغاز میں اُن اسباب و محرکات کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے، جن کو دیکھ کر مسلمانوں کو قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا مطالبہ کرنا پڑا۔ ان تاریخی حقائق کا آغاز سیواجی مرہٹہ کی مسلم دشمنی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد رام راج کی مہم، راشٹریہ سیوک سنگھ کے قیام، آریہ سماج کی تحریک، گئو رکھشا، ہندو مہاسبھا اور شدھی کے فتنوں کا ذکر ہے!
اس کے بعد پاکستان کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ کا سب سے بڑا انکشاف:-

> "اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا، بالکل وہی خیال اُن سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے، بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔" (صفحہ ۵)

فاضل مصنف کی یہ ریسرچ قابلِ قدر ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور قائد اعظم مرحوم کی قیام پاکستان کے سلسلہ میں خط و کتابت رہتی تھی۔ تھانہ بھون سے مسٹر محمد علی جناح کی خدمت میں علماء کے وفود جاتے رہتے تھے۔ طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ قائد اعظم کو مولانا تھانوی وعظ و تلقین فرماتے رہتے تھے ـــــ یہ باتیں اس تفصیل کے ساتھ پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس کے راویوں میں دیوبند کے بلند پایہ علماء شامل ہیں۔ لہٰذا ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان روایتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں!
قیامِ پاکستان میں علماءِ کرام کی جد و جہد کو اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کوئی شک نہیں کہ مطالبۂ پاکستان کو علماءِ کرام کی تائید سے بڑی تقویت پہنچائی ہے ان میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔
اس کتاب کی ثقاہت کو جس چیز نے مجروح کر دیا ہے، وہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی بیجا مخالفت ہے فاضل مصنف نے اُنہی پٹی ہوئی دلیلوں کو دہرایا ہے جو عوام و خواص کے نزدیک "تہمت و افتراء" ثابت ہو چکی ہیں ـــــ!
مثلاً جماعت اسلامی پر یہ الزام لگانا کہ وہ جہادِ کشمیر کی مخالفت کرتی رہی (صفحہ ۲۵۱) کتنی سنگین تہمت اور افترا پردازی ہے۔ جماعت اسلامی نے جہادِ کشمیر کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ اُس نے کشمیر کے معاملہ میں ہمیشہ حکومتِ پاکستان کے موقف کی تائید کی! مولانا مودودی نے ڈنکے کی چوٹ کہا تھا کہ آزاد قبائل اور خود کشمیر کے جو مجاہدین جنگ کر رہے ہیں، پاکستان کے مسلمانوں کو اُن کی دعاؤں سے، روپے پیسے سے اور ہتھیاروں سے امداد کرنی چاہیے۔ لیکن جب تک پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں ایک دوسرے کی معاہد ہیں، ایسی حالت میں پاکستان کے مسلمانوں کا از خود ہندوستان سے جنگ کرنا

درست نہیں۔ اگر مولانا مودودی کے اس اشارے کی اہمیت کو سمجھ لیا جاتا اور جب مجاہدین بارہ مولا تک پہنچ چکے تھے، اس وقت حکومت پاکستان خود میدان میں آ کر جنگ کے محاذ کو سنبھال لیتی تو ہندوستان کی فوجیں سری نگر کے ہوائی اڈے پر نہ اتر سکتیں اور کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی گود میں آجاتا۔

جناب مصنف "جماعت اسلامی" کی "فرد جرم" (؟) پر تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے اقتباسات سے دلیل دے سکا یہ معال لاسیر میں۔ اور یہ اُن کے مؤقف کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں لاہور میں مارشل لا، نافذ ہوا تھا اور اس کی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس میں اسلام کی جو عجیب و غریب تعبیریں کی گئی ہیں اور جس فکر و نظر کا مظاہرہ فرمایا گیا ہے اس کو پڑھ کر اسلام پسندوں کا دل لہو لہو ہو گیا ہے۔ خود فاضل مصنف کے قلب کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ مگر جماعت اسلامی کو بدنام کرنے کی خاطر وہ چیف جسٹس مسٹر منیر اور جسٹس مسٹر کیانی کے افکار کو سراہتے ہیں۔ وہ نہیں سوچتے کہ وہ ریت کے ڈھیروں پر اپنی کمیں گاہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں!

۱۹۴۸ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں محمد طفیل صاحب کو حکومت پاکستان نے سیفٹی ایکٹ کے تحت اس جرم میں گرفتار کیا تھا کہ یہ حضرات پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے داعی تھے۔ حکومت کے اس ظلم کو منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب ان لفظوں میں جائز ٹھہراتے ہیں:۔

"جماعت اسلامی بدستور پاکستان کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ جس کی تفصیل پیچھے پیش کی جا چکی ہے، اس لئے حکومت پاکستان نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔۔۔۔ (ان لوگوں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔) (ص۱۸۱)

اس سے اگلے صفحہ ۱۸۲ پر مودودی صاحب پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اُن کے فتووں نے سول سیکرٹریٹ میں گڑبڑ پیدا کر دی تھی اور جماعت اسلامی کی ریشہ دوانیوں سے آئندہ انتظامی مشینری میں تعطل پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔

اگر حکومت کے پاس جماعت اسلامی کی معاندانہ سرگرمیوں کی شہادتیں اور ثبوت موجود تھے تو دیانت و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ مولانا مودودی اور اُن کے رفقاء پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا۔ مقدمہ چلائے بغیر جماعت اسلامی کے اکابر کو نظر بند کر دینا ظاہر کرتا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی ایسی شہادت اور ثبوت موجود نہ تھا جس سے عدالت میں ان حضرات کا مجرم ہونا ثابت ہوتا۔ اس لئے۔ ع

اس خطا پر ہمیں مارا کہ خطا کار نہ تھے!

جماعت اسلامی نے اسلامی دستور سازی کے لئے آٹھ سال تک مسلسل مہم چلائی ہے اور جلوس نکالے ہیں مگر کہیں بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیدا نہیں ہوا۔ ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کے جلسوں میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے اور دقت کے ساتھ شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے مگر جماعت اسلامی کی طرف سے قانون شکنی نہیں کی گئی۔ جماعت کے امیر (مولانا مودودی) کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے، ایسے نازک ترین موقع پر بھی جماعت اسلامی مثالی صبر و ضبط اور قانون کے احترام کا مظاہرہ کرتی ہے! ایسی جماعت سے گڑبڑ اور انتشار کی نسبت کتنی دردناک تہمت ہے!

"جناب مودودی صاحب اس امر سے آگاہ ہو چکے تھے کہ سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی مرحوم) کو تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت کے لئے طلب کیا گیا ہے، وہ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں

مبتلا تھے کہ اگر سید صاحب نے یہ پیشکش منظور نہ کی تو شاید یہ اعزاز انھیں بخشا جائے۔" (ص ۲۱)

صرف یہی ایک اقتباس مصنف کی ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ مولانا مودودی کی ذات سے کس درجہ عناد رکھتے ہیں اور ایسی ایسی تہمتیں تراشتے ہیں کہ جن کا سر ہے نہ پیر۔ وکیلوں کے محرر اور لستہ بردار جب مفکر، مبلغ اور مصلح بن جائیں تو وہ جو شوشہ بھی چھوڑ دیں تھوڑا ہے! لاحول ولا قوۃ! توبہ!

"اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے، ایک حیات المسلمین شخصی اصلاح کے لئے اور دوسری صیانت المسلمین جمہوری نظام کے لئے۔" (ص ۵۵)۔ (حضرت تھانوی کا مکتوب)

اگر اپنی کسی کتاب یا تحریر کے بارے میں جماعت اسلامی کا کوئی فرد ان خیالات کا اظہار کر دیتا تو کس کس طرح سے انھیں مطعون کیا جاتا؟ اور ان لفظوں کو کیسے کیسے عجیب معنی پہنائے جاتے!

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ پاکستان میں جماعت اسلامی نے اسلامی دستور سازی کے لئے جو جدوجہد کی ہے۔ اسی کی بازگشت ہر طرف سے آئی ہے۔ مسلسل آٹھ سال تک "اسلامی دستور" جماعت اسلامی کی کوششوں کا موضوع رہا ہے۔ مگر اس کتاب میں جماعت اسلامی کے اس کارنامہ پر جان بوجھ کے پردہ ڈالنے اور چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتنی بڑی بددیانتی، عناد اور بغض و عداوت ہے!

پاکستان "دو قومی نظریہ" کی بناء پر وجود میں آیا ہے، کانگرسی علماء "متحدہ قومیت" کے علمبردار تھے۔ اور اپنے نظریہ کی اصابت پر کتاب و سنت سے دلیلیں لا رہے تھے، اس وقت مولانا مودودی ہی تھے جنہوں نے "متحدہ قومیت" کے طلسم پر شاہ ضرب لگا کر اسے پاش پاش کر دیا اور اس طرح پاکستان کی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں دور ہو گیا۔ مولانا موصوف نے یہ کام مسلم لیگیوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا۔ انہوں نے جس بات کو حق سمجھا اس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس حقیقت کا بھی اظہار فرمایا کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کار "صالحین" ہونے چاہئیں۔ چنانچہ پاکستان میں غیر صالح قیادت کا خمیازہ ابھی تک ہم بھگت رہے ہیں! مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے "اقامت دین" کے لئے جس انداز پر "جماعت اسلامی" کی تربیت کی، پاکستان بننے کے بعد یہ جماعت پاکستان کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر کے لئے کس قدر کارآمد ثابت ہوئی! (اللہ کی نصرت ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ آمین!)

جماعت اسلامی کی مخالفت کر کے سرکار دربار کی خوشنودی منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کو حاصل ہو جائے تو ہو جائے۔ مگر ایسی تہمتوں اور غلط بیانیوں سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی انھیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور تصوف و طریقت کی جن نسبتوں پر انھیں بڑا ناز ہے، قیامت کے دن وہ بھی ان ناانصافیوں کی تلافی نہیں کر سکتیں!

QADIANI MOVEMENT

از:۔ پروفیسر محمد الیاس برنی (ایم اے، ایل ایل بی)، ضخامت ۱۳۲ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔

Makki Publications, 100 Brickfield Road, Durban, South Africa

اس کتاب پر جناب محمد مکی (چیف آرگنائزر جنوبی افریقہ انٹرنیشنل یونین آف اسلامک سروسز) نے تعارف لکھا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی افریقہ میں سیدھے سادے مسلمانوں سے اسلام کے نام پر چندہ جمع کیا جاتا ہے اور اس رقم سے

قادیانی لٹریچر کی اشاعت ہوتی ہے اور نائیجیریا میں قادیانی جماعت کا ہفتہ وار اخبار "The Truth" "قادیانیت کا زہر" پھیلاتا رہتا ہے۔ اس فتنۂ عظیم کے توڑ کے لئے پروفیسر محمد الیاس برنی نے یہ کتاب انگریزی میں لکھی ہے اور کوئی شک نہیں کہ نام نہاد "احمدیت" (؟) کو بالکل بے نقاب (expose) کر دیا ہے!

مولانا الیاس برنی اپنی طرف سے بہت کم لکھتے ہیں۔ قادیانی لٹریچر ہی سے اقتباس پیش کر کے اس جھوٹی نبوت کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ یہ انگریزی کتاب اسی قسم کے اقتباسات سے بھری پڑی ہے۔ ان میں کتابوں کے حوالوں کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتنی پیش گوئیاں غلط اور جھوٹی ثابت ہوئیں۔

افریقہ، سنگاپور اور ماریشس وغیرہ میں جو یہ قادیانی مبلغین مسلمانوں کو اپنے دام میں پھانستے رہتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اس فرعونی لشکر کے لئے ضرب کلیم ثابت ہوگی۔ اور اس شجر خبیث کی نشو و نما رک جائے گی۔ کتاب میں ایک صفحہ پر مولانا محمد الیاس برنی کی تصویر ہے جو خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اور اس کے سامنے مرزا غلام احمد قادیانی کی تصویر ہے، جسے دیکھ کر۔ ع

آنکھیں ہوتی ہیں پشیماں کہ کہاں دیکھ لیا!

اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں چھپا ہے، پوری کتاب اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر پر ہے۔ چھپائی اتنی دیدہ زیب کہ آنکھوں میں رچا آتی ہے "[illegible]" میں یہ کتاب امریکہ اور انگلستان کی حسین ترین کتابوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر دونوں کو اس نیک کام کا دارین میں اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ کہ چودھویں صدی ہجری کے اس "مسیلمہ کذاب" کا انکار اور اس کے مشن کی مخالفت نبوت محمدی کا عین تقاضا ہے!

ماہنامہ "مہر نیمروز" خاص نمبر | ترتیب دینے والے: حسن مثنیٰ ندوی۔ ابوالخیر کشفی۔ اور علی اکبر قاصد۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:- ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی (نون ۱۹۶۶ء)

ماہنامہ "مہر نیمروز" کے چھ شمارے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ ساتواں اور آٹھواں مشترک شمارہ اس کا خاص نمبر ہے۔ جو بڑے اہتمام کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ مضامین میں تنوع اور ترتیب میں حسن سلیقہ پایا جاتا ہے۔ مرتبین کی محنت اور کاوش لائق داد ہے کہ انہوں نے اس گلدستہ کے لئے گلہائے رنگا رنگ فراہم کئے ہیں۔ "ملکی سیاست" پر ادارہ کی جانب سے یہ جرأت آمیز تنقید کتنی سچی اور بے لاگ ہے:-

"سابق گورنر جنرل جناب ملک غلام محمد نے دستوریہ کو توڑ کر ملک کو ایک سیاسی بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ بلکہ اخلاقی و معاشرتی بحران میں پاکستان کی دیانت دارانہ تاریخ جب بھی لکھی جائے گی اس وقت مولوی تمیز الدین اس دور کے "ہیرو" کی حیثیت سے آنے والی نسلوں کے سامنے آئیں گے۔"

"مہر نیمروز" کے فاضل مرتبین کو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ حضرات نہ اشتراکی ہیں اور نہ "ترقی پسند" ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ "خاص نمبر" میں نام نہاد "ترقی پسندی" اس قدر نمایاں طور پر جھلک رہی ہے کہ اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ جن دو شاعروں کے اس شمارے میں فوٹو دیئے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کمیونسٹ ہیں بلکہ "انکار و الحاد" سے قریب تر ہیں۔

"اس دور کے سب سے بڑے نمائندے فیض احمد فیض ہیں۔"

"مہر نیمروز" نے جس شاعر کو اس دور کا سب سے بڑا نمائندہ کہا ہے اس نمائندۂ اعظم کا ایک منتخب شعر بھی درج کر دیا ہے۔

گوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے　　　تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

"ترے سر بلند" کی ترکیب کی غرابت سے قطع نظر، مصرعہ اولیٰ میں "کو" غلط استعمال ہوا ہے۔ "تک" کا محل تھا۔ "کو" سے تو یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ "گوئے عشق کے رتبہ کو دار و رسن نہ پہنچ سکے۔ اور اس کی برابری نہ کر سکے" حالانکہ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "دار و رسن گوئے عشق تک نہ پہنچ سکے"! مگر اس دور کے سب سے بڑے نمائندے شاعر" کو کیا پڑی ہے کہ وہ لفظ و بیان کی ان نزاکتوں کا لحاظ رکھے اور ان باتوں میں اپنا سر کھپائے۔ جبکہ ان محاسن کے بغیر ہی اُسکے عقیدت مند تعریف کے پُل پہ پُل باندھتے چلے جا رہے ہیں!

"پاکستان" جس مقالہ کا عنوان ہے اس میں "اسلام" پہ کتنا کچھ لکھا جا سکتا تھا اور لکھا جانا چاہیئے تھا۔ مگر لائق مقالہ نگار کا اس معاملہ میں بخل کا یہ عالم ہے کہ "آزاد جمہوریہ پاکستان" کے ساتھ "اسلامیہ" کا لفظ بھی اُن کے قلم سے نہ نکل سکا۔

"دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح پاکستان میں مصوری کو بھی اب تک خاطر خواہ سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی" (ص ۲۲)

فاضل مضمون نگار کو ان باتوں کا غم نہیں ہے کہ پاکستان میں صنعت و حرفت اور سائنس کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔ یہاں برسوں سے اقتدار کی جنگ جاری ہے۔ پاکستان میں اب تک صحیح اسلامی معاشرہ پیدا نہیں ہو سکا یہاں اخلاقی حدود ڈھلتی چلی جا رہی ہیں ـــــ انھیں غم اس بات کا ہے کہ "مصوری" کو سرکاری سرپرستی اب تک کیوں حاصل نہیں ہوئی؟ اور "ایمانِ ابراہیم" کے مقابلہ میں "صنعتِ آذر" نے فروغ کیوں نہیں پایا ـــــ چنانچہ اسی مقالہ کے درمیان میں "رقص" کی تین تصویریں مزین کی گئی ہیں۔ اور ایک تصویر جس میں بیگم افروز بلبل چودھری رقص فرما رہی ہیں۔ اس میں اُن کو "پاکستان کی مایہ ناز رقاصہ" کا خطاب "مہرنیمروز" نے عطا فرمایا ہے! ہائے وہ ملک جس کا فخر و ناز کتھکوں، نچکوں، طبلچیوں، ڈوم ڈھاڑیوں اور ناچنے والیوں کے "آرٹ" سے وابستہ ہو! اور اہلِ قلم اور اربابِ فکر اس کو بڑھاوا اور شہ دے رہے ہوں! افسوس!

نمودِ این و آں مٹے سکونِ جاوداں ملے　　　فسردگی کے ذہن میں شعور کی سناں لئے　　　(ص ۲۳)

"نمودِ این و آں مٹے" نے مصرعہ کی بھرتی پوری کر دی ہے، خیر! اس پر بھی صبر کر لیا جائے مگر دوسرے مصرعہ کا بھی کوئی جواب ہے! پہلے "فسردگی کا ذہن" تصور میں قائم کیجئے۔ پھر "شعور کی سناں" کا خیال جمائیے۔ اور پھر "وجدان" کی خونچکانی کا منظر دیکھا کیجئے۔ شاعر کے قلم و زبان سے سوتے میں بھی ایسے مصرعے نہیں نکل سکتے! تو یہ!

کھنڈر میں ہر سمت رینگتی خامشی کی زنجیر بے صدا ہے
سسکتے لمحے، شکستہ در و دیوار سے لپٹے چلے ہیں!　　　(ص ۲۷)

یہ تو سنا تھا کہ "فلاں جگہ خامشی مسلط ہے یا چھائی ہوئی ہے"، مگر "خامشی دوڑ کر چلا کرتی ہے اور رینگتی بھی ہے" "مہرنیمروز" کی اس نظم سے پہلی بار اس کا انکشاف ہوا۔ اس پر مستزاد "...... لپٹے چلے ہیں"! یہ آخر کیا اندازِ بیان ہے۔ شعر میں کوئی لطف، کوئی تاثر، کوئی خوبی! بس ایک شخص ہے کہ جو جی میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی "تُک بندی" کی پذیرائی کے لئے رسالے موجود ہیں بلکہ فرشِ راہ ہیں!

جھکتے بکھرے ہوئے عارضوں پہ ہے یہ گماں　　　فضا کی سانس کا احساس ہو رہا ہے جواں　　　(ص ۲۷)

"یہ گماں" کا اشارہ آخر کس طرف ہے؟ پھر ایک تو "فضا کی سانس" - پھر اُس کا "احساس" اور اس پر مستزاد اُس کا "جواں" ہونا۔ اس شعر میں آورد و تکلف کے سوا اور کیا ہے؟

ایک خاصے مشہور نقاد کلیم الدین احمد ہیں جو انگریزی میں سوچتے اور اُردو میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ اُن کا بھی اس شمارے میں ایک مقالہ ہے جو جگہ جگہ گنجلک اور مبہم ہے۔ ایک نمونہ:-

"ادب کی صحیح تفہیم اور ناقدانہ نظم و ضبط کے بغیر ادب میں عمرانی انہماک پیدا کر لینا بڑی تباہ کن بات ہے۔" (ص ۱۴)

آخر مضمون نگار کہنا کیا چاہتا ہے۔ ان لفظوں کو پڑھتے وقت وجدان کتنی گھٹن محسوس کرتا ہے۔

"اس اُجڈ، گنوار اور وحشی گاؤں میں ......" (ص ۹۰)

اُجڈ، گنوار اور وحشی کسی انسان کی صفت ہو سکتی ہے - نہ کہ گاؤں اور بستی کی!

"اپنا جائزہ لے" منہ بنا، ناک سکیڑ [۵] وہ بولی۔ (ص ۵)

"اپنا جائزہ لے" کیا یہ عورتوں کا "روزمرہ" ہے؟ اور جن ہلکے پھلکے جملوں کے درمیان اسے (اپنا جائزہ لے) لایا گیا ہے، وہاں تو یہ جملہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

مرنے جینے کی خود نگر قسمیں
ہے اپنا پہ خاک دفن کریں (ص ۶۵)

اس قسم کے بچکانہ شعر "مہر نیمروز" میں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی!

جن لوگوں نے دین و تقویٰ کے خانوادوں میں پرورش پائی ہے اور جو نیکی کی فضا میں پروان چڑھے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو نگارش و انشاء کی صلاحیتیں بھی عطا فرمائی ہیں - اُن کی زبان و قلم کو جب دین و اخلاق کے تقاضوں سے کتراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شدید اذیت ہوتی ہے۔ کان پور اور پھلواری شریف کی خانقاہوں اور سجادوں کے وارث جب رقاصاؤں کو "مایۂ ناز" کہنے لگیں تو مغرب زدہ نوجوان جس نیچی سے نیچی سطح تک بھی پہنچ جائیں تھوڑا ہے!

نام نہاد "ترقی پسندی" نے شاعروں اور ادیبوں کو لفظ و بیان اور زبان و اظہار کے معاملہ میں جو بے پروا بنا دیا ہے بلکہ لوگوں کا مذاق بگاڑ دیا ہے۔ اس کی اصلاح بہت ضروری ہے بلکہ یہی کرنے کا کام ہے۔ "مہر نیمروز" کے مرتبین یہ خدمت انجام دے سکتے تھے مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ "مہر نیمروز" نام نہاد "ترقی پسندی" کی بے اعتدالیوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر رہا ہے!

عبیر و شکر | از:- محترمہ تہنیت۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ مجلّد (گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

محترمہ تہنیت النساء بیگم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے نعتیہ کلام کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس پر پیش لفظ جناب ایم اسلم (لاہور) نے لکھا ہے، اس کا رنگ یہ ہے:-

"کلام کے ہر لفظ سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح مترشح ہو رہی ہے، جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں۔"

---

[۵] "سکیڑ کر" لکھنا چاہیے تھا "کر" کے حذف و سہو کا ذمہ دار [illegible]

"مخمور" کی صفت یہاں زاید استعمال کی گئی ہے۔ پوری عبارت میں ناپختگی پائی جاتی ہے۔

"جس دل میں حضور اکرم کی محبت موجزن ہو۔ وہاں درد کا ہونا بھی ضروری چیز ہے"

یہ بات کیا ہوئی ؟ اور یہ کیا "کلیہ" ہے جس کو یہاں بیان فرمایا گیا ہے۔

تہنیت نے "نعت رسول" کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور یہ بہت بڑی سعادت اُن کے حصہ میں آئی ہے

تمہاری یاد میں راتیں گزار دیں ہم نے خیال ہی میں تمہارے کٹے ہیں دن سارے

ہے شام حرم یاد جو دن ڈوب رہا ہے ہر صبح در پاک کی رونق ہے نظر میں

شاید اپنی دعا قبول ہوئی پھر کلی دل کی کھل کے پھول ہوئی !

مناروں کی رونق، اذاں کی صدائیں وہ فردوس گوش اور وہ آنکھوں کی جنت

مدینہ میں جو سر رہ گزار گزری ہے اب ایسے لطف سے شاید کبھی نہ گزرے گی

اس کو ایسا سیاہ بھی نہ کریں حشر میں اُن کو مُنہ دکھانا ہے

عقل ملتی ہے مگر دل نہیں پایا جاتا عصر حاضر نے سجائی ہیں دکانیں کیا کیا

تو یوں لگتا ہے جیسے اب بھی سر اُس آستاں پر ہے وہ سجدے وہ دعائیں، وہ کرم جب یاد آتے ہیں

اسی امید میں ہر شب کی سحر ہوتی ہے خواب ہی میں نظر آ جائے گا اُن کا جلوہ

دوسرا رُخ :-

جائیں گے وہیں چھوڑ کے سب روضۂ رضواں یثرب کو جو وہ رشکِ ارم کرتے رہیں گے (ص۲۰)

شعر میں نہ کوئی معنوی کیف ہے اور نہ لفظوں ہی کا شکوہ ہے۔ "رشک ارم کرتے رہیں گے" کی کیب اس پر مستزاد !

آپ کی بخششوں کو کیا دیکھیں اپنی قسمت کو ہم زمانے لگے

شوقِ دیدار میں تڑپتے ہیں ! آپ تو اب بہت رُلانے لگے (ص۲۴)

اس قسم کے بچکانے شعر مجموعہ کلام میں رکھنے نہیں چاہیئے تھے۔

لطف پیہم حرم میں ملتا تھا ! لوٹ آئے بس اتنی بھول ہوئی (ص۲۱)

"بس" کا یہاں کیا محل تھا۔ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ زندگی میں یہی سب سے بڑی بھول ہوئی۔

شوق میں جی رہے ہیں تمہارے ۔۔۔ کوئی باقی نہیں اب سہارے (ص۱۲)

" تمہارے " کی تعقید سے کسی طرح صرفِ نظر بھی کرلی جائے مگر " سہارے " کی جمع کیساتھ " کوئی " کو وجدان کس طرح گوارا کرے!

خدا بھی جس کی رعنائی پہ شیدا ہو گیا اختر ۔۔۔ اسی محبوب کے ہم بانکپن کو یاد کرتے ہیں (ص۵۶)

" اختر " بھرتی کا لفظ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعنائی پر شیدا ہو جانا۔ یہ عجیب عقیدہ ہے۔ پھر حضورؐ سے " بانکپن " کی نسبت بھی ناپسندیدہ ہے۔ چھب، بانکپن، عشوہ۔ یہ مجازی محبوبوں کی صفات ہیں۔

یہ تصور ہیں کون بستا ہے ۔۔۔ دیکھنے جس کو دل ترستا ہے (ص۶۱)

" دیکھنے کیلئے " کہنا چاہیئے تھا۔ " کیلئے " کے بغیر یہ شعر ولی اور سراج کے زمانے کے کسی شاعر کا شعر معلوم ہوتا ہے اور یہ زبان اب بکسر متروک اور روزمرہ کے خلاف ہے۔

مثل یہ مشہور ہے کہ:-

" نقاش نقشِ اول بہتر کشد ز اول "

مگر " ذکر و شکر " کے مقابلہ میں محترم تہنیت کا یہ دوسرا مجموعہ کلام (صبر و شکر) نسبتاً پھیکا ہے۔

آئینۂ تاریخ (حصہ اول)

مرتبہ:- افضل حسین ایم اے، ایل ٹی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند رام پور (بھارت)

آسان اور دلنشین زبان میں ہندوستان کی تاریخ اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

چند عنوانات:-

راماین کی کہانی ۔۔۔ آریوں میں بگاڑ ۔۔۔ بدھ مت ۔۔۔ اشوک ایک مبلغ راجہ ۔۔۔ کنشک اور بدھ مت کا زوال ۔۔۔ مسلمانوں کی آمد ۔۔۔ محمود غزنوی ۔۔۔ معین الدین چشتیؒ ۔۔۔ مسلمانوں کے ہند پر حملے۔ درویش تاجدار التمش ۔۔۔ نیک دل سلطان ناصر الدین ۔۔۔ شاہ تغلق اور اس کے جانشین ۔!

تاریخی واقعات کافی چھان بین کرکے لکھے گئے ہیں۔ انداز بیان میں دلکشی ہے۔ زبان ٹکسالی اور منجھی ہوئی۔ بس دو ایک کھٹک سی پیدا ہوئی:-

" مگر جب انہوں نے دین کی وضاحت کی . . . . . . " (ص۸۵)

اس جملہ میں کوئی غلطی اور سقم نہیں ہے مگر جس مفہوم کو ادا کرنا مقصود ہے۔ اس کے لئے دوسرے جاندار الفاظ استعمال ہونے چاہیئے تھے۔ یہ جملہ تو ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔

" پنجاب کے ملحقہ حصوں میں ذکریا اور شمس تبریزی . . . . . . "

یہ روایت بالکل بے اصل ہے کہ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد حضرت شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ملتان میں ریف لائے تھے اور وہاں ان کی قبر ہے۔ ملتان میں جن بزرگ کا مزار ہے وہ دوسرے " شمس " ہیں " شمس تبریزی " نہیں ہیں۔

سلاطین ہند کی علم پروری

از:- محمد حفیظ اللہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے۔ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- مسلم اکاڈمی۔ پھلواری شریف پٹنہ۔

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں محمود غزنوی سے لے کر میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد دکن تک کے

مسلمان بادشاہوں اور حاکموں کی علم پروری اور معارف نوازی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے خاصی کدوکاوش اور تفحص سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر پہلی بار اس کا علم ہوا کہ سلطانہ رضیہ شعر کہتی تھی اور اس کا "شیریں" تخلص تھا۔ اور یہ بھی:-

"یہ واقعہ عجائب عالم میں شمار ہوگا کہ اورنگ زیب جس کلام مجید میں تلاوت کیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ملکیت ہے۔" (ص۱۱۳)

"مقامی علماء کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے علماء وادباء کبھی یہاں علم وادب کی مجلسیں گرمائے ہوئے تھے۔" (ص۳۲)
"مجلسیں گرم کئے ہوئے تھے" لکھنا تھا۔ "گرمائے ہوئے تھے" میں سنجیدگی نہیں پائی جاتی۔ "التمغا ہیں اور جاگیریں وقف کی گئی تھیں" (ص۱۲۹) ریاست دکن کے سرکاری کاغذوں میں "التمغا" لکھا جاتا تھا۔ "رسدخانہ صرف اس خادم کے دم سے زندہ تھا" (ص۱۶۵) "رصدخانہ" میں "ص" ہے!

"قاضی جلال عروسی بغداد سے دہلی آئے تو سلطان التمش کے لئے خلیفہ مامون کے ہاتھ کی ایک تحریر لائے جو اس نے "سفینۃ الخلفاء" میں لکھی تھی۔ سلطان اس تحریر کو پڑھ کر قاضی جلال عروسی سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ اس تحفہ کے صلہ میں قاضی صاحب کو نصف مملکت دینے کے لئے تیار ہوگیا۔" (تاریخ فیروز شاہی)

یہ واقعہ مبالغہ سے خالی نہیں! اگر کسی صحابی یا تابعی کی کوئی کوئی تحریر ہوتی تو عقیدت کی بناء پر سلطان التمش کی زبان سے ایسا جملہ نکل سکتا تھا کہ "یہ تحریر میری نصف سلطنت سے بھی گرانقدر ہے۔"

"فتاویٰ عالمگیری" کو فقہاء کے جس بورڈ نے مدوّن کیا ہے اُن کے نام ضرور لکھنے چاہیئے تھے۔ حکومت آصفیہ نے علم وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا ذکر تفصیل چاہتا تھا۔ چار پانچ جملوں میں اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جانا مناسب نہ تھا۔ حیرت ہے کہ "دائرۃ المعارف" کا ذکر تک نہیں کیا!

صحیح مقام حدیث اوّل وتدوین حدیث

از:- مولانا فضل احمد غزنوی۔ ضخامت ۲۲۰ صفحات۔ تدوین حدیث ضخامت ۴۶ صفحات ملنے کا پتہ:- مصنف سے فضل منزل حیدرآباد سندھ۔

مولانا فضل احمد غزنوی نے یہ کتاب منکرین حدیث کے رد میں لکھی ہے اور خاص طور سے چکڑالوی عقائد کے سرگرم مبلغ مسٹر پرویز پر بڑی سخت گرفت کی ہے۔ مولانا غزنوی اپنے اندر دینی حرارت رکھتے ہیں اس لئے "سنت رسول" جو دین کا ستون ہے اُس پر کسی بدبخت کی دراز دستی برداشت نہیں کرسکتے۔ پوری کتاب میں حُبِ رسول اور مدافعت دین کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور کہیں کہیں تو یہ حرارت شعلوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ منکرین حدیث کے دلائل کو اس کتاب میں پوری قوت کے ساتھ توڑا گیا ہے اور "سنت رسول" کے دین میں حجت ہونے پر قرآن کریم سے دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

"یقیناً جن احادیث کو سوالاکھ صحابہ کرام نے لکھا وہ بھی قرآن پاک کی طرح محفوظ ہیں۔" (ص۶۹) اس میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ لکھنا یوں چاہیئے تھا "جن احادیث کو ہزاروں صحابہ کرام نے لکھا اور یاد رکھا اُن کو بھی دین کا جزو سمجھ کر محفوظ رکھا گیا۔" — "ابتداء میں حکم قرآن تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں کا مقابلہ کرے مگر بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ یہ حکم نازل ہوا کہ ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔" (ص۳۷) — نہ پہلی آیت کا حکم منسوخ ہے اور نہ

دُوسری آیت ناسخ ہے۔ دونوں آیتوں کا حکم اپنی جگہ پر ثابت اور باقی ہے۔ آج مسلمان قوی ہوں تو بہت سی تعداد کا تھوڑے مسلمان مقابلہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیئے۔ کمزور ہوں تو بھی اپنے سے دُگنے کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے تو انھیں ہرگز نہ ہچکچانا چاہیئے!

"یا ایّھا المزمّل" کا ترجمہ "اے قائدِ اسلام" اور "یا ایّھا المدثّر" کا ترجمہ "اے ماحیٔ کفر" (صفحہ ۲۹۴-۲۹۵) پہلی بار نظر سے گزرا۔ اور جب تک اس ترجمہ کا "ماخذ" نہ معلوم ہو جائے دل کو تشویش ہی رہے گی ۔۔۔ "سید ابوالاعلیٰ مودودی جن کو میں پاکستان بھر میں، بس یہی ایک صحیح عالمِ دین ہیں، جنہیں شعورِ اسلام بھی ہے۔ مانتا ہوں اور مجھے سب سے بڑی کوفت یہی ہوتی ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں ایک بھی عالم ایسا نہیں ہے جسے صحیح معنی میں عالمِ دین کہا جا سکے" (صفحہ ۲۴۲۔ حصہ دوم) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی علمی عظمت اپنی جگہ مسلّم۔ مگر غزنوی صاحب نے اُن کی تعریف میں بےجا مبالغہ سے کام لیا ہے!

"قاری نظر آتا ہے حقیقت میں قرآں ہے مسلمان" (صفحہ ۱۸)

"عقل کو کیا ہم نے سپردِ جنوں   اور عمر بھر میں یہی دانائی کی" (صفحہ ۳۲۵)

"لرزتے تھے جن کی ہیبت سے شاہانِ جہاں
کون؟ یہی ہے تربیت اُونٹوں کو چرانے والے" (صفحہ ۲۳ حصہ دوم)

"کہ تختِ کیاں را کتند آرزو   تفت بر تو اے چرخِ گردوں تفت" (صفحہ ۲۳)

ان شعروں کو اس قدر مضحکہ خیز انداز میں غلط لکھ کر مصنف نے اپنے ادبی ذوق کا بُرا مظاہرہ کیا ہے!

"جو اس کائنات اور حواسِ کائنات سے بالا ...... ہے" (صفحہ ۱۱۶) "حواسِ کائنات" کیا چیز ہے؟ "کوئی پُوچھے بلا رمضان کا نواں مہینہ اور نواں امام تک بندی چڑھ گئی۔ مگر زکات اور اُستاد کا شاگرد کو پڑھانا تو کسی تک بندی سے گانٹھا نہیں جا سکتا" (صفحہ ۱۳) یہ کیا زبان اور اندازِ بیان ہے ۔۔۔ توبہ! ۔۔۔ "بیوی کو منہ دیا، جو میری زندگی میں متاعِ حیات ہے" (صفحہ ۴۸) "بیوی کو منہ دینا" پہلی بار نظر سے گزرا۔ اس میں ذم بھی پایا جاتا ہے۔ اور "زندگی متاعِ حیات" تو "شبِ لیلۃ القدر کی رات" والی ترکیب ہے۔ "ابن جوزی کی قدم بوسی میں مت پڑ جانا" (صفحہ ۳۲) عجیب زبان ہے۔ "اس سے زیادہ کیا ثابتی ہو" (صفحہ ۱۵) "ثبوت" کو "ثابتی" کہنا۔ یا للعجب! ۔۔ "اور قیامت پدرہا امتِ محمدیہ کی طرف سے" (صفحہ ۱۶۹) "پدرم" (غالباً سنو کھرب کا ایک پدم ہوتا ہے) کی جمع "پدرہا" بنانا غزنوی صاحب ہی کا حصہ ہے!

کتاب میں جگہ جگہ طنز بہت زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہے کہ بعض طبیعتیں اس کا خوشگوار اثر نہ لیں گی۔ شاید غزنوی صاحب لکھتے وقت جذبات پر پُورا قابو نہیں رکھ سکتے۔ کتاب میں مصنف نے جہاں جہاں اپنے ذاتی واقعات اور حالات کا ذکر کیا ہے پڑھنے والے کو ضرور کھٹکیں گے!

مولانا فضل احمد غزنوی کو ذاتِ رسالت مآب سے بے پناہ محبت ہے، مگر اس کے باوجود اُن کا دامن نہ صرف یہ کہ شرک و بدعت سے پاک ہے۔ بلکہ اُن کا قلم شرک و بدعت کے مقابلہ میں "برہنہ شمشیر" کا اپنا فرض انجام دیتا ہے۔

فروغ اردو | مدیر اعزازی:۔ ڈاکٹر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۔ معاونین:۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۔ شجاعت علی سندیلوی ایم اے ، سید امیر حسن نورانی ۔ حکیم عبد القوی دریابادی ۔ مینیجر و نگراں:۔ محمد حسین شمس علوی ۔ فی پرچہ چار آنہ ۔ سالانہ دو روپے ۔ ملنے کا پتہ:۔ ۲۷ امین آباد پارک لکھنؤ ۔ (انڈیا) پاکستان میں:۔ مبارک بک ڈپو، بندر روڈ ۔ بالمقابل نیشنل بنک کراچی ۲ ۔

"فروغ اردو" کا ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے، اس کے سرنامہ پر شمارہ کا نمبر ۵ لکھا ہوا ہے ۔ یعنی یہ رسالہ پانچ سال سے نکل رہا ہے۔ اس حساب سے اس مجلّہ کا یہ چھٹا سال ہے اور اس کی اشاعت چودہ ہزار بتائی گئی ہے ۔

ماہنامہ "فروغ اُردو" بڑے سلیقہ سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ رسالہ کسی خاص ادبی جماعت سے متعلق نہیں ہے۔ شمارۂ زیر تنقید میں "لفظوں کی کہانی" ایک اچھا مضمون ہے ۔ "باغ رسالت کے چند پھول" نے اس رسالہ میں تقدیس کی شان پیدا کر دی ہے ۔

"اس کی نوک پلک کے بعد اس کی گڑھن اس کی صورت گری ...." (ص ۹)

اُردو کے معروف اور عام فہم ٹکسالی لفظوں کو "ہندیانے" کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ "گڑھن" کی صورت میں نظر آتا ہے۔

"...... سخن وہ تمام کام کرتے ہیں جو کلاسیکی روایت کے پابند شعراء بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔" (ص ۲۲)

اس عبارت میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔

جمالِ یار کا آخر جواب کیا ہوگا 		اب اور اتنا مکمل شباب کیا ہوگا 		(ص ۶۲)

"اتنا" کا "الف" بُری طرح دب رہا ہے ! خود شعر بھی بہت سطحی ہے، اس غزل کے دوسرے شعروں کا بھی یہی رنگ ہے !

ہندوستان میں اُردو زبان کی ترویج و بقا کے لئے "فروغ اُردو" کا دم بسا غنیمت ہے ۔

انمول کلیاں | مرتبہ:۔ حنیف صابری ۔ ضخامت ۴۰ صفحات ۔ قیمت دس آنہ ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ گلشن، چوک بازار، ملتان

جناب حنیف صابری نے بچوں کے لئے ہلکی پھلکی نظموں کا یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے ۔ سرنامہ کا یہ شعر کس قدر جاندار ہے ؎

زمیں سے پتھروں کو چُننے والو! 		ستارے بھی نکلتے ہیں زمیں سے

"ہمارا پاکستان" پُرشکوہ نظم ہے ۔ مگر بچّوں کے لئے ۔

"جنت منظر، انجم طلعت، گردوں رفعت، عرش مقام۔"

جیسے مصرعوں کا سمجھنا اور یاد کرنا کس قدر دشوار ہوگا ۔

اے خدا ہم پہ اگر تیری عنایت ہو جائے 		پھولنے پھلنے کی دُنیا میں علامت ہو جائے 		(ص ۸)

"علامت" نے شعر کو کس قدر بے مزہ بنا دیا ۔

فیض جھنجھانوی کی نظم سب سے اچھی ہے۔ اس نظم میں یہ مصرعہ۔ ع

مرے نام کی بولتے ہیں دہائی !

کھٹکا ۔ "دہائی بولنا" نہیں "دہائی دینا" روزمرہ ہے ۔

توقع ہے کہ نظموں کا یہ گلدستہ بچّوں میں مقبول ہوگا ۔

ملک کا استحکام صنعتی ترقی پر منحصر ہے
ملکی اشیاء کی
سرپرستی کیجئے
ٹرسٹ انڈسٹریز کے ادارے
(۱) ٹرسٹ میچ فیکٹری
(۲) ٹرسٹ سرمیک انڈسٹریز
(۳) ٹرسٹ کلے ورکس
(۴) ٹرسٹ ریفریکٹری پروڈکٹس
(۵) ٹرسٹ سائیکل فیکٹری
ٹرسٹ انڈسٹریز
لانڈھی ــــ کراچی

آپ کا پسندیدہ
سگریٹ
شاہین
دس سگریٹ کے ایک پیکٹ کی قیمت تین آنے -/3/-
پریمیئر ٹوباکو کمپنی پاکستان کراچی

پرنٹر و پبلشر: مسرور حسین — ادبی پریس۔ رابسن روڈ۔ کراچی

حی سنز

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۷

فاران

اکتوبر ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... .. آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستانی سیاست کا سفینہ جو برسوں سے ڈانواڈول تھا اور دستور سازی کے بعد جس میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر
ک زبردست ہچکولے سے دوچار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پتوار چلانے والے ہاتھ بدل گئے۔ اس طوفان نصیب سفینہ کے
افروں کی بے بسی اور بے دست و پائی کا یہ عالم ہے کہ ناخداؤں کی تبدیلی کے بارے میں ان غریبوں سے کچھ نہیں پوچھا جاتا
یہ "خداوندانِ سفینہ" کا توڑ جوڑ اور اُن کی غرض پرستیاں ہی انقلاب ناخدائی کا فرض انجام دیتی رہتی ہیں۔ جس کشتی کے
ح جتھہ بندی، پارٹی بازی اور نزاعِ اقتدار میں مبتلا ہوں، اس بدنصیب سفینہ کو جو ہولناک سے ہولناک بھی
ثہ پیش آجائے، تھوڑا ہے!

کرسیوں کی اس جنگ نے پاکستان کی ساکھ کو بین الاقوامی دنیا میں اتنا گرادیا ہے کہ شدید سے شدید اظہار تاسف
اس کے لئے کم ہے۔ باہر وہ بے آبروئی اور اندر یہ انتشار و خلفشار اور زبوں حالی کہ ع

دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں!

اس ۹ سال کی مدت میں یہ پانچویں وزیر اعظم ہیں جو کرسی اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ یہ داستانِ انقلاب بڑی
درد ناک اور جگر خراش ہے مگر جب بات چھڑ گئی ہے تو کاغذ پر دل کی کچھ پھانسیں نکال کر رکھنی ہی پڑیں گی۔ حقائق
صرف نظر نہیں کیا جا سکتا!

مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ جن کی شہادت کے بارے میں وقائع نگاری کی زبان
یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید اکبر نام کے ایک شخص نے انھیں راولپنڈی کے جلسہ میں قتل کر دیا مگر مسلم لیگ کے ذمہ دار رہنما

ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ لیاقت مرحوم کو اُن کے دشمنوں نے میدان سے ہٹا دیا - یہ دشمن کون تھے؟ اس پر ابھی تک رمز و اشاریت کے پردے پڑے ہوئے ہیں - نہیں کہا جا سکتا یہ پردے اٹھیں گے بھی یا نہیں اور اس افشائے راز کے لئے نہ جانے کس موزوں وقت کا انتظار ہے !

عوام میں طرح طرح کی افواہیں گرم ہیں :-

درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید !

کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ ، جتنے منہ اتنی باتیں ! ایسے سنگین واقعات کے لئے صرف افواہیں "ثبوت" نہیں بن سکتیں - ہم فضا میں گونجنے والی افواہوں کی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب ! ہمیں اس سلسلہ میں بس اتنا کہنا ہے کہ لیاقت علی خاں مرحوم کا خونِ ناحق پاکستان کو بہت مہنگا پڑا - اُن کی شہادت کے دن سے انقلاب در انقلاب کا جو چکر چلا ہے تو وہ آج تک چل رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان کا ستارہ کب تک گردش میں رہے گا !

خواجہ ناظم الدین صاحب ایک رسمی گورنر جنرل تھے ، اصل طاقت مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھی - خواجہ صاحب ملکی معاملات میں دراندازی نہیں فرماتے تھے اس لئے نیک نام تھے - مگر لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت کے بعد نہ جانے خواجہ صاحب کو خود یہ بات سوجھی یا اُن کے کسی نادان دوست نے انھیں یہ خطرناک مشورہ دیا - یا اُن کے کسی چالاک دشمن نے انھیں پٹی پڑھائی کہ وہ گورنر جنرلی مسٹر غلام محمد کو سونپ کر خود وزارتِ عظمٰی کی کرسی پر براجمان ہو گئے - خواجہ صاحب کی شرافت بھلمنساہت اور مرنجان مرنج ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں - اسلام سے بھی انھیں محبت ہے - اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے بھی وہ ایک مذہبی آدمی ہیں اور سازش کا فن تو انھیں آتا ہی نہیں !

خواجہ صاحب کے دورِ حکومت میں ملک کے نظم و نسق میں جو ابتری پیدا ہوئی اُس سے اُن کی سادہ لوحی اور کمزوری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا - لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کو بدنام اور ناکام کرنے کی تدبیریں بھی اختیار کی گئیں - ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ وزیر اعظم کمزور اور بے اثر اور گورنر جنرل طاقتور اور با اثر بلکہ مطلق العنان ہوتا چلا گیا - اُن کے مرغی پالنے اور کھانے سے شغف رکھنے کے افسانے پھیلائے گئے ، اُن کو "قائدِ قلت" کا خطاب دیا گیا - اُن کی کابینہ کے رکن مسٹر فضل الرحمٰن جیسے ذہین اور دیانت دار شخص کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا کہ اُن سے بڑھ کر ناسمجھ ، ناکارہ اور غیر دانشمند آدمی شاید ہی کوئی اور ہو !

پنجاب میں ختم نبوت کی تحریک کا اتفاقاً نوبت تک پہنچ جانا ایک اتفاقی واقعہ نہ تھا - مسٹر ممتاز دولتانہ کا دماغ جانتا تھا کہ اس ہنگامہ آرائی کی زد خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمٰی پر جا کر پڑے گی - قادیانی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خواجہ صاحب آمادہ بھی ہو جاتے مگر ارد گرد جو "نوکر شاہی" گروپ تھا اُس نے خواجہ صاحب کو اس طرف نہیں آنے دیا - خواجہ صاحب کو ایک وہم یہ بھی ہو گیا تھا کہ سردار عبد الرب نشتر وزیر اعظم بننے کی تمنا رکھتے ہیں - اُن کے اس "وہم" سے بھی اُن کے چالاک مشیروں نے خوب فائدہ اٹھایا !

مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد یہ دوسرا حادثہ پیش آیا کہ خود وزارتِ عظمٰی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا اور یہ وہ وقت تھا جب اسلامی بنیادوں پر دستور قریب قریب تیار ہو چکا تھا - الزام یہ تھا کہ خواجہ صاحب کی وزارتِ عظمٰی غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی مگر اس انقلاب کی طرفگی بلکہ ستم ظریفی یہ تھی کہ وزیر خوراک پیرزادہ عبد الستار صاحب کو

مسٹر محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں لے لیا گیا!

محمد علی بوگرہ کا اچانک امریکہ سے کراچی آنا اور خواجہ ناظم الدین کو معزول کر کے بوگرہ صاحب جیسے غیر معروف شخص کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپنا، یہ سب کچھ ایک سوچی ہوئی اسکیم کے تحت تھا۔ اس انقلاب نے گورنر جنرل کی طاقت میں "آمریت" کی جھلک پیدا کر دی اور نئے وزیر اعظم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ گورنر جنرل کا حاشیہ بردار رہ کر اپنے فرائض انجام دے!

اس انقلاب کے بعد کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب کو جیل سے لا کر وزارت کی کرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے اُن نظریوں کی تبدیلی کا کوئی اعلان نہیں کیا تھا جن کی بناء پر انھیں نظربند کیا گیا تھا۔ پھر اس دور میں "بڑے آدمیوں" کے اُن بیانات کو بھی ذہن میں رکھئے جن میں "ملا ازم" پر پھبتیاں چُست کی گئی ہیں اور دین کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک "اسلامی نظام حکومت" بعض بڑے آدمیوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے۔ حالات کے دباؤ نے انھیں مجبور کر دیا ہے جو وہ کچھ نہیں کہتے۔ مگر انھیں جب بھی موقع ملے گا وہ اس پر وار کرنے سے چوکیں گے نہیں!

پاکستان کی سیاست کا یہ خوفناک انقلاب بھی یادگار رہے گا کہ دستور سازی جبکہ بالکل آخری مرحلہ میں تھی مسٹر غلام محمد مرحوم نے دستور ساز اسمبلی ہی کا تیا پانچہ کر دیا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جس شاخ پر آشیاں بندی ہو رہی تھی باغباں نے اس شاخ ہی کو کاٹ کر پھینک دیا۔ جمہوریت کے خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی!

"ون یونٹ" کی تشکیل بھی اس دور کا بہت اہم واقعہ ہے۔ اس کے لئے ہر قیمت ادا کی گئی۔ ہر بے اصولی کو گوارا کیا گیا یہاں تک کہ سندھ میں مسٹر کھوڑو کے کھلے ہوئے ظلم و ستم سے جان بوجھ کر صرفِ نظر کیا گیا۔ ع

نہ رہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے!

مسٹر محمد علی بوگرہ نے بھی آخر آخر میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے پر پُرزے نکالے۔ مگر یہ روشنی طبع اُن کے لئے بلائے جان ثابت ہوئی۔ اُن کو بہ صد حسرت و یاس امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھنا پڑا اور یہ نعمتِ عظمیٰ چودھری محمد علی صاحب کے حصہ میں آئی!

اسی دور میں مسٹر غلام محمد اپنی صحت کی انتہائی خرابی کے باعث گورنر جنرلی سے سبکدوش کئے جاتے ہیں اور جناب اسکندر مرزا اس منصبِ بلند پر فائز ہوتے ہیں۔ مسٹر غلام محمد مر گئے، اب ہم اُن کو کیا کہیں؟ بہرحال پاکستان کی تاریخ پڑھ کر آئندہ نسلیں حیرت کریں گی کہ پاکستان کے عوام پر بے بسی کا ایک وہ دور بھی گزرا ہے کہ ایک مفلوج شخص نے یہاں کئی سال تک مطلق العنان بن کر فرمانروائی کی ہے!

جائزہ

مسٹر محمد علی اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے پیش رو وزرائے اعظم یہاں تک کہ مسٹر لیاقت علی خاں بھی عوام کی مخالفت اور طعن و طنز سے نہ بچ سکے۔ لیاقت علی خاں مرحوم پر اُن کی بیگم کی بے حجابی کے سبب جو نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ محمد علی صاحب اپنی شریکِ حیات کی بے پردگی کے ہوتے ہوئے بھی اُس نکتہ چینی سے محفوظ رہے۔ انھیں پاکستان کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کا جتنا تعاون حاصل رہا ہے اور کسی وزیر اعظم کو اتنا تعاون میسر نہیں آیا!

مسٹر محمد علی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شراب، رقص و سرود اور اس قسم کی تمام بیہودگیوں اور عیش سامانیوں سے مجتنب ہیں۔ پاکستان کے وہ پہلے وزیر اعظم تھے جنہوں نے اپنے یہاں کی دعوتوں میں مردوزن کے اختلاط کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دی۔ اُن کی دیانت اور فرض شناسی کو بھی سب لوگ مانتے ہیں۔ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا چارج سنبھالنے کے بعد پبلک میں جو تقریریں کی تھیں اور اُن میں اسلام کو جس قدر ولولہ انگیز انداز میں پیش کیا تھا۔ اُس نے مسلمانوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اُن کے کردار کی عوام میں اچھی شہرت تھی !

مسٹر محمد علی کی ان تمام خوبیوں کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ مگر اس تصویر کا دُوسرا رخ یہ بھی ہے کہ قائد ملت مرحوم کی شہادت کے بعد پاکستان میں جتنے بھی انقلابات آئے ہیں، توڑ جوڑ کے کسی کھیل سے محمد علی صاحب غیر متعلق نہیں رہے سیاست کی اس شطرنج میں مانا کہ وہ "فرزین" نہیں رہے مگر پیادہ کی حیثیت سے انہوں نے ضرور حصہ لیا ہے۔ وہ اس قدر گہرے واقع ہوئے ہیں کہ پاکستان میں جو خوفناک تبدیلیاں ہوئی ہیں اور سیاست کی چالیں چلی گئی ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک چال کا بھی محمد علی صاحب کے قریبی دوست آشنا تک اُن سے اتا پتا معلوم نہ کر سکے۔ انہوں نے ہر انقلاب کا ساتھ دیا۔ ہر مشین میں اپنے کو فٹ کر دیا۔ اُن کی زبان سے کسی انقلاب کے خلاف کوئی لفظ نہیں نکلا !

مسٹر محمد علی کی دیانت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ مگر اُن کی وزارتِ خزانہ کے زمانہ میں غلام محمد مرحوم کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ پر جو اندھا دُھند مصارف ہوتے ہیں اور پاکستان کے بیت المال کو صرف ایک شخص کی ذات کے لئے جتنا زیر بار ہونا پڑا ہے، اس کی جوابدہی سے محمد علی صاحب بری الذمہ نہیں ہو سکتے !

دستور کا اُن کے دَورِ حکومت میں منظور ہونا یقیناً قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ اور اُن کے اس فخر و امتیاز کو دنیا کا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اگر اپنے ذاتی اثر سے کام لیتے تو دستور کے بہت سے خلاف خوش اسلوبی کے ساتھ پُر ہو سکتے تھے۔ دستور سازی کے دوران میں اُن کی روش یہ رہی ہے کہ کسی دفعہ میں اسلام اور جمہوریت کو کچھ فائدہ پہنچ گیا ہے تو کسی دوسری دفعہ میں اسلام اور جمہوریت کے مفاد کے "بقدر" کمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر دستور سازی کے بعد دستور کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ پُوری قوم اُن کے ساتھ تعاون کرتی اور "کاغذی دستور" حقیقی معنوں میں "دستورِ عمل" بن جاتا۔ اُن کے دَورِ حکومت میں یہ بھی ہوا کہ ایک طرف الجزائر میں فرانسیسیوں کے مظالم پر احتجاج کے لئے انہوں نے عوام کو یقین دلایا اور دُوسری طرف حکومتِ فرانس سے تجارتی معاہدہ بھی کر لیا !

مسلم لیگ کی بداعمالیاں اپنی جگہ مُسلّم ہیں۔ کھوڑو اور دولتانہ جیسے خود غرض کے بندوں کے کارنامے بھی سب پر روشن ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ مسلم لیگ کے بعض چوٹی کے لیڈر محمد علی صاحب کو چکے دیتے رہے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسٹر محمد علی کی روش نے مسلم لیگ کو نقصان اور ری پبلکن پارٹی کو فائدہ پہنچایا ہے۔ انہوں نے ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کی اور اُن کی پچھلی کامیابیوں اور تجربوں کے برخلاف اب کی بار اُن کا پانسہ اُلٹا پڑا !

ناظرین اپنے حافظہ میں اس یاد کو تازہ کر لیں کہ ڈاکٹر خاں صاحب کو نظر بندی سے نکال کر وزارت پر لایا جاتا ہے۔ پھر "ون یونٹ" کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے توڑ پر ری پبلکن پارٹی وجود میں آتی ہے اور "عالم بالا" کے اشارے سے مسلم لیگ کے بعض لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر اس نومولود پارٹی میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ واقعات کی اِن

کڑیوں کو ملا کر سنجیدگی سے سوچئے کہ ہمارے ملک میں پارٹی پالیٹکس کن بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

مسٹر محمد علی اگر پوری قوت کے ساتھ مسلم لیگ کا ساتھ دیتے اور تذبذب کی پالیسی اختیار نہ کرتے تو اُن کی پوزیشن بہت مضبوط رہتی۔ اُن کے انہی رجحانات کو دیکھ کر مسٹر فضل الحق کو بار بار یہ کہنے کی جراَت ہوئی کہ وزیر اعظم مسلم لیگ کو چھوڑ کر ری پبلیکن پارٹی میں شامل ہونے والے ہیں!

مسٹر محمد علی جب لندن میں تھے اور پھر وہاں سے حجاز گئے، تو اس دوران میں قائم مقام وزیر اعظم مسٹر چندریگر اور مسٹر نور الحق نے کراچی پولیس کی لرزہ بر اندام بے ضابطگیوں اور بے اعتدالیوں پر خوب کس کر گرفت کی تھی۔ اس احتساب کا پبلک نے بڑے پُر جوش انداز میں خیر مقدم کیا۔ مسٹر محمد علی جب اپنے سفر سے واپس تشریف لائے تو اُن کے روبرو ان واقعات کو دوسرے رنگ (!؟) میں پیش کیا گیا۔ یہ محمد علی صاحب کی فراست کے امتحان کا وقت تھا۔ انھیں پبلک کے جذبات اور صورتِ واقعات کا اچھی طرح اندازہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر انہوں نے بڑی بے دانشی کا ثبوت دیا۔ اور اپنے بعض جذباتی مشیروں کے کہنے میں آکر صورتِ حالات کو اس قدر غیر متوقع انداز پر بدلا کہ پبلک چیخ اٹھی:۔

یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے!

مسٹر محمد علی کی ساری عمر دفتری ماحول میں گزری تھی۔ پبلک سے اُن کا کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ اس لئے عوام کے معمولی سے احتجاج نے انھیں ہلا دیا۔ اور انھیں اس کشمکش و اضطراب سے دامن چھڑا نے ہی میں اپنی اور ملک و ملت کی بھلائی نظر آئی! مسٹر محمد علی کی سبکدوشی پر عوام نے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ اس انقلاب نے سب کو ششدر سا کر دیا اور دل دھڑکنے سے لگے کہ:۔

مبادا ازیں بتر گردد

نئے وزیر اعظم | مسٹر حسین شہید سہروردی اب ہمارے وزیر اعظم ہیں، اس منصب کے لئے وہ بہت دن سے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ:۔

مَیں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں!

بلکہ یہ اُن کی دیرینہ تمنّا اور برسوں کی آرزو تھی جو سنہ ۱۹۵۶ء میں جا کر پوری ہوئی ہے۔ عوام کے لئے وہ کوئی نئے آدمی نہیں ہیں سہروردی صاحب کو عوام اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔

ہمیں جناب سہروردی صاحب کی خدمت میں چند گزارشیں کرنی ہیں۔ ان گزارشوں میں "پند و نصیحت" کی جہاں جہاں "تلخی پیدا ہو گئی ہے اس کے لئے ہم معذور ہیں۔ خداوند کا حال اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارا مقصد طنز و تعریض نہیں۔ بلکہ اصلاح حال ہے۔ ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ جو سب سے بڑی بھلائی کر سکتا ہے وہ کلمۂ حق کا اُس تک پہنچا دینا ہے!

سہروردی صاحب (بالقابہ) کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ فرانس اور لبنان کے نہیں پاکستان کی اسلامی جمہوریہ کے وزیر اعظم ہیں۔ اسلامی جمہوریہ کے وزیر اعظم کو لازمی طور پر اسلامی اخلاق کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ یہ کسی "ملّا مولوی" کا قیاس یا رائے نہیں ہے۔ قرآن کریم عزت کا معیار "تقویٰ" کو ٹھیراتا ہے۔

مسٹر سہروردی نے اسلامی دستور سازی کے سلسلہ میں جو روش اختیار کی تھی، وہ پاکستان کے عوام مسلمانوں کی تمنّاؤں

...ذ کے مطابق نہ تھی۔ مگر اب وزیر اعظم بننے کے بعد اُن کا فرض ہے کہ جس دستور نے انھیں وزیر اعظم بنایا ہے اُس کا وقار اگر اُن کے دل میں باقی ہے تو اُسے دھوکہ دستور کے آگے رضا و رغبت کے ساتھ سر اطاعت ختم کر دیں۔ اور دستور کے عملی نفاذ کے لئے جدوجہد کریں۔ سہروردی صاحب میں فراست و دانائی ہے، تجربہ ہے اور جرأت بھی ہے، اس لئے اگر وہ اپنی تمام اچھی صلاحیتیں اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے صرف کر دیں تو یہ پاکستان جنت نشان بن سکتا ہے!

بعض "بڑے لوگ" عام انتخابات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کی کرسیاں خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ یہ لوگ انتخابات کو زیادہ سے زیادہ مدت تک ٹالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ سہروردی صاحب کو چاہیئے وہ اوپر کے چند لوگوں کے زوالِ نعمت کی بدخالیوں اور اندیشوں کی پروا کئے بغیر عام انتخابات کے لئے جلد سے جلد اسباب مہیا کر دیں۔

سہروردی صاحب عہدوں کے زوال و کمال کی دھوپ چھاؤں بارہا دیکھ چکے ہیں۔ یقین ہے کہ "جی حضوریوں" کی قصیدہ خوانیاں اُن کو دھوکے میں نہ ڈال سکیں گی۔ کرسی پر آتے ہی گارڈ آف آنر، استقبالیہ، خیر مقدم اور زندہ باد کے نعروں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ اخبارات کس اہتمام کے ساتھ کرسی نشینوں کی تصویریں چھاپتے ہیں۔ کیا کیا آؤ بھگت ہوتی ہے۔ مگر کرسی کے چھنتے ہی یہ سب مصنوعی نیاز مندیاں اور بناوٹی ہوا خواہیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ان "اُترے شخصوں" سے اُن کے وہی نیاز مند ملتے ہوئے کتراتے ہیں۔ کرسیوں اور عہدوں کے ساتھ جو عزتیں وابستہ ہیں وہ سب اضافی ہیں اُن کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل اعتبار اُس عزت، محبت اور عقیدت کا ہے جو کوئی شخص اپنے کردار و عمل سے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے۔ اس عزت و عقیدت کو کوئی زوال نہیں! اے وزیر گرامی مرتبت! آپ کو عمر دراز نصیب ہو۔ مگر سعدی کے اس قول پر مزید نظر رکھیئے ؂

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر — زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند!

ڈھاکہ کے پبلک جلسہ میں جو تقریر آپ نے کی ہے وہ بہت شاندار اور حوصلہ افزا ہے۔ مگر آپ سے پہلے جو وزیر اعظم بھی آیا ہے اُس نے ایسی ہی شاندار تقریریں کی ہیں۔ محمد علی بوگرہ تو برسات کے زمانہ میں مہاجرین کی جھونپڑیوں کے سامنے کوٹ پتلون سمیت دَلدل میں گھس گئے تھے اور "زندہ باد" کے نعروں نے انھیں خاصہ سرشار بلکہ فربہ کر دیا تھا۔ مگر وہ وقتی جوش ثابت ہوا۔ لوگوں کو تسلی دینے اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی تدبیریں ——— آپ اپنے شاندار لفظوں کو شاندار عمل سے بدل دیجئے۔ گرجئے کم، برسیئے زیادہ!

اے خانوادہ عالیہ سہروردیہ کے فرد محترم! آپ نے یقیناً بڑے نازک زمانہ میں اس اہم ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔ پاکستان اندر اور باہر ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ ابتری و انتشار کی کوئی حد نہیں۔ آپ کو ان نازک حالات میں ملک کی شیرازہ بندی کرنی ہے۔ بے روزگاری، بھوک اور جہالت کو مٹانا ہے۔ رشوت، اقربا نوازی اور بددیانتی کو ختم کرنا ہے۔ لاکھوں آدمی ہیں کہ سر چھپانے کیلئے بانس کی کھپچیں اور چٹائی کے ٹکڑوں تک کیلئے محتاج ہیں۔ انھیں بسانا ہے۔ کشمیر کی مہم ہے اور ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی حفاظت اور ناموسِ رسُولؐ کے تحفظ کا مسئلہ ہے، پاکستان کی کمزوری اور انتشار کو دیکھ کر ان کم ظرفوں کو یہ ہمت ہوئی ہے۔ پاکستان آج مضبوط ہوتا تو انسانیت کے محسن اعظم اور ہمارے آقا و مولا حضور خاتم النبیینؐ (ہماری جانیں حضورؐ کا در پر نچھاور ہوں) کی اہانت کا جواب احتجاج سے نہیں طاقت سے دیا جاتا!

پاکستان کی مادی ترقی کے ساتھ اُس نظریۂ حیات کی حفاظت، بقا اور ترقی و اشاعت سب سے زیادہ ضروری ہے۔

جس کی بناء پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔ اس سے جو کوئی غفلت برتے گا پاکستان کے مقصدِ وجود کو نقصان پہنچائے گا۔ اور کوئی مادی ترقی اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی !

جناب سہروردی صاحب کی خدمت میں آخری گزارش یہ ہے کہ طریق انتخاب کے مسئلہ میں اگر آپ نے "مخلوط انتخاب" پر اصرار کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کے دورِ حکومت کا آغاز ہی ایک بہت بڑی کشمکش سے ہوگا۔ اس کشمکش سے خدارا اپنی وزارت کو بچائیے۔ پاکستان کے عام مسلمانوں کے جذبات اور رجحانات کا احترام کیجئے۔ اقلیت کے حقوق کی حفاظت ایک اسلامی حکومت کا یقیناً فریضہ ہے مگر اقلیت کی دلدہی کیلئے اپنے معتقدات اور نظریوں کو تو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

مفاد پرستوں اور غرض کے بندوں سے عوام تنگ آ چکے ہیں۔ آٹھ نو سال سے جنگِ اقتدار کا تماشہ لوگ دیکھ رہے ہیں صبر و ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اب سیاست کے اس رُخ ہی کو بدل دیجئے۔ اس بساط ہی کو اُلٹ دیجئے۔ آپ اس بساط کے ہر مہرے کو خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں کہ کون کیا ہے ؟ آپ جرأت کے ساتھ کوئی اصلاحی قدم اٹھائیں گے تو قوم آپ کا ساتھ دے گی۔ آپ سے محبت کرے گی اور آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی۔ یہ بات آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ عوام کے جذبات اور تمناؤں سے بے پروا ہو کر جس کسی نے اپنی چلتی چلائی اور من مانی کی اس کو ناکامی بلکہ رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم آپ کو کامیاب اور نیک نام دیکھنا چاہتے ہیں !

آپ افراد کا بھی جائزہ لیجئے۔ اور ملک کی پارٹیوں اور جماعتوں پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ کس جماعت کا کیا رول رہا ہے ؟ کس نے کتنے رنگ بدلے ہیں۔ اور کیسے کیسے روپ بھرے ہیں اور کون جماعت اپنے مقصد کے ساتھ مخلص اور اپنی منزل میں ثابت قدم رہی ہے ! اہلِ اخلاص کی طرف خود بڑھیئے اور اُن کی فکر و بصیرت اور عملی قوتوں سے فائدہ اٹھائیے۔

ہمارے سامنے اس وقت آپ کا ماضی نہیں مستقبل ہے۔ ہم یہ خوش گمانی رکھتے ہیں کہ حکومت کا بارِ گراں آپ میں انشاء اللہ تبدیلی پیدا کرے گا۔ ذمہ داریوں کا احساس آپ کو وہ بنائے گا جو اسلامی حکومت کے سربراہ کار کو بننا چاہیئے۔

بارِ الٰہا ! جو تیرے دین کا بھلا چاہے، اُس کو دینی بہترین نعمتوں سے نواز۔ اور اُس پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔ اُس کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر دے ــــ اور جو کوئی تیرے دین سے کد رکھتا ہو اس کو اصلاح کی توفیق عطا ہو اور اگر وہ اصلاح پر آمادہ نہ ہو تو اس کو پست و ذلیل بنا دے۔ نصرت اُن کے لئے جو اسلام کے مددگار رہیں اور خذلان و نامرادی اُن کے واسطے جو اسلام کی ناکامی کے درپے ہوں !

اے مالک الملک ! فرعونی لشکروں کے لئے "ضربِ کلیم"، بُت کدوں کیلئے "تیشۂ ابراہیم"، شرارِ بولہبی کیلئے "چراغِ مصطفوی" اور فتنۂ باطل کے لئے عزمِ فاروقی عطا فرما !

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ !

ماہر القادری
۲۲ ستمبر ۵۶ء

خلیل حامدی

مصر کا دستور

جمہوریت اور اسلام کے ساتھ مذاق

مصر سے اور اُس کے عوام مسلمانوں سے ہمیں محبت ہے کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں۔ سوئز کینال کے مسئلہ میں مصری حکومت کے جرأت مندانہ اقدام کے ساتھ ہماری ہمدردیاں وابستہ ہیں اور ہم اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مصر کو اس جدوجہد میں کامیابی نصیب ہو۔

اب رہا جمال ناصر کی ذات اور شخصیت کا سوال۔ تو اس کا صرف یہی ایک رخ نہیں ہے کہ اُس نے سوئز کینال کے مسئلہ میں غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ جمال ناصر کی اس جرأت کی تابناکی کے ساتھ اس تصویر کا دوسرا تاریک رخ بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس کے ظلم وستم نے عرب دنیا کی سب سے زیادہ باا ثر اور فعال جماعت "اخوان المسلمین" کو تباہ کیا ہے اور اس کے اکابر کو اشاعتِ حق کے جرم میں پھانسیاں دی ہیں اور آج تک ہزاروں "اخوان" قید خانوں میں دردناک عقوبت کا شکار ہیں۔ جمال ناصر اسلامی تاریخ کی نامور شخصیتوں (Heroes) کے مقابلہ میں "فراعنہ مصر" کی شخصیتوں کو ابھار رہا ہے اور اسلام دشمنی کی حد ہے کہ مصر میں "فرعون" کے نام پر مصری مسلمانوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔

جمال ناصر نے مصر میں خود ساختہ "دستور" پیش فرما کر دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ جناب خلیل حامدی نے اس آمرانہ دستور پر تنقید کر کے ناصر کے آمرانہ عزائم کو بے نقاب کر دیا ہے۔ (م۔ ق)

۱۶ جنوری ۵۶ء کی شام کو مصر کے وزیر اعظم جمال عبد الناصر نے قاہرہ کے الجمہوریہ میدان میں ہزارہا لوگوں کے جمِ غفیر کے سامنے ملک میں آئندہ نافذ ہونے والے مجوزہ دستور کو پڑھ کر سنایا اور یہ اعلان کیا کہ ۲۳۔ جون ۵۶ء کو اس دستور کا پورے ملک میں ریفرینڈم کرایا جائے گا۔ درمیان میں پانچ ماہ کا وقفہ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ملک اہلِ فکر و دانش حضرات کو اطمینان کے ساتھ دستوری سفارشات کا مطالعہ کرنے اور اُن کے ماله اور ما علیہ کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ اور استصواب سے پہلے پہلے عوامی حلقوں کے تاثرات منظرِ عام پر آجائیں۔ یہ صورت نہ صرف اہلِ مصر کے لئے دل خوش کن تھی بلکہ دوسرے ممالکِ اسلامیہ میں بھی اسے استحسان کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس سے یہ امید بھی بندھ چلی تھی کہ اب مصر کو صحیح معنوں میں صدیوں کی غلامی سے نجات پانے اور جمہوری و آئینی نظام سے متمتع ہونے کا موقع نصیب ہو جائیگا۔ چنانچہ پورے پانچ ماہ کا عرصۂ مہلت ختم ہو گیا۔ ۲۳۔ جون ۵۶ء کو دستور پر رائے شماری کرائی گئی۔ صدر جمہوریہ کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔

اس پانچ ماہ کے طویل وقفہ میں ہم نے اپنی حد تک انتہائی کوشش اور جستجو کی ہے کہ دستور کے بارے میں مصر کی رائے عامہ کا ردّ عمل (Reaction) معلوم ہو اور کوئی ایسی آواز کان میں پڑے جو دستور پر آزادانہ تنقید کہی جا سکتی ہو۔ مگر ہمیں نہایت حسرت آمیز کلمات کیساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ پورے ملک میں کم از کم ہمیں کوئی ایسا شوریدہ سر نظر نہیں آیا جس نے جرأت اور جگرداری کیساتھ دستور کا تجزیہ کیا ہو۔ اور اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو مفصل طور پر اجاگر کرنے کی سعی کی ہو۔ حالانکہ وہاں بڑے بڑے "عباقرہ" موجود تھے، جن کی زبانیں ہر سانس کے ساتھ استقلال و حرّیت کا ورد کرتی ہیں۔ مساوات، رواداری اور جمہوریت کا چرچا اُن کی محفلوں میں عام رہتا ہے۔ اُن کے قلم ہمیشہ موجودہ دنیا کے جمہوری و آئینی ممالک کے نظام ہائے حکومت کی توصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ دستور کے معایب و محاسن کی شناخت میں اُنھیں پوری دستگاہ حاصل ہے۔ اگر کسی کی زبان نے مہرِ سکوت توڑی ہے تو اس لئے نہیں کہ دستور کی اصل حقیقت و ماہیت سے اور اس کے منافع و مضرّات سے عامۃ الناس کو روشناس کرانا مطلوب تھا۔ بلکہ اس لئے کہ مصر کے وزیر اعظم کو، جن کے متعلق اُنھیں کامل یقین تھا کہ "صدرِ جمہوریہ" بھی وہی بنیں گے ـــــ الروح العالمیہ (روحِ عالم) صانع التاریخ العربی (تاریخ ساز) اور رمز الثورۃ (رمزِ انقلاب) ثابت کریں۔ اور اُن کی زبان کو الہام ترجمان اور مسودۂ دستور کے ایک ایک لفظ کو عین حق و صداقت ٹھہرائیں۔ اس غیر مآل اندیشانہ کوتاہی (؟) کا ارتکاب صرف مصر کے عام اہلِ قلم اور اصحابِ فکر و نظر نے ہی نہیں کیا۔ بلکہ ازہر کے پُرجوش علماء بھی اپنی روایتی گرمجوشیوں کے باوجود مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اور شیخ الازہر عبد الرحمان تاج سے عام ازہری عالم تک کسی صاحبِ جبّہ و طیلسان نے دستور کو کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ عین انہی ایام میں جو حکومت کی طرف سے دستور پر عام غور و خوض کے لئے بطورِ مہلت دیئے گئے تھے، اُن میں سے کچھ حضرات مسئلہ وحدت الوجود اور وجودیین کے ساتھ مناقشات میں اُلجھے ہوئے تھے اور کچھ ازہر کے سرکاری لباس (جبہ و قطفان) کے فضائل و مناقب میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اور اُن کی تنقیص کرنے والوں یا اُس میں تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کی خبر لینے میں منہمک تھے۔ بلاشبہ محب الدین خطیب جیسے دین کے پُرانے مخلص، بے لوث عالم اور سنجیدہ و فہیم کارکن حلقۂ ازہر میں موجود ہیں۔ بلکہ مجلۃ الازہر (ازہر کا سرکاری آرگن) کے سرپرست ہیں۔ اور رسالہ کے اداریوں میں اپنی حد تک حکیمانہ انداز میں اصلاحِ احوال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس طرح کی اِکّا دُکّا آواز زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔ ممکن ہے انہوں نے دستور پر کھُلا اور واضح تبصرہ کیا ہو مگر ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اس بند اور محبوس فضا میں صرف ایک دبی دبی سی آواز سنائی دی ہے۔ یہ آواز منبر الشرق کے معمّر مدیر علی الغایاتی کی ہے۔ جس نے دعائیہ انداز میں دستور ساز حضرات کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ملک کے اندر اسلامی طرز کا شورائی نظامِ حکومت قائم کریں۔ اور مصر کے اسلامی ملک ہونے کی لاج کو برقرار رکھیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں احمد الغزالی اور مصالح عثمادی سے خاص طور پر شکوہ ہے۔ اُن کی دین پسندی بھی آڑے نہ آئی ـــ

دستور سازی اور فوجی استبداد

سوال یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت مصر میں باضمیر انسانوں کا اس قدر قحط رُونما ہو گیا ہے کہ دستور جیسے اہم مسئلہ کو، جو قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے ـــ درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کی تشخیص کر کے اچھے پہلوؤں کو اختیار کرنے اور تاریک پہلوؤں سے اجتناب کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اصل واقعہ یہ نہیں ہے اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم من حیث القوم

اس قدر بے شعور اور بے حس ہو جائے۔ بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ مصر کی پوری زندگی پر فوج چھائی ہوئی ہے۔ صدارت سے لے کر ایڈمنسٹریشن کے تمام ادنیٰ و اعلیٰ مناصب پر فوجی آفیسرز براجمان ہیں۔ محکمہ ہائے صحت، تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت، مواصلات، تعمیرات، رفاہِ عامہ، داخلہ و خارجہ پالیسی۔ حتیٰ کہ ادب و آرٹ پر بھی وہ لوگ بست و کشاد کے فرائض انجام دے رہے ہیں جو کل تک فوج کے اندر بکباشی (میجر) یوزباشی (کیپٹن) قائم مقام (لفٹنٹ کرنل) صاغ (بریگیڈیر) قائد الجناح (ونگ کمانڈر) اور لوا (جنرل) کے القاب سے پکارے جاتے تھے۔ اور انھیں فوجی قواعد و ضوابط کی بےچون اطاعت کے سوا ملکی نظم و نسق میں کوئی درک نہ تھا۔ ہمارے پاس ناموں کی پوری تفصیل کے ساتھ فہرستیں موجود ہیں (جن کی تائید مصر کے سرکاری اخبارات و رسائل بھی کرتے ہیں) جن سے پتہ چلتا ہے کہ بلدیاتی اور شہری نظم کے چھوٹے چھوٹے اداروں کی نگرانی کے لئے بھی فوج سے آدمی سپلائی کئے گئے ہیں۔ صحافت اور پریس پر نہ صرف فوج کا سنسر بیٹھا ہوا ہے (اگرچہ اعلان بھی ہوا ہے کہ ایک سال سے سنسر شپ ختم کر دیا گیا ہے مگر علی الغایاتی کا کہنا یہی ہے کہ "ابھی تک ہم آزاد نہیں ہوئے") بلکہ خود فوجی آفیسرز اخبار نویسی کی خدمت پر مامور ہیں۔ مثلاً کرنل انور السادات جو انقلابی عدالت کے تیسرے ممبر اور موتمر اسلامی مصر کے سرکاری طور پر جنرل سیکرٹری، الجمہوریہ پبلیکیشن کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اور الجمہوریہ اخبار کے مدیر مسئول ہیں۔ میجر حسن فہمی دار الہلال کے ادارتی عملہ میں ہیں اور انقلابی کونسل میں دار الہلال کے نمائندہ بھی ہیں۔ لفٹنٹ کرنل یوسف سباعی الرسالہ الجدیدہ کے رئیس التحریر، کرنل عبد المنعم اخبار روز الیوسف کے نگران اعلیٰ اور رسالۃ التحریر (سرکاری آرگن) کے ایڈیٹر ہیں۔ میجر وحید رمضان رسالہ النورۃ کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کے علاوہ آٹھ مدیر ثابت (ضلعوں) کے مدیر (انچارج) بکباشی ہیں۔ ازہر کے تمام اوقاف کی تولیت براہ راست انقلابی کونسل کے دستِ اختیار میں ہے۔ اس وقت لقریباً پچاس ایسے ایسوسی ایشن اور فیڈریشن ہیں جن کی زمامِ کار بکباشیوں اور میجروں کے ہاتھ میں ہے۔ بیرون مصر سفیروں اور قنصلوں میں بارہ کی تعداد میں صرف فوجی ہیں۔ ان تفصیلات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حکومتِ مصر کی طرف سے دستوری مسودہ کی اشاعت اور اس پر تنقید کرنے کے حق کا اعلان ایسے حالات میں ہوتا ہے جبکہ پورے ملک پر فوجی اقتدار اپنی پوری ہمہ گیری اور قوت کے ساتھ مسلط ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے جان لیوا حالات میں کس ناعاقبت اندیش اور احمق کی شامت آئی ہے کہ وہ دستوری مسودہ پر "مرضی ہست" کے خلاف زبانِ انتقاد کھول کر اپنے جان اور ناموس کو خطرے میں ڈال دے۔ جبکہ ایک سال پہلے اہلِ مصر کی آنکھیں فوجی اقتدار کی مخالفت کرنے والوں کا لرزہ انجام دیکھ چکی ہیں اور ہنوز دیکھ رہی ہیں۔ بے محابا پھانسیوں کے مناظر بھی اُن کے سامنے ہیں اور مصر کے جنگی جیلوں اور سینا کے صحراؤں کی ہولناکیاں بھی اُن کے شب و روز کے مشاہدے میں ہیں!

صحت مند اور عوامی تقاضوں کے مطابق دستور کی وضع و تدوین کے لئے جس ماحول اور فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ تدوینِ دستور کے وقت ہر شہری کو دستور سازوں پر کڑی نگرانی رکھنے کے آزادانہ مواقع میسر ہوں تاکہ اگر کسی وقت دستور سازوں کی نیت میں فتور پیدا ہو جائے اور وہ راہ راست سے ہٹ کر ذاتی اغراض اور نفسانی مطالب کے راستہ پر چل پڑیں تو جمہور کی طاقت بروقت اُن کا ہاتھ پکڑ سکے اور قومی مقتضیات کے مطابق دستور بنانے پر انھیں مجبور کر سکے۔ مگر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مصر میں یہ سب سے پہلی اور اہم شرط مفقود ہے۔ اگر اربابِ اقتدار کے اندر خلوص و دیانت کی ذرا بھی رمق ہوتی تو اُن کے لئے سب سے موزوں اور اقرب الی المقصود یہ شکل تھی کہ گزشتہ ہنگ

میں قوم کی جو خاصی تعداد گرفتاریوں کی نذر ہو چکی تھی - اور اُن کی گرفتاریاں بھی کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں - بلکہ سیاسی اختلاف کی بناء پر عمل میں آئی تھیں - اُن کو رہا کر دیا جاتا اور انھیں پوری سہولتیں فراہم کی جاتیں کہ وہ اپنا منشاء اور اپنی رائے منظرِ عام پر لاسکیں - اس کے ساتھ ہی ہنگامی قوانین کو یکسر منسوخ کر کے شہری آزادیوں کو بحال کر دیا جاتا اور ہر شخص کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے زبان و قلم کے استعمال کی غیر مشروط اجازت ہوتی - اس کے بعد یہ توقع تھی کہ دستوری خاکہ عوامی اُمنگوں کا آئینہ دار ہوگا - مگر یہ نہایت پُر فریب اور عدل و انصاف سے ہٹا ہوا راستہ ہے کہ فوج کے زیرِ سایہ اندرونِ خانہ بیٹھ کر ایک دستوری خاکہ ترتیب دے لیا جائے اور پھر ایک پبلک جلسہ منعقد کر کے عوام کے سامنے پڑھ کر سُنا دیا جائے - اور ایک طرف بہ بانگِ دُہل دستور پر عام تنقید کی دعوت دی جائے اور دوسری طرف سنسر شپ کو پہلے سے زیادہ ہوشیار اور چوکنا کر دیا جائے کہ اگر کسی منچلے اخبار نویس کی زبان کلمۂ حق نکال بھی دے تو اُسے عوام کے سامنے آنے سے پیشتر ہی حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے - اور ایک خاص منصوبہ بندی کیساتھ دستور کے معائب و محاسن سے بے بہرہ رکھنے والے عوام سے دستور کی منظوری پر ووٹ لے لئے جائیں، بلکہ دستور کے استصواب سے قبل دستوری خاکہ پیش کرنے والے "ہیرو" کو صدرِ جمہوریہ کی کرسی پر براجمان کرا لیا جائے - دستور سازی کی تاریخ میں ایسا عجوبۂ روزگار ڈرامہ آج تک چشمِ گردوں نے نہ دیکھا ہوگا - مکر و فریب کا یہ فنی شاہکار صرف مصر کی اسٹیج پر کھیلا گیا ہے - اس سلسلہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دستور پر لوگوں نے اتنے ووٹ نہیں دیئے جتنے صدرِ جمہوریہ کے انتخاب پر جناب ناصر کو دیئے ہیں - عوام کو دستور سے بڑھ کر "صدرِ جمہوریہ" سے کیوں والہانہ محبت ہے - اس کا انکشاف مستقبل کے ہاتھ میں ہے -

دوسرے عرب ممالک مثلاً شام، عراق، لبنان اور فلسطین کے اہلِ علم اور سیاست داں حضرات نے دستورِ مصر پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - اخوان المسلمین کے فاضل رہنما مصطفیٰ السباعی (جو شام کی دستور ساز کمیٹی کے ممبر رہ چکے ہیں) نے بھی مصری دستور اور شامی دستور پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے جامع اور مفصل موازنہ کیا ہے !

دستور ساز کمیٹی

دستورِ مصر کی تدوین و ترتیب میں دوسری نادرہ کاری یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جس "مجلس" نے دستور کی وضع و ساخت کی مہم سَر کی ہے - آج تک اُس کی ہیئتِ ترکیبی اور اُس کے ارکان و اعضاء پردۂ راز میں ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کونسی شخصیتیں ہیں جن کے ہاتھوں ملک کے مستقبل کی خاکہ بندی ہوتی ہے - براہِ راست عوام کی طرف سے کسی ایسی نمائندہ اسمبلی کا انتخاب نہیں ہوا اور نہ عوامی تنظیموں کے نمائندوں پر مشتمل کوئی بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جسے دستور سازی کے فرائض سونپے گئے ہوں - ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۶ - جنوری ۱۹۵۶ء کی مبارک شام کو وزیرِ اعظم مصر کی طرف سے ایک مسودۂ دستور حسبِ وعدہ پڑھ کر سنایا گیا ہے - اور ہزارہا حاضرین نے (جن میں اکثریت شہری لباس میں ملبوس فوجی حضرات کی تھی) پُرجوش تالیوں کے درمیان نہ صرف دستور کو شرفِ سماعت بخشا ہے بلکہ بیٹھے بیٹھے شرفِ قبولیت بھی عطا کر دیا ہے !

انقلابِ ملک کے چھ ماہ بعد سے مسلسل انقلابی عناصر اعلان کرتے رہے کہ ملک میں آزادانہ انتخاب کرائے جائیں گے اور شہری آزادیوں سے پابندیاں ختم کر دی جائیں گی - اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ جو اسمبلی وجود میں آئے گی وہ ملک کیلئے دستور بنانے کی ذمہ دار ہوگی - لیکن عملاً یہ ہوتا رہا ہے کہ جب انتخاب کا "یومِ موعود" قریب آتا رہا ہے "ناسازگاریٔ احوال" کا حوالہ دے کر اُسے نذرِ تعویق کیا جاتا رہا ہے - آخری اور حتمی وعدہ یہ کیا گیا تھا کہ جمال عبد الناصر بنڈونگ کانفرنس سے

واپس آکر سب سے پہلے اسی فرض سے سبکدوش ہوں گے، مگر" ناسازگاری احوال" میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - چنانچہ انقلابی حکام نے اس پیچیدگی کے حل کے لئے مؤثر گر یہ تجویز کیا کہ پارلیمانی الیکشن کا طویل اور دیر رس راستہ طے کرنے کے بجائے مختصر راستہ اختیار کرلیا اور انتخابات کے عوامی نتائج سے بچنے کے لئے خود ہی ایک تراشیدہ و خراشیدہ دستور عوام کی جھولی میں لاکر ڈال دیا - اس ضمن میں یہ بتادینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ انقلابی کونسل میں ۱۹۵۳ء میں سابق وزیر اعظم علی ماہر پاشا کی صدارت میں ایک دستوری کمیٹی تشکیل کی تھی - کچھ عرصہ تک کمیٹی دستور سازی کا کام کرتی رہی - کمیٹی کی ضمنی رپورٹوں کے جو حصے پریس میں آئے تھے اس سے مترشح ہوتا تھا کہ کمیٹی نیک نیتی سے قومی تقاضوں کی ہم آہنگی کرنے والا دستور بنانے کا ارادہ رکھتی ہے - لیکن کمیٹی کا یہ خلوص یا "شوخیٔ طبع" انقلابی کونسلروں کو ناگوار گزری اور انہوں نے بلطائف الحیل اس کے راستہ میں روڑے اٹکانے شروع کردیئے - حتیٰ کہ گزشتہ ہنگاموں میں علی ماہر پاشا اور ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری (ممبر دستور ساز مجلس) کے ساتھ سرکاری جماعت (ہیئت التحریر) کے لوگوں نے جو بدسلوکی کی ہے وہ اپنی شرمناکی میں اپنی آپ مثال ہے - انہیں ان کے دفتر میں بری طرح زدوکوب کیا - مگر حکام نے اس پر کوئی نوٹس نہیں لیا - کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ موجودہ مصری دستور دراصل وہی مسودہ ہے جو مذکورہ کمیٹی نے تیار کیا تھا، فوجی حکام نے اسی مسودے کو اپنی مرضی اور منشاء کے قالب میں ڈھال لیا ہے، مگر ہم اسے صریح مغالطہ سمجھتے ہیں - نیا دستور موجودہ حکمرانوں نے خود وضع کیا ہے - اس میں کسی کا مشورہ شریک نہیں ہے، اس کا انکشاف خود مصر کے قومی رہنمائی کے وزیر فتحی رضوان نے کیا ہے - لبنان کے ماہنامہ الصیاد کے ایڈیٹر (جو انقلاب مصر اور حکام مصر کے بہت بڑے مداح ہیں) نے الصیاد کے شمارہ ۵۹۴ کے افتتاحیہ میں لکھا ہے:-

"گزشتہ جمعہ کے روز پورا ایک گھنٹہ مجھے قومی رہنمائی کے وزیر فتحی رضوان کی صحبت میں گزارنے کا موقع ملا - اس مجلس میں ہماری گفتگو دستور کے موضوع پر ہوتی رہی - میں نے عزت مآب سے دریافت کیا "نیا دستور کس کیفیت کے ساتھ وجود میں آیا ہے، کیا اس کے بنانے میں انقلابی حکام اور وزراء کے علاوہ قانون دانوں نے بھی حصہ لیا ہے"؟ فتحی رضوان نے جواب دیا "نئے دستور کی تدوین صرف انقلابی حکام ہی کی مرہون منت ہے - ہماری خواہش یہی تھی کہ دستور سازی کی ذمہ داری صرف ہم اپنے کندھوں پر اٹھائیں" میں نے پھر سوال کیا "ہم نے تو سن رکھا ہے کہ بین الاقوامی عدالت کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالحمید بدوی بھی اس مہم میں شریک رہے ہیں" عزت مآب کی طرف سے جواب ملا "انقلابی رہنماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

اس تمہید کے بعد اصل دستور کا بعض پہلوؤں سے جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے:-

دستوری ڈھانچہ پورا دستور چھ ابواب اور ایک سو ترانوے دفعات پر مشتمل ہے - شروع میں ایک دیباچہ ہے جس کی ابتداء "نحن الشعب المصری" (ہم مصری قوم) سے ہوتی ہے - دیباچہ میں نہایت مفتخرانہ انداز میں امپیریلزم اور بادشاہت سے گلو خلاصی کرانے اور ملک میں انقلاب برپا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے - اور ان تمام عزائم کا اظہار کیا گیا ہے جن کے تحت آئندہ ملک سے سرمایہ داری، جاگیرداری اور ذخیرہ اندوزی کا استیصال کیا جائے گا۔

اور اجتماعی عدل اور صحت مندانہ جمہوریت کو فروغ دیا جائے گا۔ دیباچہ میں اسلام اور اسلامی اصولوں کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ بنیادی طور پر جس پہلو پر زور دیا گیا ہے، وہ نیشنلزم ہے اور بار بار "نحن الشعب المصری (ہم مصری قوم) کے الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ اور مصری قوم کی سربلندی اور مصری قوم کی تمجید و تعلّی کو اصل خواہش قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچے کے سرنامہ پر "بسم اللہ" لکھنے کے بجائے "ہم مصری قوم" کا جملہ نصب کیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم درج ذیل ہے:-

باب اول:- اس میں ریاست مصر کی تعریف - اقتدار جمہور اور سرکاری دین کی وضاحت کی گئی ہے۔

باب دوم:- اس میں "مصری سوسائٹی کے بنیادی ارکان" کے عنوان کے تحت معاشرے کی اساسات، قومی اقتصادیات، شخصی ملکیت، زرعی نظام، بنیادی ضروریاتِ زندگی، خدائی ثروت وغیرہ کے متعلق ریاست کا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم:- بنیادی حقوق کے ضمن میں شہری آزادیوں کی نوعیت بیان کی گئی ہے اور ان تمام حقوق کی تفصیلات متعیّن کی گئی ہیں جو شہریوں کی طرف سے ریاست پر اور ریاست کی طرف سے شہریوں پر عاید ہوتے ہیں۔

باب چہارم:- اس میں "اقتدار عظیم" کا عنوان دے کر اس کی ذیلی فصلوں میں اُن تمام اختیارات اور امتیازات کو بیان کیا گیا ہے جو صدر ریاست، مقننہ - انتظامیہ اور عدلیہ کو دیئے گئے ہیں۔

باب پنجم:- اس میں متفرق امور (*Miscellaneous*) مذکور ہیں اور ریاست کے مرکزی مقام (دارالحکومت) جھنڈے، پرچم اور سرکاری گزٹ اور اُن کے قواعد و ضوابط کا ذکر ہے۔

باب ششم:- اس میں نفاذ دستور تک عبوری، اور عارضی احتیاطات (*Transitional Provisions*) کے لئے حدود کار کی تعین اور انتخابات کا بیان ہے۔

عوام کا ردِّ عمل عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے "خذہ بالموت حتی یرضی بالحمّیٰ" یعنی حریف کو اگر موت کی دھمکی دی جائے تو وہ بخار پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی مثال آئین مصر پر صادق آتی ہے جس ملک میں فوجی ڈکٹیٹرشپ کا عفریت ناچ رہا ہو۔ ملک بھر کی حیات و ممات کا فیصلہ چند کرنلوں اور میجروں کے رحم و کرم پر موقوف ہو۔ سیاسی حریفوں کو، ان کے علم و فضل کا پاس کئے بغیر، پھانسی کے تختہ پر لٹکا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل تصور کیا جاتا ہو۔ قوم کی قوم کو ننگی کا ناچ نچا دینا تسکینِ خاطر کا سامان سمجھا جاتا ہو۔ آئین و ضابطہ، عدل و انصاف کا منہ چڑایا جاتا ہو۔ صبح و شام ریڈیو سے "ہامان و فرعون" زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہوں۔ ایسے ملک کے بارے میں صرف اتنا اعلان ہی کانوں میں پڑ جانا کہ وہاں بے آئینی کو ختم کر کے دستوری زندگی بحال کی جا رہی ہے۔ اطمینان کا سانس لینے کے لئے کافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شروع میں مصر کے سوا دوسرے عرب ممالک کے ہر طبقۂ خیال کے لوگوں نے مصر میں دستوری زندگی کی بحالی کا ذکر سنتے ہی کلمۂ شکر ادا کیا۔ اور یاس و ناامیدی کی اتھاہ تاریکیوں سے امید کی دھندلی کرنیں دکھائی دینے پر خوشی کا اظہار کیا۔ مگر افسوس! یہ تمام خوشی چند روز کی مہمان نکلی۔ جب دستور کا پورا متن سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ

ہیں اسلام کو تو باضابطہ فارغ خطی دے دی گئی ہے۔ جمہوریت کا گلا بھی گھونٹ ڈالا گیا ہے۔ پوری عرب دنیا میں
مصر کے ماسوا ہر ذی شعور اور صاحبِ بصیرت شخص نے دستور کو "آمریت کے خطرناک ڈھانچے اور ڈکٹیٹرشپ کے ارد گرد
مضبوط آہنی حصار بندی" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس وقت دستور کا پورا متن ہمارے سامنے ہے۔ عرب اخبارات
ہ اکثر اصحابِ علم کے تبصرے بھی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت دستور کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لینا ہمارے لئے مشکل ہے۔
تہ کسی حد تک اس کے اسلامی اور جمہوری گوشوں کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ کم از کم ان حضرات کی
غلط فہمی" کا ازالہ ہو سکے جنہوں نے پہلے ہی دن تاؤ میں آکر حکومتِ مصر کے نام مبارکبادی کے تار بھیج دیئے تھے
یا وہاں عملاً اسلامی نظام قائم ہو گیا ہے۔ مقامِ تعجب ہے کہ ہمارے ملک میں بھی کیسے کیسے سادہ لوح پائے جاتے
ہیں جو چین گئے تو فتویٰ دے دیا کہ وہاں مذہبی آزادی ہے۔ مصر کی خبر آئی تو پکار اٹھے۔ سبحان اللہ۔ اسلامی حکومت
قائم ہو گئی ہے !!

دستورِ مصر میں اسلام کا حصہ | دستورِ مصر کی پوری دستاویز میں جو ۱۹۶ دفعات پر مشتمل ہے، اسلام کا تذکرہ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک دفعہ ۳ (باب اول بعنوان "مصری ریاست")
میں، جس میں کہا گیا ہے کہ "الاسلام دین الدولة" (ریاست کا مذہب اسلام ہوگا) دوسرا دفعہ ۵ (باب
دوم بعنوان "مصری سوسائٹی کی بنیادیں") میں ذکر ہے۔ جس میں مصری معاشرتی تعمیر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے
"الأسرة اساس المجتمع قوامها الدين والاخلاق والوطنية" (مصری سوسائٹی کی بنیادیں خاندانی سسٹم
پر قائم کی جائیں گی اور خاندان کی عمارت دین، اخلاق اور وطن پرستی کے ستونوں پر تعمیر ہو گی)

ان دونوں مقامات کے علاوہ پورے دستوری ڈھانچہ میں کہیں اسلام، قرآن، سنت، فقہ اسلامی، اسلامی تعلیم
وغیرہ کا ذکر نہیں۔ حتیٰ کہ مساوات، اجتماعی عدل (Social justice) حریت وغیرہ کے اصولوں کے ذکر میں کہیں
اسلام کو مَس تک نہیں کیا گیا۔ مساوات سے مراد عام مساوات۔ اور عدل اجتماعی سے مراد مغربی جمہوری تصور لیا
گیا ہے۔ دفعہ ۳ میں بھی اسلام کا ذکر محض مجمل الفاظ میں کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور کسی جگہ ضمنی طور پر اشارتاً
یا کنایتاً بھی نہیں بتایا گیا کہ اسلام کے ریاستی مذہب ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس دفعہ کے اضافہ سے کیا ممکنہ نتائج
برآمد کرنے پیشِ نظر ہیں۔ اسلام کو ریاستی مذہب قرار دینے کے لئے کیا کیا عملی اقدامات کئے جائیں گے؟ کیا اسلام
(کتاب و سنت) کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیا جائے گا؟ کیا رسولِ خدا کو حَکَم (FINAL AUTHORITY)
مانا جائے گا؟ کیا قرآن و سنت کے خلاف قوانین و احکام پر خطِ تنسیخ پھیرا جائے گا؟ کیا بنیادی اور شہری حقوق
کے تحفظ کی ضمانت اسلامی اصولوں کے مطابق ہو گی؟ کیا قانونی یکسانیت انہی اساس پر قائم ہو گی جو اسلام نے
بیان کی ہے اور جس میں (Head of the State) سے لے کر ایک عام شہری (ور بدوی) تک ایک ہی سطح
پر ہوتے ہیں؟ کیا اسلام سرکاری مذہب بن کر اقامتِ معروف" اور ازالہ "منکر" کے بنیادی نظریہ کو جامۂ عمل پہنانے
کی طاقت رکھے گا؟

الغرض اسلام کی کوئی تشریح مثبت طور پر نہ منفی طور پر آئین کے کسی نقطہ میں جھلکتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ یہ
تک نہیں واضح کیا گیا کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ کا مذہب کیا ہوگا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائیگا۔

سرکاری مدارس میں دین کی تعلیم لازمی ہوگی یا نہیں؟ ان سب امور کے بارے میں دستور کی زبان یکسر گنگ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس آگے چل کر صاف صاف ایسی دفعات بیان کی گئی ہیں جو اسلام کے سرکاری مذہب ہونے کی دھجیاں اڑا رہی ہیں۔ اور جن میں اسلامی حکومت کے ایک ایک نقش کو کھرچ کھرچ کر مٹا دیا گیا ہے۔ اور مذکورہ بالا اسلامی دستور کی لازمی خصوصیتوں کی پوری جسارت کے ساتھ علانیہ تردید کی گئی ہے۔

ریاست کا مذہب اسلام ہوگا!

یہ وہ دعویٰ ہے جس کا شرف صرف جناب ناصر کے دستور ہی کو حاصل نہیں بلکہ مصر کا سابق دستور بھی اس دعوے سے خالی نہیں تھا۔ مصر پر کیا منحصر ہے، ترکی کے علاوہ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کیا گیا ہے۔ اس دعوائے عالم دعویٰ کی جو حقیقت تاریخی تجربات نے مہیا کی ہے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر وہ انسان جسے قدرت نے ذرہ بھر بھی عقل و شعور کی نعمت سے نوازا ہے، اس کے کھوکھلے پن پر شک و شبہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ خود مصر کا ماضی شاہد عادل ہے کہ جب سرزمینِ کنانہ پر شاہنشاہیت کا عفریت ناچتا رہا تھا، اُس وقت بھی یہ دفعہ دستور کے سرنامے پر منقش تھی۔ حالانکہ بجائے خود شاہیت اسلام کے منافی تھی۔ یہ بے جان اور نام نہاد دفعہ اپنے اندر قوت کا اتنا سرمایہ بھی نہ رکھتی تھی جتنی کہ بادشاہ کے اشارۂ ابرو میں ہوتی ہے۔ اسی دفعہ کی دستوری حکمرانی کے زیر سایہ مصر میں ناجائز جاگیرداریاں پنپتی رہیں۔ اسلام کے صریح محرمات، شراب، سود، اور فحش کاری کا ارتکاب کیا جاتا رہا۔ طاغوتی قوانین کا اجراء عمل میں آتا رہا۔ دشمن دین طاقتوں کے ساتھ محبت و الفت کے پیمان استوار کئے جاتے رہے۔ اخلاق و آداب کی سر بازار مٹی پلید کی جاتی رہی۔ امر بالمعروف کے بجائے "امر بالمنکر" اور نہی عن المنکر کے بجائے "نہی عن المعروف" کا علانیہ مظاہرہ ہوتا رہا۔ عدل و انصاف کے ادارے صریح طور پر غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلے نافذ کرتے رہے۔ ملکی ایڈمنسٹریشن کی پالیسی بے خدا سیاست کی بنیادوں پر مرتب کی جاتی رہی۔ سیاسی ڈراموں کے کردار اسلام کا جامہ تار تار کرتے رہے۔ بے بس رعیت فقر و فاقہ کے ہاتھوں سرِ راہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتی رہی۔ مگر شاہی محلات کے پردوں کے پیچھے جلوہ فروشی، ساقیوں اور نغمہ زن مطربوں پر زر و جواہر نچھاور ہوتے رہے۔ اور ناخدایانِ مصر مدہوشیوں کے عالم میں:-

تمتع من شمیم عرار نجد ۔۔۔ فما بعد العشیۃ من عرار

کا نعرہ الاپتے رہے اور اخلاق و کردار، شرافت و دیانت اور حریت و انصاف کے تمام اصولوں کے گریبان تار تار ہوتے رہے۔ جسے دیکھ کر اسلام تو کجا انسانیت کا بھی شرم کے مارے سر جھکتا رہا۔ مگر اس کے باوجود "دین الدولۃ الا... ے اندر یہ سکت نہ تھی کہ وہ اپنی دستوری قوت کو بروئے کار لا کر خلافِ اسلام اور خلافِ عدل عناصر کا ہاتھ پکڑ کر انھیں سیدھے راستے پر ڈال دیتا!

دفعہ ۵ میں "دین" کو خاندان کا اساسی عنصر تجویز کیا گیا ہے، بلاشبہ موجودہ دستور میں یہ مہدار امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے سابق دستور خالی تھا۔ اور اس دفعہ کی اہمیت اور تاثیر سے بھی مجالِ انکار نہیں۔ جس معاشرے کا خاندانی نظام دین و اخلاق سے عاری ہو اُس کے انحطاط پذیر ہونے میں کوئی معقول انسان شبہ نہیں کر سکتا۔ واضعینِ دستور فی الواقع اس احتیاط و حزم پر ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خاندان کے استحکام و انصرام کو دستور سازی کے موقع پر پیش نظر رکھا ہے۔

---

٥ ترجمہ:۔ نجد کے نرگسِ صحرائی کی خوشبو جتنا لطف اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ آج رات کے بعد یہ پھول دوبارہ کہاں نصیب ہوں گے۔

مگر "دین واخلاق" کے دستوری کلمات سے گزر کر جب ہم اس کی عملی تعبیر کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمارے ذہن سے حسنِ ظن کے وہ تمام محلات جو ظاہری الفاظ نے تعمیر کئے تھے اگر کر زمین پر آ رہتے ہیں۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین کا ذکر محض قلم کی روا روی اور زبان کے تعلق کی وجہ سے کر دیا گیا ہے۔ اسی بے اطمینانی اور غیر یقینی کیفیت میں اس چیز سے بھی اضافہ ہوتا ہے کہ عدلیہ (judiciary) مقننہ (legislature) اور انتظامیہ (Executive) تک کی تمام فصول (chapters) دین کے ذکر سے خالی گزر گئی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستور ساز حضرات (جن میں خود وزیر اعظم کرنل ناصر پیش پیش ہیں) نے اعلانِ دستور سے قبل اور اعلانِ دستور کے بعد معاشرتی زندگی میں اخلاق و آداب کی جو "تجدید" کی ہے، اُس سے مغربی معاشرہ کی صحیح جھلک سامنے آجاتی ہے۔

ارباب حل وعقد (جو واضعین دستور بھی ہیں) نے اب تک اپنے دینی تصور اور اخلاقی معیار کی جو عملی مثالیں فراہم کی ہیں وہ اس امر کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک دین و اخلاق کا تصور اور مفہوم وہ نہیں ہے جو اسلام کی تعلیم کے مطابق ایک عامی مسلمان تک کو ہوتا ہے۔ اُن کا تصور دین "تجدد و تسامح" کے جدید اصولوں پر مبنی نظر آتا ہے۔ عورتوں کا بے محابا نیم عریاں ہو کر بھری مجلسوں میں شرکت کرنا۔ غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز و تکریم میں لوک ناچ اور لوک گانوں کا بندوبست کرنا (جیسا کہ مارشل ٹیٹو کے اعزاز میں قاہرہ کے قصر عابدین میں رقص و سرود کی شب گیر محفل منعقد کی گئی تھی) کلب گھروں کے اندر ورائٹی پروگراموں کا اہتمام کرنا۔ (دستور کی رات کو "ہولبلد کلب" میں انوار السادات نے مجلس رقص منعقد کی۔ مثلاً اس میں اُم کلثوم کے نغمات اور کلب کی دوشیزاؤں کے رقص و سرود کے بیچ مؤتمر اسلامی کا جام صحت نوش کیا گیا۔ انوار السادات مؤتمر اسلامی کے جنرل سیکرٹری ہیں) ملک کی فاحشہ عورتوں کو اُن کے رقص و غنا کے "بلند فنی مظاہروں" پر قومی ثروت نثار کرنا۔ آزادیٔ نسواں کے نام پر اُٹھنے والی مغرب زدہ عورتوں کی ٹولی (بنات النیل وغیرہ) کی حوصلہ افزائی کرنا۔ اخلاق سوز۔ گھٹیا اور مبتذل لٹریچر کو سرکاری طور پر شائع کرنا۔ (آجکل مصر کے سرکاری اخبارات و رسائل جس طرح بے حیائی اور عریانی کے فحش مناظر سے لبریز ہوتے ہیں۔ اُس کا ذکر کرنے سے تو یہی بھلی) فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے وفود غیر ممالک میں بھیجنا (پاکستان میں بھی حال ہی میں ایک فلمی ڈیلیگیٹ آیا تھا۔ بلکہ چند روز ہوئے قاہرہ یونیورسٹی کی طالبات کا ایک وفد شام کے دورے پر گیا تھا اور انہوں نے وہاں جا کر کلاسیکی اور لوک ناچ کے مختلف نمونے پیش کئے۔ اس پر شام کے اخبارات نے حکومت شام سے سخت احتجاج کیا۔ اور غیرت دلائی کہ ایک طرف یہودیوں کی سنگینیں مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہیں اور دوسری طرف قوم کی غیرت و حمیت کو مصر کی "فرعون زادیاں" سیر تاج کر رہی ہیں۔ مطالبہ کیا کہ انھیں جلد از جلد واپس بھیج دیا جائے) دین کے مسلّمہ اصولوں مثلاً روزہ وغیرہ کو منہدم کرنے والے شر انگیزوں کو کھلی چھٹی دیئے رکھنا (جیسے شیخ بخیت نے فرضیت صوم پر حملہ کیا تھا۔ ازہر کی عدالت نے اُس پر مقدمہ چلا کر اُسے مجرم ثابت کیا مگر قومی مجلس نے اُسے آزادیٔ رائے قرار دے کر بری کر دیا) ان حضرات کے تصورِ دین اور تصورِ اخلاق کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتا۔

تہذیب فرعون کی آبیاری

خاندانی اساس کا تیسرا عنصر وطنیت بیان کیا گیا ہے۔ وطنیت سے مراد اگر اصولی اور فطری طور پر وطن کی محبت، وطنی اور جغرافی عوامل کو ایک حقیقت تسلیم کرنا اور معاشرے کے میٹریل (خاندان) میں اُن کے طبعی اثرات کا اعتبار کرنا ہے تو اس حد تک اس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی بلکہ بعض پہلوؤں سے مفید ہے۔ اور اگر وطنیت کی تہ میں وطن پرستی اور وطنی بالاتری کا وہی احساس کارفرما ہے جو

مغرب کے طرزِ فکر کی اُپج ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مصر کے آئین میں ایک ہی فقرے میں تضاد و تناقض کی ایسی لاجواب مثال پائی جاتی ہے جو شاید دُنیا کے کسی دستور میں ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔ کیونکہ ایک طرف اسی فقرے میں دین کو عنصر اساسی بتایا گیا اور دوسری طرف ساتھ ہی وطن پرستی کو بھی من حیث الاساس شامل کیا گیا ہے۔ مگر ہم کسی قسم کی غلط فہمی اور بد اندیشی کا شکار ہوئے بغیر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مصری حکمران جس طرح کی وطنیت اور قومیت کے احیاء کے خواہشمند ہیں وہ مغرب کی کوتاہ وطنیت اور قومیت سے کسی صورت کم نہیں۔ اس وقت حکومت مصر کے ذریعے سے، اخبارات کے ذریعہ سے اور پبلک جلسوں کے ذریعہ سے مسلسل یہ کوشش کر رہی ہے کہ قوم کے اندر یہ شعور بیدار کیا جائے کہ اس کا سلسلۂ نسب مصر کے "ذی المجد والعزۃ" فراعنہ کے ساتھ جا کر ملتا ہے۔ اور رمسیس، تحوتمس، توت، عنخ آمون وغیرہم فرعونی دور کے اکابر اس کے قومی رائل ہیرو ہوگ ہیں۔ "العزۃ للہ" کے پہلو بہ پہلو "المجد لمصر" کا نعرہ اُن کے انہی عزائم کی غمازی کرتا ہے! مصری قومیت کو اُبھار دینے کا یہ جوش ایک نہایت ہی خطرناک فتنہ ہے۔ یہ ایک زبردست سازش ہے جو اسلامی تاریخ کے نامور اکابر اور "ہیروز" کے خلاف کی گئی ہے کہ اُن کے سیرت و کردار اور تقدیس و عقیدت کی طرف جو مصری مسلمانوں کا اب تک رجحان رہا ہے اُس کا رُخ فراعنۂ مصر کی طرف ہو جائے۔ ط

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

صدر جمہوریہ آئینِ مصر کا سب سے دلچسپ حصہ صدر جمہوریہ یا صدر ریاست کے اختیارات و اوصاف ہیں۔ صدر جمہوریہ گویا پورے دستور کی روح اور محور ہے۔ آئین کے اس حصہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے بیسویں صدی کا صدر جمہوریہ نہیں بلکہ دَورِ ملوکیت کا "ظلّ سبحانی" ہے۔ جس کی ذات قدسی صفات معصوم، مبرّا عن الخطاء اور ہر قسم کے اختیارات کی مالک ہے۔ ذیل میں ہم مصر کے صدر جمہوریہ کے اختیارات و اوصاف کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ لگا لیں گے کہ مصر کے صدر جمہوریہ کے اختیارات میں اور نازی جرمنی اور فاشی اطالیہ کی آمریت کے اختیارات میں کیا فرق ہے۔ بیشک نام جمہوریت کا ہے مگر سارا نقشہ خالص آمریت کا کھینچا گیا ہے۔ اور ملک کو ایک شاہی خاندان سے نجات دلا کر دوسرے شاہی خاندان کے حوالے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صدر کے اختیارات پر ایک نظر دستور کی دفعہ ۱۱۱ کی رُو سے صدر جمہوریہ کو یہ علی الاطلاق حق حاصل ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کو جب چاہے توڑ دے۔ اسمبلی کی تحلیل میں وہ کسی شرط کا اور کسی مشورے کا پابند نہیں کیا گیا ہے۔ اگر نیشنل اسمبلی صدر کو معزول کرنا چاہے تو اُسے نہایت طویل راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور پھر بھی اس امر کا کوئی یقین نہیں کہ وہ اسے معزول کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مثلاً صدر کی معزولی کے لئے لازم ہے کہ اولاً اس تجویز کو اسمبلی میں لانے کے لئے ⅓ ارکانِ اسمبلی کا اتفاق ہو۔ اور تجویز میں یہ تصریح کی گئی ہو کہ صدر نے بہت بڑی بدعنوانی کی ہے یا اُس نے نظامِ جمہوری (دستور کی نہیں) کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کے بعد معزولی کی قرارداد کو پاس کرنے کے لئے ⅔ ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل ہونا ضروری ہے۔ (جبکہ اس کے انتخاب کے لئے مطلق اکثریت کی شرط لگائی گئی ہے۔ دفعہ ۱۲۰)

علاوہ ازیں دفعہ ۱۰۲ صدر کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ اسمبلی کے اجلاس کو کسی وقت بھی برخاست کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس اسمبلی کی گردن ہر وقت صدر کے ہاتھ میں ہو کہ وہ جب چاہے اُسے summon کر دے اور جب چاہے اُس کا اجلاس برخاست کر دے۔ وہ صدر کی معزولی کا کیا اختیار رکھتی ہے۔ اُس کی شامت آئی ہے کہ وہ صدر کو رخصت کرنے کی

حماقت میں خود اپنے ہی وجود سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاکستان میں بھی صدر کو تحلیلِ اسمبلی کے لئے پارلیمنٹ کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے، خود مصر کے پڑوسی ملک (شام) میں صدر کو کلی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ جب ترنگ میں آئے اسمبلی کا تیا پانچہ کردے۔ بلکہ پارلیمنٹ کی منظوری اس پر لازم کردی گئی ہے۔ صدر جمہوریہ مصر یا صحیح لفظوں میں کرنل ناصر ہی وہ واحد صدر ہیں جو اسمبلی کو چاہیں تو موت کے گھاٹ اتار دیں اور چاہیں تو زندہ رہنے دیں ؎

مار دیجی جلاؤ بھی آسان ہے سب تم کو آنکھوں میں ہلاہل ہے ہونٹوں میں مسیحائی

ڈکٹیٹرشپ کے خدوخال

(۱) صدر جمہوریہ افواج مصر کا کمانڈر انچیف ہے۔ (دفعہ ۱۳۹) کمانڈر انچیف وزیر دفاع کے منصب پر بھی فائز ہو سکتا ہے اور بیک وقت دونوں عہدوں پر رہ سکتا ہے (دفعہ ۱۷۰)

(۲) وزیراعظم بھی صدر جمہوریہ ہی ہوگا۔ پارلیمنٹ کے تمام وزراء کا نصب و عزل صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہوگا (دفعہ ۱۴۷)

(۳) ہنگامی حالات (ایمرجنسی) کا اعلان بھی صدر محترم ہی فرمائیں گے۔ اعلان کے پندرہ روز کے اندر اسے اسمبلی میں پیش کرنا ضروری ہوگا۔ اور اگر اسمبلی موجود نہ ہو (یعنی اسے قبل از وقت صدر محترم نے توڑ دی ہو) تو یہ آرڈیننس توثیق کے لئے نئی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں پیش ہوگا۔ (دفعہ ۱۴۴)

(۴) "دفاعِ وطن" کے نام سے ایک مجلس بنائی جائے گی جس کی زمام صدارت صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ اور اس مجلس کا کام پبلک کے اندر امن عام اور سلامتی کو قائم رکھنے والے وسائل و ذرائع پر خصوصی نگاہ رکھنا ہوگا۔ (دفعہ ۱۶۸) غالباً اس احتیاطی تدبیر کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے اندر اگر کوئی فرد یا چند افراد حکمران طاقت کے خلاف ہو جائیں تو ان کی سرکوبی کے لئے "قانونی" ذرائع موجود ہوں۔

(۵) صدر جمہوریہ سزاؤں کو کلیتہً معاف کرنے کا مجاز ہے اور ان کے اندر تخفیف بھی کر سکتا ہے (دفعہ ۱۴۱) البتہ عام معافی قانون کے مطابق ہوگی۔

(۶) صدر جمہوریہ کو حق حاصل ہے کہ وہ از خود قوانین کی سفارشات (تجاویز) پیش کرے۔ مجوزہ قوانین پر اعتراض کر سکے۔ قوانین کو صادر کرے۔ (دفعہ ۱۳۲)

(۷) سول اور فوجی ملازمین اور سیاسی نمائندوں کی نامزدگی صدر جمہوریہ کی طرف سے ہوگی۔ اور وہی حسب قانون انھیں معزول کرنے کے مجاز ہیں۔ (دفعہ ۱۴۰)

(۸) مصر کی تنظیمی وحدتوں کی نمائندہ مجالس کو صدر جمہوریہ اپنے آرڈیننس سے توڑ سکتے ہیں۔ اور ان کی تحلیل کے بعد عبوری دور کے لئے ایک باڈی نامزد کر سکتے ہیں جو ان کی قائم مقام ہوگی (دفعہ ۱۶۶)

(۹) جس زمانہ میں نیشنل اسمبلی کا اجلاس منعقد نہ ہو رہا ہوگا۔ یا نیشنل اسمبلی ٹوٹ چکی ہوگی۔ اس دوران میں صدر جمہوریہ ضرورت محسوس کرے تو آرڈیننس جاری کر سکتا ہے۔ جن کی پاورقت قانون کی ہوگی۔ یہ آرڈیننس تاریخ اجراء کے بعد پندرہ دن کے اندر اندر منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش کئے جانے لازم ہیں۔ اگر اسمبلی باقی ہو۔ اور اگر نیشنل اسمبلی ءءءءءءءء ہو چکی ہو تو نئی اسمبلی کے پہلے سیشن میں پیش کئے جائیں گے۔ اگر یہ آرڈیننس نیشنل اسمبلی میں توثیق کے لئے پیش نہیں کئے جائیں گے تو ان کی قانونی قوت از خود ختم ہو جائے گی۔ اگر نیشنل اسمبلی ان آرڈیننس کو مسترد کر دیتی ہے تو ان کے سابقہ اثرات بھی کالعدم سمجھے جائیں گے۔ الّا یہ کہ اسمبلی ان کے سابقہ اثرات پر اعتماد کی رائے دے یا کسی اور طریقہ سے سابقہ اثرات

کو صحیح قرار دے دے (دفعہ ۱۳۵)

) صدر جمہوریہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ ہنگامی حالات میں آرڈیننس جاری کرسکے۔ جو قانون کی قوت رکھیں گے، یہ حق صدر کو نیشنل اسمبلی کی طرف سے تفویض کیا جائے گا۔ ایسے آرڈیننس کا زمانۂ اجراء اور ان کی نوعیت محدود ہوگی (دفعہ ۱۳۶)

۱) صدر جمہوریہ مصلحت عوام کے تحت ضروری آرڈیننس کا اجراء عمل میں لاسکتا ہے۔ اور اُن کی عملی نوعیت پر نگرانی کرسکتا ہے (دفعہ ۱۳۷)

۱) تمام انتظامی اختیارات مصر کے صدر جمہوریہ کی ذات میں مرکوز رہیں گے (دفعہ ۱۱۹)

۱) صدر جمہوریہ کو دستور کی کسی ایک دفعہ کو یا متعدد دفعات میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔

رسالہ "الحضارۃ الدمشقیہ" کا مقالہ نگار دستور کی انہی دفعات کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ۔

> "مصر کا نیا دستور فی الحقیقت آمرانہ نظام حکومت کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں کسی عقلمند کو شک و شبہ نہیں ہوسکتا۔ ہمیں صرف ایک نیابتی طرز حکومت پر ہی اطمینان ہوسکتا ہے جس میں وزارت مجلس اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو"

جمہوریہ بننے کی ایک دلچسپ شرط اور اس کا پس منظر

جمہوریۂ مصر کی صدارت کے لئے جس شخص کو منتخب کیا جائے گا۔ اُس کے اندر اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کہ وہ ابوین اور [illegible]ن سے مصری النسل ہو۔ اور مصر کے اندر اُسے شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوں۔

— اس کی عمر ۳۵ سال (سن عیسوی کے لحاظ سے) سے کم نہ ہو۔

— شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ (دفعہ ۱۲۰)

دستور مصر کی اس سب سے اہم دفعہ پر ہم نے کافی غور و خوض کیا لیکن شروع میں تو ہم نہ سمجھ سکے کہ صدر جمہوریہ کے لئے پشتوں سے مصری النسل ہونے کی قید لگانے کا آخر پس منظر کیا ہو سکتا ہے، مگر بعد میں اس کی وجہ ہمیں معلوم ہوئی اور [illegible]صاحب (دمشق) نے بھی اس کی تائید کردی، کہ صدر جمہوریہ مصر کے لئے ابوین و جدین سے مصری ہونے کی سخت ترین شرط [illegible]ت اس بناء پر لگائی گئی ہے کہ کرنل جمال عبد الناصر کے سخت جان حریف اور مصر کی محبوب ترین شخصیت جنرل محمد نجیب کو [illegible] دیۂ مصر کی صدارت سے ابد الآباد تک کے لئے محروم قرار دے دیا جائے۔ اس لئے کہ جنرل نجیب کی ماں مصری نہیں، سوڈانی [illegible]۔ اب جنرل نجیب از روئے دستور (جب تک مصر کے اندر یہ دستور باقی ہے) صدارت کے لئے منتخب نہیں [illegible]سکے گا۔!

جمال عبد الناصر کی عاقبت اندیشی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اس نے اپنے حریف کو، جس کے متعلق اُسے ہر وقت یہ سخت اندیشہ لاحق رہتا تھا کہ فوج میں ہر دلعزیز ہونے کی وجہ سے وہ کسی وقت بھی دوبارہ ریاستِ مصر پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس [illegible]ن اسلوبی سے میدان سیاست سے نکال دیا ہے کہ اس کے دوبارہ آنے کے امکانات ہی ختم کردیئے ہیں۔ اور اس سے [illegible]ظلم شاہی خاندان پر کیا ہے جس کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اُس خاندان میں قیامت تک کے لئے وطن کے [illegible] غدار ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس فرضی جرم کی پاداش میں از روئے دستور فیصلہ کردیا گیا ہے کہ قیامت تک کے لئے [illegible] اس خاندان کا فرد صدارت کی کرسی پر نہیں بٹھایا جاسکتا۔ یہ شرط [illegible] نقطۂ نظر سے بھی اور جمہوری نقطۂ نظر سے بھی

سراسر نامعقولانہ اور جابرانہ ہے۔

۳۵ سال کی تحدید بھی بڑی معنی خیز ہے، دنیا کے تمام دستوروں میں غالباً کسی صدر کی عمر ۴۰ برس سے کم نہیں ہوگی۔ مصر کا دستور اس سلسلہ میں بڑا وسیع النظر ثابت ہوا ہے کہ اس نے ۳۵ سال کے امیدوار کو بھی صدارت کے انتخاب کی اجازت دے دی ہے۔ یہ جامہ دراصل جس ہستی کو پیش نظر رکھ کر سیا گیا ہے۔ وہ کرنل ناصر ہیں۔ کرنل ناصر کی عمر اس وقت ۳۶ برس کے لگ بھگ ہے، اگر دنیا کے دوسرے دستوروں کی تقلید میں مصر کے صدر کے لئے بھی ۴۰ سال کا ہونا ضروری قرار دے دیا جاتا تو اس کا صاف مدعا یہ تھا کہ "مصر کے" رمز الثورة، صانع التاریخ العربی، الروح العالمیة" کرنل ناصر صدارت کے لئے منتخب نہ ہوسکتے۔ ایسی صورت میں دستور بنانے سے کیا حاصل تھا۔ اس قباحت سے بچنے کے لئے جامۂ عمر کو ۵ سال کم کر کے ۳۵ سال کر دیا گیا ہے تاکہ "یہ دستور" (ناصر) کے بدن پر بلا نشیب و فراز پورا آسکے!

جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل

باب ششم میں عارضی انتظامات (Trasitional Provisions) کے تحت یہ دفعہ رکھی گئی ہے:۔

"ملکی عوام ایک نیشنل یونین کی تشکیل کریں گے جو" انقلاب" کے اغراض و مقاصد کو جامۂ عمل پہنائے گا۔"

"نیشنل اسمبلی کے امیدوار نامزد کرنے کا حق صرف۔ اور صرف نیشنل یونین کو حاصل ہوگا۔"

"نیشنل یونین کی تشکیل کا طریقہ اور قواعد و ضوابط صدر جمہوریہ اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعہ واضع کریں گے۔"

اس دفعہ کا بنظر تعمق مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مصر عارضی عسکری حکومت کے شکنجۂ استبداد سے نکل کر دائمی ڈکٹیٹرشپ کی گود میں جا رہا ہے۔ اس دفعہ کا صاف مفہوم یہ ہے کہ آئندہ مصر پر صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوگی!

نیشنل یونین کی تجویز اس لئے رکھی گئی ہے کہ ملک میں کسی دوسری جماعت کا وجود باقی نہ رہ سکے، اور اگر کوئی پارٹی قائم بھی ہو جائے تو اسے دستوری حیثیت سے اپنے نمائندے اسمبلی میں بھیجنے کا سرے سے موقع ہی نہیں مل سکیگا۔ دستور کی رُو سے صرف نیشنل یونین ہی اپنے نمائندے اسمبلی میں بھیج سکتی ہے، جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں فوج کی حکومت ہے۔ تمام نظم و نسق سے لے کر ادب و صحافت تک کے ادارے فوجی آفیسرز کی تحویل میں ہیں جو تمام ایسوسی ایشنز کے کرتا دھرتا بکباشات وصاغات ہیں۔

مجوزہ نیشنل یونین (جسے عوام منتخب کریں گے اور جس کی ہیئت ترکیبی صدر جمہوریہ اپنے ایک آرڈیننس سے واضع کریں گے) میں جن لوگوں کو نمائندگی حاصل ہوگی بلکہ جو نمائندگی کے واحد حقدار ہوں گے اور ان کے علاوہ کسی دوسرے کو جرأت نہیں ہوگی، وہ فوجی آفیسر ہی ہوں گے۔ یا وہ لوگ جنہیں فوج کی تائید اور حمایت حاصل ہوگی۔ کسی آزاد امیدوار کے لئے یا کسی آزاد جماعت کے لئے نیشنل یونین میں بار پانا حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ نیشنل یونین ہی اس امر کی مختار کل ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کے لئے نمائندوں کی نامزدگی عمل میں لائے، گویا نیشنل اسمبلی کی زینت اور رونق بھی انہی حضرات کے دم قدم سے ہوگی جو نہ صرف فوج کے محبوب اور مؤید ہوں گے بلکہ جناب ناصر کو بھی اپنا واحد اور لاشریک آقا تسلیم کرتے ہوں گے۔

اس پوری منطق کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نیشنل اسمبلی اپنی مطلق اکثریت سے صدر جمہوریہ کا انتخاب کرے گی اور پھر

منتخب کردہ صدر کا عام استصواب کرائے گی، حقیقت یہ ہے کہ نیشنل اسمبلی کے انتخاب اور صدر کے انتخاب کی یہ الٹی منطق کسی ڈکٹیٹر کے ذہن کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے۔ دُنیا کے جمہوری ممالک میں اس کا نمونہ گزشتہ اور موجودہ کسی دَور میں نہیں نظر آتا۔ یہ طرزِ حکومت صرف فاشی اور نازی حکومتوں کے اندر یا موجودہ روسی حکومت کے اندر ہی پایا جا سکتا ہے۔ جہاں صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے۔ اُس پارٹی کو اسمبلی کے نمائندے نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو منتخب کرتی ہے۔ اور پھر عوام سے پُوچھتی ہے کہ بتاؤ تم میں سے کسی ناعاقبت اندیش کو ہمارے منتخب کردہ شخص کے بارے میں چون و چرا کرنے کی جسارت ہو سکتی ہے!

مصر کے ہفتہ وار اخبار منبر الشرق نے اپنی ۱۷۔فروری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں انقلابی کونسل سے سوال کیا ہے۔

"کیا نیشنل یونین" ہیئت التحریر ہی کا دوسرا نام ہے یا اُسے جداگانہ بنیادوں پر تشکیل دیا جائے گا؟"

ہیئت التحریر وہ پارٹی ہے جو اس وقت مصر پر حکمران ہے اور انقلابی حکومت کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ منبر الشرق کا یہ استفسار دراصل اپنی استفہامی زبان میں اس امرِ واقعی کی غمازی کر رہا ہے کہ وہی کھلاڑی جو اب تک فوجی حکومت کے نام سے مصر کے اسٹیج پر دندنا رہے تھے۔ اب جمہوری قبا کے پردے میں استبداد کے کرتب دکھائیں گے!

ایک نہایت خطرناک دفعہ

باب پنجم دفعہ ۱۹۱ میں بیان کیا گیا ہے۔

(ا) وہ تمام فیصلے جو انقلابی کونسل کی ہائی کمان کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔

(ب) وہ تمام آرڈیننس جن کا تعلق انقلابی ہائی کمان سے ہے اور وہ اس کی تکمیل اور تنفیذ کے لئے جاری کئے گئے ہیں۔

(ج) وہ تمام آرڈیننس اور قوانین جو ان اداروں سے جاری کئے گئے ہیں جن کی تشکیل کا حکم انقلابی ہائی کمان کی طرف سے دیا گیا تھا۔

اور

وہ تمام اقدامات، تصرفات اور جملہ کارروائیاں جو مذکورہ اداروں کی طرف سے یا کسی بھی ایسی پارٹی کی طرف سے جو انقلاب کی حمایت اور نظامِ حکومت کی حفاظت کے لئے قائم کی گئی تھی، عمل میں آئی تھیں اُن پر کسی قسم کی:

(۱) نکتہ چینی اور تنقید نہیں کی جا سکے گی۔

(۲) اُن کی تنسیخ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکے گا۔

(۳) اُن میں ترمیم و تغیر (amendment) کرنے کی اجازت نہیں ہوگی!

اس ظالمانہ دفعہ نے نہ صرف اہلِ مصر بلکہ تمام عرب ممالک کے عوام کے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال کی حکومت نے بھی اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اپنی بدعنوانیوں پر نقاب ڈالنے کے لئے اسی طرح کی دستوری تدابیر اختیار کی تھیں۔

اس دفعہ کا مفہوم یہ ہے کہ فوجی حکمرانوں نے مصر کے اندر فوجی انقلاب لانے کے بعد جو کچھ صحیح یا غلط اقدامات کئے

ہیں۔ براہ راست کئے ہیں یا مختلف باڈیز کو تشکیل دے کر کئے ہیں۔ انھیں زیرِ بحث لانے کے تمام دروازے بند کئے جائیں۔ انقلابی حکمرانوں نے عنانِ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں اُن سے ساری دنیا باخبر ہے، انقلاب اس لحاظ سے مستحسن تھا کہ مصر کے اندر سے شاہیت کی جڑیں اکھاڑ کر عوام کو اس کے ظلم وجور سے نجات دلائی گئی تھی۔ مگر خود انقلاب لانے والوں نے اہلِ ملک کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ اس شاہی استبداد سے بھی بدتر ثابت ہوا ہے۔ جنرل نجیب کو جس کے سر پر انقلاب لانے کا سہرا ہے اور جو کرنل ناصر سے پہلے صدارت کی کرسی پر تھا، نہ صرف صدارت سے برطرف کر دیا گیا بلکہ عملاً اس کے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہے کہ اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ابھی تک وہ اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ اسے کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر جرم کی جو فردِ قرارداد عائد کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ آمریت کے بجائے جمہوری حکومت کے حق میں تھا اور ملک کی زمام فوج کے ہاتھ سے نکال کر عوام کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ جنرل نجیب کے حامیوں کو چن چن کر فوج سے نکال دیا گیا۔ رائے عامہ کو سختی سے دبا دیا۔ سول اداروں میں جتنے لوگوں نے جنرل نجیب کی برطرفی پر احتجاج کیا یا افسوس کیا انھیں ڈسچارج کر دیا۔

اسی طرح مصر کی دینی جماعت الاخوان المسلمون کے ساتھ جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے وہ ہر صاحبِ خرد انسان کو خون کے آنسو رلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی مقتدر علمی شخصیتوں کو کسی جرم و گناہ کے بغیر تختۂ دار کی نذر کر دیا گیا۔ ہزاروں انسانوں کو جیلوں میں بند کر دیا اور وہاں سخت سزاؤں کا نشانہ بنایا۔ اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اُن کی املاک کو ضبط کر کے فوجی حکومت کے قبضہ میں دے دیا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ عالمِ عرب واسلام کے شدید احتجاج کے باوجود اُن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ ان تمام بے ضابطگیوں اور بدکرداریوں کے ہوتے ہوئے انقلابی حکمران پاداشِ عمل سے کیونکر بچ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس گرفت سے جان بخشی کرانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھا ہے کہ دستور میں کوئی ایسا تحفظ کر لیں جس کی زد سے آئندہ بھی اُن کی حماقتوں کے خلاف کسی کو چارہ جوئی کرنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انقلابی عدالت نے آج تک جو انصاف دشمن فیصلے صادر کئے ہیں وہ باقاعدہ نافذ رہیں گے۔ اُن کے خلاف کسی ادارے کے سامنے اپیل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جنرل نجیب نظر بند رہیں گے۔ اُن کے حامی فوجی علی حالہم برطرف رہیں گے۔ اخوان المسلمون کے معدودے چند اور باقی اصحاب پھانسی پا چکے ہیں تو یہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ ہزاروں جیل میں پڑے سسک رہے ہیں اور سسکتے رہیں گے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور نظم ونسق کے اداروں میں سے معتد بہ تعداد نجیب و اخوان کی حمایت کے اشتباہ میں معزول کر دی گئی ہے تو اسے کوئی دوبارہ نہیں لا سکتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ دستور یہ کہتا ہے کہ انقلابی کونسل اور انقلابی کونسل کی ماتحت باڈیز (انقلابی عدالت وغیرہ) نے جو فیصلے صادر کر دیئے ہیں اُن پر تنقید کی جا سکتی ہے نہ انھیں کسی کے سامنے زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے اور نہ اُن میں کسی تبدیلی و ترمیم کی گنجائش ہے!

مصر کے دستور ساز ممکن ہے کہ اس دفعہ کو دستور میں داخل کر کے مطمئن ہو گئے ہوں کہ اُن کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کائنات میں اللہ کی سنت بھی جاری وساری ہے۔ اُس کے سامنے مصر کے موجودہ فوجی حکمران کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ خود مصر کے اندر فرعونِ وہامان کے نعرہ ہائے "انا ربکم الاعلیٰ" کے باوجود سنت اللہ نے اُن کا ایسا نام ونشان مٹایا کہ رہتی دنیا تک عبرت وموعظت بنا رہیگا۔ ترکی کا ماضی اُن کے سامنے ہے۔ کمال اتاترک نے اپنے بچاؤ کے لئے ایسے ہی ذرائع اختیار کئے تھے۔ مگر تاریخ نے بہت جلد اُن کا بودا پن ثابت کر دیا۔ وہی "اتاترک" جو "قوم کا باپ" کہلاتا تھا، وہی آج

اپنے "بیٹوں" کے ہاتھوں اپنے کئے کی سزا پا رہا ہے۔ اس کے مجسمے ترکی میں بکثرت مقامات پر توڑ دیئے گئے ہیں۔ اور اُس کی تمام تصویروں کو (دو ایک کے سوا) پھاڑ دیا گیا ہے۔ اور اب "تحفظ اتاترک" اور "تحفظ انقلاب" کے نام سے قانون نافذ کئے جا رہے ہیں۔" (المسلمون قاہرہ) ؎

(الحذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

ملکی عدالت سے بالاتری

اولاً تو یہ تصور کرنا ہی محال ہے کہ نیشنل اسمبلی، صدر کا محاسبہ کرنے اور اُسے مجرم قرار دینے میں کامیاب ہو سکتی ہے، اور اگر بالفرض (جیسے عنقاء کا وجود فرض کر لیا گیا ہے) صدر کے خلاف ارکانِ اسمبلی کی ⅔ اکثریت بہت بڑی بدعنوانی یا نظامِ جمہوری سے عدم دلچسپی کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کرلے تو مقدمہ کی سماعت کا حق سپریم کورٹ کو بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی جائیگی جو اس کی تحقیقات کرے گی۔ ثبوتِ جرم پر زیادہ سے زیادہ اُسے منصبِ صدارت سے معزول سمجھا جائے گا اور دوسری کوئی سزا اُسے نہیں دی جاسکے گی۔

"دین الدولۃ الاسلام" کا تقاضا تو یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں۔ کسی کو کسی پر تفوق نہ ہو۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور متدین خلیفہ کا ایک بوڑھیا سرِ بازار محاسبہ کر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صدرِ ریاست کو حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ اُونچا درجہ دیا جائے۔ مگر "دین الدولۃ الاسلام" کی دفعہ اس لئے دستور میں نہیں رکھی گئی کہ صدر جمہوریہ مصر کے اختیارات کو محدود کردے اور قدم قدم پر اسلام کی عائد کردہ پابندیوں کا احساس دلاتی رہے بلکہ اس دفعہ کے شاملِ دستور رکھنے (کیونکہ یہ پہلے دستور میں بھی تھی) کا مقصد محض عوام کو بیوقوف بنانا ہے!

بنیادی حقوق

"شہری آزادیاں"۔ دستور کے اندر اہم ترین حصہ شہریوں کے بنیادی حقوق کا ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دستور کی ضرورت ہی اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ ایک شہری کو اس کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بہم پہنچائی جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ مصری دستور میں بنیادی حقوق و واجبات کی وضاحت کی گئی ہے جن کا ملخص یہ ہے:۔

(۱) ہر شہری کو عقیدہ و مذہب اور عبادات وشعائر دینیہ کی آزادی ہوگی۔ بشرطیکہ اُن سے عام نظم و نسق میں خلل واقع نہ ہو اور نہ آداب کے منافی ہو۔

(۲) ہر شہری کو آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ تحریر و تقریر۔ آزادیٔ بحث و مباحثۂ علمی کی ضمانت دی جائے گی۔ مگر ان آزادیوں کو "قانونی حدود" میں پابند رکھا جائے گا۔

(۳) آزادیٔ نشر و اشاعت اور آزادیٔ صحافت کی ضمانت، مصالحِ عامہ اور قانونی حدود کے تحت بہم پہنچائی جائیگی۔

(۴) آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع (اسلحہ کے بغیر) "قانونی حدود" میں رہ کر جائز ہوگی۔

اخبار "منبر الشرق" نے "قانونی حدود" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"قانونی حدود" کے الفاظ کے اضافہ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دستور دائیں ہاتھ سے آزادی دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے واپس لے لیتا ہے۔"

تعلیم

(۱) تعلیم آزادانہ ہوگی اور اسے قانون، عام نظم و نسق اور آداب کی حدود میں محدود رہو گا۔

(۲) تعلیم مصریوں کا حق ہے، حکومت تربیتی، ثقافتی ادارے اور مدارس جاری کرکے اُن کے اس حق کو پورا کرے گی۔ ہر قسم کی تعلیم پر حکومت نگراں ہوگی اور اس کے لئے قانونی تدابیر عمل میں لائے گی۔

(۴) سرکاری مدارس میں تعلیم مختلف مرحلوں میں مفت ہوگی۔ مگر اُن حدود کے تحت جنہیں قانون متعین کرے گا۔

(۵) ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ جسے سرکاری مدارس میں مفت رکھا جائے گا۔

صحت | صحت کی دیکھ بھال مصریوں کا حق ہے۔ ریاست مصر اپنے مختلف اداروں کے ذریعہ سے اس حق کی نگرانی کرے گا۔

مساوات عامہ:۔ (۱) تمام شہری قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے۔ قومیت، نسل، زبان اور دین و عقیدہ کی بنا، پر اُن کے حقوق میں تفاوت نہیں کیا جائے گا۔

(۲) جرم و سزا قانون کی بنا پر ہوگا۔

(۳) کسی شہری کی گرفتاری اور نظر بندی قانونی احکام کے موافق ہوگی۔

(۴) کسی شہری کو کسی معین جگہ پر رہنے کے لئے مجبور کرنا یا کسی معین جگہ پر رہنے سے منع کرنا ناجائز ہوگا۔ مگر ان احوال کے تحت جو قانون میں واضح کر دیئے جائیں گے۔

مصر کے دستور پر یہ بہت ہی مختصر اور مجمل تنقید ہے۔ اس اجمال سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصر کے "دستور" نے ملک میں آمریت کی جڑیں کس قدر مضبوط کر دی ہیں اور وہاں جمہوریت کتنے سخت فولادی شکنجہ میں کسی ہوئی ہے۔

اسعد گیلانی

راہِ حق میں رشتہ اور ناتہ کی حیثیت

(سید احمد شہید کی تحریک کے واقعات کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کیا گیا تھا - در اصل یہ میری کتاب "شہیدین کی تحریک کا انقلابی پہلو" کا ایک باب ہے -) (اسعد گیلانی)

دُنیا کے بندھنوں میں جو انسان کو ہر انقلابی کام سے روکتے، ہر اُونچے مقصد سے باز رکھتے اور ہر ظاہری نقصان سے گریز کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ رشتہ اور ناطہ کے بندھن سب سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا اصول پسند اپنے اصول کی خاطر جان کی بازی لگاتا ہوا جب اپنے بچے کی صورت کو بے رونق دیکھتا ہے تو ایک دفعہ دھک سے رہ جاتا ہے اور اپنے ارادوں پر نظرِ ثانی کرنے پر تیار ہو سکتا ہے!

انقلاب کی راہ میں قدم قدم پر خطرے ہیں۔ لہٰذا اس راہ کے مسافر کو سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکلنا چاہیئے - دُنیا کی آرائشوں کی تمنّا سے پہلے اپنا دل خالی کرے، بعد میں کسی انقلابی کام کے لئے قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔ جو شخص بعض مفاد سامنے رکھ کر کسی انقلابی تحریک کا ساتھ دیتا ہے وہ عین منجدھار میں پہنچکر پسپا ہوتا ہے، عین مقابلے کے وقت پیٹھ پھیرتا ہے اور عین مخالف کی دعوتِ مبارزت پر معذرت کا ہاتھ بڑھاتا ہے، ایسے آدمی کے لئے کسی انقلابی کام کے لئے اُٹھنا ایک احمقانہ حرکت ہے -

انقلابی تو وہ ہے جو غیروں کو کشتیٔ حق میں بٹھا کر تیرتا ہوا لے جاتا ہے - اور اپنے بیٹے کو عین لہروں میں ڈوبتا دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے - دل بیٹھتا ہے، باپ کی محبت جوش مارتی ہے، ارحم الراحمین سے تڑپ کر التجا و دعا کرتا ہے اور وہ بھی عُذر کے ساتھ اور جب اُدھر سے سخت الفاظ میں تنبیہ ہوتی ہے تو پورے عجز و تضرع کے ساتھ عفو کا طالب ہوتا ہے انقلابی تو وہ ہے جو میدانِ جنگ میں باپ کے سامنے بیٹا اور بھائی کے سامنے بھائی اور چچا کے سامنے بھتیجا تلوار سونت کر آجاتا ہے اور اپنے عمل سے بتا دیتا ہے کہ حق کی تلوار سب رشتے کاٹ سکتی ہے - انقلابی تو وہ ہے جو بدر کے اسیروں کو سامنے دیکھ کر مشورہ دیتا ہے کہ ماموں کو بھانجا قتل کرے، بھتیجے کو چچا قتل کرے - ہر دشمنِ حق کو اس کے رشتہ کا عزیز قتل کر کے ثابت کرے کہ اب مادی رشتوں کا لاگ راہ حق کے مسافروں سے دُور ہو چکی ہے!

جب بھی کبھی کوئی انقلابی تحریک اُٹھتی ہے تو رشتہ اور ناتہ کے بندھن ضرور ہی اس کے کارکنوں کے دامنگیر ہوتے ہیں - باپ، ماں، بیوی، بچّے، بھائی کتنے ہی لوگ ہیں جو مختلف مفادات کے پھندے لے لے کر اس کو اس حرکت سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں - جو ان کے نزدیک اس کی دُنیا کی تباہی ہوتی ہے اور چونکہ اُن کی دُنیا اس کے ساتھ کسی نہ کسی پہلو سے وابستہ ہوتی ہے اور متاثر ہوتی ہے، اس لئے وہ اسے خود اپنے مفاد کے جوئے سے نکل کر بھاگتے دیکھ کر ہر پہلو سے اس کو روکتے، ٹھانتے، پھانستے، بہلاتے اور ڈراتے ہیں - یہ صورت اُن کو بھی پیش آئی جو باطل کا علم لے کر

اُٹھے، ان کو بھی پیش آئی جو حق کے خواہاں ہوئے اور ان کو بھی پیش آئی جو سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں آگے بڑھے، ایک بار مولانا عبدالحی نے سورۂ المجادلہ کی بعض آیات کی تفسیر کی:-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انھیں تم اس حال میں نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور رسول کے مخالفوں سے محبت کریں چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا کنبے والے!

تفسیر سنتے ہوئے اچانک سید صاحبؒ سنبھل کر دوزانو ہو گئے اور فرمایا:-

"میں خدا کا بندہ اس کے رسول پاک کا فرمانبردار ہوں۔ میں خدا اور اس کے رسول برحق کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر وغریب کسی کا پاس نہ کروں گا، کسی کی خوشی و ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا، اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب عزیز ہے۔ دنیا کی چیزوں میں سے وہ جو چاہے سے لے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے احکام بجا لانے میں اس کی بھی رعایت نہ کروں گا میرے تمام رشتہ دار صاف صاف سن لیں کہ جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری میں میرے شریک حال ہوں، حکموں کو پورا کرنے اور منع کی ہوئی باتوں سے دور رہنے میں کسی کے طعن و ملامت کا خیال تک دل میں نہ لائیں وہ میرے عزیز ہیں اور مجھے محبوب ہیں۔ اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں ان کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ صاف کہتا ہوں جو اللہ کی راہ میں مستعد ہو وہی میرا ساتھی ہوگا۔ جسے یہ منظور نہ ہو وہ مجھ سے الگ ہو جائے"!

ایک دوسرے موقع پر اپنی خوشدامن سے کہہ دیا:-

"آپ پر واضح رہے کہ مجھے خاندان کے چھوٹے یا بڑوں سے جو تعلق ہے صرف خدا کے لئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی خدا کے احکام کے خلاف قدم اٹھائے گا تو میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی" (وقائع ص ۱۵۸)

چنانچہ سید صاحبؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اگر تعلق رکھا تو صرف اپنے معبود حقیقی سے۔ باقی لوگوں سے اتنا ہی تعلق رکھا جتنا کہ ان کا تعلق حق کے ساتھ قائم ہوا۔ انہوں نے ہمیشہ حق کی راہ اختیار کی۔ اور اس کی رضا کو پیش نظر رکھا اور اس مقصد کے لئے اگر رشتہ اور ناطہ کو قطع کرنا پڑا۔ تعلقات کو کاٹنا پڑا اور اقرباء کی امیدوں کا خون کرنا پڑا۔ تو وہ خون کے اس دریا میں سے بھی بے دریغ گزر گئے۔ اور اس بے نیازی سے گزرے گویا یہ ان کی منزل کا لازمی تقاضا تھا۔ چنانچہ جب سید صاحبؒ نے میدان جہاد کے لئے گھر سے ہجرت کی تو اہل وعیال کو بعد میں کسی وقت اپنے پاس بلا لینے کا ارادہ تھا۔ لیکن اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ ملاقات اس دنیا میں آخری ہے۔ اس وقت دونوں بیویوں اور معصوم بچوں کو اللہ کے سپرد کر کے گھر سے نکل گئے۔ اور یہ ان سے ان کی آخری ملاقات تھی۔ اس جدائی کے بعد اس دنیا میں ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ بات صرف کہہ کر گزر جانا آسان ہے۔ لیکن عمل میں لانے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے جسم کے ٹکڑوں اور اپنے

قریب ترین رشتوں کو اس طرح زبح کر راہ حق میں پھینکے چلے جانا اور آگے ہی آگے رخ رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اپنے مالک کی رضا کے بدلے اس طرح بک گئے ہوں جس طرح بکنے کا حق ہوتا ہے۔

چنانچہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں شیخ محمد اسحق گورکھپوری کا واقعہ ہے کہ ان کے باوجود ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور اُن کی دیکھ بھال والا کوئی نہ تھا۔ لیکن جب راہ حق کی پکار سنی اور اپنے فرض کا احساس پیدا ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر محبت دین کے جوش میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اور یہ انہی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے سینکڑوں ساتھیوں کا حال یہی تھا۔ اس کے باوجود انھیں اخلاص و ایثار پر غرہ نہ تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایک وعظ میں جب وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کی تفسیر بیان کی تو شیخ صاحب حجرے کا دروازہ بند کر کے لیٹ رہے۔ کھانا بھی نہ کھایا۔ جب سید صاحب نے کیفیت پوچھی تو عرض کیا :-

"میری بدقسمتی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا۔ اب مولانا کے وعظ سے معلوم ہوا کہ جس دل میں خدا کی محبت دوسروں کی محبت پر غالب نہ ہو۔ وہ ایمان کی لذت سے محروم ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال محو نہیں ہوتا ہو سکے تو یہ نکال دیجئے۔"

مولانا نے پوچھا کیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں جہاد کے اس کام کو چھوڑ کر واپس وطن چلے جاؤ۔؟ شیخ نے کہا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا "پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں اللہ کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے۔" تب شیخ کو اطمینان ہوا اور انہوں نے کھانا کھایا۔" (سید احمد شہید جلد دوم ص[illegible])

حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنوں کی بے وفائیوں پر بھی پوری طرح صبر سے کام لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو صبر کرنا سکھایا۔ چنانچہ مجاہدین جو ہندوستان سے چل کر سرحد پہنچتے تھے تو راستے میں ایک افغان رئیس خادے خاں کا علاقہ عبور کرنا پڑتا تھا۔ وہ ظالم انھیں گرفتار کر کے ان سے اکثر مال و اسباب چھین لیتا۔ پریشان کرتا۔ دریا میں غوطے دیتا۔ اور پریشانی کا سبب بنا رہتا۔ لیکن سید صاحبؒ نے ہمیشہ صبر کیا اور اپنے ساتھیوں سے یہ کہتے کہ بھائی صبر کرو اور اپنی شکائتیں اللہ کے حوالے کر دو!

خادے خاں جو ابتداء میں سید صاحب کا سب سے پہلا مؤید اور حامی تھا۔ اب اسلام کی پابندیوں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر جاو بیجا مخالفت کر رہا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے اسے بلا کر سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی۔

"خان بھائی آپ ہی نے ہم کو اس ملک میں ٹھہرایا تھا۔ اور آپ ہی ہمارے سب سے پہلے انصار بھی بنے تھے۔ آج علماء کی مجلس مشورت سے منحرف ہو کر اٹھ گئے۔ یہ بات آپ کی دانش مندی سے بعید تھی۔ آپ کو لازم تھا کہ اگر کوئی منحرف ہو کر اٹھتا تو آپ اس کو سمجھاتے۔ آپ کو چاہیئے کہ جس بات پر علماء نے اتفاق کیا ہے اُس کی مخالفت نہ کریں۔ اس میں دین دنیا کی بہتری ہوتی ہے اور اس کے خلاف دُنیا و عقبیٰ کی خرابی ہے۔ ہم آپ کی خیر خواہی کے لئے کہتے ہیں۔"

اُس نے جو جواب دیا وہ بگڑے ہوئے مسلمان کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ وہ بگاڑ جو مسلمان ارباب اقتدار میں گھس آیا کرتا ہے:-

"حضرت ہم پٹھان لوگ کاروبار ریاست کا رکھتے ہیں اور (جہاد کا) یہ مشورہ ملاؤں نے ملکر کہا ہے۔ یہ لوگ ہمارے خیرات کے کھانے والے ہیں۔ کاروبار ریاست میں انھیں کیا شعور ہے اُن کا جو مشورہ ہمارے ذہن میں آتا ہے تسلیم کر لیتے ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتا نہیں مانتے اُن کے مشورے کی ہمیں کچھ پروا نہیں۔ خود ہماری قوم اور جمعیت بہت ہے۔ کسی طور پر اُن کا دباؤ نہیں ہے یہ ہمارے تابع ہیں ہم ان کے تابع نہیں۔" (صلا۹ جلد دوم سید احمد شہید)

خادے خاں کا جواب مدت سے مسلمان قوم کے اندر پرورش پانے والے ارباب اقتدار کا جواب تھا جو اسلام سے بے نیاز اور اہل علم سے بے پروا صرف اپنی مفاد پرستی کے اشارے پر زندگی بھر کام کرتے رہے ہیں۔

لیکن سید صاحب رح جس دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے تھے اس میں مداہنت نہیں ہے حق پرستی ہے، جرأت اور صداقت ہے، اور بڑی سے بڑی باغی قوت سے ٹکرا جانے کا داعیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خان کی اس بوالعجبی پر انہوں نے اُسے صاف صاف متنبہ کر دیا :-

"خان بھائی آپ نے حد شریعت سے قدم باہر نکالا صرف اس خیال سے کہ آپ ملک کے خان ہیں، قوم و جمعیت کے مالک ہیں، کوئی کیا کر سکیگا۔ یہ محض گمراہی ہے اور شیطان کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا قادر ہے، اُس نے کروڑوں پیدا کئے۔ اور کروڑوں کو نابود کر ڈالا۔ کیا معلوم کہ کس صبح آپ کی آنکھ کھلے تو انتظام کی باگ ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔"

اس طرح سید صاحب رح نے ایک ایسے شخص کو جو مدت تک دوست رہنے کے بعد اب حق کے خلاف جا رہا تھا۔ اُس کی قوت و طاقت کے باوجود کاٹ کر الگ پھینک دیا۔

اس کے جواب میں خادے خاں نے ایک دوسرے موقع پر شاہ اسمٰعیل شہید سے جو باتیں کیں وہ بھی بگڑے ہوئے مسلمان اقتدار پرست کے ذہن کا بہترین نمونہ ہے۔ اُس نے کہا :-

"مولانا خفا نہ ہونا ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں۔ سید بادشاہ کی طرح ملا مولوی نہیں ہیں ہمارا طریقہ جدا ہے اُن کا راستہ جدا۔ سید بادشاہ کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کیونکر چل سکتے ہیں۔ ہمارے حق میں جو کچھ اُن سے ہو سکے درگزر نہ کریں۔" (جلد ۲ صلا۱۱ سیرت احمد شہید)

چنانچہ جب معاملہ جنگ و جدل تک پہنچا تو حق کی تلوار نے سارے رشتے الگ الگ کر دیئے۔ خادے خاں کے ایک عزیز مقرب خاں کو سید صاحب رح نے لکھا :-

"یکسو ہو جاؤ۔ ہمارا ساتھ دو۔ یا مخالفت کا اعلان کر دو۔ اسلام کی خیر خواہی میں پدر و مادر اور فرزند و برادر کی جانب داری جائز نہیں ہے۔"

اُس نے جواب دیا "میں حضور کا فرمانبردار ہوں نہ کہ خان نہڈ کا۔"

اور جب خادے خاں کے بھائیوں نے مقرب خاں سے کہا کہ اپنی قومی ہمدردی میں ہمارا ساتھ دو تو مقرب خاں کے بھائیوں نے جواب دیا :-

"خادے خاں سید صاحب کا دشمن ہے۔ تم لوگ دین کے دشمن ہو۔ مقرب خاں ہمارا بھائی ہے"

اگر وہ تمہارا ساتھ دے گا تو ہم اس سے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے "

جنگ پھولڑہ میں سید صاحبؒ کا بہت محبوب بھانجا سید احمد علی شہید ہوا۔ قاصد خبر لایا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھتے ہوئے فرمایا۔ الحمد للہ وہ جو مراد لے کر آئے تھے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مراد کو پہنچا دیا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

یہ ہر تحریک کا فطری تقاضا ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو جن لوگوں کو اس دعوت سے محبت ہوتی ہے انھیں اس داعی سے بھی قلبی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ انھیں زندگی کا ایک نصب العین دیتا ہے۔ ان کے سامنے شاہراہ حیات کھولتا ہے۔ اُن کی زندگیوں کا رُخ ایک طرف سے موڑ کر دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ انھیں نئے دوست نئے ساتھی اور نئے عزائم دیتا ہے۔ نیا ولولہ، نئی تڑپ اور نئے حوصلے دیتا ہے۔ چونکہ اس کی دعوت نے ان کے سارے ہی وجود پر گہرے نقوش ثبت کئے ہوئے ہیں اس لئے وہ خود بخود اُن کی دلچسپیوں اور توجہات کا مرکز بن جاتا ہے سارے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور اس سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ ساری محبتیں دھیمی پڑ جاتی ہیں۔ اور اسکے ساتھ لگاؤ بڑھ جاتا ہے۔ وہ دراصل تسبیح کے اندر اس مضبوط ڈوری کی طرح ہوتا ہے جس سے ایک ایک دانے کا سینہ پیوست ہوتا ہے۔ وہ سب کے قریب ہوتا ہے، سب کو ایک رشتہ میں پروتا ہے۔ سب کے لئے یکساں تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ سب کو ایک معنوی حیثیت دیتا ہے۔ اور سب کو جوڑ کر بکھرے ہوئے دانوں سے ایک تسبیح بناتا ہے!

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریک اٹھائی اس میں بھی تحریک کے کارکنوں کو سید صاحبؒ سے گہری محبت اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ فرصت کے اوقات میں مجاہدین سید صاحب کے پلنگ کے ارد گرد بیٹھ جایا کرتے، اکثر بیٹھے رہتے اور بعض وہیں سو رہتے تاکہ اُن کے ارشادات سے مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ اُن کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ:۔

> "ہم سید صاحبؒ کے پلنگ کے ارد گرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سننے کے لئے جمع رہا کرتے تھے۔ اور اس کثرت سے ہوتے تھے کہ کسی کا سر، کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ۔ کسی کو کسی بات کا کچھ تکلف نہ تھا۔ جس نے جہاں کہیں جگہ پائی وہیں بے تکلف سو رہا۔"

اور یہ اس لئے ہوتا تھا کہ کتنے ہی رشتے گنوا کر اور توڑ کر یہ نیا رشتہ جوڑا تھا۔

اس سلسلہ میں ایسے محبت اور فدائیت اور سارے ہی رشتوں سے بڑھ کر مضبوط رشتہ کی مثال مولانا عبدالحئی صاحب کی وفات ہے، مولانا بوڑھے تھے، اس پر جہاد کے شدائد۔ بیمار ہو گئے، آخری وقت آ گیا۔ سید صاحب مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ مولانا نے آنکھیں کھولیں اور سید صاحب کو پہچان لیا۔ مزاج پوچھا تو کہنے لگے:۔

> "نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں اور میرے سینہ پر پاؤں رکھ دیں شاید اس کی برکت سے میری مشکل آسان ہو جائے۔"

سید صاحبؒ نے فرمایا:۔

> "مولانا آپ کا سینہ علوم کتاب و سنت کا گنجینہ ہے۔ میں اس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔"

سید صاحبؒ پاس بیٹھ گئے اور سینہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس سے کچھ تسکین ہوئی گویا ساری سکینت اس ہاتھ سے وابستہ تھی ——!

بالاکوٹ کی آخری شہادت گاہ میں شاہ اسمٰعیل شہید کا حال یہ تھا کہ اُن کی پیشانی پر گولی لگی تھی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ ڈاڑھی خون سے رنگی ہوئی تھی۔ لیکن آپ ننگے سر بندوق ہاتھ میں پکڑے ہوئے پوچھتے پھر رہے تھے۔

"امیرالمومنین کہاں ہیں؟ امیرالمومنین کہاں ہیں؟"

پھر ایک طرف اشارہ پاکر جہاں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اس طرف یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "بھائی میں تو وہیں جاتا ہوں" اور وہاں جاکر پھر واپس نہ آئے!

برخیزد بہ تیغ تیز بنشین یا از سرِ راہِ دوست برخیز!

رشتہ اور ناتہ کا اس دُنیا میں اس سے بڑھ کر اور کیا مسافرانِ راہِ دوست کا نمونہ ہو سکتا ہے کہ سینکڑوں اور ہزار ہا مجاہدین ہزاروں میل کے راستے پیدل چل چل کر مہینوں میں پہنچتے، مصائب برداشت کرتے، لڑتے اور شہید ہوجاتے۔ ان میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ میں ان گھر والوں کو، ان عزیزوں اور دوستوں کو، بیوی اور بچّوں کو، ان مکانوں اور جائیدادوں کو، آخری بار الوداع کہہ رہا ہوں۔ پھر مجھے جاکر تلوار کا کھیل کھیلنا ہے۔ اور رضائے الٰہی کے حصول کی جدوجہد کرنا ہے۔ اور تلوار کے کھیل سے واپس آنا یقینی نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ وہ حضرات برسوں اور مہینوں وطن سے دُور، گھروں سے بے نیاز، بچّوں کی خیریت سے بے خبر مسلسل جہاد کرتے رہے، انہوں نے اپنے عمل سے دکھادیا کہ وہ اس نصب العین کو اپنے سارے جسم، ساری روح اور سارے وسائلِ حیات کے ساتھ اپنا چکے تھے، اور سارے رشتوں کو جہاد کی تلوار سے کاٹ کر صرف ایک مقصد یعنی حصولِ رضائے الٰہی سے رشتہ جوڑ لیا تھا!

چنانچہ جہاں انہوں نے اپنی کسی عزیز ترین ہستی کو بھی اس راہ سے ڈگمگاتے دیکھا تو اس سے محبت کے تعلقات توڑ لئے جب اس تحریک پر مقدمات کا دَور چلا تو اکثر و بیشتر کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ بعض میدانِ جہاد میں تھے۔ مولانا ولایت علی کے صاحبزادے مولوی محمد حسن جو سولہ سالہ نوجوان تھے انہوں نے تنہا گھر بار کا بوجھ اُٹھایا اور مقدمات کی پیروی کیلئے انگلینڈ تک سے وکلاء منگوائے اور خبر گیری کے لئے انڈمان تک گئے۔ لیکن انہوں نے ساتھ ہی خاندان کی تعلیمی پالیسی ذرا بدل کر حالات کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ حکومت کے انتقامی طرزِ عمل سے بچا جا سکے۔ اُن کی اتنی سی بات پر خاندان کے بیشتر افراد اُن سے ناراض ہوگئے اور حد یہ ہے کہ مولانا عبدالحکیم صادق پوری تو اتنے سخت ثابت ہوئے کہ انہوں نے مولوی محمد حسن کی نمازِ جنازہ تک میں شرکت سے انکار کردیا!

سید صاحب کی تحریک کے ایک مجاہد محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے بھی اپنی کتاب "کالا پانی" میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> "میں اپنی والدہ سے آخری ملاقات کرکے اور بیوی بچّوں کو ساتھ لے کر بہ سواری ایک عمدہ بہلی صبح ہوتے ہی ۳۲ کوس پانی پت پہنچا۔ میں پانی پت شہر کے اندر نہیں گیا سڑک پر سے اپنے بیوی بچّوں کو رخصت کردیا۔ اس وقت میں جس کسی سے رخصت ہوتا تھا مجھ کو اس زندگی میں دوبارہ اس سے ملنے کی امید نہ تھی۔" (کالا پانی۔ صفحہ ۲۲-۲۳)

"میں نے بہلی والے سے کہا کہ تم میرے بیوی بچّوں کو پانی پت میں چھوڑ کر مع بہلی جمنا پار چلے جانا۔

یہ پہلی مع بیلوں کی بولی کے ہم نے تم کو اس خواہ بخش دی کہ تم کسی شخص کو ہمارے بال بچوں کا پتہ نشان نہ بتانا جس وقت ڈاک خانہ پانی پت کے سامنے میں نے ساری عمر کے واسطے اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑا اور اُن سے جدا ہوا اور میرا بچہ ان کے سامنے دہلی کو چلا وہ حادثہ قابل تحریر نہیں ہے۔" (کالا پانی ص۲۲)

پھر جب مقصد کی اس راہ میں وہ جیل میں چلے گئے تو:-

"میرا گیروا لباس اور کمبل کا کرتہ اور پاؤں میں بیڑی دیکھ کر میرے اقربا بہت متعجب اور غمگین ہوئے۔ مگر میں نے اُن کی بہت تسلی کی اور ایمان اور صبر کا مضمون اُن کو سمجھایا۔ اس دن کوئی سوا برس کے بعد میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو بھی دیکھا وہ ایسا بڑھ گیا تھا کہ میں نے مشکل ہی سے اس کو پہچانا۔ یہ گویا اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ پھر میں نے دوبارہ اُس کو اس دُنیا میں نہیں دیکھا۔" (کالا پانی ص۶۲)

ایک موقع پر جب مولانا عبدالحیٔ صاحب نے حق کے مقابلہ میں رشتہ اور ناتہ کی کم وقعتی پر وعظ فرمایا اور ساتھ ہی علماء و مشائخ کے اعمال اور مختلف خاندانوں کی کمزوریاں گن گن کر بیان کیں اور ساتھ ہی سید صاحبؒ کے خاندان میں جو باتیں اس کے خلاف پائی جاتی تھیں اُن کا ذکر کیا تو سید صاحبؒ بیتاب ہو کر اپنی جگہ اٹھ بیٹھے اور دوزانو ہو کر فرمایا:-

"میں خدا کا بندہ ہوں، اُس کا اور اس کے رسُول کا تابع ہوں۔ اس سے پہلے سہارنپور وغیرہ میں میں نے مولانا سے کہا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہیں، اس کا حکم بے کم و کاست ادا کروں گا اور کسی کی خوشی اور ناخوشی کا خیال نہ کروں گا۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب (برادر زادہ) عزیز ہیں۔ دُنیا کی چیزوں میں سے جو چاہیں لے لیں۔ لیکن اللہ کی اطاعت میں اُن کی بھی رعایت نہیں کروں گا۔ میرے تمام رشتہ دار صاف صاف سُن لیں کہ اللہ اور رسُول کی اطاعت میں میرے شریک حال ہوں، ادائے اوامر و اجتناب میں کسی کی طعن و ملامت کا خیال نہ کریں۔ وہ میرے عزیز اور مجھے محبوب ہیں۔ اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے اُن سے کوئی واسطہ نہیں صاف کہتا ہوں کہ جو اللہ کے راستہ میں مستعد ہو میرا شریک ہو اور جو چاہے مجھ سے جُدا ہو جائے۔" (سیرت سید احمد شہید ص۱۱۶)

یہ تھا وہ معیار رشتہ و ناتہ جو خدا کے ان دلدادہ و شیدا بندوں نے قائم کیا تھا۔ رشتہ اُن کے نزدیک رشتہ نہ تھا۔ اس کے رشتہ میں حائل ہوتا تھا اور محبت ان کے نزدیک محبت نہ تھی جو خدا کے حقوق کے آڑے آتی تھی، انہوں نے سب سے توڑا اور ایک کو پکڑا۔ سب کچھ سے مُنہ موڑا اور اس ایک کی طرف رُخ کیا۔ اللہ نے اُن کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تو کوئی اُن کا راستہ روک نہ سکا۔ آج ہر شخص یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ اللہ والے تھے اور انہوں نے اللہ کی سپردگی میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی ــــ!

ماہر القادری

منقبت

درود تجھ پہ ہو گُل کر کے اپنے گھر کے چراغ ‏ — حُسینؑ! دی ہے زمانے کو روشنی تُو نے

غمِ حسینؑ تری تازگی کا کیا کہنا! ‏ — نفس نفس کو عطا کی ہے زندگی تُو نے

اُسی نماز کی ہیں جستجو میں دیدہ و دل ‏ — بنا دیا جسے معراجِ بندگی تُو نے

سلام کوثر و تسنیم کی طرف سے تجھے ‏ — لبِ حسینؑ کو چُوما ہے تشنگی! تُو نے

ترا کرم حق و باطل کے درمیان لکیر
خود اپنے خون کی سُرخی سے کھینچ دی تُو نے

(شبنم سبحانی)

ترا خیال تری یاد لے کے اُٹھے ہیں
دلوں میں جذبۂ فرہاد لے کے اُٹھے ہیں
وہ فتنہ جس سے ہوا بارہا چمن برباد
وہ فتنہ پھر ستم ایجاد لے کے اُٹھے ہیں
جہاں اُڑا سے تھے طائر فضا کی وسعت میں
وہیں پہ دام بھی صیاد لے کے اُٹھے ہیں
کوئی تو شیشہ گری کا شعور لے کے اُٹھے
ہزاروں بازوئے فولاد لے کے اُٹھے ہیں
جو بار اُٹھ نہ سکا ساری کائنات سے آج
ہمیں وہ شاد کا اشاد لے کے اُٹھے ہیں

(جبریل صدیقی)

عزمِ شوق کو عمل کر وقت ہے یہ پروانے
اب تو شمع روشن ہے صبح تک خدا جانے
یُوں تو ہر قدم پہ ہیں سرحدیں منازل کی
حوصلہ مسافر کا دیکھتے ہیں ویرانے
ہے ترے تصوّر میں کتنی کیف سامانی
ہر نفس میں ساغر ہیں ہر قدم پہ میخانے
ذرّے جگمگاتے ہیں مہر و ماہ کی صورت
کوچۂ محبت کی خاک تو کوئی چھانے

☆

تسکین قریشی

دو آتشہ

بے خودی میں نہ محبت میں کمی ہے ساقی
دورِ صہبا نہ سہی دل تو وہی ہے ساقی

زندگی میکدۂ تشنہ لبی ہے ساقی
پیاس دل کی نہ بجھے گی نہ بجھی ہے ساقی

بے خودی میں بھی یہ احساسِ خودی ہے ساقی
تو نے خود اٹھ کے پلائی ہے تو پی ہے ساقی

بادہ و ساغر و میخانہ سب اس دل کے نثار
جس کو نسبت تری آنکھوں سے رہی ہے ساقی

اب وہ لغزشِ مستی ہے نہ وہ جراتِ شوق
تجھ سے کیا کیا گلۂ کم نگہی ہے ساقی

اہلِ دل رسم و رہِ اہلِ جہاں کیا جانیں
عاشقی سادگی و سادہ دلی ہے ساقی

لغزشوں میں بھی قدم اٹھتے ہیں تیری طرف
کتنی معصوم مری بادہ کشی ہے ساقی

دیر سے آج جو وہ گرمیِ ہنگامہ نہیں
کیا تری بزم میں تسکیں کی کمی ہے ساقی

کچھ ایسا دل کا عالم ہو گیا ہے
کہ اب ہر غم، ترا غم ہو گیا ہے

تصور جب مجسم ہو گیا ہے
بس اک عالم ہی عالم ہو گیا ہے

تغافل کے تو پہلو اور بھی تھے
ستم ہی کس لئے کم ہو گیا ہے

نہ دن دیکھے نہ صبح و شام دیکھے
تجھے کیا چشمِ پرنم ہو گیا ہے

جہاں راہِ طلب میں گم ہوا ہوں
وہیں کچھ فاصلہ کم ہو گیا ہے

مسرت کی دعا کیا کر کے مانگوں
جب اس کا نام ہی غم ہو گیا ہے

مبارک عشق کی خودداریوں کو
غرورِ حسن کچھ کم ہو گیا ہے

تری محفل سے کیا آئے ہیں اٹھ کر
یہ عالم اور عالم ہو گیا ہے

جب اہلِ عشق مل بیٹھے ہیں تسکیں
دگرگوں رنگِ عالم ہو گیا ہے

غزلیں

آبر احسنی گنوری

عنایت اُن کی پرسش نے یہ فرمائی تو کیا ہوگا
دلِ مجروح کی ہر چوٹ اُبھر آئی تو کیا ہوگا

نظر کی مسند پہ تابِ حُسن اُتر آئی تو کیا ہوگا
تجلّی خود ہی نظارے سے ٹکرائی تو کیا ہوگا

یقیں تو وعدۂ وعدہ شکن کا آ نہیں سکتا
مگر بات احترامِ حُسن تک آئی تو کیا ہوگا

بہاروں کی دعا کے ساتھ یہ بھی تھی خلش دل میں
بہار آئی مگر ہم کو نہ راس آئی تو کیا ہوگا

تری سازش ہے جس سے باغباں میری تباہی کی
وہ بجلی تیرے خرمن پر بھی لہرائی تو کیا ہوگا

صدائے لن ترانی کی کشش کی بھی ہے خبر تم کو
اسی آواز پر دُنیا سمٹ آئی تو کیا ہوگا

عالم اکبر آبادی

محسوس ہو رہا ہے طبیعت پہ بار سا
ابکی بہار میں ہے جنوں سازگار سا

اُس کیف کو شراب ابھی تک نہ پا سکی
آنکھوں میں تیری بن کے رہا جو خمار سا

اے اہلِ جستجو کوئی نازک مقام ہے
منزل کے آس پاس ہے گرد و غبار سا

جانے یہ کیا مقامِ تمنا ہے عشق کا
گزرا ہے انتظار ترا ناگوار سا

عاشق ذبیحی

چمن کی یاد سے کیوں دل کو داغدار کریں
خزاں کے دَور میں کیا شکوۂ بہار کریں؟

ابھی تو جوشِ جنوں کم نہیں بہاروں سے
ذرا یہ کم ہو تو اندازۂ بہار کریں

تمہیں تو فکرِ نشیمن ہے ہم کو فکرِ چمن
تمہارا غم کریں یا ہم غمِ بہار کریں

مذاقِ دید میں اتنا تو حُسن پیدا کر
کہ جلوے طُور پہ خود تیرا انتظار کریں

بدلا ہوا ہے کتنا اندازِ مطربانہ
سازوں میں ہے حرم کی نغمے ہیں ملحدانہ

دُہرائے گا زمانہ برسوں مرا فسانہ
شعلوں پہ لکھ رہا ہوں تاریخِ آشیانہ

سُنتی نہیں ہے دُنیا کیوں میرے دل کی دھڑکن
اُن کی نوازشوں کا میں بھی ہوں اک فسانہ

رمز گنوری

گناہِ عشق کی اِس رہبری کے میں صدقے
کہ مجھ کو یہ سوئے راہِ نجات لے آیا

سرِ شکِ خوں کی قسم بزمِ ناز سے اُن کو
میں آب و رنگِ رخِ کائنات لے آیا

حریمِ ناز نہیں ہے نہ اب کوئی سومنات نشیں
اُٹھا کے سب کو ترا التفات لے آیا

شعورِ عشق جنہیں ہے وہ کیا کہیں گے مجھے
زبانِ شوق پہ میں دل کی بات لے آیا

دُنیا اور آخرت کی بھلائی ان پانچ باتوں میں ہے۔ دل غنی ہو۔ ایذا رسانی سے بچتا رہے۔ حلال کی روزی حاصل ہو۔ پرہیزگاری ہو اور ہر حالت میں صرف خدا پر بھروسہ ہو۔ بہت زیادہ سفارشیں کرنا دقار کھو دیتا ہے۔ جو شخص بغیر کچھے بُوجھے علم حاصل کر بیٹھتا ہے، اُس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص رات کو لکڑیوں کا گٹھا باندھے اور اس میں کوئی سانپ اس کو کاٹ لے۔ علماء کی زینت پرہیزگاری ہے اور زیور حُسنِ اخلاق ہے! علم پڑھ کر جو بُرائی سے نہ بچا اس کو علم نے کیا فائدہ پہنچایا۔؟ جو تمہارے سامنے اوروں کی بُرائیاں کرتا ہے وہ تمہاری برائی بھی دوسروں کے آگے کرتا ہے۔ تین کام بہت دشوار ہیں۔ تنگی میں سخاوت۔ خلوت میں تقویٰ اور جہاں سے امید لگی ہو یا کچھ خوف ہو وہاں سچ سچ بات کہنا۔ اپنے عزیز کو تنہائی میں نصیحت کرنا اور سمجھانا بھی شرافت اور اس کی اصلاح کا راز ہے۔ اور سب کے سامنے نصیحت کرنا باعثِ رسوائی و بدنامی ہے تواضع اہلِ کرم کی نشانی ہے اور تکبر لئیم اشخاص کی۔ **امانت رکھنے کے شوقین یا تو چور ہوتے ہیں یا احمق۔**

جب تمہارے سامنے کام کی کثرت ہو تو پہلے سب سے اہم کام شروع کرو۔ علم کی فضیلت یہ کیا کم ہے کہ بے علم اس کے مدعی ہیں۔ اور جہل کی بُرائی یہ کیا کم ہے کہ جاہل اپنے جہل کا مُنکر ہے۔ اگر جاہل کہہ دو تو وہ برافروختہ ہو جاتا ہے۔ دل زبان کی کھیتی ہے اس سے اچھی باتوں کی تخم ریزی کرو اگر سب دانے نہ اُگیں گے تو کچھ تو ضرور اُگیں گے۔ زبان سے جو (ناشائستہ) بات نکلتی ہے وہ پتھر سے زیادہ سخت، سوئی سے زیادہ چبھنے والی۔ ایلوے سے زیادہ کڑوی۔ چکی کے پاٹ سے زیادہ پھرنے والی۔ اور نوکِ سناں سے زیادہ تیز ہوتی ہے! (نثر)

خدا کے احکام کے نافذ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سمجھدار تکلیف میں مُبتلا ہے اور احمق عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں وہ شخص سب سے زیادہ قابلِ ہمدردی ہے جو باوجود تنگ حالی کے ہمت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اے دُنیا، او دُنیا کی زینت پر دھوکا کھانے والے یاد رکھ کہ زمانہ، مکان اور مکان بنانے والے دونوں برباد کردے گا۔ جس کو دُنیا کی عزت و وجاہت پسند ہو اُس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عزت جلد مٹ جانے والی ہے۔ دیکھو کہ دُنیا کے خزانے تو سونے سے بھرے جاتے ہیں مگر تم اپنا خزانہ ایمان اور نیکی سے بھرو!

میں نے طمع کو چھوڑ کر خود کو آرام پہنچایا۔ نفس میں جس قدر لالچ بڑھتا جاتا ہے وہ خود ذلیل ہوتا جاتا ہے۔ قناعت زندگی ہی میں میری عزت کی حفاظت ہے۔ تمہاری عمر کی قسم گھر کا گر جانا کوئی بڑی مصیبت نہیں ہے، نہ اونٹ اور بکری کا جانا۔ بلکہ سب سے بڑی مصیبت ایک شریف کی موت ہے۔ جس سے ایک جہان مردہ ہو جاتا ہے!

اے اہلِ بیتِ رسُول اللہ! تمہاری محبت قرآن کی وجہ سے فرض ہے۔ تمہاری جلالتِ شان کے لئے یہی ہے کہ جس نے تم پر درود نہ پڑھا اس کی نماز قبول نہیں ہوتی! (نظم)

(حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

لکھنؤ سے ایک ماہواری رسالہ نکلتا ہے۔ جس کا نام ہے "سنی"۔ اور ایڈیٹر صاحب کا اسم گرامی ہے:۔
"ابوالنصر حافظ محمد عرف قادری الرازی برکاتی نوری ہدایت رسولی"۔

اور یہ تو ایڈیٹر صاحب کی کسر نفسی ہے جو انہوں نے کنیت، نام اور نسبتوں کے سلسلے میں اس قدر اختصار سے کام لیا ہے ورنہ یہ "ہدایت رسولی" صاحب اگر اپنی تمام نسبتیں کو زیب قرطاس فرما دیتے تو یہ سلسلہ محبوب کی زلف شبگوں کی طرح دراز ہو جاتا اور پڑھنے والے یہ فیصلہ ہی کرتے رہ جاتے کہ:۔

زلفیں دراز ہیں کہ شب غم دراز ہے!

چونکہ اس رسالہ کا نام "سنی" ہے تو اُسے دوسرے رسالوں کے مقابلہ میں مقدس اور صاحب کرامت ہونا ہی چاہیئے —
اس لئے چندہ کی جگہ "نذرانہ سالانہ" اور قیمت کی جگہ "ہدیہ فی پرچہ" لکھا ہے!

رسالہ کی اشاعت کا مقصد "دیوبندیت" کی تردید ہے۔ پورے رسالہ کا ایک ہی آہنگ ہے۔ کہیں دیوبندیوں کے خلاف مناظرہ بازی کا اعلان ہے، کسی صفحہ پر "دیوبند" کے نام کی ترکیب پر عجیب و غریب پھبتیاں ہیں۔ دیوبند کیا ہے؟
"صدقہ و خیرات بند"۔ "گیارھویں و میلاد بند"۔ "کان بند"۔ "زبان بند"۔

اگر کوئی یہ کہہ دے کہ "دیوبند" میں شرک و بدعت کے دیو بند کئے جاتے ہیں تو "ہدایت رسولی" صاحب غصہ کے مارے "پرچھولالی" ہو جائیں گے!

پاکستان میں ایک صاحب ہیں "حاجی لق لق" انہی کے توڑ پر ہندوستان میں "حاجی حق حق کوٹلوی" پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کی ایک نظم رسالہ "سنی" میں چھاپی گئی ہے جس کا ایک ایک مصرعہ "ہدایت رسولی" صاحب کے ادبی ذوق پر فاتحہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے۔ "دیوبندی" فرماتے ہیں:۔

سنی بن کر سنیوں کو لوٹنا ہے اس کا کام نجدیوں کے دام سے بھی ہے مُقضر تر اس کا دام

اس "مقضر تر" کا بھی کوئی جواب ہے؟ اس شعر سے رسالہ "سنی" کے ادبی مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہو گا اور ہونا چاہیئے!

دین اور شریعت کے نام سے جب اس طرح کا ادب منظر عام پر آرہا ہے اور اُسے پڑھ کر آج کل کا نوجوان طبقہ دین سے بیزار ہو جائے تو "ہدایت رسولی" قسم کے دین داروں اور "عاشقان رسول" (؟) سے نوجوانوں کی اس گمراہی اور اسلام بیزاری کی کیا بازپرس نہ ہو گی:۔

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

... بد اس سمرلی پہلی ٹولی ہے۔ جو "ری پبلکن پارٹی" کے نام سے وجود میں آئی ہے۔ جس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پارٹی کی بنیاد ہی سرکاری عہدوں اور منصبوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بھان متی نے کنبہ جوڑ کر اس حقیقت کو اچھی طرح ابھار دیا کہ مسلم لیگ میں کس قدر بودے کردار کے لوگ شامل ہو گئے تھے۔ جن کے پیش نظر جلب منفعت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ مگر جن ہوا پرست ملاحوں نے مسلم لیگ کے بیڑے کو ڈبویا ہے وہ ری پبلکن پارٹی کے "بجرے" کو کب صحیح سلامت رہنے دیں گے۔ بس ذرا ہوا کا رُخ بدلنے دیجئے پھر دیکھئے کہ "ری پبلکن پارٹی" کے یہ عقیدت مند ڈاکٹر خاں صاحب کو بزم منجدھار میں چھوڑ کر کس "طوطا چشمی" کا ثبوت دیتے ہیں!

وفاداری مدار از بلبلاں چشم کہ ہر دم بر گلِ دیگر سرایند!

حسن محمود، قاضی فضل اللہ، امیر اعظم، کیانی، مسلم لیگ کے کیسے کیسے جہیتوں اور لاڈلوں نے مسلم لیگ سے بے وفائی کی ہے۔ پاکستان میں شاید "ہر کرسی" اپنے اندر گرگٹوں کی ایک ٹولی کو چھپا ہوا رکھتی ہے کہ رنگ بدلتے رہنا "ہر کرسی" کے لئے ایک طرح کا دستور بن گیا ہے!

جی بھر کر کھیلے "خداوندانِ نعمت" عوام کے زخموں سے۔ پاکستان کی مظلومیت اور بے کسی سے!..... مگر.....

حذر اے چیرہ دستو! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

کیا طنطنہ تھا اسٹالن کے سطوت و جبروت کا، روس کے "مورخے" اس کی پرستش پوجا کرتے تھے! بڑی بڑی حکومتوں کے سفیر اور نمائندے یہ حسرت ہی جی کی جی میں لے کر رہ گئے کہ کسی طرح "حضور اسٹالن" کے درشن ہو جائیں۔ مگر اسٹالن کا کبر و ناز اس سطح تک بھلا کہیں اترنے والا تھا۔ مگر اب اسی روس میں اسٹالن کے مجسمے توڑے جا رہے ہیں اور اسٹالن کی شہرت اور عزت و ناموری پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے۔ اور یہ کیچڑ وہی ہاتھ اچھال رہے ہیں جو کل تک اسٹالن جی مہاراج کو "پرنام" کرتے تھے!

ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن ان تین جھوٹے خداؤں کی خدائی کا حشر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا! مگر حیرت ہے اُن پر کہ جو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور ان واقعات سے عبرت نہیں پکڑتے اور جو اس غلط فہمی میں اپنے کو مبتلا کئے ہوئے ہیں اُن کے جاہ و جلال پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آ سکتی۔ اے شتر مرغو! اس نفس فریبی کا انجام تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائیگا۔ رکھو! اللہ تعالیٰ جب حالات کو بدلنا ہے تو پھر اس کی زد سے نہ قلعے بچ سکتے ہیں اور نہ قصر و ایوان! بڑے بڑے ں سے کان پکڑوا کر اٹھک بیٹھک کرا کے چھوڑتا ہے اور کسی کسی کو تو ناک رگڑنی پڑتی ہے!

ایک خمیدہ کمر بوڑھے کو دیکھ کر ایک نوجوان ہنستے ہوئے بولا "بڑے میاں! یہ کمان کتنے میں مول لی؟"
بوڑھے نے جواب دیا "میاں! کچھ دن اور انتظار کرو، یہ کمان تمہیں قیمت دیئے بغیر مفت ہی مل جائے گی!"

"آپ کے ملک کی آمدنی کیا ہے، اخراجات کتنے ہیں؟ یعنی میں بجٹ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں" کراچی کے ہوائی اڈے پر ایک شخص نے نجد و حجاز کی ایک ذمہ دار شخصیت سے پوچھا۔ "واللہ اعلم بالصواب" جواب دیا گیا۔

سیرت نمبر کے بعد "فاران"

کا

★ توحید کے تقاضے کیا ہیں ؟ ★ توحید کیا مطالبہ کرتی ہے ؟

● کتاب وسنت نے "توحیدِ خالص" کو کس انداز میں پیش کیا ؟

★ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی "توحید" کی تبلیغ و تعلیم تھی !

اور

شرک ایمان کیلئے زہر قاتل ہے۔ یہ "ظلم عظیم" ہے جس سے بڑا نہ کوئی گناہ ہے نہ کوئی برائی ہے نہ کوئی ظلم و جہالت ہے۔ کتاب وسنت پر ایمان رکھنے والا شرک کی پرچھائیں سے بھی منزلوں دور رہیگا۔ شرک وبدعت کی رسموں نے ملت کو کیا نقصان پہنچایا۔ دین خالص پر عجمی تصورات نے بدعات کے روپ میں کس طرح شب خون مارا۔

فاران کے "توحید نمبر" میں ان موضوعات پر گرانقدر مضامین ہوں گے

فاران کا توحید نمبر شرک و بدعت کے بتانِ عجم پر فیصلہ کن ضرب لگائے گا !

ہماری نظر میں

انتخاب صحاح ستہ

ضخامت ۵۶ صفحات (بڑا سائز) مجلد۔ رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب و مالکان کتب سعیدی۔ قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کر
بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ صحیح کتابوں (صحاح ستہ) سے آٹھ سو احادیث
منتخب کرکے اُردو ترجمہ کے ساتھ "انتخاب صحاح ستہ" کے نام سے شائع کی گئی ہیں۔ ترجمہ عام فہم ہے۔ اس سے اُردو جاننے
والے فائدہ اٹھا کر دین و دنیا کی بھلائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مولانا امجد العلی صاحب استاذ الحدیث مدرسہ عربیہ مطلع العلوم
رامپور نے اس ترجمہ کے نوک پلک درست کئے ہیں۔
مقدمہ میں صفحہ ۲۴ پر "حدیث کا علم اور اس کی حفاظت" کے عنوان کے تحت جو چند سطریں لکھی گئی ہیں۔ وہ حدیث کی
پوزیشن کو کمزور کرنے والی ہیں۔ صفحہ ۲۳ پر علامہ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا سن ولادت ۳۰۲ ہجری لکھا ہے جو غالباً
کتابت کی غلطی ہے۔ ۲۰۲ ہجری سن ولادت ہونا چاہیئے کہ ۲۷۵ھ میں تو ان کا انتقال ہوا ہے!
کتاب اللہ کے بعد سنت رسولؐ ہی دین کا سب سے بڑا ماخذ اور منبع ہے۔ اس دور میں جبکہ بعض جاہلوں نے "انکار
حدیث" کا فتنہ کھڑا کر دیا ہے، احادیث کے زیادہ سے زیادہ چرچے اور تذکرے کی ضرورت ہے!

علم الحدیث

از:۔ علامہ عبد اللہ العمادی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (سرورق رنگین)
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۃ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد دکن۔
علامہ عبد اللہ العمادی مرحوم جون پور کے ایک علمی خانوادہ میں ۱۲۹۶ ہجری میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ مولانا محمد فاروق
چریاکوٹی۔ مولانا ہدایت اللہ جون پوری اور قاضی زین العابدین لکھنوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے اکابر علماء اور قابل فخر اساتذہ
سے حاصل کئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ مرحوم نے عرب جاکر صنعاء، زبید اور حدیدہ کے علماء سے علمی استفادہ
کیا اور پھر نصرہ پہنچ کر مفتی شیخ محمد عبیدہ کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، تاریخ،
فلسفہ، منطق، اقلیدس اور طب و ہیئت میں علامہ عمادی کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ صحافت کی طرف قدم بڑھایا تو
البیان۔ الوکیل، زمیندار اور الہلال کو اپنی قابلیت اور قلم کی قوت سے چمکایا۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم مولانا عمادی کے
خاص قدر شناسوں میں تھے!
تاریخ عرب قدیم۔ صناعۃ العرب، فلسفۃ القرآن اور کتاب الزکوٰۃ مولانا عمادی مرحوم کی تصنیفات شائع ہوکر
اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ابن خلدون کا آپ نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور پھر علامہ مرحوم حیدر آباد
کے دار الترجمہ کے رکن بن گئے۔ اور طبقات ابن سعد، ابن حزم اندلسی کی الملل والنحل، التنبیہ والاشراف،

اور تاریخ یعقوبی کو اُردو میں منتقل فرمایا۔

علامہ عمادی فارسی کے شاعر بھی تھے اور اُردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں شعر آپ کو یاد تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا، نام ونمود کی کبھی تمنا ہی نہیں کی۔ اس لئے اپنے علم وفضل کے مقابلہ میں گمنام ہی سے رہے۔ زیرِ نظر کتاب علم الحدیث اسی گمنام فاضل اجل کی تالیف ہے۔ جس کے مرکزی عنوانات حسب ذیل ہیں :۔

علم حدیث کی تنقیح ــــ اصولِ حدیث ــــ درایت ــــ حدیث کے اجتماعی وعمرانی فوائد ــــ شبہات ــــ روایت ــــ اسناد ــــ جرح وقدح ــــ صحیح حدیثیں پہچاننے کے اصول ــــ !

کتاب اپنے موضوع پر مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑی تحقیق اور تدقیق ومطالعہ کے بعد قلم اُٹھایا ہے اور تدوینِ حدیث کی صرف تاریخ ہی بیان نہیں کی بلکہ احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے اصول بھی قلمبند کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک اقتباس :۔

"...... علمِ حدیث کا ایک عظیم الشان سرمایہ موجود ہے، موضوعات کی کتابوں میں جعلی حدیثیں الگ کر دی گئی ہیں۔ صحیح حدیثوں کا ایک جداگانہ ذخیرہ ہے۔ اور بایں ہمہ محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ممکن ہے "صحاح" کی کتابوں میں بھی ضعیف حدیثیں ہوں لیکن اس کے لئے انہوں نے اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ جس حدیث کی تنقیح کرنا ہو۔ اسی معیار پر جانچ لو۔ ع

کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں "!

اس سے ملتی جلتی کوئی بات مولانا مودودی کی زبان وقلم سے نکل جائے تو بعض لوگ اُن پر "منکرِ حدیث" کی پھبتی چُست کر دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اُن کی اس شدّتِ احتساب کی زد علمِ حدیث کے کتنے بڑے مویدین اور اعاظم رجال پر جا کر پڑتی ہے !

نعمتِ عظمیٰ | کشکولِ قلندری :۔ ملفوظات وارشادات شاہ سید اسد الرحمٰن قدسی۔ مرتبہ سید زمرد حسین شاہ جیلانی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ گوشۂ ادب، چوک انار کلی لاہور۔

قلندریہ خاندان کے کوئی بزرگ جناب سید اسد الرحمٰن قدسی ہیں۔ جن کے ملفوظات وارشادات سید زمرد حسین صاحب شاہ جیلانی نے مرتب کر کے شائع فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا رنگ یہ ہے :۔

"حدودِ شریعت سے متجاوز اور قیودِ طریقت سے ماورئی بھی ایک شاہراہ ہے جس کو حق الیقین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کے اسرار ورموز وہبی طور سے حاصل ہوتے ہیں" (صفحہ ۱۸)

حالانکہ حدودِ شریعت سے ماوریٰ کوئی شاہراہ ہو ہی نہیں سکتی اور ہوگی تو وہ صراطِ مستقیم نہ ہوگی !

حضرت موسیٰؑ اور جناب خضرؑ کے قصہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :۔

"مذکورہ قصہ سے یقیناً یہ سبق ملتا ہے کہ کتاب وسنت کی راہ سے جداگانہ بھی کوئی راہ ہے۔ جس کے طے کرنے کیلئے صبر واستقلال اور خدمت واطاعتِ مرشد ضروری ہے" (ص ۲۳)

وہ علم لدنی جس کا سرچشمہ ذات نبی کریمؐ ... کی ذات سے جداگانہ راہ کہنا عجب فکر ہے !
مخصوص ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ علم اسرار اولادِ اطہار حیدرِ کرار تک ہی محدود ہے " (ص۴۴)
یہ اسلام میں " پاپائیت " کا عقیدہ داخل کرنے کی تدبیریں ہیں۔ خود صاحبِ ملفوظات بھی تو " سید " واقع ہوئے ہیں۔
" حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چار سو اصحابِ صفہ نے طریقت کی تعلیم حاصل کی " (ص۴۲)
کتاب و سنت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہو کہ اصحابِ صفہ کو حضورؐ نے " طریقت "
کی تعلیم دی تھی۔ اگر " تزکیۂ نفس " کو صاحبِ ملفوظات " طریقت " کہتے ہیں تو تزکیۂ نفس کی تعلیم عام تھی۔ اصحابِ صفہ
کے لئے مخصوص نہ تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور میں " دین " کو شریعت، طریقت اور حقیقت کی
شاخوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا !
" کتاب و سنت کی وہ راہ جو فقہاء و محدثین کی خود ساختہ اور مجتہدین کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔ قلندران
حق پرست اس پر نہیں چلتے بلکہ وہ نظریات و مسلمات کے پس پردہ حقائقِ معانی پر نظر رکھتے اور
اس کی پیروی کرتے ہیں جو من جانبِ حق تعالیٰ اُن کے قلوب پر القاء ہوتے ہیں۔ وہ ان اوراق بھری
درسی کتابوں کو جو اہلِ جہل نے باوجود قرآن حکیم جیسی جامع و مکمل و مفصل کتاب کی موجودگی کے
محض اپنے زعم باطل کی بناء پر تالیف کی ہیں، قابلِ مطالعہ نہیں سمجھتے " (ص۵۶)
تفسیر اور حدیث و فقہ کی تمام کتابوں کو اہلِ جہل کی تالیف کردہ کتابیں کہنا اور اپنے قلوب پر القاء کئے ہوئے
" حقائقِ معانی " پر اعتماد کرنا۔ کتنی گمراہیوں اور جہالتوں کا دروازہ کھول دینے کی ترغیب ہے اس قسم کے " تصوف " سے
" جذب و سوز " سے اور " علم لدنی " سے ہزار بار خدا کی پناہ !
" جو باہمت اہلِ ذوق مسلک قلندری اختیار کرتے ہیں اُن میں سے بعض تو اپنے نفس کو زیر کرنے
کے لئے طریقۂ ملامتیہ پسند کرتے ہیں اور بعض آہنی طوق و زنجیر کے بھاری بوجھ سے خود کو جکڑ لیتے ہیں
تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے لئے طریقۂ قلندریہ کے معمولاتِ خصوصی میں صوم الوصال ہے جسے
روزہ رکھنے والے بھی رکھتے ہیں۔ یہ روزہ تین تین، پانچ پانچ دن اور سات سات دن کا ہوتا ہے، ان روزوں
کے ایام میں آگ پر پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے " (ص۵۷)
عیسائی اور یہودی فقیہوں اور راہبوں نے اسی قسم کے تکلفات کی بیڑیاں لوگوں کو پہنا دی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے ان " اصر و اغلال " کو اتار دیا تھا بلکہ کاٹ دیا تھا۔ مگر دین میں یہ ٹریجڈی بھی ہو کر رہی کہ تزکیۂ نفس کے نام پر
زنجیر کی طوق اور بیڑیاں (معنوی اور مادی) پھر پہنا دی گئیں !
" بعض اہلِ خدمات، کوئی قطب ہوتا ہے، کوئی غوث، انتظامیہ امور قطب سے متعلق ہوتے ہیں
اور عدلیہ کا تعلق غوث سے ہوتا ہے۔ عسکری تنظیم اور دفاعی امور ان حضرات (قلندروں)
سے متعلق ہوتے ہیں " (ص۵۸)
کیا عقیدہ ہے ؟ یہ کیسا اندازِ فکر ہے ؟ نہ جانے یہ سراسر غیر اسلامی خیالات " تصوف " کے نام سے مسلمانوں ...

کس طرح بار ہا گئے۔ یہ جو جگہ جگہ شہروں میں "شاہ ولایت" کے مزارات ہیں۔ اور ان کے بارے میں بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس بستی اور شہر کا انتظام فلاں صاحب مزار (شاہ ولایت) کے سپرد ہے۔ تو یہ عقیدہ شرک سے قریب تر ہے۔ اور ایک مسلمان شرک کی پرچھائیں سے بھی کوسوں دور بھاگتا ہے!

کتاب و سنت اور اسوۂ صحابہؓ سے بے نیاز ہو کر، خود اپنے ذہن و قلب کے واردات کو "الہام و القاء" سمجھنے سے جو گمراہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں وہ دین و اخلاق کے لئے ایک مستقل فتنہ ہیں۔ اور ان فتنوں پر جس "فن" کی تشکیل ہوئی ہے اس کی جسے ہوا بھی لگ جائے گی تو وہ بے راہ روی سے بچ نہیں سکتا!

حقیقت

مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دیگر علماء دیوبند کے جماعت اسلامی سے اختلافات عقیدہ و مسلک کی حقیقت

از:- مولانا عامر عثمانی (فاضل دیوبند) ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت صرف دس آنے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر ملت چوک بازار ملتان شہر۔

جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلہ میں مخالفین کا کئی سال سے بازار گرم ہے افترا پردازیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طوفان بد تمیزی ہے جو قریب قریب ہر طرف سے اٹھ رہا ہے!

ان ایکسٹرا قسم کے مولویوں سے ہمیں زیادہ شکوہ نہیں ہے جو ہمیشہ یہی کھیل کھیلتے رہے ہیں اور شریفوں کی پگڑیاں اچھالنا ہی جن کا شیوہ رہا ہے۔ ان "مرغانِ بادنما" کو عوام اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ انتہائی اذیت اور قلبی کوفت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ علماء جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بھی قابلِ احترام ہیں اور جن کے زہد و تقویٰ کی بھی اچھی شہرت ہے! جماعتِ اسلامی کے خلاف مورچے لگائے ہوئے ہیں۔ اور جن کے نزدیک جماعتِ اسلامی کو مطعون کرنے بلکہ مٹانے کی کوشش کرنا دین و ایمان کا سب سے بڑا تقاضا ہے!

پاکستان میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور ہندوستان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، جماعتِ اسلامی اور مودودی صاحب کو گمراہ اور دشمن اسلام ٹھہرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بزرگوں کا ہمارے دل میں احترام ہے مگر یہ احترام مجروح ہونے سے کب تک بچا رہے گا جبکہ یہ حضرات اور ان کے عقیدت مند جماعتِ اسلامی پر تہمتیں جوڑنے میں ذرہ برابر باک محسوس نہیں کرتے اور یہ بزرگ عناد و مخالفت کی اس نیچی سطح تک اتر آئے ہیں کہ جو سطح بر سبیل تنزل بھی ان کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے!

"رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو"

یہ جماعتِ اسلامی کے دستور اساسی کی ایک دفعہ (clause) ہے۔ جو کسی اعتبار سے بھی محلِ اعتراض نہیں ہے اور اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو نزاع و جدال کا موضوع بن سکے۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی مدظلہم کی ذہانت کو داد دیجئے کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے دستور کی اس دفعہ سے ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں اور وہ معنی نکالے ہیں کہ عقل حیران ہے اور ضمیر ششدر ہے!

مولانا عامر عثمانی دیوبند کے فاضل ہیں۔ بلند پایہ مجلہ "تجلی" کے مدیر اعلیٰ ہیں اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ کے ہونہار نواسے ہیں۔ صاحب موصوف نے مولانا حسین احمد مدنی کے ان اعتراضات کا جائزہ لیا ہے جن کی زد سے جماعت

اسلامی کے دستور کی مندرجہ بالا دفعہ کو گمراہی ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ بلند پایہ مقالہ ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) میں چند مہینے پہلے چھپا تھا۔ اب اسے مکتبۂ تعمیرِ ملت ملتان نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

ندرتِ استدلال، حسنِ نگارش، خلوصِ تحریر اور اندازِ بیان، غرض وہ تمام خوبیاں اس مقالہ میں موجود ہیں، جو کسی کو تحریر کو وزنی، پائدار اور اثر انگیز بناتی ہیں۔ مولانا مدنی کے اعتراضات اور دلیلوں کو کھنگال کر رکھ دیا ہے۔ اور اس مضمون میں نری ادبیت ہی نہیں پائی جاتی۔ اس میں خالص علمی اور عقلی استدلال کی بھی فراوانی ہے۔ یہ "شیوخ عرب و عجم" علم و فضل کی جس بلندی پر متمکن ہیں۔ وہاں "قبولِ حق" کی رسائی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم اُن کی خدمت گرامی میں کچھ عرض معروض کرنے کی اپنے میں جراُت نہیں پاتے۔ البتہ عوام مسلمانوں سے پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ کہ جن کو گمراہ ٹھہرایا جارہا ہے اُن کا کیا مقام ہے! اور جو اپنے کو زہد و شریعت کا ٹھیکیدار سمجھے ہوئے ہیں وہ کس سطح پر ہیں؟ اتنے سنجیدہ اور باوقار علمی مقالے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے خود دیوبند ہی میں ایک ایسے اہلِ فکر عالم کو پیدا کر دیا ہے، جس نے اس ادارے کے بڑے بڑے ستونوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے!

کنیز (ناول) | از۔ نظر زیدی۔ ضخامت ۳۰۸ صفحات۔ مجلد (رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ خواتین۔ اچھرہ۔ لاہور۔

یہ ایک نیم تاریخی اسلامی ناول ہے۔ جو شہرت و نمود اور طلبِ زر کے لئے نہیں بلکہ اخلاق و پاکیزگی کی ترویج و اشاعت کے لئے لکھا گیا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک پلاٹ مربوط ہے۔ بعض مقامات پر نفسیات کی ترجمانی اور مناظر کی عکاسی خاصی دلچسپ اور اثر انگیز ہے۔ ناول نگار اپنے مافی الضمیر کو ہم آہنگ الفاظ میں ادا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں ان کے رہوارِ قلم کو ٹھوکر بھی لگی ہیں:۔

سوقِ عکاظ کا جو سماں کھینچا گیا ہے اُس میں "شاعری" کی جگہ "عروض" (ص۹) نظر آیا۔ سوقِ عکاظ میں شاعری کے معرکے تو ضرور گرم ہوتے تھے مگر "عروض" کی بحثیں نہیں چھڑتی تھیں۔ (ایام جاہلیت میں "عروض" کا فن مرتب ہی کب ہوا تھا!

" اس کے علاوہ یہ مقابلہ اس تقریب کی آخری شق بھی سمجھی جاتی تھی۔" (ص۱۱)

"شق" کی جگہ کوئی اور لفظ ہوتا تو افسانوی زبان کا آہنگ باقی رہتا۔

" مردوں کی یہ عظیم بھیڑ (ص۱۲) بھیڑ جیسے ٹھیٹ ہندی لفظ کے ساتھ "عظیم" کس قدر بے جوڑ ہے۔" ادھیڑ چاند" (ص۱۶) چاند کو "بچہ" "جوان" اور "ادھیڑ" کہنا جدت تو ہے مگر نامانوس جدت۔ "سردار ابو خالد اپنے بھاری وجود کو سمیٹ کر ایک گینڈے کی سی پھرتی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا" (ص۲۱) "بھاری جسم" لکھنا چاہیئے تھا۔ "درندہ اپنا جباڑہ چیرے کھڑا ہو (ص۳۲) "جبڑا" بولا جاتا ہے۔ "بڑی بڑی بوٹیاں بھنبھوڑ رہے تھے" (ص۹۶) صحیح تلفظ اور املا "بھنبھوڑنا" ہے۔ دونوں جگہ "ہ" زاید ہے۔ "اور پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا" (ص۱۰۱) "لڑکھڑاتے ہوئے" لکھنا چاہیئے تھا۔ "سیدی شحنہ نے تقریباً لجاجت کے انداز میں کہا" (ص۱۴۱) اُردو میں "تقریباً" اس مفہوم میں نہ بولا جاتا ہے اور نہ لکھا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے "تقریباً" ایسے محل پر بار بار استعمال کیا ہے۔ "یہ مختصر سا قافلہ

بڑے بڑے سفر کر رہا تھا " (ص ۱۶۲) " مزے مزے " کے بعد " سے " لانا ضروری تھا۔

" قد، کاٹھ اور رعب دبدبے میں زبیدہ سے بڑھا ہوا " (ص ۱۶۶ - ۱۶۷) " کاٹھی " بولتے ہیں۔ " کاٹھ " تو لکڑی کو کہتے ہیں۔ " کیوں یہ منہ بچھیڑنے کا کونسا موقع ہے " (ص ۲۳) " منہ بچھیڑنے " پہلی بار نظروں سے گزرا " ان حقیر کیڑوں میں سے پہلے کیسے مسلنا مناسب ہوگا " (ص ۲۷۲) یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔

ہُبل (بت کا نام) کی جگہ " جبل " (ج کے ساتھ) لکھا ہوا نظر آیا۔ اسی طرح " ہدف " بھی (حدف)! " پھرتی دکھانے کے لئے " جگہ جگہ " چیتے کی سی پھرتی " کی تکرار کچھ بھلی نہیں لگتی!

" ابلیت " یہ عجیب نامانوس سا عربی نام افسانے کے لئے تلاش کیا گیا ہے۔ ناول بہرحال مجموعی طور پر کامیاب ہے!

قدیم خورجہ

از:- خان بہادر نقی محمد خاں۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- ۱۲۱ لاجپت رائے روڈ۔ جمشید کوارٹرس۔ کراچی۔

جناب نقی محمد خاں صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی موصوف کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے وطن خورجہ (ضلع بلندشہر) کے قدیم تمدن اور احوال وکوائف کو دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ حب الوطن ایک ایک سطر میں جھلکتی ہے۔ کہیں کہیں تو اس لے میں شیون و فریاد کا رنگ آگیا ہے!

صفحہ ۲۰ پر عراقی کے دو شعر درج ہیں۔ جن کے پہلے مصرعے غلط درج ہوئے ہیں:-
" نخستیں " کی جگہ " نخستن " اور " چہ خود کردند " کے بجائے " چو خوش کردند " اور " مشک بر " بیادار " کو " بہ یاددار " لکھا گیا ہے!

" سوانگ " کو بلندشہر کے نواح میں " سانگ " بولتے ہیں۔ مگر اس کا املا " سوانگ " ہی ہونا چاہیئے۔ ص ۲۴۳ پر " سانگوں " (سوانگ کی جمع) اور " چیلوں " کا املا کھٹکا۔ " چوہلوں " لکھنا چاہیئے تھا۔ " ختنوں " کا املا " خطنوں " (ص ۲۴۴) دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی!

" علاج میں شفت تھی اور اعتقاد تھا " (ص ۵۹) " اعتقاد " بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ خورجہ کے وہ مسلمان جو ہجرت کرکے پاکستان آگئے ہیں اُن کی آئندہ نسلیں اس کتاب کو پڑھیں گی تو انھیں ایک ایک واقعہ خواب سا نظر آئیگا!

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۳۱۶ صفحات۔
قیمت دو روپے آٹھ آنہ ملنے کا پتہ۔ اسلامی مکتبہ ۲۴۲۔ بی کلاس معظم پورہ۔ حیدرآباد دکن۔

اب سے تیئیس سال قبل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی پر ایک سلسلۂ مضامین رسالہ ترجمان القرآن میں شائع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا موصوف حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اور وہیں سے " ترجمان القرآن " نکالتے تھے۔ اسلامی مکتبہ (حیدرآباد دکن) نے اس سلسلۂ مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ چند عنوانات:-

اسلامی تہذیب کی خصوصیات ——— زندگی کا اسلامی تصور ——— زندگی کا نصب العین ——— ایمان ———

— ایمان باللہ — ایمان بالرسل — ایمان بالکتب — ایمان بالیوم الآخر — اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر —
دنیا پر آخرت کی ترجیح — اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت — تہذیب اسلامی کا خاکہ — نفاق کا خطرہ —

جن لوگوں نے مکانوں کی محرابوں، قبروں کے گنبدوں اور لباس و آرائش کی چیزوں ہی کو تہذیب و تمدن سمجھ رکھا ہے، یہ کتاب ان سطحی تصورات کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کی اساس "ایمان" اور تقویٰ ہے اور مسلمانوں کے تہذیبی اعمال اسی محور کے اردگرد گھومنے چاہئیں!

اندازِ بیان اور استدلال کے کیا کہنے! ایک ایک سطر پر مصنف کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ کہ اس اسلامی مفکّر نے چودھویں صدی ہجری میں کتنا عظیم الشان تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مولانا مودودی اپنی اس دینی فکر کی اصابت اور پھر اس کے سحر انگیز اظہار و بیان اور اس کی بے پناہ مقبولیت کے سبب محسودِ روزگار بن گئے ہیں۔ مگر یہ بیابانی بگولے کیا اس کاروانِ فکر و نظر کو روک بھی سکیں گے!

مولانا مودودی کی یہ تحریر تقریباً ربع صدی قبل کی ہے۔ اس عرصہ میں اُن کے اندازِ نگارش میں بہت کچھ بناؤ اور حُسن و خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ افکار و نظریات بھی اس مدّت میں نکھرے ہیں۔ اس لئے مولانا مودودی کی بعد کی تحریروں کے مقابلہ میں یہ کتاب کہیں کہیں اُکھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر مجموعی طور پر یہ کتاب اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔

مقامِ حسینؓ | از:- پیام شاہجہاں پوری۔ ضخامت ۲۲۷ صفحات۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:- ملک دین محمد اینڈ سنز۔ اشاعت منزل۔ لاہور۔

حضرت سیدنا حسین علیہ السلام نے جبر و استبداد کے خلاف کلمۂ حق بلند فرما کر جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا ہے، وہ گوناگوں خصوصیتوں کی وجہ سے اپنی آپ مثال ہے۔ جس کے دل میں ایمان ہوگا، اُس کو حسینؓ سے اور اہل بیت سے لگاؤ ضرور ہوگا۔ رفض کی طرح خارجیت بھی دین و ایمان کا فتنہ ہے!

جناب پیام شاہجہاں پوری نے حضرت حسین علیہ السلام کی سیرت اور واقعاتِ کربلا کو مؤثر انداز میں پیش فرمایا ہے

کتاب کے عنوانات:-
سیرت و کردار — تعلیمات و ارشادات — تلواروں کے سایوں میں — خطباتِ حسینؓ پر ایک نظر —
شہادت — مقامِ حسینؓ — حسینؓ غیروں کی نظروں میں —

بعض کم سواد اور کم نظر لوگ حضرت حسینؓ کے اس جہاد کو "جنگِ اقتدار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کتاب میں اس لغو نظریہ کی فاضل مصنف نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ حُبِّ اہل بیتؓ اطہار کی بو ہر ورق سے آتی ہے!

غالی مؤرخین اور غیر محتاط ذاکروں نے افسوس ہے کہ واقعاتِ کربلا کو تاریخ سے زیادہ حکایت و افسانہ کا رنگ دے دیا۔ اور جذبۂ عقیدت ان افسانوں کو پرکھنے اور جانچنے سے کتراتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کو یا اور خلافتِ راشدہ کی جنگوں کو تاریخی حیثیت حاصل ہے، کربلا کے افسانوی واقعات اس درجے کے نہیں ہیں۔

MUSLIM | انگریزی ہفتہ وار۔ ایڈیٹر:- فروغ احمد۔ منیجر:- سید فیاض الدین۔ فی پرچہ چار آنے۔ چندہ سالانہ بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ:- مولوی بازار ڈھاکہ۔

یہ لوطلوع انگریزی ہفتہ وار ہے۔ جس کی عمر ایک سال سے بھی کم ہے۔ مگر مضامین کی بلندی اور تنوع و ترتیب، فکر کی اصابت اور اظہار حق کی جرأت میں بہت سے پرانے اخباروں اور رسالوں سے منزلوں آگے ہے۔ ہفتہ وار مسلم اسلامی فکر و نظر کا ترجمان ہے۔ اس لئے اس کے مضامین پاکیزہ اور سنجیدہ و بادقار ہوتے ہیں۔ گندی سیاست پر طنز اور سازشوں کی بے نقابی اُس کا طرۂ امتیاز ہے۔

یہ اخبار ہر طرح کی حوصلہ افزائی اور امداد و تعاون کا مستحق ہے۔ پاکستان کے وہ گھرانے جن میں انگریزی بھی اچھی پڑھی جاتی ہے اُن میں ہفتہ وار " MUSLIM " کا بار پانا ضروری ہے۔ ہم اس اخبار کی ترقی، مقبولیت اور استحکام کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ــــ !

بچوں کیلئے کہانیاں

(۱) "چوکیدار" از:- محمود پرویز کاکوی- ضخامت ۳۲ صفحات- قیمت پانچ آنہ- ملنے کا پتہ:- مکتبہ اشاعت اردو- کوٹری۔

بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ کہانیاں دل چسپ اور عام فہم ہیں۔

" مجھے کنگھی کردو" (صلا) " میرے کنگھی کردو" لکھنا چاہیئے تھا۔" ماں کے دُلار سے یہ اور بھی کوڑی کا تین ہوگیا تھا" (ص۱۳) " کوڑی کا تین ہونا بے قیمت اور ارزاں ہونے کے معنی میں بولتے ہیں۔ اور حکایت نگار نے اس ضرب المثل کو " آوارہ اور پست کردار" ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ (ص۱۹) " آئرن سیف کھلا ہوا تھا" " آئرن سیف" کی جگہ " لوہے کی تجوری" لکھنا چاہیئے تھا۔ (ص۲۵) " اور جس وقت وہ (ہاتھی) جھومتے تو بے حد سہانا منظر معلوم ہوتا" ہاتھیوں کے جھومنے کے منظر کو " سہانا" کہنا کتنی بے جوڑ بات ہے۔ یہاں " عجیب" کا محل تھا۔

(ص۲۵) " اس کی مونچھیں کڑی کڑی سی تھیں یہ ہاتھی کا کاروبار کرتا تھا" " سخت مونچھوں کو" کڑی" لکھنا وجدان کو کھٹکتا ہے۔" ہاتھی کا کاروبار" بھی محل نظر ہے۔" ہاتھیوں کی تجارت کرتا تھا" لکھنا چاہیئے تھا۔

(۲) لالچی فقیر:- از- محمود پرویز کاکوی- ضخامت ۳۲ صفحات- قیمت پانچ آنہ- ملنے کا پتہ- مکتبہ اشاعت اردو، کوٹری۔
اس کتاب میں بھی بچوں کے لئے ہلکی پھلکی کہانیاں ہیں- جو دل چسپ ہیں: (ص۲۵) " دونوں کے دونوں بالکل جُھٹ ہی تو گئے" یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ مشغول ہونے کے معنی میں " جُٹ گئے" بولتے ہیں۔ اس لفظ میں " ھ" نہیں ہے۔

(۳) " ایک بادشاہ اور قصاب" از:- محمود پرویز کاکوی- قیمت پانچ آنہ- ملنے کا پتہ- مکتبہ اشاعت اردو کوٹری (حیدرآباد)
اس کتابچہ میں بھی دل چسپ کہانیاں بچوں کی نفسیات کے مطابق ہیں" مگر اس کے انگ انگ میں شرافت بھری ہوئی تھی۔" (ص۱۷) " انگ انگ" کی جگہ " نس نس" زیادہ عام فہم اور فصیح تر تھا۔" پولس کے کئی افراد" (ص۲۳) بچوں کے سمجھنے کے لئے " افراد" کی جگہ " آدمیوں" لکھنا تھا" سفید رنگ کا ایک طویل قامت کُتا" (ص۲۵) " طویل قامت" بھی بچوں کے لئے مشکل لفظ ہے۔

(۴) " بچوں کے ترانے" از- محمود پرویز کاکوی- ضخامت ۱۶ صفحات- قیمت تین آنہ- ملنے کا پتہ:- مکتبہ اشاعت اردو، کوٹری (حیدرآباد)
اس کتابچہ میں بچوں کے لئے مختلف موضوعات پر گیارہ نظمیں ہیں۔

محبت کو رگ رگ میں ڈالے ہوئے (صفحہ ۳) یہ کیا زبان ہے ؟

" سعادت کا نغمہ سنانے کو آیا ۔ (ص ۹) "سعادت کا نغمہ" کیا ہوتا ہے ؟

"سحر ہوگئی" جس نظم کا عنوان ہے ۔ اس کا آخری بند شروع کے تین بندوں سے مختلف بحر میں ہے ۔

جناب وقار اشدی کی کوشش سے یہ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ۔ موصوف اردو زبان کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں ۔

اسلام اور انسانی قانون

از :۔ عبد القادر عودہ شہید ۔ مترجم :۔ عمر بن اللہ ایم اے عثمانیہ ۔ ضخامت ۔۔ صفحات ۔ قیمت پندرہ آنہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ اسلامک بک سینٹر (مسجد چوک) حیدر آباد دکن ۔

حضرت عبد القادر عودہ شہید رحمتہ اللہ علیہ " اسلامی دستور" اور "دینی شریعت و قانون" پر سند (authority) ملنے جاتے تھے ۔ ظالم ناصر نے اُن کو پھانسی دے کر ایک بہت بڑی سعادت اور نعمت سے ملتِ اسلامیہ کو محروم کردیا ۔ عبد القادر عودہ ایک فرد کا نام نہ تھا ۔ وہ اپنی ذات سے علم و فضل کا ایک مستقل ادارہ تھے بلکہ ایک امت تھے ۔

عبد القادر عودہ شہید کے ایک معرکہ آرا مقالہ کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے ۔ جس میں انہوں نے قانونِ شریعت پر بڑا سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے ۔ اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ کے فکر و نظر کا بڑی خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے ۔ زیر مرتبہ "فاران" میں انشا اللہ العزیز اس کتاب کے بعض اقتباسات "درج انتخاب" میں دیئے جائیں گے ۔

" اسلام اور انسانی قانون " بڑے کام کی چیز اردو میں منتقل ہوئی ہے ۔ جس کا مطالعہ ذہن و فکر کو تنویر بخشتا ہے ۔ مصنف، مترجم اور ناشر سب کے سب ملتِ اسلامیہ کی طرف سے تشکر و امتنان کے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جزائے خیر کے مستحق ہیں ۔

حقیقت عیسائیت

مولفہ :۔ حکیم شمس الدین احمد قریشی ۔ ضخامت ۴۴ صفحات ۔ قیمت پانچ آنہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ دار الاشاعت و التبلیغ ٹیکسلا ۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی مشنریاں شروع شروع میں تو صلح کل اور رواداری کے انداز پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتی ہیں ۔ مگر قابو پانے کے بعد اُن کی زیادتی و اکراہ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ صرف الجزائر شہر میں بڑی بڑی مساجد ایک سو ساٹھ کی تعداد میں تھیں ۔ جن میں سے اکثر کو عیسائیت کے جور و ستم نے کلیساؤں ، سرکاری دفتروں اور اصطبلوں میں تبدیل کردیا اور بعض ڈھادی گئیں ۔

پاکستان میں بھی عیسائی مشنریاں پر پرزے نکال رہی ہیں اور عیسائیت کی تبلیغ زور و شور کے ساتھ کررہی ہیں ۔ اور یہ بات عالم آشکارا ہے کہ عیسائی مشنریوں کے پاس مذہبی لٹریچر کے علاوہ لوگوں کی تحریص و ترغیب کے دوسرے ذرائع بھی ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھے ۔

اس کتابچہ کے آخری حصہ میں عیسائیوں کے عقائد (۱) عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں ۔ (۲) عیسیٰ علیہ السلام تین خداؤں میں سے ایک خدا ہیں ۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے گناہوں کے بدلے اپنے اکلوتے بیٹے کو سُولی دی ۔ کی فیصلہ کن دلیلوں سے تردید کی ہے ۔ اور عیسائی عقائد کی قلعی دل کر رکھ دی ہے !

...شبلی نعمانی کی معرکہ آرا اور بے مثال تالیف الفاروق کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ یہ ... تاریخ کا شاہکار ہے۔ انگریزی، فارسی اور ترکی میں اس کے ترجمے ہو کر قبول ہو چکے ہیں۔ ... نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اور قیمت بازار کے عام نرخوں سے بہت کم رکھی ہے ... کتاب پر "جملہ حقوق محفوظ" دیکھ کر طبیعت میں کھٹک سی پیدا ہوئی۔ کیا دار المصنفین اعظم گڑھ سے ... ملتان نے باضابطہ حقوق طباعت حاصل کر لئے ہیں۔ اگر نہیں کئے تو پھر "جملہ حقوق محفوظ" کا "اعلان" نہیں رکھتا۔

"الفاروق" سے کسی اُردو شناس مسلمان کا گھر خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ علمی اور دینی ہر اعتبار سے ... اور توجہ و عمل کی مستحق ہے۔

ہفتہ ترکی میں | از:۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ضخامت ۲۱۱ صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ دیدہ زیب۔ مجلد۔ خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

پتہ:۔ مکتبہ اسلام۔ گوئن روڈ۔ لکھنؤ (بھارت)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اور دمشق سے ... ہو آئے۔ یہ کتاب اسی سفر کے مشاہدات، واردات اور تاثرات سے عبارت ہے۔ سفرنامہ انتہا... مات آفرین ہے۔ تنقید نگار نے اسے شروع کیا اور ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیا۔ انشا... کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:۔

> "گاڑی اُس سرزمین پر جا رہی ہے جس کے دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں سے بار بار گونجے اور جس کی خاک پاک عرب شہسواروں اور ترک مجاہدوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بار بار پامال اور حق یہ ہے کہ مالامال ہوئی۔"

ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک زمانہ میں اپنی ناواقفیت کے سبب مصطفیٰ کمال پاشا کی ذات سے کس... بلکہ عقیدت تھی۔ راقم الحروف نے بھی اتا ترک کی مدح میں اشعار کہے ہیں اور اپنی اس غلطی پر سخت... اتا ترک کمال نے ترکی کو دین سے بیگانگی اور بیزاری کے جس پاتال میں گرایا ہے۔ اُس پر خون کے... ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ترکی پھر اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے اور مصطفیٰ کمال کی ... جا رہی ہے۔ مولانا علی میاں نے گلہانہ پارک میں اتا ترک کے مجسمہ کو دیکھ کر جو یہ کہا:۔

"ما ولدت الأمة التركية اشأم منه" (مادر ترکیہ نے اس سے زیادہ منحوس آدمی کو جنم نہیں دیا) ... حقیقت کی ترجمانی کی۔

مولانا علی میاں کا یہ سفر کوئی تفریحی سفر (Excursion) نہ تھا۔ دینی تقاضے اُن کے ہمہ وقت پیش نظر رہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اور زیادہ قدر کے قابل ہے!

"عفت" کا سالنامہ ادارۂ تحریر:- عبدالوحید خاں۔ حمیدہ بیگم، رخشندہ کوکب۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ عام پرچہ کی قیمت آٹھ آنہ۔ سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر ماہنامہ "عفت" ادارۂ خواتین اچھرہ - لاہور۔

ماہنامہ "عفت" کا سالنامہ بڑے حُسن اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جیسا نام ویسا کام۔ عفت و پاکیزگی ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ مضامین دل چسپ اور متنوع ہیں۔ نظمیں بامقصد اور ولولہ انگیز ہیں۔ افسانے مفید اور کار آمد ہیں۔

"عفت" کا یہ شاندار شمارہ ہر اُردو داں مسلمان گھرانے میں بار پانے کا مُستحق ہے۔ تدبیر منزل سے لے کر ادب و انشاء اور دینی افکار تک ہر چیز اس میں ملتی ہے۔ مغرب زدہ غیر صالح لٹریچر کے مقابلہ میں پاکیزہ ادب پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اشاعتِ پاکیزگی و اخلاق کی ایک مثبت کوشش۔ سرورق دیدہ زیب اور سادہ و پُر کار ہے۔ جو ظاہری طور پر بھی الماریوں اور میزوں کی زینت بن سکتا ہے!

★ سوشلسٹ پلاننگ سے پہلے
کارخانہ دار مل مزدوروں کے خون کی ایک ایک بوند چوس لیتا۔
سرمایہ دار غریبوں کی کمائی کا ایک ایک تنکا تک بکوا لیتا۔
اور زمیندار کسانوں کی محنتوں سے اپنے گوداموں کی زینت بڑھاتا۔
★ اور سوشلسٹ پلاننگ کے بعد
یہ تمام کام حکومت نے اپنے ذمے لئے ہیں۔
حکومت ہی کارخانہ دار ہوگی۔
حکومت ہی سرمایہ دار ہوگی۔
اور حکومت ہی زمیندار بھی ہوگی۔
بس خون چوسنے والے بدل جائینگے
★ اسلام ہی ایک ایسا نظام حیات ہے، جس نے معاشی انصاف کو عملاً نافذ کیا۔
سوشلسٹ پلاننگ اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کیلئے
عظمت اللہ خاں ایم اے کی بیش بہا تصنیف
پلاننگ پر ایک تنقیدی نظر
کا مطالعہ فرمائیے۔ چند ایک عنوانات درج ذیل ہیں:-
• پلاننگ کیا ہے • پلاننگ کے معاشی نقصانات • سرمایہ دارانہ معیشت اور پلاننگ کا موازنہ • اسلام میں فرد کے معاشی حقوق • اسلام میں سماج کے معاشی حقوق
• ایک ماڈل پلان
قیمت ایک روپیہ ۔ علاوہ محصول ڈاک ۔ صفحات ۱۳۶
پتہ۔ مکتبہ سبیل نو ۔ جدید آغا پورہ ۔ حیدرآباد دکن
پاکستان میں تمام مکتبوں سے دستیاب ہو سکتی ہے

kobai
کوبائی
داد، اکزیما اور دیگر جلد
امراض کا بہترین
مہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین
قیمت: ایک روپیہ فی ڈبیہ

ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کر سکتے ہیں
ز کے لئے بہترین تحفہ
بارہ مجرب دواؤں کا خزینہ
علاج اور اہل محلہ کی طبی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
دوائیں بڑی حد تک آپ کی طبی ضروریات کو پورا کر دیں گی
بخار کھانسی درد گھبراہٹ قبض
اسہال پیچش
بچوں کی
کا خاطر خواہ علاج
دواؤں سے کیا جا سکیگا۔ قیمت
ساکو (پاکستان) کراچی
تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس کراچی

ٹیکسٹائل ملز
حیدرآباد سندھ
جس میں
مضبوط دھاگا
اور
پائیدار خوشنما کپڑا
تیار ہوتا ہے
آپ پاکستان کو اُسی وقت خوش حال بنا سکتے ہیں
جبکہ آپ پاکستان کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں

اپنے ملک
پاکستان کی صنعت
کو
ترقی دیجئے
اور اپنے
لائلپور کاٹن ملز
لائلپور کا بنا ہوا مضبوط کپڑا خرید کر ملک و قوم کو مضبوط تر بنائیے
پروپرائیٹرز
دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ
ان کارپوریٹڈ ان انڈیا

ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۸

فاران

نومبر ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ .. چھ روپے

فی پرچہ .. آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

انگریز کے دور میں عوام اور حکومت کے درمیان نزاع و کشمکش ناگزیر تھی کہ "غلام رکھنے" اور "آزاد ہونے" کی دو متضاد کا ٹکراؤ تھا۔ اس زمانہ میں حکومت کے خلاف احتجاج، قانون شکنی اور پولیس اور عوام کے درمیان جھڑپ کی خبریں سن کر دل کیا کیا خوش ہوتی تھی کہ گورنمنٹ کے خلاف بیزاری، بددلی بلکہ نفرت و عداوت بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آزادی کے شیدائی نزدیک دن حکومت کا تختہ الٹ کر رہیں گے!

انگریز سے نفرت اس لئے نہ تھی کہ وہ عیسائی مذہب کا پیرو ہے۔ انگلستان کا رہنے والا ہے اور اس کا رنگ اور نسل مختلف ہے۔ نفرت و بیزاری کا سبب انگریز کے وہ منصوبے اور عزائم تھے جو عوام کی تمناؤں کے خلاف وہ اپنے اندر رکھتا اور وہ صرف ذہنی عزائم اور خیالی منصوبے نہ تھے۔ عملی دنیا میں بھی اس کے آثار و علائم سب کو دکھائی دیتے تھے۔

انگریز نے اپنے اقتدار کی عمر بڑھانے اور عوام کی جدوجہد آزادی کو ناکام بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سبز باغ اس نے دکھائے، قرطاس ابیض کے جال اس نے بچھائے، آزادی کی قسطیں اس نے مقرر کیں، دھونس اس نے لالچ اس نے دیا۔ یہاں تک کہ جبر و تشدد پر اتر آیا۔ انگریز کو بہت سے حاشیہ بردار اور نسبی حضوری بھی ہاتھ لگ گئے جو اپنے بھائی بندوں کے خلاف مخبری کرتے اور ہر جا و بے جا بات میں اپنے سفید فام آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے!

مگر اس کشمکش کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جو نکلنا چاہیئے تھا یعنی عوام کی جیت اور حکومت کی ہار! انگریز کی تمام چالیں ناکام ثابت ہوئیں، اس کی ڈپلومیسی فیل ہو گئی، اس کی تدبیریں زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ اب رہا قوت کا استعمال، تو اس نے بھی دیکھ لیا کہ جبر و تشدد سے عوام کے جذبات کو تھوڑی دیر کے لئے دبایا تو جا سکتا ہے مگر ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور دنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور حکومت بھی عوام کے مقابلہ میں ان کی حریف اور فریق مخالف بن کر زیادہ دن تک

ہیں رہ سکتی ۔ اختیار و اقتدار پر گھمنڈ کرنے والے اگر انگریز کے زوال سے اتنی سی بھی عبرت نہ حاصل کریں تو پھر اُن کو اسی انجام کے لئے تیار رہنا چاہیئے !

اگر عوام کے مقابلہ میں مکر و فریب کی چالیں اور سیاست کی شیشہ گری کامیاب ہو سکتی تھی تو انگریز سے بڑھ کر اس فن میں اور کون مہارت رکھتا تھا مگر بساطِ سیاست کے اس سب سے بڑے شاطر کو بالآخر زچ ہونا پڑا ۔ اگر عوام کو طاقت سے مغلوب کیا جا سکتا تھا تو انگریز کی طاقت کا بھلا کوئی ٹھکانا تھا ۔ عوام کی تمناؤں کے سامنے انگریز کی طاقت کو بھی سپر انداختہ ہونا پڑا !

انگریز کو ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ دشمنی مسلمان قوم سے تھی ۔ اس لئے یہ کینہ پرور ظالم جاتے جاتے مسلمانوں پر وار کر گیا ۔ مسلمانوں کے قتل و غارت گری میں یوں تو جیسے مہاسبھائی سنگٹھنوں کا تو ہاتھ تھا ہی مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی انگلیاں بھی اس ہاتھ کو شہ دے رہی تھیں ۔ آخر میں رہتے رہتے پاک و ہند کی سرحدوں کی نامنصفانہ تقسیم کر کے پاکستان کو مصیبت میں پھنسا گیا !

انگریز کے جانے کے بعد مسلمان خوش اور مطمئن تھے کہ پاکستان ، ان تمام پچھلے صدموں کی تلافی کر دے گا اور مسلم قوم کے کلیجہ پر اگرچہ بڑے کاری زخم آئے ہیں مگر پاکستان کا وجود اپنی جگہ ان زخموں کا مرہم ہے ! خوش خیالی یہ تھی کہ حکومت اپنے نمائندوں اور بھائی بندوں کے ہاتھوں میں ہوگی ، جو قوم کے مزاج سے ، نظریوں سے ، تمناؤں اور اس کے مطالبوں سے پوری طرح واقف ہیں ۔ اس لئے انگریز کے زمانہ میں رعیت و راعی اور حاکم و محکوم کے درمیان جو نزاع و کشمکش جاری رہتی تھی ۔ اُس کا پاکستان میں موقع ہی نہیں آئے گا ۔ سب مل جل کر ، ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر بلکہ یک دل و جان ہو کر اس سفینہ کو چلائیں گے ۔ انگریز کے دورِ منحوس میں حاکم و محکوم کے جو امتیازات قائم تھے ، وہ مٹ جائیں گے ، چھوٹے اور بڑے ، غریب اور مالدار ، سب کے سب اخلاص و محبت کے ساتھ پاکستان کی خدمت کریں گے اور یہ نومولود مملکت دنیا کی باوقار مستحکم سلطنت بن جائیگی ایسی سلطنت جس کے اندر امن و اطمینان ہوگا اور بین الاقوامی دنیا میں جس کا وزن محسوس کیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس آئیڈیالوجی (اسلام) نے اس حکومت کو وجود بخشا ہے ، وہ یہاں عملی طور پر متشکل اور نافذ ہوگی !

ہندوستان کی تقسیم بڑی روا روی اور انتہائی عجلت میں عمل میں آئی تھی ۔ انگریز نے جلد بازی کی یہ پالیسی جان بوجھ کر اختیار کی کہ دلی میں تو مرکزی حکومت کا سب کاروبار جما جمایا موجود تھا ، ساری پریشانی حکومتِ پاکستان کو لاحق ہوئی ۔ کراچی میں کلرکوں کو بیٹھنے کے لئے کرسیاں تک میسر نہ تھیں ، اس افراتفری میں کسی تعمیری منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا بہت دشوار تھا ۔ جبکہ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین پاکستان میں آئے چلے جا رہے تھے !

تقریباً ایک سال تک پاکستان کے عوام صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کرتے رہے ، اُس کے بعد انہوں نے اندازہ کیا کہ پاکستان جس مقصد کیلئے وجود میں آیا ہے ، اُن خطوط پر کام نہیں ہو رہا ہے ۔ اُوپر سے لے کر نیچے تک وہی انگریزی دور کی روایات و رجحانات کام کر رہے ہیں ۔ اس احساس کے بعد عوام میں حرکت پیدا ہوئی ، جس کے نتیجہ میں "قرار دادِ مقاصد" دستور ساز اسمبلی کو منظور کرنا پڑی ۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے دورِ وزارت کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ "قرار دادِ مقاصد" کا دستور پاکستان کا سرنامہ اور حرفِ آغاز بننا ہے ! پاکستان کو بنے ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی اس لئے موقع پرست ـــــ (opportunist) اور کمزور کردار کے مسلمان لیڈروں تک میں مذہبی ولولہ موجود تھا ۔ اور "منافقین" کو اتنی مدت نہیں مل سکی تھی کہ وہ ان موقع پرست اور زمانہ ساز مسلمان لیڈروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر سکیں !

قرارداد مقاصد" کا عوام مسلمانوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا جیسے اُن کے دل کی مُراد بر آئی اور بھٹکے ہوئے قافلہ کو مل گیا۔ مگر اہلِ نفاق کے لئے "قرارداد مقاصد" ایک المناک سانحہ تھی۔ ان میں سے کسی کسی نے تو اپنے دل کی جلن بھی کر دیا اور دوسرے منافقین اس بغض و نفاق۔ بلکہ یوں کہیے "زخم دل" کو چھپائے بیٹھے رہے!

اسلامی دستور سازی کو روکنے کے لئے اہلِ نفاق نے جو جو چالیں چلی ہیں اور جو حربے استعمال کئے ہیں، وہ روشن ہیں۔ مگر اللہ کے فضل سے کوئی دھمکی اور جور و ظلم عوام کے عزم کو متزلزل نہ کر سکا۔ پاکستان کے ایک ایک سے یہی صدا بلند ہوئی۔ کہ ع

اپنا مقصد، اپنی منزل اسلامی دستور!

پاکستان کے مسلمان ان "بڑے لوگوں" کی بے تدبیری، غرض پرستی اور آپس کی جنگِ اقتدار کے سبب طرح مشکلات میں مبتلا رہے ہیں۔ کپڑا، روٹی، مہنگائی، بے روزگاری، خانماں بربادی، ان میں کا ہر مسئلہ ان بیچاروں کے ایک مستقل مصیبت تھا اور ہے۔ مگر انہوں نے ان میں سے کسی مسئلہ کو بھی موضوعِ احتجاج نہیں بنایا۔ انہوں نے اُس کے لئے کیا جس کا تعلق اُن کے دین و ایمان اور آخرت سے تھا۔ ان جفاؤں کو وہ کسی نہ کسی طرح سہہ گئے اور سہہ رہے ہیں اسلامی نظام کے مقابلہ میں لادینی نظام اُنھیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور آج بھی جب کوئی یہ کہتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ اور ہندو قومیت کو "ایک قوم" (one - nation) قرار دے کر، اسلام کے مقابلہ میں وطنیت لادینیت کو اُبھارا جائے۔ تو اس کے صرف تصور سے پاکستانی مسلمان کا دماغ جل اُٹھتا ہے!

چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں دستور کا مسئلہ جب اسمبلی میں پیش ہوا تو پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار تھی کہ بعض مسلم ارکان نے ہندو ممبروں کے ساتھ یک زبان ہو کر دستور کی اسلامی دفعات کی پوری قوت اور شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیسے مسلمان ہیں جو کانسٹی ٹیوشن کی اسلامی دفعات سے اس قدر بیزار ہیں اور جن کو دستور میں اسلام کا نام تک لانا گوارا نہیں ہے!

آتے ہی! چودھری محمد علی صاحب کے بعد مسٹر شہید سہروردی وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن ہوتے ہیں اور مسلم عوام کی امن پسندی اور خوش فہمی کی انتہا ہے کہ سہروردی صاحب کے وزیر اعظم ہونے پر کسی اسلام پسند طبقہ کی طرف سے مخالفت نہیں کی جاتی۔ اس لئے نہیں کہ عوام نے ڈر کے مارے صدائے احتجاج بلند نہیں کی، یا نئے وزیر اعظم صاحب کی خوشامد مقصود تھی۔ اس سکوت، گوارائی اور برداشت کا سبب یہ تھا کہ پاکستان کے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جناب شہید سہروردی صاحب پر جب حکومت کا بار پڑے گا، عوام کے حقیقی مطالبے اُن کے سامنے آئیں گے، خود کانسٹی ٹیوشن کی روح جب اُن کے سامنے ہو گی تو وہ اپنی پچھلی روش پر جمے رہنے پر اصرار نہ کریں گے۔ وہ اپنے کو بدل دیں گے اور اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیں گے کہ وہ اُس حکومت کے وزیر اعظم ہیں جس کے دستور کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے اور اسلام جس کا نام ہے، اسلام جس کی روح ہے۔ اسلام جس کی اساس ہے اور اسلام جس کے وجود کا سببِ تخلیق ہے!

ہم جیسے خاک نشینوں نے اپنے نئے وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کی تھی کہ:۔

"ہمارے سامنے آپ کا ماضی نہیں مستقبل ہے۔ ہم یہ خوش گمانی رکھتے ہیں کہ حکومت کا

بارِ گراں آپ میں انشاء اللہ تبدیلی پیدا کر دے گا۔ ذمہ داریوں کا احساس آپ کو وہ
بنا دے گا جو اسلامی حکومت کے سربراہ کار کو بننا چاہیئے۔" (فاران۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

سہروردی صاحب کا ماضی کیا رہا ہے؟ اس بحث کو ہم نے قصداً نہیں چھیڑا کہ مقصود بلا وجہ کی چھیڑ نہ تھا۔ یہ بحث درمیان میں لائی جا سکتی تھی مگر ہم نے اس سے عمداً گریز کیا۔ تاکہ سہروردی صاحب کی وزارتِ عظمٰی کا آغاز تنقید و تعریض کی بجائے خوش فہمی، خیر اندیشی اور محبت کے جذبات سے ہو! ہمیں سہروردی صاحب کے وسیع تجربہ، سیاسی زندگی اور اُن کی ذہانت و دانائی سے توقع تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ کو ہرگز نہ اٹھائیں گے، جو چاہے اُن کے رجحانات کے عین مطابق ہو مگر پاکستان کے عوام مسلمان جس کو ناپسند کرتے ہوں!

حیرت سے زیادہ افسوس اور افسوس سے زیادہ حیرت ہے کہ مسٹر سہروردی نے اپنی وزارتِ عظمٰی کا آغاز ہی اُس مسئلہ سے کیا کہ جس کو اگر درست مان لیا جائے تو پاکستان جس نظریہ کی بناء پر وجود میں آیا ہے وہ ایک غلط اقدام بلکہ "بناء فاسد" قرار پاتا ہے۔ اُنہوں نے پبلک کے بڑے بڑے جلسوں میں "دو قومی نظریہ" کی تردید اور مخلوط انتخاب کی تائید فرمائی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا بڑے جوش کے ساتھ پرچار کیا۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سہروردی صاحب نے ان جلسوں میں اپنے خیالات کا ردِّ عمل دیکھنے اور عوام کے خیالات کا اندازہ کرنے کے بعد بھی اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی نہ کی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی ناراضگی اور برہمی نے اُن کے اندر ضد پیدا کر دی، حالانکہ سیاست میں ضدم ضدا کی پالیسی ناتجربہ کاری کا ثبوت ہے، تجربہ کار لیڈر کسی قومی مسئلہ کو اپنی ذاتی فتح و شکست اور شخصی عزت و ذلت کا سبب قرار نہیں دیا کرتے۔ اور نہ تُنک مزاج عورتوں کی طرح ہٹ پر اُتر آتے ہیں کہ جو بات مُنہ سے نکل گئی ہے، چاہے زمین آسمان کیوں نہ ٹل جائیں وہ پُوری ہو کر رہے گی!

مسٹر شہید سہروردی پاکستان کے وہ پہلے وزیرِ اعظم ہیں۔ جن کی وزارت کا آغاز ہی پبلک کی برہمی و ناخوشی سے ہوا ہے! پاکستان کے عوام مسلمانوں کو سہروردی صاحب کی ذات سے کوئی کد نہیں ہے۔ اگر کد ہوتی تو جس دن صاحب موصوف نے قلمدانِ وزارت سنبھالا ہے اُسی دن اُن کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو سکتی تھی۔ پاکستان کے عوام مسلمانوں کو برہمی اور ناخوشی کی دعوت خود وزیرِ اعظم صاحب بہادر نے دی ہے! انہوں نے پبلک جلسوں میں "دو قومی نظریہ" کو چیلنج کر کے مخلوط انتخاب کی حمایت فرمائی ہے۔ یہ وہ ناوک تھا، جو مسلم عوام کے دلوں کو برماتا چلا گیا۔ وہ بے ساختہ درد سے چیخ اُٹھے کہ یہ اُن کی قومی غیرت کا سوال تھا!

مسلم عوام کی اس فریاد، واویلا اور احتجاج کا جواب سہروردی صاحب کی عوامی لیگ نے ہندو اور کمیونسٹ غنڈوں کی مدد سے ڈھاکہ کے جداگانہ انتخاب کے حامیوں کے جلسے میں جس طرح دیا ہے۔ وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ عوامی لیگ والے تو سب سے زیادہ اوچھے، اُتھلے اور کم ظرف نکلے اور ان حرکتوں پر اُتر آئے جو بازاری لوگوں کو زیب دیتی ہیں۔ بادۂ اقتدار کے دو چار چُلّوؤں ہی نے عوامی لیگ کو "بازاری لیگ" بنا دیا۔

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ نیشنل اسمبلی میں مشرقی پاکستان

کیلئے مخلوط انتخاب کی منظوری کی منحوس اور جگر خراش اطلاع ملی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

ناوک نے اُن کے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یہ ابتدا ہے تو پھر اسکی انتہا معلوم

اور یہ فیصلہ اس زمانہ میں ہوا ہے جبکہ پاکستان کا گوشہ گوشہ "جداگانہ انتخاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا ہے مخلوط انتخاب سے اس طرح عوام نفرت کر رہے ہیں جس طرح کوڑھ کی بیماری سے طبعی نفرت ہوتی ہے!

عوام کے اس قدر ملک گیر احتجاج اور اتنے عظیم الشان متفقہ مطالبہ کو وہی لوگ اتنی بے دردی اور سفاکی سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ جن کو اقتدار کے نشہ نے بالکل بےخود و سرشار بنا دیا ہو اور جو عواقب سے قطعاً بے پرواہوں۔ اور جن کو خود اعتمادی اور غلط فہمی کا مرض لاحق ہو گیا ہو کہ ہم طاقت کے بل پر جو بھی کر گزریں گے، ہمارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا!

تاریخ بتاتی ہے کہ وقت کے جابر غلط کاروں نے ہمیشہ اپنی طاقت کے گھمنڈ پر انسانیت کی بنیادی قدروں کو کچلا ہے۔ اور عوام کو مور و ملخ سمجھ کر روندا ہے۔ مگر اللہ کی دی ہوئی ڈھیل جب ختم ہو چکی ہے اور جب قدرت نے انہیں پکڑا ہے تو پھر بڑے بڑوں کی کبریائی (؟) کے تخت اوندھے ہو گئے ہیں اور بلندیاں آن کی آن میں خاک بسر ہو کر رہ گئی ہیں ؎

تجھ کو یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ "قرارداد مقاصد" کو بعض "منافقین" نے ایک المناک سانحہ کی طرح محسوس کیا تھا اور وہ اُس وقت سے اب تک اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہے کہ کسی طرح اسلامی دستور کا بنیا پانچہ ہو جائے اور یہ جو پاکستان پر "اسلامیہ جمہوریہ" کی چھاپ لگی ہوئی ہے یہ کسی عنوان باقی نہ رہے۔ "مخلوط انتخاب" کی تجویز کو منظور کرانے میں ان "منافقین" کا بہت کچھ ہاتھ ہے۔ قصر و ایوان میں لالچ اور دباؤ نے کیا پارٹ انجام دیا ہے؟ یہ اسرار جب بے نقاب ہوں گے تو دنیا دیکھ لے گی کہ ننگِ ملت کون تھا، ننگِ دین کون تھا اور ننگِ وطن کا لقب کسے زیب دیتا تھا؟

ری پبلکن پارٹی کے ارکان نے وعدہ شکنی، زمانہ سازی، جاہ پرستی، ملک و ملت سے بے وفائی اور کھلی ہوئی ضمیر فروشی کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے، اُسے توڑنے کے لئے ان جیسے بے ضمیر انسان شاید پھر پیدا نہ ہو سکیں! رہے ڈاکٹر خان صاحب، تو وہ ہر اس گٹھ جوڑ کا ساتھ دیں گے جس سے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہو۔ کیونکہ اُن کے ضمیر نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا!

چودھری محمد علی کے دورِ وزارت عظمیٰ میں مولاناؤں اور ملاؤں پر فقرہ بازی اور پھبتیاں بند رہیں مگر سہروردی صاحب جو اسلام پسندوں کے مقابلہ میں تمام سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا غالباً بیڑا اٹھا چکے ہیں، انہوں نے اس آگ کو پھر سے بھڑکایا ہے اور مولویوں اور مولاناؤں کے خلاف انہی پٹی ہوئی دلیلوں کو دہرایا ہے، جن میں اب کوئی وزن نہیں رہا۔ اور چشم بد دور! وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھتے ہی اسرارِ شریعت بھی آپ پر منکشف ہوگئے ہیں اور دینی مسائل میں اجتہاد کا منصب بھی آپ کو مل گیا ہے۔ شریعت کے بارے میں سہروردی صاحب نے اسمبلی میں جو کچھ کہا ہے وہ اتنا بڑا بول ہے جو اب تک کسی نے نہیں بولا۔ افسوس ہے کہ اقتدار کے نشہ میں "عزت مآب" اس قدر بے قابو ہوگئے ہیں کہ شریعت کے بارے میں انہوں نے اس قدر لغو اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ ڈالی ہیں جو اُن جیسے ذمہ دار اور اعلیٰ منصب کے حامل انسان کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ ؎

کم کن ز کبر و ناز کہ دیداست روزگار　　چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

جب سے پاکستان بنا ہے یہ پہلا سانحہ ہے کہ کمیونسٹ غنڈوں اور مہاسبھائی ہندوؤں کی یہ جرأت ہوئی ہے کہ انہوں نے اسلام پسند طبقہ کی کھلم کھلا اہانت و تضحیک کی ہے، اُن پر جارحانہ حملے کئے ہیں اور بھرے جلسے میں اُن کی ڈاڑھیاں نوچی ہیں۔ سہروردی صاحب پہلے وزیر اعظم ہیں جنہوں نے اُس "دو قومی نظریہ" کو باطل قرار دیا ہے، جس کی بنیاد پر ہندوستان تقسیم ہوا ہے اور پاکستان وجود میں آیا ہے۔ یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ اُن کی موجودہ سیاسی روش نے پاکستان میں اسلام پسند طبقہ کو نقصان پہنچایا ہے اور ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے مؤقف کو مستحکم بنا دیا ہے، ایسا وہ کیوں کر رہے ہیں؟ یہ تو وہی جانتے ہوں گے مگر ہم وہ کہہ رہے ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں اور یہ بات سب سے زیادہ خطرناک ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے مسلم عوام دست بردار نہیں ہوں گے، یہ تحریک جاری رہے گی۔ تو اس کے جواب میں سہروردی صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف برابر کی مہم شروع کرا دی جائے گی۔ ملک کے وزیر اعظم کے اور یہ خوفناک عزائم۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس ملک میں کیا ہونے والا ہے؟

مسٹر سہروردی نے اپنی جماعت — عوامی مسلم لیگ — کے نام سے لفظ "مسلم" نکال دیا، دوسرے ناموں کی طرح بھی انہیں لفظ "اسلام" کی نسبت پسند نہیں ہے۔ بہر حال یہ اُن کی ذاتی پسند اور شخصی رجحان کا معاملہ ہے مگر اپنی اس پسند اور ناپسند کو جو وہ دوسروں پر ڈنڈے کے زور سے مسلط کرنا چاہتے ہیں اس کا تو انہیں حق نہیں پہنچتا۔ اس پاکستان میں دس بیس لاکھ نہیں کروڑوں ایسے انسان بستے ہیں جو "مسلم"، "اسلام" اور "دین و شریعت" کی نسبتوں کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، جس کیلئے وہ اپنا گھر بار لٹا سکتے ہیں اور اپنے سر کٹا سکتے ہیں مگر ان مقدس نسبتوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے، اگر ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے بے غیرت مسلمان اس "شدھی" کو قبول کر لیتے ہیں تو اسکے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ عام مسلمان بھی "مسلم" اور "اسلام" کی نسبتوں کو چھوڑ کر لفظی اور اصطلاحی "ارتداد" گوارا کر لیں!

پچھلے بڑے لوگوں نے مہینوں اور برسوں میں پبلک کی برہمی کے جو حالات پیدا کئے ہیں سہروردی صاحب نے چند دنوں میں اُن سے بڑھ کر خراب حالات پیدا کر دیئے ہیں، اُن کی جرأت اور ذہانت کا یہ بڑا افسوسناک مظاہرہ ہے۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد اُن کے بولنے کا انداز اس قدر تحکمانہ ہوگیا ہے جیسے اُن کی زبان سے پولیس کی لاٹھیاں اور سنگینیں بول رہی ہیں!

سہروردی صاحب بیشک انگریزی قانون میں مہارت رکھتے ہیں اور وکالت اُن کا پیشہ اور ذریعہ معاش رہا ہے۔ مگر دین و شریعت میں جو اپنی ذہانت اور قانونی مہارت کی دخل در معقولات کی ذمہ داری وہ اپنے سر بلا وجہ لے رہے ہیں، یہ اُن کی ذہانت کا بیجا

کیلئے مخلوط انتخاب کی منظوری کی منحوس اور جگر خراش اطلاع ملی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

ناوک نے اُن کے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یہ ابتدا ہے تو پھر اسکی انتہا معلوم

اور یہ فیصلہ اس زمانہ میں ہوا ہے جبکہ پاکستان کا گوشہ گوشہ "جداگانہ انتخاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور مخلوط انتخاب سے اس طرح عوام نفرت کر رہے ہیں جس طرح کوڑھ کی بیماری سے طبعی نفرت ہوتی ہے!

عوام کے اس قدر ملک گیر احتجاج اور اتنے عظیم الشان متفقہ مطالبہ کو وہی لوگ اتنی بے دردی اور سفاکی سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ جن کو اقتدار کے نشہ نے بالکل بے خود و سرشار بنا دیا ہو اور جو عواقب سے قطعاً بے پروا ہوں۔ اور جن کو بے جا خود اعتمادی اور غلط فہمی کا مرض لاحق ہو گیا ہو کہ ہم طاقت کے بل پر جو بھی کر گزریں گے، ہمارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا!

تاریخ بتاتی ہے کہ وقت کے جابر غلط کاروں نے ہمیشہ اپنی طاقت کے گھمنڈ پر انسانیت کی بنیادی قدروں کو کچلا ہے۔ اور عوام کو مور و ملخ سمجھ کر روندا ہے۔ مگر اللہ کی دی ہوئی ڈھیل جب ختم ہو چکی ہے اور جب قدرت نے انھیں پکڑا ہے تو پھر بڑے بڑوں کی کبریائی دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تخت اوندھے ہو گئے ہیں اور بلندیاں آن کی آن میں خاک بسر ہو کر رہ گئی ہیں ؎

تجھ کو یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ "قرارداد مقاصد" کو بعض "منافقین" نے ایک المناک سانحہ کی طرح محسوس کیا تھا اور وہ اُس وقت سے اب تک اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہے کہ کسی طرح اسلامی دستور کا بیڑا پار نہ ہو جائے اور یہ جو پاکستان پر "اسلامیہ جمہوریہ" کی چھاپ لگی ہوئی ہے یہ کسی عنوان باقی نہ رہے۔ "مخلوط انتخاب" کی تجویز کو منظور کرانے میں ان "منافقین" کا بہت کچھ ہاتھ ہے قصر دا یوان میں لالچ اور دباؤ نے کیا پارٹ انجام دیا ہے؟ یہ اسرار جب بے نقاب ہوں گے تو دنیا دیکھ لے گی کہ ان میں ننگِ ملت کون تھا، ننگِ دین کون تھا اور ننگِ وطن کا لقب کسے زیب دیتا تھا؟

ری پبلکن پارٹی کے ارکان نے وعدہ شکنی، زمانہ سازی، جاہ پرستی، ملک و ملت سے بے وفائی اور کھلی ہوئی ضمیر فروشی کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے، اُسے توڑنے کے لئے ان جیسے بے ضمیر انسان شاید پھر پیدا نہ ہو سکیں! رہے ڈاکٹر خان صاحب، تو وہ ہر اُس گٹھ جوڑ کا ساتھ دیں گے جس سے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہو۔ کیونکہ

اُن کے ضمیر نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا!

چودھری محمد علی کے دور وزارت عظمیٰ میں مولاناؤں اور ملاؤں پر فقرہ بازی اور پھبتیاں بند رہیں مگر سہروردی صاحب جو اسلام پسندوں کے مقابلہ میں تمام سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا غائب بیڑا اٹھا چکے ہیں، انہوں نے اس آگ کو پھر سے بھڑکایا ہے اور مولویوں اور مولاناؤں کے خلاف انہی پٹی ہوئی دلیلوں کو دہرایا ہے، جن میں اب کوئی وزن نہیں رہا۔ اور چشم بد دور! وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھتے ہی اسرار شریعت بھی آپ پر منکشف ہو گئے ہیں اور دینی مسائل میں اجتہاد کا منصب بھی آپ کو مل گیا ہے۔ شریعت کے بارے میں سہروردی صاحب نے اسمبلی میں جو کچھ کہا ہے وہ اتنا بڑا بول ہے جو اب تک کسی نے نہیں بولا۔ افسوس ہے کہ اقتدار کے نشہ میں "عزت مآب" اس قدر بے قابو ہو گئے ہیں کہ شریعت کے بارے میں انہوں نے اس قدر لغو اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ ڈالی ہیں جو ان جیسے ذمہ دار اور اعلیٰ منصب کے حامل انسان کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ ؎

کم کن ز کبر و ناز کہ دیدا است بدنگا چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

جب سے پاکستان بنا ہے یہ پہلا سانحہ ہے کہ کمیونسٹ غنڈوں اور مہاسبھائی ہندوؤں کی یہ جرأت ہوئی ہے کہ انہوں نے اسلام پسند طبقہ کی کھلم کھلا اہانت و تضحیک کی ہے، ان پر جارحانہ حملے کئے ہیں اور بھرے جلسے میں ان کی ڈاڑھیاں نوچی ہیں سہروردی صاحب پہلے وزیر اعظم ہیں جنہوں نے اس "دو قومی نظریہ" کو باطل قرار دیا ہے۔ جس کی بنیاد پر ہندوستان تقسیم ہوا ہے اور پاکستان وجود میں آیا ہے۔ یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ سیاسی روش نے پاکستان میں اسلام پسند طبقہ کو نقصان پہنچایا ہے اور ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے مؤقف کو مستحکم بنا دیا ہے، ایسا وہ کیوں کر رہے ہیں؟ یہ تو وہی جانتے ہوں گے مگر ہم وہ کہہ رہے ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں اور یہ بات سب سے زیادہ خطرناک ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے مسلم عوام دست بردار نہیں ہوں گے، یہ تحریک جاری رہے گی۔ تو اس کے جواب میں سہروردی صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف برابر کی مہم شروع کرادی جائے گی۔ ملک کے وزیر اعظم کے اور یہ خوفناک عزائم اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس ملک میں کیا ہونے والا ہے؟

مسٹر سہروردی نے اپنی جماعت — عوامی مسلم لیگ — کے نام سے لفظ "مسلم" نکال دیا، دوسرے ناموں کے ساتھ بھی انہیں لفظ "اسلام" کی نسبت پسند نہیں ہے۔ بہرحال یہ ان کی ذاتی پسند اور شخصی رجحان کا معاملہ ہے مگر اپنی اس پسند اور ناپسند کو جو وہ دوسروں پر ڈنڈے کے زور سے مسلط کرنا چاہتے ہیں اس کا تو انہیں حق نہیں پہنچتا۔ اس پاکستان میں دس بیس لاکھ نہیں کروڑوں ایسے انسان بستے ہیں جو "مسلم"، "اسلام" اور "دین و شریعت" کی نسبتوں کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، جس کیلئے وہ اپنا گھر بار لٹا سکتے ہیں اور اپنے سر کٹا سکتے ہیں مگر ان مقدس نسبتوں کو نہیں چھوڑ سکتے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے، اگر ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے بے غیرت ارکان اس "شدھی" کو قبول کر لیتے ہیں تو اسکے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ عام مسلمان بھی "مسلم" اور "اسلام" کی نسبتوں کو چھوڑ کر لفظی اور اصطلاحی "ارتداد" گوارا کر لیں!

پچھلے بڑے لوگوں نے مہینوں اور برسوں میں پبلک کی برہمی کے جو حالات پیدا کئے ہیں سہروردی صاحب نے چند دنوں میں ان سے بڑھ کر خراب حالات پیدا کر دیئے ہیں، ان کی جرأت اور ذہانت کا یہ بڑا افسوسناک مظاہرہ ہے۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد ان کے بولنے کا انداز اس قدر تحکمانہ ہو گیا ہے جیسے ان کی زبان سے پولیس کی لاٹھیاں اور سنگینیں بول رہی ہیں!

سہروردی صاحب بیشک انگریزی قانون میں مہارت رکھتے ہیں اور وکالت ان کا پیشہ اور ذریعہ معاش رہا ہے۔ مگر دین و شریعت میں جو اپنی ذہانت اور قانونی مہارت کی دخل در معقولات کی ذمہ داری وہ اپنے سر بلا وجہ لے رہے ہیں، یہ ان کی ذہانت کا بے

ال ہو اس طرح وہ ذہنی انتشار تو پھیلا سکتے ہیں مگر دین و شریعت کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اور اُن کی "جرأت" جو کمیونسٹ مفسدوں
جو بھاشانی فتنہ کو میدان میں لے آئی ہے یہ بڑے خوفناک کھیل کا آغاز ہے !

آخری گزارش

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ انگریز کے زمانہ میں جو عوام اور حکومت کے درمیان تصادم ہوا کرتا تھا تو اس سے طبیعت کو مسرت ہوتی تھی مگر پاکستان میں عوام اور حکومت کے مابین ذرا سی بھی تلخی اور برہمی دیکھ کر دل کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اس راستے سے پاکستان کو برابر نقصان پہنچ رہا ہے، پاکستان میں اربابِ اقتدار اور عوام کے درمیان جو کشمکش اب تک برپا رہی ہے اور اسے ہمدردی احباب نے اس کو تیز کر دیا ہے، اُس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے حاکم عوام کی مرضی سے بے پرواہ کر اپنی چلتی چلانا چاہتے ہیں۔ اُن کو عوام کے جذبات، معتقدات، مطالبے اور تمنائیں رتی رتی بھر معلوم ہیں مگر پھر بھی وہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ طاقت کے زور پر یا ڈپلومیسی کے داؤں پیچ سے عوام پر اپنی مرضی کو مسلط کر دیں !

پاکستان میں اب تک عوام کو آئینی جدوجہد کے ذریعہ کامیابی ہوئی ہے اور اب بھی انشاء اللہ ہوگی، دوسروں کی اشتعال انگیزی اور غیر قانونی حرکتوں کے باوجود عوام مسلمانوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیئے جوش کیسا ہو ہوش کا رہنا ضروری ہے۔ فساد و انتشار کمیونسٹوں کے لیے ہیں، مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پاس بھی نہیں پھٹکنا چاہیئے!

عوام مسلمان حالات کی اس نئی کروٹ کو دیکھ کر بد دل اور پریشان نہ ہوں، ان جیالوں کی نوبت بھی بس کوئی دن کی بات ہے، انشاء اللہ سطح ہموار ہو جائیگی، حق کو ایک نہ ایک دن غالب آنا ہے۔ اس قسم کے اضطراب و برہمی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمانا چاہتا ہے کہ کس کے پاس اخلاق و ایمان کی کتنی قوت ہے اور حق و باطل کی کشمکش میں کون کیا پارٹ انجام دیتا ہے ؟

یہ حقیقت سورج کی روشنی اور چاند ستاروں کی چمک سے زیادہ روشن ہے کہ پاکستان کے سات کروڑ مسلمان پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں، اس لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ چند مٹھی بھر انسان اپنی مرضی طاقت کے زور سے سات کروڑ مسلمانوں پر مسلط کر دیں ! پاکستان میں اللہ کا قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی چلیگی، ناچ گھروں اور شراب خانوں سے جاری کئے گئے فرمانوں اور ہدایت ناموں کو پارہ پارہ کر دیا جائیگا کہ مسلمان اللہ اور رسولؐ کے منشور کا پابند ہے اور یہی اسکی زندگی کا مقصود اور غایت ہے !

آخر میں ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کی آئیڈیالوجی پر بنا ہے، اقتصاد و معیشت کی بنیاد پر نہیں بنا۔ اگر چیزوں کی قیمت کا سستا ہونا اور پوشاک و خوراک کے مسائل کا حل ہی مقصود تھا تو پھر متحدہ ہندوستان میں کیا برائی تھی، انسانی ضروریات کی فراہمی میں آسانیوں کا پیدا ہونا بہت اچھی بات ہے اور ہر فرض شناس حکومت کو یہ کام کرنا چاہیئے لیکن ان سہولتوں اور منفعتوں کیلئے مسلمان اپنے اسلامی نظریوں سے دست بردار نہیں ہو سکتا، مسلمان اپنے شکم کی سیرابی بیشک چاہتا ہے مگر ایمان کی قیمت پر نہیں ! مسلمان "بندۂ شکم" نہیں ہے، اُس نے اپنے معدہ سے نہیں بلکہ اللہ سے پیمانِ وفا باندھا ہے اور اس پیمان کے مقابلہ میں تمام دُنیا کی نعمتیں اُس کی نگاہ میں پرِ کاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں !

روٹی، کپڑا، مکان، روزگار ——— اسلام کے سایہ میں

یہ ہر مُسلمان کا مطالبہ اور اُس کی دلی تمنا ! دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دُنیوی منفعت بھی ایمان کی قیمت نہیں ہو سکتی، مسلمان کے اندر جب تک ایمانی احساس زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہیگا، اسوقت تک کسی طاقت، دھمکی اور چیلنج سے وہ مرعوب نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کی فراست کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، باطل چاہے کسی روپ اور بھیس میں کیوں نہ آئے مُسلمان کی فراست "اندازِ قد" ہی سے سب کچھ پہچان لیتی ہے کہ کون کیا ہے ؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم ساری دُنیا کو امن و اخلاق اور صلح و آشتی سے معمور کر دیں۔ یہاں تک کہ اللہ کی زمین اُس کے نور سے جگمگانے لگے۔ (آمین !)

ماہر القادری ۳۰ / اکتوبر ۵۶ء

مولانا محمد یعقوب (لائلپور)

مناظرہ بازی

فن مناظرہ کی مشہور عربی کتاب (رشیدیہ) میں مناظرہ کی غرض وغایت اور شرائط مناظرہ پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے — دورِ حاضر کے مناظرہ باز حضرات بوقت مناظرہ ان شرائط کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھتے۔ بلکہ آجکل کے فنی مناظرین مناظرہ کی بجائے مشاجرہ و مخاصمہ کرتے ہیں۔ مناظرہ کے دوران شرافت ومتانت وسنجیدگی ان سے کوسوں دور ہو جاتی ہے۔ جب ایک فریق اپنی شکست محسوس کرتا ہے تو وہ اپنی خفت وندامت کو مٹانے کے لئے مقابل مناظر پر طرح طرح کے الزام اور تہمتیں لگا دیتا ہے۔

اب میں مذکورہ بالا کتاب سے مناظرہ کی تعریف، غرض وغایت اور شرائط تحریر کرکے فیصلہ قارئین کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

تعریف مناظرہ:۔ هو علم يعرف به كيفية آداب اثبات المطلوب او نفيه او نفي دليله مع الباحث الخاصم۔ یعنی مناظرہ ایک ایسا علم ہے جو مطلوب کے اثبات ونفی اور مدمقابل مخاصم کے دلائل کی تردید کے طور وطریق پر سکھاتا ہے۔

مقصد مناظرہ:۔ اظهاراً للصواب ان يكون نية المناظر من المناظرة اظهار الصواب وان لم يظهر عصبية۔ یعنی مناظرہ کا مقصد حق کو ظاہر وغالب کرنا ہے یعنی مناظر کا ارادہ یہ ہو کہ حق اور صحیح بات ظاہر ہو اور غلط اور باطل مٹ جائے۔ دلائل وبراہین میں دیانت سے کام لیا جائے۔ استنباط واستدلال کا صحیح اور معقول طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر مخالف حق پیش کر رہا ہو اور اس کے دلائل بھی وزنی ہوں تو پھر تعصب کو بالائے طاق رکھ کر قبول حق میں تاخیر نہ کی جائے اور عین مناظرہ کے دوران اپنے دعاوی سے رجوع کرکے فریق ثانی کے دعاوی کے تسلیم کر لینے کا پوری جرأت وہمت کے ساتھ کھلا اعلان کر دیا جائے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ آجکل کا مناظر خواہ کسی قدر حق پرست، متقی، پرہیزگار، با اخلاق اور نیک نیت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر۔ ایسی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ تو وہ فریق ثانی کے مناظر کی پیش کردہ صحیح سے صحیح اور سچی سے سچی دلیل کو نخوت واستکبار کے ساتھ ٹھکرا دے گا۔

شرائط مناظرہ:۔ الاول انه يجب على المناظر ان يحترز عن الاختصار في الكلام عند المناظرة كيلا يخل بالفهم۔ یعنی مناظر پر لازم ہے کہ مناظرہ کرتے وقت مختصر کلام سے اجتناب کرے اپنے مطلب ومدعا کو اچھی طرح پبلک پر واضح کر

والثاني:۔ ان يحترز عن التطويل لئلا يؤدي الى الاملال۔ دوسری شرط یہ ہے کہ لمبی تقریر بھی نہ کرے تاکہ سامعین اکتا نہ جائیں۔

الثالث:۔ ان لا يستعمل الالفاظ الغريبة۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اجنبی اور غیر مانوس الفاظ استعمال نہ کرے بلکہ عام فہم اور سادہ ودلنشین الفاظ کے ساتھ مطلب بیان کرے۔

الرابع:۔ ان لا يستعمل المجمل المحتمل للمعنيين بلا قرينة معينة للمراد۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ تقریر میں ایسے

جملے قطعاً نہ استعمال کرے جو ذو معنی ہوں یعنی جن جملوں کے کئی معنی مراد لئے جا سکتے ہوں۔ ہاں البتہ ایسا جملہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو جو اس کے مفہوم کو واضح کر دے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

والخامس:۔ ان یحترز عما لا دخل لہ فی المقصود ولئلا یخرج الکلام عن الضبط ولئلا یلزم البعد عن المطلوب۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ مناظر غیر متعلق کلام نہ کرے یعنی ایسا کلام نہ کرے جو اس کو مقصود و مطلوب سے بہت دور پھینک دے اور جس کا دعوے کے ساتھ کوئی قریب و بعید کا تعلق بھی نہ ہو۔

والسادس:۔ ان لا یضحک ولا یرفع الصوت ولا یتکلم بکلام السفہاء عند المناظرۃ لانہا من صفات الجہال وو ظائفہم لانہم یستیرون بہا جہلہم۔

چھٹی شرط:۔ مناظر کو دوران مناظرہ ہنسنا نہیں چاہئے اور نہ بلند آواز سے تقریر کرے۔ مناظرہ کرنے وقت کوئی خلاف عقل بات منہ سے نہ نکالے۔ بیوقوفوں کی حرکات و عادات سے پرہیز کرے کیونکہ یہ جاہلوں کی صفات ہیں اور ان جیسی حرکات سے وہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ طنز و استہزاء جاہل لوگوں کا شیوہ ہے۔

یہ شرط تو تقریباً تمام مناظر حضرات میں مفقود ہے۔ ہر مناظر اپنے مقابل کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے برسر مجلس تمسخر کا استہزاء کرتا ہے۔ بعض لوگ ان حرکات مذبوحی کو ظرافت و خوش طبعی اور حاضر جوابی پر محمول کرتے ہیں۔ الغرض ان مذکورہ بالا شرائط میں سے کسی ایک شرط پر بھی عمل نہیں کیا جاتا۔ تعلی و تفاخر و مسابقت مناظر حضرات کا عام شیوہ بن گیا ہے۔

حالانکہ اسی کتاب کے آخری صفحہ پر مناظر کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ بوقت مناظرہ درویشانہ و فقیرانہ صورت و ہیئت بنا کر بیٹھے نہ کہ امیرانہ و متکبرانہ شان و شوکت کے ساتھ۔ کیونکہ تواضع و انکسار پر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید شامل حال ہوتی ہے۔ اپنے سے زیادہ صاحب علم سے مناظرہ کا تصور بھی نہ کرے اور نہ کسی کو مناظرہ کے لئے چیلنج دے۔ کیونکہ اس مشغلہ میں تعمیری پہلو کی بجائے تخریبی پہلو نمایاں ہے۔ تعمیری اور اصلاحی کام کرنے والے مناظرہ بازی سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اور اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔

مناظرہ کا مشغلہ دراصل ذہنی عیاشی ہے۔ جسے عباسی خلفاء نے اپنایا۔ عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی عیسائی، ہر فرقہ اور ہر ملت کے افراد علماء موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلیس منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفہ خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ نہایت آزادی و بے باکی اور دلیری سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔ بنوامیہ کے زمانہ تک یہ مباحثے اور مناظرے مسلمانوں میں محدود رہے۔ لیکن عباسیوں کے عہد میں یہ دائرہ اور وسیع ہوا۔ عباسیہ کے زمانہ میں تعلیم کو نہایت وسعت ہوگئی۔ مجوسی، یہودی، عیسائی وغیرہ اسلامی درس گاہوں میں علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اس وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی خیالات و اعتقادات سے واقف ہونے کا انہیں موقع ملتا تھا۔ اس کے ساتھ عباسیوں نے لوگوں کو مذہبی آزادی بھی دے رکھی تھی۔ ہر شخص جو چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ اس طرح دوسری قوموں کو موقع ملا کہ لوگوں میں الحاد و زندقہ پھیلائیں اور اسلامی عقائد پر ردّ و قدح کریں۔ چنانچہ اس دور میں اسلامی اصول و عقائد پر شبہات و اعتراضات شروع ہو گئے۔ اہل اسلام کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے غیر مسلم اقوام کے رہنماؤں اور مناظرہ بازوں نے باقاعدہ منظم مہم جاری کر دی۔ اب خلفائے عباسیہ کو ہوش آیا۔ غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے۔ اسلام پر پُر زور حملوں کی

مدافعت کے لئے زمانہ کے مشہور ترین علماء فضلاء کو جمع کیا اور انھیں جوابات لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ علمائے دین نے خلوصِ نیت اور مقدس ارادہ کے ساتھ بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں مخالفین کے شبہات کا عقلی و نقلی دلائل سے مدلل و معقول طرز سے رد کیا گیا۔

یہ تو تحریری مناظرے تھے۔ بعد ازاں تقریری مناظرے بھی شروع ہو گئے۔ اُس وقت کے حالات اس فن کے متقاضی تھے۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں سکوت کی پالیسی اسلام کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ منطق و فلسفہ کو بھی عروج نصیب ہو رہا تھا۔ منطقی طرز استدلال کا رواج روز افزوں ترقی پر تھا۔ مگر افسوس کہ یہ اسلحہ جو اغیار کے لئے ایجاد ہوا تھا اب اپنوں پر استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مسلمان متعدد فرقوں میں بٹ گئے اور ہر فرقہ نے دوسرے فرقہ کو ضال و مضل کہنا شروع کر دیا۔ پھر اپنے عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک دوسرے کو چیلنج دیئے گئے۔ سنجیدگی و متانت غائب ہوتی گئی۔ جدال و مخاصمت نے زور پکڑ لیا۔ برسر بازار ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی گئی۔ اور یہ افہام و تفہیم رفتہ رفتہ محبادلہ اور مخاصمہ بن گئی۔

علمی دُنیا میں نظریوں کا اختلافات اور پھر اُس اختلاف پر فریقین کا گفتگو کرنا کوئی بے جا بات نہیں ہے۔ اگر مقصد احقاقِ حق ہو تو پھر اس قسم کے مناظرے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں اور بہت سے مسائل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہو یہ رہا ہے کہ لوگ اپنی بات کی پچ کے لئے وزنی سے وزنی دلیلوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور کتاب و سنت تک سے اعراض برتنے میں انھیں باک نہیں ہوتا۔ اس قسم کے مناظروں سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے! مناظرہ کرنے والے جب پہلوانوں کی طرح اکھاڑے میں اُترنے لگیں تو پھر ان کشتیوں کا انجام معلوم!!

ماہر القادری

حرفِ آخر

نئے رسالوں اور کتابوں پر "فاران" میں جس طرح تبصرہ ہوا کرتا ہے، اسی طرح نو مولود ماہنامہ "تاج" پر بھی ماہ جون کے شمارے میں ریویو کیا گیا تھا اور اس رسالہ کے ان مضامین پر جو دینی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض تھے نرم سے نرم لفظوں میں گرفت کی گئی تھی۔ احتساب ماہنامہ تاج کی مندرجہ ذیل عبارتوں پر تھا:۔

(۱) "...... افسوس اور کمال افسوس ہے کہ علماء کبار نے شرق سے لے کر غرب تک، سلف سے لے کر خلف تک، کیا محدث، کیا مفسر، کیا مجتہد، کیا متکلمین، کیا متفقہین، سب نے کلمہ طیبہ کی اس... مقام سے تحریف کر ڈالی اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف لوٹا دیا۔ پس انہوں نے لا الٰہ الّا اللہ کہہ کر شرک سے بچایا اور لا الٰہ غیر اللہ کا اعتقاد رکھ کر دل سے شرک کیا اور نہ جانا کہ یہ غیریت اور تفرقہ کہ جس کے وہ معتقد ہیں "لا الٰہ الّا اللہ" کے مخالف ہے"۔

اس عبارت کی رُو سے سلف سے لے کر خلف تک کے تمام علماء، کیا محدثین، کیا مفسرین اور محدثین، کیا مجتہدین اور ائمہ فقہ، سب کے سب (خاک بدہن گستاخ) ارتکابِ شرک کے مجرم اور کلمہ کے محرفین قرار پاتے ہیں۔ اس عبارت میں کوئی ایچ پیچ بھی نہیں ہے۔ اور یہ اس قسم کے الفاظ ہیں کہ کسی کے دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف ہوگا تو وہ ان لغو اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ لفظوں کی "تاویل کرنے کی بجائے ان سے اپنی برأت اور بیزاری ظاہر کرے گا، اس قسم کے ہذیانات کی "تاویل" بناء فاسد علی الفاسد" کا مصداق ہوگی۔ مگر ماہنامہ "تاج" کے مدیرِ اعلیٰ نے جو اپنے رسالہ کو "اردو زبان میں تصوف اسلام کا پہلا ترجمان" کہتے ہیں اور خود بھی معارف و اسرار کی عقدہ کشائی کے دعویدار ہیں۔ اس لغو عبارت کی تاویل فرمائی۔ بلکہ اُسے درست قرار دیا۔

اور پھر حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ جو خدا کے نیک بندے توحیدِ خالص کے مبلغ و منّاد ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مشکل کشا ہے نہ فریاد رس ہے اور نہ داتا اور غریب پرور ہے، اُن پر اولیاء اللہ کی "معادات" کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ مگر اس کے برخلاف جو خلف سے لے کر سلف تک کے تمام محدثین، مفسرین اور ائمہ فقہ کو کلمہ کا محرف اور مرتکبِ شرک قرار دے کر اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت کی کھلی ہوئی توہین کرتے ہیں ان کو "عالمِ ربانی" اور "قطبِ عالم" سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے عقائد کو ملفوظات کو کشف و الفت و کو دین کی بہت بڑی خدمت قرار دے کر "احسان" کی تفسیر کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔

جو لوگ اس قسم کے لطائف و شطحیات میں اُلجھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اس قسم کے انتہائی خطرناک نکات

اور غیر ذمہ دارانہ شورغ افکار کی تبلیغ کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہو تو وہ اللہ کے دین اور کتاب و سنت کے ساتھ جو سلوک بھی کر گزریں تھوڑا ہے

(۲) " وہ خدائے پاک ذات ہی ہے جو مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے۔ اور جو فرائض و واجبات حقوق الٰہیہ کی صورت میں مخلوق پر متعین فرماتے ہیں وہ اپنے آپ پر ہی متعین فرماتے ہیں۔" (فتوحات مکیہ)

اس پر فاران میں یہ تبصرہ کیا گیا تھا۔

" ان جملوں کی خطرناکی کی بھی کوئی انتہا ہے! اگر یہ "حقائق و اسرار" ہیں اور کشف و وجدان کی نزاکتیں ہیں تو کیا اس طرح ان کا افشا مناسب ہے؟" (فاران۔ ماہ جون ۵۶ء)

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ " وہ مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے "۔ کیا اس سے " حلول و تجسیم " کی بو نہیں آتی۔ کیا اس قسم کی فکر و وجدان کی شوخیاں اسلامی فکر کی سادگی سے مطابقت رکھتی ہیں؟ ایسی باتوں سے اس کے سوا اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوں اور عبد و معبود کے درمیان جو عبدیت کا تعلق ہے، اس پر آنچ آئے۔

تصوف کی کتابوں میں سے اس قماش کی خطرناک عبارتوں کو چھانٹ چھانٹ کر عوام کے سامنے پیش کرنا کیا صلاح کا موجب ہوگا یا فساد کا؟ اگر اس قسم کے شطحیات کو بفرض محال " اسرار و غوامض " ہی سمجھ لیا جائے تو عوام کیا اس کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ خود ماہ اگست کے " تاج " میں صفحہ ۴۴۔ اور ۴۵ پر یہ عبارت ہمیں ملتی ہے۔

" حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کہ میں اس آیت کی تفسیر بیان کروں تو مجھے تم کافر کہوگے یا سنگسار کردوگے۔ یہ قول بھی اس امر کا مؤید ہے کہ عوام اسرار و معارف کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ... "

جب حضرت ابن عباسؓ کے زمانہ کے عام جن میں تابعین بھی شامل تھے " اسرار و معارف " قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ نے " اسرار و معارف " کے افشار کو مصلحت کے خلاف سمجھا تو کیا چودھویں صدی ہجری کے عوام میں اس کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ " اسرار و معارف " کو سمجھ سکیں۔ حالانکہ حضرت ابن عباسؓ کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہدت بالکل متصل تھا۔ اس دور کے خیر و برکت اور دینی فہم کا کیا کہنا۔ اس دور کے عوام ہمارے خواص سے بہتر تھے اور ہمارے زمانہ میں تو فتنے گھاس کی طرح اگ رہے ہیں اور عوام " کالانعام " ہو گئے ہیں! " اسرار و غوامض " کے افشار کے لئے یہ دور کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس سے نقصان ہی نقصان پہنچے گا!

رسالہ " تاج " تصوفِ اسلام کے نام پر جس خطرناک تعلیم کا مبلغ و ناشر بن کر منظر عام پر آیا ہے۔ وہ نہ دین کی کوئی ضرورت ہے اور نہ دنیا کا اس سے کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ اس تعلیم و تلقین میں خطرناک قسم کی الجھنیں اور وسوسے پیدا کرنے والے رموز و ابہام ہیں۔ رسالہ " تاج " کا حال اس طبیب کا سا ہے جو مریضوں کا علاج سنکھیا اور کچلے سے گھٹ کر کسی دوا سے کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہا پسندانہ طریق علاج مریضوں کے حق میں مضرت رساں اور خطرناک ہی ثابت ہوگا۔ اور اس مریض کی نادانی پر ہر انسان کو ترس آئے گا جو اپنے کو ایسے خطرناک اور انتہا پسند طبیب کے حوالے کر دے

(۴)، ماہ جون کے " فاران " میں بابا تاج الدین ناگپوری کو " شہنشاہ ہفت اقلیم " کہنے پر بھی گرفت کی گئی تھی کہ

ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان کو بھی "بادشاہوں کا بادشاہ" کہنے کی ممانعت فرمائی ہے!
عقیدت کا یہی وہ غلو ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیرایہ میں روکا ہے :-
"مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو"
صحابہ کرام سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی اور عقیدت مند اور کون ہو سکتا ہے انہوں (رضی اللہ
م) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مالکِ دوجہاں" اور "شہنشاہ کونین" جیسے غیر محتاط القاب سے نہ رسول اللہ کی
ت میں حضورؐ کو مخاطب کیا اور نہ وفات کے بعد !
کسی پیر، فقیر یا عالم کو "شہنشاہ ہفت اقلیم" کہنا اسلام کی تعلیم کے مزاج کے خلاف ہے ! یہ "لقب" اپنی تفصیلات
اکر ان گمراہ عقائد تک پہنچتا ہے کہ فلاں بزرگ کا ہفت اقلیم میں حکم چلتا ہے اور وہ مرنے کے بعد لوگوں کی فریاد سنتے
ر حاجت روائی کرتے ہیں !
عقیدت کے اس غلو کی کم سے کم مضرت یہ ہے کہ بعض لوگ انبیاء کرام اور صحابہ عظام کے اسمائے گرامی کے ساتھ تو "حضرت"
ہیں مگر اپنے بزرگوں کو "اعلیٰ حضرت" کہتے ہیں - یہی عقیدت کا غلو تھا جس نے خدا کے بندے مسیح (علیہ السلام) کو
"اللہ" بنا ڈالا - اور بادشاہوں کو مالکِ رقابِ امم اور قادرِ قدرت کا لقب دیا گیا !
۵) "....... (بابا تاج الدین ناگپوری نے) جُبہ مبارک اُتار دیا اور ہماری طرف پھینک کر فرمایا :-
"لے تیری شریعت تجھے مبارک"
اور
۶) "ایک روز فرمایا بتاؤ بابا کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ ہم کو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا
نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے ؟ میں نے عرض کیا - "پیر خبیر کہاں مجھے حاجت خبر کی ہے" فرمایا - کوئی ولی
قوسِ ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک جناب سیدہ اس کی تربیت نہ فرمائیں - "......
قوسِ ولایت میں بابا کی تربیت جناب سیدہ نے فرمائی تو آپ مرتبہ ولایت پر فائز ہوئے ....."
ن عبارتوں پر بھی "فاران" میں تنقید کی گئی تھی - ہم اہلِ فکر و نظر کے انصاف سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان عبارتوں
، اور پھر فیصلہ فرمائیں کہ یہ اقتباسات قابلِ گرفت ہیں یا نہیں ہیں !
ہنامہ "تاج" کے مدیر اعلیٰ نے ان اقتباسات میں سے کسی ایک اقتباس کی مضرت یا کم سے کم اُن کی بے احتیاطی
یں کیا - بلکہ ان کی وہ وہ تاویلیں کیں اور ایسے ایسے عجیب و غریب معنی پہنائے کہ شرح و تفصیل میں جا کر ان
ں کی سیاہی پھیکی پڑنے کے بجائے اور پھیلتی اور گہری ہوتی چلی گئی !
برائی ، ہر لغزش اور ہر فاسد عقیدہ کی تاویل کی جا سکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے - کونسا گمراہ عقیدہ ایسا ہے
ے کتاب و سنت سے دلیلیں نہ لائی گئی ہوں - ! قادیانی جو تمام مسلمانوں کے نزدیک بالاتفاق کافر اور خارج از
، وہ تک اپنے فاسد عقائد کے لئے قرآن و حدیث ہی سے دلیلیں لاتے ہیں - اور شیخ محی الدین ابن عربی اور
سم نانوتوی کی تحریریں اپنے موقف کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں - جس قرآن سے لوگوں نے "تجسیم" ثابت
سے "وحدت الوجود" کے لئے بھی دلیلیں مہیا کی جا سکتی ہیں - اور کی گئی ہیں - مگر اُن کا وزن کیا ہے ؟ -

اب رہا مخصوص عقاید کا پھیل جانا اور چل پڑنا تو اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ اور فرید کو بہت بڑا آدمی بلکہ اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ اور ان تمام گمراہیوں کے لئے طرح طرح کی تاویلیں، نکتہ آفرینیاں اور دلیلیں یہ لوگ رکھتے ہیں! مسلمانوں کی کس بدعت اور مشرکانہ رسم کے لئے دلیلیں نہیں تراشی گئیں۔ اور ان کو کتاب وسنت کے مطابق ثابت نہیں کیا گیا!

اندازِ فکر

ماہ ستمبر کا ماہنامہ "تاج" ہمارے سامنے ہے جس میں "فاران" کے تبصرہ پر بڑے پُرجوش انداز میں پھر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے سرنامہ پر اقبال کا یہ شعر درج ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس شعر کی لفظی صنعت اور معنوی محاسن اپنی جگہ مسلّم! لیکن اس مقالہ میں جو مضامین پیش فرمائے گئے ہیں اور جیسی جیسی تاویلیں کی گئی ہیں۔ ان کے لحاظ سے یہ شعر اس مقالہ کے ساتھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ افسوس!

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی! (وحید مظہری)

اس مقالہ میں کہیں "صالح ادب" پر چوٹیں ہیں۔ کہیں مولانا مودودی پر طنز و تعریض ہے۔ کسی جگہ "مدیر فاران" کی تبدیلیٔ عقاید پر پھبتیاں ہیں۔! ...... عفاک اللہ نکو گفتی"! میں ذہین صاحب کو یہ تفصیل کس طرح بتاؤں کہ عرس و مزار اور پیر پرستی کے نام پر جو جو کھیل تماشے اور بدعتیں ہو رہی ہیں، میں نے ایک زمانہ میں ان سب کا جائزہ لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ میری نادانیوں کو معاف فرمائے، میں خود ان میں مبتلا رہا ہوں۔ لیکن جب کتاب وسنت اور آثار و باقیات[1] کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ میں ایک بڑی تاریکی میں تھا۔ ان میں کی بہت سی رسمیں تری بدعتیں ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حال سیرت کی کتابوں میں پڑھا سادہ اس میں یہ کہیں نظر نہیں آیا۔ کہ صحابہؓ نے آپ کا تیجا، دسواں یا چالیسواں کیا ہو۔ یا کھانے پر حضورؐ کے نام کی فاتحہ دلوائی ہو۔ یا مزارِ مبارک پر پھولوں کی چادریں چڑھائی ہوں یا بارہ ربیع الاول کو صحابہ نجد و حجاز اور یمامہ و یمن سے چل چل کر حضورؐ کے عرس میں شرکت کے لئے آتے ہوں اور قبر اقدس کے سامنے لوگ دف اور نفیری بجا بجا کر نعتیہ اشعار گاتے ہوں اور رقص کرتے ہوں۔ اس کے بعد دوسری باتوں کا تفحص کیا اور کھوج لگایا تو حقیقتِ حال واضح ہوتی چلی گئی کہ کیا اصل ہے اور کیا اس پر زیادتی ہے!

میں اللہ کے فضل و کرم پر اعتماد کر کے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مشرکانہ رسموں اور بدعتوں میں سے اگر کوئی ایک بدعت کی اصل حقیقت کا پتہ لگانے پر اپنا وقت صرف کرے تو نفسِ حقیقت کا انکشاف ہو کر رہے گا۔ اور یہ ایک ہی گرہ دوسری گرہوں کو بھی کھول دے گی۔ اس حقیقت کے انکشاف سے اہلِ بدعت کے استدلال، طرزِ فکر اور ذوق و وجدان کھل کر سامنے آجائیں۔

اہلِ بدعت کا یہ عجیب اندازِ فکر ہے کہ جہاں کسی نے کہا کہ "من دون اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا، کسی غیر سے چاہے وہ انبیاء و اولیاء ہی کیوں نہ ہوں، استعانت اور استغاثہ کی اللہ نے ممانعت فرمائی ہے۔ تو وہ جھٹ سے اعتراض جڑ دیتے

---

[1] تابعین کرام کے اقوال و افعال کے لئے میں یہ لفظ "باقیات" استعمال کرتا ہوں۔

ہیں کہ یہ شخص بڑا ہی منہ زور اور گستاخ ہے کہ اس نے پتھر کے بتوں مورتیوں اور دوسرے انسانوں کے درجہ میں انبیاء و اولیاءکو لاکر رکھدیا۔ اور اسی قیاس پر وہ عجیب عجیب عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ چونکہ...... لہذا...... پس یہ ثابت ہوا...... !

حدیث بتاتی ہے کہ شیطان آدمی کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ تو کیا اس حدیث کی بنا پر یہ اعتقاد بھی رکھنا چاہیئے کہ اولیاء اللہ بھی انسانوں کے جسموں میں خون کی طرح گردش کرتے ہیں اور جو کوئی یہ اعتقاد نہیں رکھتا وہ اولیاء اللہ کو شیطان سے بھی کمتر سمجھتا ہے، اس لئے "معاندات اولیاء" کا مرتکب ہے پس وہ گمراہ اور راندۂ درگاہ ہے! یہ کیا انداز فکر ہے ؟

آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ مگر وہ دریائی جانوروں کی طرح سمندر اور دریا میں نہیں رہ سکتا۔ تو انسان کے مخلوقات پر اشرف ہونے کے وصف کو ثابت کرنے کے لئے کیا اس کا ماننا بھی ضروری ہے کہ اس میں دریائی جانوروں کی قدرت بھی ثابت کی جائے یا اس میں لازماً یہ قدرت ہونی ہی چاہیئے اور جو کوئی انسان میں اس قدرت کو نہ مانے وہ انسان کے رتبہ کو گھٹاتا ہے اسے مچھلیوں اور مگرمچھوں سے بھی کمتر سمجھتا ہے !

آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ مگر ہاتھی اور اونٹ اور گھوڑے کی برابر جسامت نہیں رکھتا۔ پرندوں کی مانند ہوا میں نہیں اُڑ سکتا۔ ہرن کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتا۔ تو کیا انسان میں یہ مادی اوصاف نہ پائے جانے سے اس کے شرف میں کوئی کمی آجاتی ہے؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہ شرف تمام محاسن و اوصاف پر بھاری ہے !

ہدہد ملک سبا کی خبر لے کر آتا ہے اور کہتا ہے۔

"فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ" (النمل)

کہا، میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ جس کی تجھ کو اس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لے کر

ہدہد کا سلیمان علیہ السلام سے یہ کہنا کہ "میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی"۔ کیا اس سے خدانخواستہ حضرت سلیمانؑ نبی پر ہدہد کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ اولیاء اللہ تمام کائنات کے احوال کی خبر اور تمام مقامات پر نظر رکھتے ہیں۔ ان پر قرآن کا یہ بیان گراں گزرے گا !

یہ سوچنے کا انداز ہی غیر اسلامی ہے کہ فلاں مخلوق میں یہ قوت پائی جاتی ہے تو انسان میں بھی اس قوت کا پایا جانا لازمی ہے۔ ورنہ انسان اس مخلوق سے کمتر سمجھا جائے گا۔ یا حضرت میکائیل علیہ السلام رزق کا پیمانہ رکھتے ہیں۔ تو انبیاء کرام جو فرشتوں سے بھی افضل ہیں، ان کو بھی رزق کے بندوبست اور تقسیم پر دسترس ہونی چاہیئے۔ اور جو کوئی انبیاء کرام کی یہ قدرت اور صفت تسلیم نہ کرے گا وہ ان کی شان گھٹانے کا مجرم ہوگا۔ اس انداز کی منطق یونان و روما کے اہل دانش اور بھارت کے گیانیوں اور بدھ مانوں کی ہو تو ہو مگر اسلامی مفکرین نے ان مسائل کو اس طرح نہیں سوچا !

خطرناک اندازِ بیان

"ھوالاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم"

اس آیت سے جو حضرات "وحدت الوجود" ثابت کرتے ہیں اور پھر یہ نظریہ ان کو اس حد تک پہنچا دیتا ہے:۔

"وہ خدائے پاک کی ذات ہی ہے جو مخلوق کی صورت میں جب چاہتا ہے، اپنی اطاعت آپ ہی کرتا ہے اور جو فرائض و واجبات حقوق الٰہیہ کی صورت میں

مخلوق پر متعین فرمائے ہیں وہ اپنے آپ ہی متعین فرماتے ہیں" (رسالہ تاج "اردو ترجمہ فتوحات مکیہ)

اس پر نظر کرتے ہوئے ایک شخص جو "وحدت الوجود" کو دین کا مسئلہ نہیں سمجھتا، "وحدت الوجود" کی خطرناکیوں کو ذہن میں رکھ کر اس آیت کا ان لفظوں میں مطلب بیان کرے:-

"اللہ تعالیٰ کی ذات ہی (ہر) اول و آخر اور (ہر) ظاہر و باطن کی خالق و رب ہے۔"

تو اس میں الحاد و زندقہ کی کیا بات ہے؟ مسلہ جیاالحاج مختار جس : کا نظریہ ہے، اس کی خطرناکی اور پیچیدگی اور اس "مطلب" کی سادگی کا ناظرین مقابلہ کرسکتے ہیں۔

ہم نے اپنے مضمون میں اس آیت کے اس ترجمہ:-

"وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔"

کی صحت سے خدا نخواستہ انکار نہیں کیا؟ ہمارا اس آیت پر اسی طرح ایمان ہے، جس طرح یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ اُن آیتوں میں سے ہے جس کے الفاظ معلوم ہیں مگر اس کی کیفیت مجمل ہے، مکشوف نہیں ہے۔

جبر و قدر کا مسئلہ کتنا نازک ہے، اس کی تفصیلات نے کس قدر پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں۔ صحابہ کرام ان مسائل میں نہیں الجھتے تھے۔ مگر جب جبر و قدر کی بحث کا ہنگامہ برپا ہوا تو بندہ کے فعل میں "خلق" و "کسب" کا امتیاز قائم کیا گیا۔ یعنی یہ کہ بندہ کے فعل کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر کاسب بندہ ہے اور اسی "کسب" پر اُسے جزاء و سزا ملے گی! جو لوگ "جبریین" تھے وہ اس انتہا تک پہنچ گئے تھے کہ کائنات میں محض جبر ہی جبر ہے اور بندہ سے کسی اختیار و تکلیف کی نسبت ہی درست نہیں۔ تو اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے "خلق" و "کسب" کا تعین کیا گیا تھا۔

نظریہ "وحدت الوجود" کی خطرناکیوں کے پیش نظر ہم نے اس آیت (ھوالاول ..... والاخر .....) کا جو مطلب بیان کیا تھا، اس کی شرح یہ ہے۔ کہ بندہ ایک کام کا آغاز کرتا ہے تو اس آغاز کا اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالاول" ہے اور جب کام ختم ہو جاتا ہے تو اس کے "آخر و اختتام" کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کی صفت خلق و ربوبیت سے ہے۔ اُس اللہ سے جو "ھوالآخر" ہے اور آغاز سے اختتام تک کوئی مرحلہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر "شے" کے ظاہر کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالظاھر" ہے اور اس "شے" کے باطن کا بھی اللہ تعالیٰ خالق و رب ہے۔ وہ اللہ جو "ھوالباطن" ہے۔ ہر شے کے اوّل و آخر اور ہر شے کے ظاہر و باطن کا اللہ تعالیٰ کو خالق کس آیت اور کس حدیث کے مخالف ہے! یہ ارض و سمٰوات اللہ تعالیٰ نے خلق فرمائے ہیں۔ تو جب بھی یہ عدم سے وجود میں آئے ہیں وہی ان کا "آغاز و اوّل" ہے اور اس کا خالق اللہ کے سوا کون ہے۔ ہر شے کے اوّل و آخر اور ظہور و خفا کا اللہ کی صفت خلق و ربوبیت اور شان تسخیر و احاطہ ہی سے تعلق ہے کہ وہی "علیٰ کل شیٔ" ــــ "قدیر و محیط" اور "بکل شیٔ علیم" ہے! اور کائنات کے اول و آغاز کا اللہ تعالیٰ کو "خالق" ماننے سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اپنا خالق ہے، اسی طرح سے آخر، باطن اور ظاہر کی سادہ جزئیات پر غور کیا جا سکتا ہے:-

"الاول جل شانہٗ - الآخر جل شانہٗ ، الظاھر جل شانہٗ - الباطن جل شانہٗ - اللہ کے اسماء مبارکہ ہیں۔ سب جانتے ہیں صفاتِ الٰہیہ حادث نہیں قدیم ہیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو وہ یہ کلماتِ کفر کہنے کی کبھی جرأت نہ کرتے کہ

اللہ اپنی صفات کا خالق اور رب ہے، استغفراللہ (نقل کفر کفر نباشد)" (تاج - ستمبر ۱۹۵۸ء)

یہ مدیر "تاج" کی نکتہ آفرینی ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ کی صفت کی عینیت و غیر عینیت اور حدوث و قدم کی بحث ہی نہیں چھیڑی تھی اور نہ ہمارا یہ منصب ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کی کلامی بحثوں نے سلجھایا کم ہے اور اُلجھایا زیادہ ہے۔ اور ہم نے یہ بھی نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا خالق ہے۔ "خلقِ قرآن" کی بحث ہی نے کتنے فتنے پیدا کئے ہیں۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفت کے تعلق کی بحث کا آغاز کیا جائے اور اُسے موضوعِ گفتگو بنایا جائے۔

ہم نے اول و آخر اور ظاہر و باطن کا سادہ مفہوم لیا تھا۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ (ہر شے کے) اوّل اور (ہر شے کے) آخر اور (ہر شے کے) ظاہر اور (ہر شے کے) باطن کا اللہ تعالیٰ خالق ہے تو اُس وقت حاشا وکلا یہ خطرہ ہمارے ذہن میں نہیں گزرتا کہ خود اللہ نے اپنی صفات کو خلق کیا ہے (.........) "مدیر" تاج" کے قلب و دماغ میں ایسے اندیشے پیدا ہوتے ہوں تو وہ خود پر دُوسروں کا کیوں قیاس کرتے ہیں۔

"اسمِ آخر نے موجوداتِ ممکنات کے حدوث و فنا و زوال کو متحقق کیا اور الظاہر نے اس تکوینی دُنیا کو اپنی تکوینی تجلیوں سے آباد فرمایا......" (ماہنامہ "تاج" ستمبر ۱۹۵۸ء)

لفظوں کی ہیر پھیر کی دوسری بات ہے، ورنہ جو ہم نے کہا ہے مدیر "تاج" بھی اُس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ کہ "الظاہر نے اس تکوینی دُنیا کو اپنی تجلیوں سے آباد فرمایا" تو "آباد فرمانے" کا یہ فعل کیا "خلق" کی تعریف میں داخل نہیں ہے، اور اُن کی منطق کے مطابق اُن کی اس عبارت پر بھی یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے خود اللہ کو آباد فرمایا۔

وحدت الوجود کی دعوت پر "تاج" میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ:-

"یعنی اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر تم ڈول کو رسّی باندھ کر زمین زیریں تک لٹکاؤ تو وہ ڈول اللہ پر گرے گا" اس کے بعد بطورِ استشہاد آپ نے یہ آیت "هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شيء عليم" تلاوت فرمائی"۔

قرآن پاک میں "ید اللہ" آیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ تجسّم و تجسّد سے منزہ ہے۔ اس لئے "ید اللہ" سے اللہ کی قدرت مراد لی جاتی ہے۔ اور یہ مراد قرآن کے منشا کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہ و تجرید کے عین مطابق ہے، اسی طرح یہ حدیث جو اُوپر نقل کی گئی ہے، اس میں "اللہ پر ڈول گرنے کا" کوئی بھی یہ مفہوم نہیں لیتا کہ اللہ کوئی جسم ہے جس پر ڈول جا کر گرتا ہے۔ اگر حدیث کے ظاہری الفاظ سے کوئی یہی مفہوم نکالتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم جو زمین پر چلتے ہیں تو معاذ اللہ — معاذ اللہ — معاذ اللہ — ہمارے پاؤں اللہ پر جا کر پڑتے ہیں۔ پس جس طرح "ید اللہ" سے اللہ کی قدرت مراد ہے۔ سی طرح "اللہ پر ڈول گرنے" سے یہ مراد ہے کہ زمین کی آخری حد تک کوئی شے اللہ کے احاطۂ علم و قدرت سے باہر نہیں ہے اور پاتال میں بھی کوئی چیز جا کر گرے گی تو وہ اللہ ہی کی حکومت، ربوبیت اور خلق و قدرت کے احاطہ میں جا کر ہی گرے گی۔ قرآن پاک میں اس کیفیت کو "تسخیر" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس حدیث سے ممکنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عینیت مراد لینے میں ہمیں اس لئے تامل ہے کہ قرآن پاک میں ممکنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خلق و ربوبیت اور علم و تسخیر کی صفت کا بہ تکرار اظہار فرمایا ہے۔ "عینیت" کا لفظ قرآن میں ایک جگہ بھی نہیں ملتا۔ ہاں! شعر و تصوف میں اس طرح کی اصطلاحیں اور نکتے ابھی ملتے ہیں۔ جو کتاب و سنّت کے سمجھنے میں مدد کم دیتے ہیں اور اُلجھنیں زیادہ ڈالتے ہیں۔

اور یہ آیت :-

"ھوالاول والآخر، والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم"

جس سے "وحدت الوجود" پر دلیل لائی جاتی ہے، اس میں خود "وحدت الوجود" کی نفی موجود ہے۔

"وھو بکل شیٔ علیم"

سے ظاہر ہے کہ "شیٔ" اور "علیم" میں تعلق وحدتِ وجود کا نہیں بلکہ علم (اور خلق و ربوبیت[1]) کا ہے۔ جیسا کہ بعض یونانی فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو خلق کیا۔ اس کے لئے ایک طبعی قانون بنایا۔ اور اب کائنات کے چلانے اور بنانے بگاڑنے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، سب کچھ طبعی قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے اللہ تعالیٰ اشیاء کا خالق ہے اور خلق کرنے کے بعد اس کا علم و ربوبیت اور قدرت اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر شے سے پہلے اللہ تعالیٰ ہے اور اس سے پہلے کوئی شے نہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ہر شے کے آغاز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شے خلق ہوتی ہے تو وہی اس کا آغاز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق سے ہے ہم "ھوالاوّل - والآخر" کو جس طرح سمجھے ہیں اور اس کا اظہار کیا ہے اگر مفکر علماء ہماری اس توجیہ کو اقرب الی الفہم نہ قرار دیں تو پھر شرح صدر کیساتھ ہم ان سے یہ گزارش کریں گے کہ شاہ صاحب کا یہ کہنا: "ہر اسم کا ظہور ازلی و ابدی ہے"

ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ تصوف کے یہی وہ شوشے ہیں، جن کے نہ سمجھنے ہی میں ہم جیسے سادہ مزاج لوگوں کے دین ایمان کی خیر ہے۔

بعض تصوف پسند شاعروں نے بھی ان نازک مباحث میں اس قدر احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے :-

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

شاعر اس نزاکت سے واقف ہے کہ کائنات سے اللہ کی عینیت کے تعلق کا ڈھنکے کی چوٹ اظہار ایک حدیثِ نازک اور حکایتِ مشکل ہے!

ذہین شاہ صاحب کو کون سمجھائے کہ حضرت شیخ محی الدین اکبر اور دوسرے صوفی بزرگوں کی وہ تحریریں جو انتہائی نازک، کم درجہ کی پیچیدہ بلکہ خطرناک ہیں اور ان کا اظہار نہ کوئی دینی ضرورت ہے اور نہ دنیوی ضرورت ہے۔ اُن کو اردو زبان میں منتقل کر کے وہ ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول رہے ہیں!

اس آخرت فراموش دَور میں ہم جیسے گناہگار مسلمانوں کو شاہ صاحب اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔ آخرت کو یاد دلائیں عذابِ قبر اور عذابِ دوزخ سے ڈرائیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون الرشید کو جس طرح نصیحت نامہ بھیجا تھا اس طرح وہ بھی پاکستان کے حاکموں کو ٹوکیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ کام ہے آج کل مصلحین اور راسخون فی العلم کے کرنے کا! اتنے ضروری مسائل کو چھوڑ کر شاہ صاحب جو تصوف کے انتہائی نازک، خطرناک اور غیر ضروری مسائل کو لے بیٹھے ہیں تو اس طرح نہ وہ دین کی کوئی مفید خدمت کر رہے ہیں نہ دنیا کی کوئی ابتری اس سے دُور ہو رہی ہے۔

---

[1] اس لئے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کو کائنات کا خالق اور رب فرمایا ہے۔

ایک شمع کو سامنے رکھئے، اُسے روشن کیجئے اور پھر اُسے گُل کر دیجئے - اب اس طرح بحث کا دروازہ کھولئے کہ شعلے سے پہلے اس شمع کا شعلہ کہاں تھا اور اب کہاں چلا گیا ؟ اس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں اور اصطلاح و معانی کا ایک پورا "فن" تیار ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی شمع میں شعلہ کے ہونے اور نہ ہونے کی حقیقت پوری طرح منکشف نہ ہو گی:-

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل کے مجمع البحرین تھے اور ارشاد و تصوف کے خانوادے کے چشم و چراغ تھے، وہ بھی "وحدت وجود" کو صوفیا کے کشف و شہود کا ایک مسئلہ سمجھتے ہیں:-

"مسئلہ وحدت وجود در شرع صراحۃً نیامدہ نہ در کتاب نہ در حدیث، حضرات صوفیہ برائے تائید کشف و شہود خود کہ مدار ایں مسئلہ بر ہماں است از کتاب و سنّت اشارات برآوردہ اند" (فتاویٰ عزیزی ص۲۸)

اور صوفیاء کا کشف و شہود کوئی "دینی حجت" نہیں ہے - یہ بات ملحوظ رکھئے کہ شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح تصوف کے مخالف نہیں ہیں بلکہ خود صاحب ارشاد و تصوف ہیں۔ اُن کا یہ فرمانا کہ "وحدتِ وجود کی صراحت نہ کتاب اللہ میں آئی ہے نہ احادیث میں" اس باب میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے -

اگر "وحدتِ وجود" کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ اس سے توحید نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور دھندلکا نہیں رہتا - تو بھی ایک بات تھی، اور "وحدتِ وجود" کی تفصیلات کی تمام خطرناکیوں کے باوجود اس سے صرف نظر کیا جا سکتا تھا۔ مگر رسالہ "تاج" تو "وحدتِ وجود" کو اس شدت کے ساتھ پیش کر رہا ہے کہ جس نے وحدتِ وجود کی روشنی میں "لا الٰہ الا اللہ" کو نہ سمجھا اس نے ارتکابِ شرک کیا۔ چنانچہ صوفی عبد الرحمٰن لکھنوی کی کتاب کا اقتباس ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ جو رسالہ "تاج" میں شائع ہوا ہے -

کیا کوئی معمولی عقل بھی اس کو باور کر سکتی ہے کہ کتاب اللہ میں کسی ایسی بات کی صراحت ہونے سے رہ گئی ہو - جس پر مدارِ ایمان ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بھی اس کی صراحت نہ فرمائیں - اور صحابہ کرام کو بھی اس کا "کشف و شہود" نہ ہو - ان حقائق کے ہوتے ہوئے وحدتِ وجود کے مسئلہ میں صوفیا کے "کشف و شہود" کی کیا دینی حیثیت رہ جاتی ہے

پھر جو لوگ صوفیاء کے "کشف و شہود" کی مزید صراحت، تشریح اور ترجمانی کر رہے ہیں، وہ ایک ایسا کام کر رہے ہیں - جس کی صراحت نہ کرنے ہی میں اللہ اور رسولؐ کی مصلحت نے انسانوں کے حق میں بھلائی دیکھی۔

"اگر گوید کہ مرادِ من آنست کہ در ہر چیز ظہور صفات اوست مثل ظہور صورت رائی در مرأت پس کفر نیست لیکن ترویج ایں کلام کہ موہم خلافِ شریعت ہے در مجالس و محافل خصوصاً در مجمعِ عوام کہ بغور سخن نمی رسند بسیار مذموم و قبیح است" (فتاویٰ عزیزی ص۲۸)

ترجمہ:- اگر کوئی کہے کہ میری مراد اس (یعنی وحدتِ وجود) سے یہ ہے کہ ہر چیز میں اُس (یعنی اللہ تعالیٰ) کا ظہور اس طرح ہے جیسے دیکھنے والے کی صورت کا ظہور آئینہ میں ہوتا ہے تو یہ کفر نہیں ہے مگر اس کلام کو رواج دینا (یعنی پھیلانا) جو موہم خلافِ شریعت ہے۔ محفلوں اور مجلسوں میں کہ جہاں عوام کا جمگھٹا ہوتا ہے اور جو بات کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتے، بہت زیادہ مذموم و قبیح ہے

تو مدیر "تاج" "وحدت الوجود" کے ان خطرناک مسائل کو جن کا رواج دینا شریعت کے مزاج کے خلاف اور انتہا

مذموم و قبیح ہوتا ہے ، لوگوں میں پھیلا کر ایک فعل مذموم و قبیح کے مرتکب ہوئے ہیں ۔

معجزہ و کرامت

"مدیر فاران شعلہ اسی جوابی مقالہ میں لفظی صراحت سے نہ سہی معنوی صراحت سے یہ بتا دیا ہے کہ معجزہ کرامت کا اظہار کسی نبی و ولی سے اعلانِ قرآنی کے خلاف ہے ۔" (رسالہ "تاج")

یہ بہت بڑی تہمت ہے جو ہم پر جوڑی گئی ہے۔ "دروغ گو یم بر روئے تو" اب تک کتابوں میں پڑھا اور لوگوں کی زبانی سنا تھا۔ اس کی معنویت "مدیر" تاج" کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد سمجھ میں آئی ۔ ہماری تحریر میں کوئی معنوی قرینہ اور رمز و اشارہ بہت تک اس بات کی نہیں نکلتی کہ ہم خدانخواستہ معجزہ و کرامات کے صدور کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں ۔ قرآن پاک میں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر واضح طور پر پایا جاتا ہے تو کوئی منافق ہی ہوگا جو قرآن پاک پر ایمان بھی رکھے گا اور معجزات کے صدور کو خلافِ قرآن بھی سمجھے گا ۔ (نحن نبرأ من هذه الهفوات)

لیکن اس کو کیا کہیے کہ مدیر "تاج "معجزات و کرامات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء قبر و برزخ کے مقامات سے لوگوں کی فریاد سنتے اور اُن کی دستگیری فرماتے ہیں ۔ جو کوئی اُن کے اس عقیدہ کو درست تسلیم نہیں کرتا ۔ اُسے وہ بزعمِ خویش معجزہ و کرامات کا منکر سمجھتے ہیں ۔ اس "قیاس مع الفارق" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے !

کجای نائی کجا می زنی !

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت خود معجزہ تھی ۔ آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا بھی معجزہ ہے ۔ اور پھر آپ کا دوبارہ دُنیا میں آنا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی آیت (نشانی) ہوگا ۔ اور یہ بھی سو فی صدی درست ہے کہ آپ کوڑھیوں، اندھوں بیماروں کو اچھا کر دیا کرتے تھے اور اللہ کے حکم سے مُردوں کو جِلا دیا کرتے تھے ۔ لیکن کیا اس کا بھی کتاب و سنت سے کوئی حکم یا اشارہ نکلتا ہے کہ بیماروں کی شفا کے لئے حضرت مسیح کا نام لے کر دہائی دینی جائز ہے کہ ۔

"اے عیسیٰ روح اللہ ! اس بیمار کو اللہ کے حکم سے شفا دیجئے اور اس مرے ہوئے آدمی میں جان ڈال دیجئے "

اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس طرح کا استغاثہ کرنے کو درست نہیں سمجھتا ۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی عنوان قرین صواب ہے کہ اس عقیدہ کا رکھنے والا سرے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہی کا منکر ہے !

"...... اغناهم الله ورسوله" جو قرآن پاک میں آیا ہے تو جہاں تک حضورؐ کی ذات گرامی کا تعلق ہے ۔ اس سیدھا، صاف اور واقعات کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مدینہ میں غلہ کی فراوانی ہوئی ۔ وہاں کے باشندوں کے عام مالی حالات درست ہوئے ۔ اس سے مومنین صادقین کے ساتھ منافقین بھی بہرہ اندوز ہوئے اور عام مسلمانوں میں ملے جُلے رہنے کے سبب غنائم سے بھی منافقین فائدہ اٹھاتے تھے ۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہو رہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دُنیا کے پردے پر جس کسی کو آسودگی اور مال و دولت ملتا تھا ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ۔ یا قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کو غنا و آسودگی دینے کا منصب اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کو سپرد فرما دیا ہے ۔ مفہوم نہ اس آیت سے نکلتا ہے، نہ مفسرین نے ایسا سمجھا ہے !

تاریخ و سیر کے واقعات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کے پاس مال ہوتا تھا تو عطا فرماتے تھے اور جب ہوتا تھا تو نہیں تھے ۔ ایک بار ایک سائل آیا اور حضورؐ سے سوال کیا تو آپ نے امہات المؤمنین کے گھروں میں معلوم کرایا کہ کچھ دینے کے لئے ہو تو کوئی دیا جائے پتہ لگا کہ پانی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے ۔ اس لئے آپؐ نے اُسے دوسرے صحابہ کے پاس بھیج دیا ۔

ایسا بھی ہوا کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک وفد آیا۔ اُن کے ایک نوجوان نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے لئے قناعت کی دعا فرمائیے۔ حضورؐ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا فرمائی۔ وفد چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُدھر کے لوگ پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے اُس نوجوان کا حال پوچھا۔ اہلِ وفد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اُس نوجوان کی سیرچشمی اور قناعت کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ ساری دُنیا کی دولت اُس کے سامنے رکھ دی جائے تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم وارواحنا لہ الفداء)

غزوات کے لئے اسلحہ، زادِراہ اور سواریوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو حضورؐ اس کے لئے چندہ کی اپیل فرماتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا۔ اور تمام مجاہدین کے ہاتھوں میں اسلحہ اور رانوں کے نیچے گھوڑے آگئے۔

پھر "اغناھم اللہ ورسولہ" کی تفسیر میں کیا یہ بھی کہیں ملتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے فقر و احتیاج کی حالت میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر یا مدینہ سے باہر دُور بستیوں میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ "یا رسول اللہ! ہماری محتاجی دُور کر کے ہمیں غنی بنا دیجئے" اور جب صحابہ کرامؓ تک کو ہم فقر و فاقہ اور دُنیوی مشکلات میں مبتلا پاتے ہیں۔ تو اولیاء اللہ کے بارے میں ہم کس طرح یہ عقیدہ قائم کر لیں کہ فلاں بزرگ کے پاس اللہ کے دیئے ہوئے خزانے ہیں اور وہ اُن میں تصرف فرما کر جس کو چاہیں مالا مال کر دیں۔

"اللہ یعطی وانا قاسم" کا شروع کا حصہ نہ جانے فاضل مدیر نے قصداً حذف فرمایا ہے یا لکھنے سے سہواً رہ گیا ہے۔ اصل حدیث یہ ہے۔

"من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی"۔

(جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے)

حدیث کے خود الفاظ بول رہے ہیں کہ یہاں "عطا" سے مال و دولت کی تقسیم نہیں ہے۔ حافظ فضل اللہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:-

"قولہ انما انا قاسم ـــ قال التوربشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ - اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ وانما انا قاسم الی ما یلقی الیھم من العلم والحکمۃ ویقول واللہ یعطی ای انھم الذی یھتدی بہ الی خفیات العلوم فی کلمات الکتاب والسنۃ وذلک انہ لما ذکر الفقہ فی الدین وما فیہ من الخیر"

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت عطا فرماتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی حکمت صحابہ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے۔ اسی کو حدیث میں "تفقہ فی الدین" کہا گیا ہے اور یہی وہ "فہم" ہے جو کتاب و سنت کے نکات و معانی کی طرف ہدایت اور رہنمائی کرتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم و حکمت میں اللہ تعالیٰ کی عطا یقیناً ثابت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضور اس دولتِ علم و حکمت کو تقسیم بھی فرمایا کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کے سمجھنے میں

کہیں اشکال واقع ہو تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کریں کہ آپؐ اس عقدہ کو حل فرما دیجئے۔ صحابہ کرامؓ کے دَور میں کیسے کیسے فقہی مسائل پیش آئے ہیں۔ کیا صحابہ ان دینی مسائل میں حل مشکل کے لئے حضورؐ کی وفات کے بعد آپؐ سے استغاثہ کیا کرتے تھے؟

"انا اعطینک الکوثر" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خیر کثیر" کا عطا کیا جانا ہے۔ اس میں جو شک کرے وہ منافق ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قیامت میں "حوض کوثر" سے حضورؐ پیاسوں کو سیراب بھی فرمائیں گے۔ اور "خیر کثیر" یہ بھی ہے جو حضورؐ کی نبوت و رسالت کی صورت میں قیامت تک جاری و ساری رہے گا کہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اور اب جس کسی کو ہدایت و نجات ملے گی وہ حضرت خاتم النبیین (روحی لہ الفداء) کی اطاعت و فرمانبرداری میں ملے گی کہ جس راہ میں سرکارؐ کے نقش قدم نظر آتے ہیں، وہی "صراط مستقیم" ہے۔ ؎

باہر ترے گھر کے تو نہ دُنیا ہے نہ دیں ہے!

اور حضورؐ کو جو "تکثیر" کا معجزہ عطا ہوا تھا کہ بعض اوقات تھوڑی چیز بہت سی ہو جایا کرتی تھی، یا طشتہ میں حضورؐ کی انگشتان مبارک سے پانی کے فوارے سے جاری ہو گئے تو یہ بھی اسی "خیر کثیر" کا اظہار تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ان تمام معجزات و عطایا سے کس کو انکار ہے۔ مگر "انا اعطینک الکوثر" سے یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب خیر کے لئے استغاثہ کریں اور رزق کی تکثیر کے لئے حضورؐ کو پکاریں کہ یا رسول اللہ! ہمارے رزق کو کثیر و وافر فرما دیجئے! فریاد و استغاثہ اللہ تعالیٰ ہی سے کیا جائے گا۔ کہ وہی مصیبتوں کا کھولنے والا، غموں کا دُور کرنے والا اور ہر مصیبت میں کام آنے والا ہے۔

قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے۔ وہی رزق دیتا ہے، وہی مصیبتیں کھولتا ہے، وہی لوگوں کو غنی اور آسودہ بناتا ہے۔ تو ان تمام آیتوں سے صرفِ نظر کر کے "اغنا" کے لفظ سے ذہن کو اس طرف لے جانا کہ تمام مخلوقِ خدا کو "غنی بنانے" کا منصب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپ دیا ہے، عجیب انتقالِ ذہنی ہے!

"من انصاری الی اللہ"

میں "انصاری" کا لفظ آجانے سے کیا یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی "مددگاروں" کی ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے اور "انصار اللہ" اللہ کی مدد کیا کرتے ہیں (معاذ اللہ)!

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم جب آپس میں ایک دوسرے سے مدد چاہتے ہیں، استعانت کرتے اور مدد کے لئے پکارتے ہیں، تو اس پر "یدعون من دون اللہ" کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا؟ تو یہ وہی علم کلام ہے جو نمرود نے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے مجادلہ میں استعمال کیا تھا کہ اپنے اختیار کی ظاہری مشابہت کو دلیل بنا کر کہنے لگا کہ (تمہارا خدا مارتا اور جلاتا ہے) تو میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں۔ اس جاہلانہ استدلال کا جواب نہ دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُوسرا اندازِ استدلال اختیار فرمایا اور کفر کو ششدر و حیران اور لاجواب کر دیا۔

اس دیدہ دلیری کا بھی کوئی جواب ہے کہ "بدعات" جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہو، سجدہ تعظیمی کی اباحت کی طرف جن کا رجحان ہو، ورد سرمد جیسے مجہول اور غیر ذمہ دار لوگوں کو جو اپنا پیشوا سمجھتے ہوں۔ "انا الحق" جیسے لغو اور خلافِ توحید نعرے کو جو جذب و کشف و شہود کا مظہر جانتے ہوں اور اپنے کو بہ باطن "رب الکریم" کہتے ہوں (اس عقیدہ سے ہزار بار خدا کی پناہ) ان کو خدائی صفات میں شریک کرنے پر اصرار کرتے ہوں۔ وہ اُن لوگوں پر "قبر پرستی اور بدعت" کی پھبتیاں چست کرتے ہیں کا مسلک ہی شرک و بدعت کی تردید ہو اور جو کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی کے ذوق و وجدان اور کشف و شہود کو ترجیح نہ دیتے ہوں

رسالہ "تاج" میں ایک حدیث پیش کی گئی ہے :-

" اُوتیتُ مفاتیح خزائن الارض "

یہ پوری حدیث نہیں ہے، حدیث کا ایک ٹکڑا ہے اور چونکہ اس واقعہ کا تعلق خواب سے ہے، اس لئے حدیث کا تمام حصہ مثل مدیر "تاج" نے درج نہیں فرمایا۔ ممکن ہے انہیں سہو ہو گیا ہو۔ مگر ایسے مواقع پر اُن کو نہ جانے کیوں سہو ہو جاتا ہے —
دیث کا متن یہ ہے :-

" وعن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال بعثت بجوامع الکلم ونصرت بالرعب وبینها انا نائم رأیتنی اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی " (متفق علیه)

(ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جوامع الکلم کیساتھ مبعوث کیا گیا ہوں، اور رعب کیساتھ میری مدد کی گئی ہے اور جب میں سو رہا تھا تو مجھے دکھایا گیا کہ مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے)

مگر قرآن کی اس محکم آیت کے بارے میں کیا کہئے گا :-

" قل لا اقول لکم عندی خزائن الله "

(اے نبی! تم کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے (دیئے ہوئے) خزانے نہیں ہیں)

اور ظاہر ہے کہ جو حدیث قرآن کے مخالف ہو اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور صحیح حدیث قرآن کے مخالف ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آیت میں "خزائن الله" آیا ہے، صرف "خزائن" نہیں کہا گیا۔ یعنی اس میں "اللہ کے دیئے ہوئے خزانوں" کی بھی نفی کی گئی ہے۔ "ذاتی" اور "عطائی" کی تاویل کے لئے بھی اس میں گنجائش نہیں ہے۔

مگر حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہے۔ ہاں! قرآن کی مخالف اُس وقت ہو گی جب اس کے وہ معنی لئے جائیں جو مدیر "تاج" کے ذہن میں ہیں اور عام طور پر اہلِ بدعت اسی حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں کی کنجیاں رسول اللہ کو عطا فرمادی ہیں۔ حالانکہ قرآن جس کی نفی کرتا ہو، حدیث اُس کا اثبات کرے، یہ ناممکن ہے!

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر اپنے اُمتیوں کے قبضہ و تسلط اور حکومت کی طرف اشارہ اور پیشگوئی ہے عالمِ مثال میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔ خود حضورؐ کے دَورِ مبارک میں بھی عرب پر آپؐ کا قبضہ ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسا بھی دَور گزرا ہے کہ اُس وقت کی دُنیائے معلوم کا بہت بڑا رقبہ اُمتیانِ نبی آخر کے زیرِ نگین تھا۔ اور تاریخ کے ہر دَور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے اور اس انحطاط کے عالم میں بھی آج ملکوں میں کے رقبہ پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ جن میں کم و بیش بس کروڑ انسان بستے ہیں!

مشکوٰۃ کی حدیث کے اس ٹکڑے :-

" ... ... واُحلت لی الغنائم وجعلت لی الارض مسجداً وطهوراً "

(اور میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں اور زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی)

"اُحلّت لی" (میرے لئے حلال کئے گئے) میں وہ تمام غنائم شامل ہیں جو آپ کے اُمتی جہاد کے ذریعہ حاصل کریں گے۔
"زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی" میں وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے۔ جو حضورؐ کے اُمتی قیامت تک اپنے سجدوں سے معمور کریں گے
اسی طرح "اوتیت بمفاتیح خزائن الارض" میں عرب کے علاوہ وہ تمام رقبۂ زمین (اُس کے خزائن کے ساتھ) شامل
جو آپؐ کے اُمتیوں کے قبضہ میں آیا اور قیامت تک آتا رہے گا۔

اگر یہ حدیث خواب کا واقعہ نہ ہوتی تو بھی اُس کے یہی معنی لئے جاتے کہ کتاب اللہ سے ٹکراؤ نہ ہو مگر حضورؐ کا یہ فر
"وبینما انا نائمٌ راتیتی" "جب میں سو رہا تھا تو مجھے یہ دکھایا گیا" اس نے معاملہ کو آسان تر بنا دیا۔ اس پر شاید یہ
وارد کیا جائے کہ انبیاء کرام کے خواب سچے (رویاء صادقہ) ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ اُن کو آنے وا
واقعات عالم مثال میں دکھائے جاتے ہیں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا
اُنھیں سجدہ کر رہے ہیں اور یہ مثالی واقعہ اس طرح سچا ہو کر رہا۔

" ورفع ابویہ علی العرش وخروالہٗ سجدا "

شاید کہا جائے کہ یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا تو وہ اُس وقت بچے تھے، نبوت جب تک کہاں ملی تھی! ا
کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ خواب میں حضورؐ کو جو شئے نظر آئی ہے، اُس کی خود حضورؐ نے تاویل فرمائی ہے:۔

"عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت ذات لیلۃٍ
بینما یری النائم کانا فی دار عقبہ بن رافع فاتینا برطب من رطب ابن طاب
فاولت ان الرفعۃ فی الدنیا والعاقبۃ فی الآخرۃ وان دیننا قد طاب"
(میں نے ایک رات اُس حالت میں جس حالت میں سونے والا دیکھا کرتا ہے، دیکھا گویا کہ عقبہ
بن رافع کے گھر میں ہیں اور ہمارے سامنے رطب (تازہ کھجور) لائے گئے۔ تو میں نے اُس کی یہ تاویل
کی کہ ہمارے لئے دُنیا میں رفعت ہے اور آخرت میں انجام (اچھا) ہے اور ہمارا دین مکمل اور
احسن ہو گیا)

مدیر "تاج" نے مشکوٰۃ باب الکرامات کی جو روایت درج کی ہے، اُس میں حضورؐ سے استغاثہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، ہاں! حضو
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کہنے سے روضۂ انور سے ایک روشندان آسمان کی طرف بنا دیا گیا۔ اور اس کے بعد خوب بارش ہوئی
ابن السنی سے جو روایت ہے، اُس کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

" واذا خدرت رجلہ فلیذکر احب الناس الیہ "

(اگر کسی کا پیر سُن ہو جائے، تو جو شخص اس کو سب سے زیادہ محبوب ہو تو اس کا ذکر کرے (یا نام لے)
یہ "اثر" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو موقوفاً ہے مرفوعاً نہیں ہے۔ اس "اثر" کے متن میں یہ د
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام لیا جائے۔ اور عبارت میں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ پکارنے اور ندا دینے کی ج
"ذکر" کا لفظ ہے!
اس "اثر" (متن) کے حاشیہ پر البتہ دو واقعات (قولہ) لکھے ہیں۔ جن میں ایک واقعہ میں "یا محمداہ" بھی ملتا ہے۔ ا
زبان سے دہرانے بلکہ زبان کو معطر و معنبر بنانے کے بعد پاؤں درست ہو گیا اور حضرت عبداللہ ابن عمر کے ہمراہی صحابی جا

دونوں واقعات کے بعد یہ الفاظ بھی ساتھ ہی درج ہیں:-

"واذا بل الانسان بریقه اظافیر الیه والرجل التی خدرت زال عنه ذلک مجرب"

(جب آدمی اپنے ہاتھ اور پیر کے ناخنوں کو تھوک سے تر کر لے تو سُن اس سے جاتا رہے گا اور یہ مجرب ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور اسم گرامی کی برکت سے کس کو انکار ہے۔ مگر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ سے جو "اثر" منقول ہے، اس کی حیثیت ایک "عمل" ــــ "رقیہ" (جھاڑ پھونک) کی ہے! جب "رقیہ" میں بعض دوسرے ناموں کے دہرانے سے بیماریوں کو فائدہ ہو جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ کے بعد سب سے زیادہ بابرکت اور متبرک ہے۔ مگر اس "عمل" سے "استغاثہ یا ندا" کا استدلال کرنا۔ کسی طرح درست نہیں۔

زمانہ فاروقی کی جو روایت ماہنامہ "تاج" میں نقل کی گئی ہے اس کے متن میں "استغاثہ" کا لفظ نہیں ملتا۔ یعنی روضۂ رسول پر حاضر ہو کر یہ نہیں کہا گیا کہ "آپ پانی برسا دیجئے یا پانی برسوا دیجئے" متن میں لفظ "استسق" ہے۔ یعنی آپ اللہ سے پانی طلب کیجئے!

اگر صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ روضۂ حضور پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام کے علاوہ استغاثہ اور عرض و معروض بھی کیا کرتے تھے۔ تو ایک نہیں سینکڑوں روایتیں ان واقعات کی ملنی چاہئیں تھیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ہی ارتداد کا کتنا بڑا فتنہ پیش آیا ہے۔ یہ وہ نازک وقت تھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ روضۂ رسول پر استغاثہ کرتے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کافروں سے کیسی کیسی معرکہ آرا جنگیں ہوئی ہیں اور فاروق اعظمؓ مجاہدوں کے لئے بڑے مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ روضۂ رسول پر استغاثہ کے لئے یہ سب سے زیادہ مناسب مواقع تھے! حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا مشہد روضۂ رسول سے بہت ہی قریب ہے۔ جب بلوائیوں نے آپ پر نرغہ کیا تھا تو حضور کو خطاب کرتے ہوئے دہائی، استغاثہ اور عرض و معروض کا اس سے بڑھ کر اور کونسا نازک وقت ہو سکتا تھا۔ صحابہ کرامؓ طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے مگر مصیبت اور مشکل میں وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور اسی سے دعا کرتے تھے۔ روضۂ رسول پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام تو عرض کرتے تھے مگر استغاثہ ان کا معمول نہ تھا!

قبروں سے اس قسم کے معاملات ــــ استغاثہ اور عرض و معروض ــــ کی اگر اجازت ہوتی تو قرآن پاک میں کسی ایک نبی و رسول یا مومن صالح کی قبر کا ذکر تو آتا۔ کہ وہاں جا کر اس طرح معروض کی گئی اور یہ یہ واقعات و حالات پیش آئے۔ احادیث میں زیارت قبر رسول کے لئے حضورؐ کا فرمان ملتا ہے مگر استغاثہ و فریاد کے لئے نہ حکم ہے اور نہ اجازت ہے۔ روضۂ رسول پر حاضری اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کی برکتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مسلمان جب روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام عرض کرتا ہے تو ہمہ تن سراپا خلوص و عقیدت بن جاتا ہے اور محبت کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوتی ہے۔ اور روایتوں میں یہ تک ملتا ہے کہ حضورؐ اپنے امتی کے صلوٰۃ وسلام کا جواب عطا فرماتے ہیں۔ مگر وہاں بھی دعا اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے کہ وہی سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے!

صحابہ کرام نہ قبر رسول کو چومتے تھے۔ نہ اس پر چراغ جلاتے تھے۔ نہ قبر مبارک کا طواف کرتے تھے۔ نہ وہاں حاضر ہو کر آپؐ کے نام کی دہائی دیتے تھے۔ نہ زیارت قبر کے بعد الٹے پاؤں واپس ہوتے تھے۔ نہ چادریں چڑھاتے تھے اور پھول ڈالتے تھے۔ جب تعظیم و عقیدت کے یہ مظاہر قبر رسول تک سے متعلق نہیں رہے۔ نہ ان کے لئے احادیث میں کوئی اجازت آئی ہے اور نہ صحابہ کرام نے اظہار عقیدت

کے لئے یہ طریقہ اختیار کئے ہیں۔ تو پھر دُنیا کی وہ کونسی قبر ہے۔ جس کے ساتھ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مقدس سے بڑھ کر عقید کا اظہار کریں!

سماع وغنا

سماع اور غنا کا مسئلہ بہت زیادہ طویل الذیل ہے۔ اُس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی تو "فاران" کے صفحے کے صفحے بھی اس تفصیل کو اپنے دامن میں نہ سمیٹ سکیں گے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر پہلی بار مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ بنو نجار کی کمسن لڑکیاں اشعار گا رہی تھیں:۔

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا   ما دعا للہ داع

عید کے موقع پر بھی لڑکیوں کے "لے" کے ساتھ اشعار گانے کو حضورؐ نے نہیں روکا اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ مگر یہ کہیں نہیں ملتا کہ حضورؐ کے دور میں "سماع" کی محفلیں گرم ہوتی ہوں۔ گانا سُننا حضورؐ کے معمولات میں داخل رہا ہو۔ حضورؐ کے حکم یا اشارے سے گانے بجانے کے لئے کوئی اجتماع ہوا ہو۔ صحابہ کرام کا عہد اور خلفاء راشدین کا دور بھی گانے بجانے کی محفلوں سے خالی نظر آتا ہے۔ گانے بجانے کو قلب کے تصفیہ اور تزکیہ کا سبب نہ رسول اللہ نے سمجھا اور نہ صحابہؓ نے۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں "غنا" اور "مزامیر" پر حدیث کی کتابوں میں نکیر ہی ملتی ہے!

بے شک ارباب تصوف میں بعض بزرگوں کو سماع سے رغبت رہی ہے اور وہ "سماع" سُنا کرتے تھے۔ ہم اُن پر طعن نہیں کرتے مگر اُن کے اس عمل کو سُنت بنانا کہاں تک جائز ہے۔ یہ عمل اُن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ہمارے سامنے جو اسوۂ حسنہ زندگی کے لئے معیار اور نمونہ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور حضورؐ کی حیات طیبہ ہے!

تصوف کے بعض خانوادوں میں "سماع" تو جو۔۔۔ معمولات میں داخل کر لیا گیا ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور اُس پر جو زیادتیاں اور اضافے ہوتے چلے گئے ہیں، اُس نے "سماع" کو سادہ غنا ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس پر "ملاہی" کی تعریف صادق آتی ہے۔ اور آج کل جو "سماع" کی محفلیں برپا ہوتی ہیں، وہ تو سراپا لہو و لعب ہیں۔ یہ مزامیر کا تنوع، یہ گانے میں گلے بازی اور گنگریود کے ساتھ تالیاں بجانا ــــ کہ جو عبادت میں "کفار" کا شیوہ رہا ہے۔ یہ ڈھولک کی تال اور ہارمونیم کی گت پر ناچنا اور پھر ان خرافات کو تزکیہ قلب کا سبب سمجھنا۔ بناء فاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔ اور اس کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہے کہ اب یہ قوالی کی محفلیں راگ رنگ کے جلسے اور "سماع شریعت" کے ہتھکنڈے بعض لوگوں کی دکانداری چمکانے کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس طرح ان تاجر پیروں کی محفلوں کی رونق بڑھتی ہے!

ڈھول کی گت پہ رقص ہوتا ہے
لقمہ چاندی میں ہاتھ دھوتا ہے

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے جس "سماع" کے جواز کی "اہل" کے لئے شرط لگائی وہ یہ "سماع" ہرگز نہ تھا جو ان دنوں رائج ہے اور آجکل کے موسیقی مزاج پیر جس کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ امام غزالیؒ آج زندہ ہوتے اور وہ دیکھتے کہ جاہل اور نااہلوں کو اعلان کے ذریعہ گانے بجانے کی ان محفلوں میں اکٹھا کیا جاتا ہے، تو وہ شاید اپنی رائے بدل دیتے کہ میری "رخصت و توسع" نے سادہ غنا کو لہو و لعب کی حدود تک پہنچا دیا!

مدیر "تاج" لکھتے ہیں:۔

"ائمہ احناف میں صاحب بدائع صاحب ہدایہ شمس الائمہ سرخسی اباحتِ غنا کی تصریح کرتے ہیں"

حالانکہ ہدایہ میں یہ عبارت ملتی ہے:۔

"ان الملاھی کلھا حرام حتی التغنی بالضرب القضیب"

(ہر قسم کا لہو ولعب حرام ہے یہاں تک کہ لکڑی پر لکڑی مار کر گانا بھی)

ہدایہ فقہ سنی کی مستند ترین کتاب ہے، ہدایہ کی اس تصریح کے بعد وہ لوگ جو فقہ حنفی کے مقلد ہیں اُن کو پھر کچھ اور کہنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے!

اباحتِ غنا کے سلسلہ میں امام ابن طاہر کا مدیر "تاج" نے بار بار نام لیا ہے۔ امام موصوف کے علم و فضل کے اعتراف کے باوجود اُن کے بارے میں یہ رائے بھی ملتی ہے کہ وہ "اباحتیہ ملامتیہ" تھے اور "امرد" پر نگاہ ڈالنے تک کے جواز میں انہوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے!

یہ کون کہتا ہے کہ لحن کے ساتھ ترنم و نشید حرام ہے، اس کی اجازت ہے، نفسِ غنا کی اباحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے سرود و غنا کو جس میں مزامیر کا استعمال نہ ہو مباح لکھا ہے۔[1] اور یہ بھی تصریح فرمادی ہے کہ دف مزامیر سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فتاویٰ عزیزی جلد اوّل (صفحہ ۷۵) میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"و در مدارک گفتہ کہ ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ قسم میخوردند کہ لہو الحدیث غنا است و در در المعانی گفتہ کہ لہو الحدیث غنا و مزامیر است و در کشاف ذکر کردہ کہ لہو الحدیث مانند غنا و تعلیم موسیقات است و در رقتی گفتہ کہ لہو الحدیث غنا است و آں حرام است بایں نص مستحل آں کافر است و در تفسیر ثعلبی آوردہ کہ لہو الحدیث غنا، ضرب بربط و دف و او تار و طنبور ست و آں ہمہ بایں نص حرام اند۔ من استحلہ فقد کفر"

"طبرانی و خطیب بغدادی روایت نمودہ اند کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہی کرد از غنا و استماع آں

در جامع الفتاویٰ استماع الملاہی والجلوس علیہا و ضرب المزامیر والرقص کلہا حرام و مستحلہا کافر

(جامع الفتاویٰ میں ہے کہ لہو ولعب کا سننا اور ایسی محفل میں بیٹھنا اور مزامیر کا بجانا اور رقص کرنا یہ سب باتیں حرام ہیں اور ان کو حلال ٹھہرانے والا کافر ہے)

مدیر "تاج" جس "غنا" کی نہ صرف اباحت کے قائل ہیں بلکہ اس کے داعی اور سرپرست ہیں۔ یہ وہی غنا ہے جس کے بارے میں شعب الایمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث آئی ہے:۔

"الغنا ینبت النفاق، کما ینبت الماء النبات"

(غنا نفاق کو اس طرح اگاتا ہے۔ جیسے پانی نباتات کو اگاتا ہے)

---

[1] شاہ صاحب نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ "وا دلیار اللہ خصوصاً کبار چشتیہ سماع ہیں غنا فرمودہ اند کہ بحضور مزامیر درآلات نبود"

اعتراض برائے اعتراض

"مدیر تاج" مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب "تفہیم القرآن" پر اتنے برسے اتنے برسے ہیں کہ خدا کی پناہ! مودودی صاحب کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے "یدعون من دون اللہ" میں اصحاب قبور کو کیوں شامل کر دیا!

"فاران" میں تفہیم القرآن کا جو اقتباس درج کیا گیا تھا۔ اس کو "تاج" میں پورا نقل نہیں کیا گیا۔ اور وہ حصہ جان بوجھ کر حذف کر دیا گیا ہے۔ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ مشرکین نے صالحین کے ناموں پر بتوں (ودّ، سواع، یغوث، نسر، اساف، نائلہ) کے نام رکھے تھے!

البدایہ والنہایہ میں علامہ ابن کثیر نے صفحہ ۱۰۶ پر راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے:-

"ودّ رجلاً صالحاً وکان محبباً فی قومه فقد مات عکفوا حول قبرہ ....."

(ودّ ایک مرد صالح تھا جو اپنی قوم میں محبوب تھا۔ جب وہ مرگیا تو اُس کی قبر کے ارد گرد لوگ گھومنے لگے)

البدایہ والنہایہ کی اس روایت کو پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ مولانا مودودی نے "یدعون من دون اللہ" سے جو اصحاب قبور مراد لئے ہیں اُس پر تفسیر بالرائے اور خارجیت کی پھبتی چست کرنا کس قدر بغض و عناد اور جاہلانہ عصبیت کی دلیل ہے!

اس روایت میں تفصیل ملتی ہے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو بہکایا اور ان لوگوں نے آگے چل کر ودّ کی تمثال کی پوجا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ:-

"..... حتی اتخذوہ الٰھاً یعبدونه من دون اللہ"

پھر آگے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

"ومقتضیٰ ھذا السیاق ان کل صنم من ھذہ عبدہ طائفة من الناس"

(اس سیاق عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بُت انسانوں کے گروہوں میں سے تھے)

قبر پرستوں پر اگر قرآن کا یہ انداز بیان (یدعون من دون اللہ) گراں گزرتا ہے تو اُن کی دل دہی کے لئے اہل حق سچی بات کے اظہار سے صرف نظر تو نہیں کر سکتے!

"یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں" مولانا مودودی کے اس جملہ پر "مدیر تاج" نے گرفت کر کے اپنے نزدیک بڑی دقت نظر اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "آیاتِ قرآنیہ کو "الفاظ" بولنا سخت بے ادبی ہے۔ آیات و کلمات بولنا چاہیئے"

یہ اعتراض محض برائے اعتراض ہے اس میں کوئی وزن نہیں! افہام و تفہیم کے لئے قرآن کریم کے کلمات و آیات سے "حرف، لفظ، سوابق و لواحق، عبارت، سیاق و سباق، مضمون، تقریر وغیرہ" کی نسبت دینے میں آخر بے ادبی کی کیا بات ہے؟

اُردو مفسرین قرآنی کلمات کے لئے "الفاظ" بھی استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں:-

(۱) "....... فاخذتھم الصیحة مشرقین" (الحجر) اس آیت کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں:-

"..... شاید یہ مطلب ہو کہ صبح ہوتے ہی عذاب شروع ہو جائے گا اور اشراق تک سب معاملہ ختم کر دیا جائیگا۔ کیونکہ دوسری جگہ "مصبحین" کے بجائے "مشرقین" کا "لفظ" آیا ہے" (صفحہ ۳۴۴۔ مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور)

(۲) "اے ایمان والو تم (لفظ) "راعنا" مت کہا کرو (اور اگر اُس کے ظاہری مطلب عرض کرنے کی ضرورت پڑا کرے تو (لفظ) "اُنظُرنا" کہہ دیا کرو۔ (بیان القرآن۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ صفحہ ۴۲۔ مطبوعہ تاج کمپنی)

(۳) "لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" "رب العلمین" کے لفظ میں یہ اشارہ آگیا کہ دعوت ایسے قانون کی اطاعت کی دی جارہی ہے (تفسیر ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (صفحہ ۲۹۶)

(۴) تفسیر ابن کثیر کا اُردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ "...... وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ ..." اس نکتہ کو نہ بھولئے کہ اپنی راہ کیلئے "سبیل" کا لفظ اور گمراہوں کی راہ کے لئے "سُبُل" جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

قرآنی آیات و کلمات کی تشریح میں "لفظ" کی نسبت سے کوئی کہاں تک بچے گا۔ "عرش" قرآن پاک میں آیا ہے۔ اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہی جائے گا۔ اور لوگ کہتے ہی چلے آئے ہیں کہ "عرش" کے لفظی معنی "تخت" کے ہیں۔ اور اس کی معنوی کیفیت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

قرآن کی عبارتوں کو "آیات" ہی کہا جاتا ہے۔ "جُملے" نہیں کہا جاتا۔ مگر یہ آیات جن کلموں سے عبارت ہیں۔ اُن کو افہام و تفہیم میں "الفاظ" بھی کہتے اور بولتے ہیں۔ اور کلمۂ "لفظ" (واحد) میں نہ کوئی ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔ نہ "لفظ" کسی کے قول و کلام کی تخفیف و اہانت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود "لفظ" بولتے وقت کسی کے ذہن میں اس کے لغوی معنی نہیں پہنچتے کہ بولنے والا زبان سے "حرفوں کو پھینک رہا ہے"۔ اس طرح تو قدیر۔ غفار۔ مُعید۔ غنی۔ سمیع۔ رسول۔ محمدؐ۔ مَلک، یوم الجزاء۔ صوم و صلوٰۃ وغیرہ کلمے جن لغات میں درج ہیں اور اُن پر "الفاظ" لکھا ہوا ہے۔ تو اُن کے لکھنے والے اور پڑھنے والے سب کے سب بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چشم بددُور کیا نزاکتِ فہم اور کیا احساسِ شعور ہے۔ اور یہ اعتراض وہ غیر محتاط لوگ کر رہے ہیں ــــ جو۔

مثنوی ۔ مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

پڑھ پڑھ کر وجد کرتے ہیں!

مولانا مودودی کی تحریروں کے ساتھ یہی دردناک سلوک کیا جارہا ہے۔ کہ لوگ اُن کی تحریروں سے وہ وہ نکتے پیدا کرتے ہیں جو مودودی صاحب کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے اور اپنے وہم و نفس سے پیدا کی ہوئی تہمتیں اُن پر جڑتے ہیں۔

اہلِ بدعت کا مزاج

اہلِ بدعت کا یہ مزاج ہے۔ ذوق ہے اور طبیعت و رجحان ہے کہ ایسے تمام نکتے جو "عبد و معبود" اور "خالق و مخلوق" کے تعلق پر۔

"من تو شدم، تو من شدی"

کا رنگ چڑھاتے ہوں۔ انہیں مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ توحید کے تقاضوں سے اُن سے زیادہ بے پروائی شاید ہی کوئی اور برتتا ہو۔ اور ایسے لطائف، اشاروں اور نکتوں سے جن سے شرک و توحید میں التباس پیدا ہوتا ہو۔ ان حضرات کو خاص شغف ہے۔ بلکہ اُن کے ذوق کی چیز ہے۔ مثلاً "احمد بلا میم" اور "عرب بلا "ر" پر یہ لوگ جھومنے لگتے ہیں۔

"قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ..."

کے ترجمہ میں "ی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ نے فرمایا

تم کہو کہ" اے میرے بندو ...." (یعنی مجھ محمدؐ رسول اللہ کے بندو) صرف اپنے ذوق کی بنا پر قرآن پاک میں ایسی کھلی ہوئی معنوی تحریفیں کرتے ہیں اور ذرہ برابر نہیں شرماتے۔ بلکہ اتنی بڑی مجرمانہ جسارتیں کرکے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم "عشقِ رسولؐ" کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اولیاء اللہ کو انہوں نے انبیاء کرام کے برابر پہنچا دیا ہے بلکہ اُن سے بڑھا دیا ہے اور انبیاء کرام کو خدائی منصب دے دیا ہے۔ (نعوذ باللہ) ان کا تمام علم کلامِ الٰہی معتقدات کے اردگرد گھومتا ہے۔ غلو ان کا شیوہ ہے اور فرقِ مراتب کی حدوں کو توڑنا ان کا مسلک ہے!

"یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ" (مائدہ)

کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"تقویٰ کا حکم ہو رہا ہے اور وہ بھی اطاعت سے ملا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے منع کردہ کاموں سے رُکا رہے اس کی طرف قربت یعنی نزدیکی تلاش کرو۔ یہی معنی **وسیلہ**" کے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہیں اور حضرت مجاہد، حضرت ابو وائل، حضرت حسن، حضرت ابن زید اور بہت سے مفسرین (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) سے بھی مروی ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے اعمال سے اُس سے قریب تر ہوتے جاؤ۔ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی:۔

"اولٰئک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ"

جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان ائمہ نے وسیلے کے جو معنی اس آیت میں کئے ہیں، اس پر سب مفسرین کا گویا اجماع ہے۔ اس میں کسی ایک کا بھی خلاف نہیں[1]"

(اُردو ترجمہ۔ صفحہ ۹۳)

مگر اہلِ بدعت "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" سے نہ صرف یہ کہ انبیاء و اولیاء کا توسل ہی مراد لیتے ہیں بلکہ اس توسل کو یہاں تک وسعت دیتے ہیں کہ اُن کے نزدیک بزرگانِ دین سے استمداد، استعانت، استغاثہ، سب اسی آیت کے تحت "الوسیلہ" کے مفہوم میں داخل ہے۔ قرآن کے مقابلہ میں یہ اُن کی جرأتیں اور جسارتیں ہیں۔ اُن کی اس خود تراشیدہ تفسیر پر کوئی گرفت کرے اُسے اولیاء اللہ کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

مشرکانہ عقائد، بدعت آمیز تصورات اور عجمی خرافات شعر کے اس قالب میں ڈھل گئے ہیں:۔

وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر   اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰے ہو کر

---

[1] "وسیلہ" جنت کی اس اعلیٰ منزل کا نام بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور عرش سے قریب تر ہے صحیح بخاری شریف میں ہے جو شخص اذان سن کر اللّٰھم رب ھذہ الدعوۃ التامہ ... الخ" پڑھے اس کے لئے میری شفاعت ہو جاتی ہے۔ مسلم شریف میں ہے "جب تم اذان سنو تو جو مؤذن کہہ رہا ہو۔ وہی تم بھی کہتے جاؤ۔ پھر مجھ پر درود بھیجو۔ ایک درود کے بدلے اللہ تعالیٰ دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ پھر میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ طلب کرو، وہ جنت کا ایک درجہ ہے۔ جسے وہ ایک ہی بندہ پائے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ پس جس نے میرے لئے وسیلہ طلب کیا اُس کے لئے شفاعت واجب ہوگئی!

نہیں مانتا ۔ وہ مسیح کے رتبہ کو گھٹاتا ہے! حالانکہ حضرت مسیحؑ کے شرف و مجد کا مسئلہ اُن کی الوہیت اور بنیت کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اسی پر اُن لوگوں کے عقاید و تصورات کا قیاس کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کے منصب و اختیار کا ایک "تخیل" اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے کہ وہ ان صفات اور اختیارات کے مالک ہیں۔ اور جو کوئی ان لوگوں کے خود تراشیدہ "عقیدہ و تخیل" کو نہیں مانتا، اُس پر بزرگان دین کی اہانت و عداوت کا الزام لگایا جاتا ہے۔

حضرت مولا علی کرم اللہ وجہ کے بعض غالی بلکہ گمراہ معتقدین نے حضرت علیؓ سے الٰہی صفات منسوب کردی تھیں تو مولا علیؓ نے ان لوگو کو سزائیں دیں۔ "نصیری" تو ڈنکے کی چوٹ علیؓ مرتضیٰ کو "خدا" کہتے ہیں (معاذ اللہ) اور اب بھی ایسی شرک پسند ذہنیتیں موجود ہیں۔ جو "نصیریوں" کے اس مشرکانہ عقیدہ کو اشاروں اور کنایوں میں سراہتی ہیں!

"محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا نبی بنایا اور نبوت کے سلسلہ کو آپ کی ذات پر ختم کردیا۔ اطاعت رسولؐ ہر مومن پر فرض عین ہے، آپ کی اتباع پر دین و دنیا کی سعادت، فلاح اور نجات کا دارومدار ہے حضورؐ کی محبت کا معیار ہی یہ ہے کہ جس کو سرکارؐ کی ذات سے جتنی زیادہ محبت ہوگی، اُتنا ہی وہ سنت رسولؐ کے اتباع میں سرگرم ہوگا۔ جس کے دل میں معاذ اللہ رائی کے دانہ کے کروڑواں حصہ برابر حضورؐ کی ذات سے (خاک بدہن گستاخ) کہ نہیں بے تعلقی ہوگی اس کا ایما معتبر نہیں، وہ ناشدنی منافق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عالم کیلئے رحمت ہیں۔ نذیر و بشیر ہیں، سراج منیر ہیں، صاحب قاب قوسین ہیں۔ افضل الا ہیں۔ حضورؐ سے بہتر انسان پر آج تک آفتاب طلوع نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ قیامت کے دن لواء الحمد حضورؐ ہی کے دست مبارک میں ہوگا اور جبکہ بڑے بڑے رتبہ والے انبیاء اللہ کے عظمت و جلال کے آگے سکتہ میں ہوں گے حضورؐ ہی شفاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگا میں عرض معروض کریں گے!

غالب! ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

مگر مشکل اور مصیبت میں فریاد اللہ تعالیٰ ہی سے کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کی جائے گی کہ کتاب و سنت کا یہی حکم ہے۔ اب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ و فریاد نہ کرنے اور اسے درست نہ سمجھنے پر یہ فتویٰ لگا دے کہ ایسا شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے، تو یہ کس قدر بے بنیاد الزام ہے۔ اور کتنی بے سروپا تہمت ہے! حضورؐ کی عظمت عزت اور مراتب و درجات اس سے وابستہ نہیں ہیں کہ آپؐ کو حلّالِ مشکلات اور مستغاث سمجھا جائے۔ اور جو حضورؐ کو ان صفات حامل تسلیم نہیں کرتا وہ گستاخ ہے اور حضورؐ کے درجہ کو گھٹانے والا ہے (معاذ اللہ) یہ منطق ہی غیر عقلی ہے۔ اور سوچنے طرز ہی جاہلانہ ہے!

حضورؐ کے معجزات سے کون مسلمان ہے جو انکار کی جرأت کرسکتا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ مکہ میں دو آدمی تنہا میں خفیہ مشورت کرتے ہیں اور مدینہ میں اللہ تعالیٰ آپ کو وحی خفی کے ذریعہ اُس کی خبر پہنچا دیتا ہے۔ یہ اللہ کی آیت ہے۔ جسے کلامی میں "خرقِ عادت" اور عام اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ انہی سیرت کی کتابوں میں یہ واقعات بھی ملتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگائی جاتی ہے تو وحی کے آنے تک حضورؐ شدید مضطرب رہتے ہیں۔ ورنہ استفسار

پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضور تہمت کی افواہ سنتے ہی فرما دیتے کہ میں نبی ہوں اور نبی کے سامنے مشرق و مغرب کے تمام احوال و کوائف منکشف ہوتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے، عائشہؓ اس تہمت سے پاک اور بری ہیں!

مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی افواہ سن کر آپؐ صحابہؓ سے بیعت نا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ عالم کہ مکہ کی خفیہ مشورت کی سینکڑوں میل پر مدینہ میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ خبر پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ کیفیت کہ مکہ سے چند میل کے فاصلہ کی حقیقت حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام باخبر نہیں ہو پاتے۔ انہی واقعات سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بندہ کی بے اختیاری کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ چاہے نبی ہی کیوں نہ ہو، تمام عالم سے افضل ہونے کے باوجود بندہ ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و دستگیری کا محتاج ہے۔ احتیاج بندگی کی ایسی صفت ہے جو کسی حالت میں جدا نہیں ہو سکتی!

ایک طرف حضورؐ احوالِ قیامت کا پتہ و نشان دیتے ہیں اور دوسری طرف قرآن کہتا ہے:-

"ومِمَّن حولکم من الاعراب منٰفقون ط ومِنْ اَھلِ المدینۃ (قف) مردُوا علی النفاق (قف) لاتعلمھم نحن نعلمھم (توبہ)

(تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، انھیں تو نہیں جانتا، ہم انھیں جانتے ہیں)

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب فرما کر "اُن (منافقین کو) تو نہیں جانتا ہم انھیں جانتے ہیں" کیا معاذ اللہ رسولؐ کی شان کو گھٹانا چاہتا ہے۔ یہ آیت اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتا رہے ہیں کہ "علم کل" خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ وہی "عالم الغیب والشہادہ" ہے اور اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں تک کو جن حالات و کوائف کی اطلاع دینی مناسب سمجھی دی ہے۔ اور جن کی اطلاع مناسب سمجھی نہیں دی۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے انبیاء، ملائکہ، اولیاء اور خواص و عوام سب سربسجود ہیں!

حدیث کی کتابوں میں یہ تک ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو جاتا ہے، اور یہ بھی کہ حضورؐ ضعفِ بیماری کے سبب کئی دن تک مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف نہیں لا سکے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت فرماتے ہیں — مستند واقعات بتاتے ہیں کہ بندہ کی فریاد کو وہی پہنچ سکتا ہے کہ جو حی و قیوم ہے، جس کی ذات پر زمانہ کی گردش اثر نہیں کر سکتی۔ جس کو نہ بیماری لاحق ہوتی ہے اور نہ نیند اور اونگھ آتی ہے، جس کی شان "الآن کما کان" ہے اور اس کے آستانہ پر ہر بلند سے بلند پیشانی کا خاک آلود ہونا ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔ (جل جلالہ وعم نوالہ)

قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء کرام تک کی بعض دعائیں قبول نہیں کی گئیں۔ حالانکہ ان سے بڑھ کر اللہ کا مقرب اور محبوب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یوسف میں حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں اُن میں ایک طرف تو یہ ملتا ہے کہ آپ بہت دور سے پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی قرآن ہی بتاتا ہے کہ برسوں تک حضرت یعقوبؑ کو اپنے سب سے زیادہ چہیتے بیٹے یوسفؑ کے حالات کی خبر نہیں ہوتی۔ اور اس غم میں آپ کی آنکھیں روتے روتے سفید ہو جاتی ہیں!

جب انبیاء کرام تک کے ساتھ یہ حالات پیش آئے ہوں، تو ہم کس دل، قطب، غوث اور شاہ ولایت صاحب کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کر لیں کہ اُن پر ہمہ وقت چودہ طبق روشن رہتے ہیں! اور ہر مضطرب کی فریاد وہ سن سکتے ہیں۔ اور تمام انسانوں کے احوال اُن پر روشن ہیں۔ اور وہ جس کیلئے جو دعا کر دیں گے وہ لازماً پوری ہو کر رہیگی۔ اُن کے کسی کہے کو اللہ تعالیٰ ٹال ہی نہیں سکتا۔ جو کوئی ایسا

عقیدہ رکھتا ہے، وہ کتاب و سنّت کی بنیادی تعلیمات کا مذاق اُڑاتا ہے!

بعض بزرگوں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اُن پر "کشفِ قبور" ہوا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمام دُنیا کی قبریں اُن کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور اپنی وفات کے بعد اپنے ہر مرنے والے مُرید کی قبر میں جا کر اس کی قبر کو منوّر فرمایا کرتے ہیں۔ کسی بزرگ پر اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل کے کسی خطرے یا کیفیت کو منکشف فرما دیا۔ اس کرامت کے کیا یہ معنی ہیں کہ وہ بزرگ دُنیا کے تمام انسانوں کے دلوں کی خبر رکھتے ہیں یا جو کوئی بھی اُن کے پاس آتا ہے اُس کے دل کا حال جان لیتے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ہزاروں میل دُور کے ایک مقام کو منکشف فرما دیا تھا آپ نے "یا ساریۃ! الی الجبل" کا نعرہ بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ساریہؓ کو حضرت عمرؓ کی آواز سُنوا بھی دی ـــــ تو کیا اس کرامت سے یہ اصول وضع کیا جانا قرینِ صواب ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کا ایک ایک گوشہ حضرت عمرؓ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ اور اسلامی فوجوں کو جب بھی کہیں خطرہ پیش آتا تھا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بیٹھ کر اُسے دیکھ لیا کرتے تھے۔ اور وہیں سے فوج کے کمانڈروں کو کرامت کے ذریعہ مُطلع فرمادیا کرتے تھے ـــــ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس لشکر گاہ سے خبر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو آپ انتہائی مضطرب رہا کرتے تھے۔ اور بعض گورنروں کی جب شکایتیں آپ کو ملی ہیں تو آپ تحقیقِ حال کے لئے سینکڑوں میل کے دشوار گزار سفر کی صعوبت برداشت فرما کر صوبہ کے صدر مقام پہنچے ہیں!

مسلمانوں کا ایک فرقہ واقعہ کربلا کی یاد اس طرح مناتا ہے ـــــ کہ تعزیے ہیں، عَلَم ہیں، جھنڈیاں اور جھولے ہیں۔ چاقوؤں اور چھریوں سے ماتم ہے۔ زینوں پر برچھے سے ہوئے گھوڑوں کا گشت ہے۔ یہ حضرات اس قسم کے تمام مظاہروں کو حُبِ حسینؓ، عظمتِ اہلبیت اور واقعہ کربلا کی اہمیت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے دوسرے فرقے ان مظاہروں سے اجتناب کرتے ہیں اور انہیں بدعت سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر اس انداز سے شہادت کے واقعات کی یاد منائی جانی جائز ہوتی تو سب سے پہلے بدر و خیبر اور خندق و اُحد کے غزوات ان مظاہروں کے مستحق تھے۔ اُن جنگوں کی عظمت و اہمیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے، جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک رہے ہوں اور جو کافروں سے لڑی گئی ہوں۔ غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کتنا بڑا دردناک واقعہ ہے کہ خود رحمۃ للعالمینؐ کا کلیجہ ہل گیا۔ مگر حضرت حمزہؓ کی شہادت کی یاد میں کیا کوئی تابوت، کوئی علم اور کوئی ضریح نکالی گئی؟ واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرنے کے لئے صدیوں تک اہلبیت نے اس قسم کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ تمام عجمی بدعتیں ہیں جن سے حُبِ حسینؓ اور اہمیتِ واقعہ کربلا وابستہ کر دی گئی ہے! بالکل اسی طرح قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ بدعات بلکہ خرافات ہیں۔ یہ چراغاں۔ یہ مزاروں کی گلپاشی اور صندل مالی۔ یہ چادروں اور گاگروں کے جلوس۔ یہ مزامیر کے ساتھ قوالیوں کے جھگڑے، یہ آستاں بوسی اور گنبدوں کا طواف! ان کے لئے کتاب و سنّت، صحابہ اور اہلِ بیت کے آثار میں کوئی دلیل اور نظیر نہیں ملتی۔ یہ سب بزرگوں کی محبت اور عظمت کے نام پر دین میں زیادتیاں اور اضافے ہیں!

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں :۔

"اگر تو مشرکینِ عرب کے عقائد اور اُن کے اعمال اور ان کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس زمانہ کے عوام اور جہلاء کو دیکھ لو کہ وہ قبروں اور تھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی

اور اُس کے حق اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔ (ملتقطا۔ از اردو ترجمہ)

حضرت مُلا علی قاری شرح مناسک میں فرماتے ہیں:-

"لا یطوف ای لا یدور حول البقعة الشریفة لان الطواف من مختصات الکعبة المنیفة فیحرم حول القبور الانبیاء والاولیاء الاعبرة بما یفعله الجهلة ولو کانوا فی صورت المشائخ والعلماء۔

(مزار مبارک کے اردگرد نہ گھومے کیونکہ طواف کعبہ کے لئے مخصوص ہے، لہٰذا انبیاء و اولیاء کی قبروں کے گرد گھومنا[1] حرام ہے اور ان جہلاء کے فعل کا اعتبار نہیں اگرچہ وہ علماء اور مشائخ کی صورت میں ہوں)

مجمع البحار میں ہے:-

من قصد لزیارة قبور الانبیاء والصلحاء ان یصلی عند قبورهم ویدعو عندها ویسئلهم الحوائج فهذا لا یجوز عند احد من علماء المسلمین فان العبادة وطلب الحوائج والاستغاثه حق الله وحده۔

(یعنی جس شخص نے اس غرض سے قبور انبیاء و صلحاء کی زیارت کا قصد کیا کہ اُن کی قبروں کے پاس نماز پڑھے اور اُن سے دعا مانگے اور اُن سے اپنی حاجتیں طلب کرے تو یہ علماء مسلمین میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ عبادت اور طلب حوائج اور استغاثت اللہ ہی کا حق ہے)

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے اُستاد سلطان العارفین قاضی حمید الدین ناگوری "توشیح" میں فرماتے ہیں:-

"منهم الذین یدعون الانبیاء والاولیاء عند الحوائج والمصائب باعتقاد ان ارواحهم حاضرة تسمع النداء وتعلم الحوائج وذلک شرک قبیح وجهل صریح قال الله تعالیٰ ومن اضل ممن یدعون من دون الله ......"

(یعنی وہ لوگ ہیں جو انبیاء اور اولیاء کو حاجت اور مصیبتوں کے وقت اس اعتقاد سے کہ اُن کی ارواح حاضر ہو جاتی ہیں اور اُن کی ندا کو سنتی ہیں اور اُن کی حاجتوں کو جانتی ہیں، پکارتے ہیں، یہ شرک قبیح اور جہل صریح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُن سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر چراغ جلانے کو منع فرمایا ہے اور چراغ جلانے والے پر لعنت کی ہے۔ شیخ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے مدارج النبوۃ میں لکھا ہے:-

---

[1] ایک مشہور عالم کا یہ شعر پڑھیئے:-

اس میں روضہ کا سجدہ ہو کہ طواف   ہوش میں جو نہ ہو وہ کیا نہ کرے

کہا جائیگا کہ مصرعہ ثانی میں "ہوش میں جو نہ ہو" جو کہہ دیا گیا ہے۔ مگر یہ شعر ذہن کو کس طرف لے جاتا ہے!!

"وبوسہ دادن قبر را وسجدہ کردن آنرا و کلہ نہادن حرام و ممنوع است و در بوسہ دادن قبر والدین روایت فقہی نقل می کنند و صحیح آنست کہ لایجوز"

(قبر کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا اور رخسار رکھنا حرام و ممنوع ہے اور والدین کی قبر کو بوسہ دینے کے بارے میں فقہی روایت نقل کرتے ہیں مگر ٹھیک بات یہ ہے کہ (یہ بھی) جائز نہیں ہے" (بحوالہ الجنۃ لاہل السنۃ از صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۳۰)

اگر ان تمام بدعات و خرافات کو کچھ لوگ اولیاء اللہ کی محبت اور عظمت کی نشانی سمجھتے ہیں تو یہ اُن کے خود تراشیدہ معتقدات اور اُن کا اپنا بنایا ہوا معیار ہے، ان بدعات کو اولیاء اللہ کی محبت اور عظمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی خلاف شریعت باتیں خدا اور رسُول اور اولیاء کرام کی ناخوشی کا باعث ہوں گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل میں کچھ موافق اقوال، اشارات یا تاویلیں بھی ملتی ہیں۔ تو اُن کے بارے میں یہ عرض ہے کہ دینی مسائل میں صوفیاء کے ارشادات کے مقابلہ میں علماء کے اقوال کا وزن بہت زیادہ ہے کہ تصوف، شریعت کا پابند ہے۔ شریعت، تصوف کی پابند نہیں ہے۔ اوّل تو ان میں سے بعض بنیادی مسائل میں علماء متقدمین کے مابین اختلاف نہیں ہے، بعد کے علماء میں جو اختلافات نظر آتے ہیں اُسے کثرت آراء اور شخصیتوں کے وزن سے تولا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔ اگر اس پر بھی کوئی اُلجھن باقی رہے تو کتاب و سنّت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کسوٹی پر کھوٹے کھرے کا بھید کھل جائے گا۔

قبروں کی زیارت کی اجازت ہے مگر میلے لگانے، چراغ جلانے، چادر چڑھانے اور مرادیں مانگنے کے لئے نہیں۔ وہاں جانے کی اجازت اس لئے ہے کہ صاحبِ قبر کے لئے دعائے مغفرت کرے، موت کا دھیان جمائے، اور عبرت حاصل کرے کہ یہ دن مجھے بھی دیکھنا ہے اور ایک دن قبر کا کونا مجھے بھی بسانا ہے۔ اور یہ سب منزلیں نیک اعمال کے ساتھ ہی آسان ہو سکتی ہیں اور ساتھ ہی اللہ کی رحمت پر نظر رکھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نے فرمایا ہے کہ میری بخشش بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کے سبب ہو گی ــــ !

دین کے معاملہ میں جب یہ صورت پیش آئے کہ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہو اور دوسری طرف کسی بزرگ کا معمول۔ تو غیرتِ ایمانی کا یہ تقاضا ہے کہ سنتِ رسُول ہی پر عمل کرے۔ معیارِ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے !

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جب "سماع" شروع ہوتا تھا تو آپ کے مُرید حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ وہاں سے اُٹھ جاتے تھے اور مُرشد کے "معمول" پر اتباعِ سنّت کو ترجیح دیتے تھے !

اللہ کی کتاب جُوں کی تُوں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حضورؐ کی احادیث کتابوں میں محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے کتاب و سنت پر کس کس عنوان سے عمل کیا اُس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ ائمہ فقہہ کی دینی مسائل میں تشریح، تعبیر اور اجتہادات بھی ملتے ہیں۔ ہم کسی بزرگ اور عالم کے قول، فعل، معمول اور طریقہ کو ان پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں۔ جس کسی کا کوئی قول و فعل یا معمول یا کشف و شہود اس کسوٹی پر پُورا نہ اُترے اُس کا رد کر دینا ہی اللہ اور رسُول کی محبت، غیرتِ دینی اور فراستِ ایمانی کی نشانی ہے !

بے نقاب !

حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد سراپا حق اور مجسم واقعیت ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ۔ اسی طرح انسان اپنے قول و فعل سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم نے پچھلے ہزاروں انسانوں کو نہیں دیکھا ۔ لیکن جب تاریخ و سیر میں اُن کی زندگیوں کو ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا تھا ؟ چنگیز کو ظالم ہم اس لئے کہتے ہیں کہ اُس کے کارنامے جو تاریخ بتاتی ہے وہ انتہائی ظالمانہ اور بہیمانہ ہیں ۔ نوشیرواں کے عدل کی شہرت اُس کے انصاف کی وجہ سے ہے، تاریخ میں اُس کے عادلانہ فیصلے اور اقوال ہمیں ملتے ہیں۔ اور انھیں پڑھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ جس شخص کا معاشرے کے ساتھ یہ سلوک ہو، اُسے عادل ہی ہونا چاہیئے ۔

کسی شخص کے ماتھے پر شریف اور رذیل لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص کے کردار سے اُس کی شرافت اور رذالت کا پتہ چلتا ہے ۔ کوئی ولی اور صالح آدمی اپنے ساتھ آسمانی دستاویز، ربّانی سند اور غیب سے لکھا ہوا کوئی سارٹیفکٹ نہیں رکھتا کہ جسے پڑھ کر دنیا یہ جان جائے کہ یہ شخص ولی ہے اور نہ کسی کی ولایت اور صالحیت کی غیبی آوازوں کے ذریعہ تصدیق ہوتی ہے اور نہ اُس کے نام کا اعلان کیا جاتا ہے ۔ اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت کی زندگیوں کو پڑھ کر ہم اُن کی صالحیت اور ولایت کا اعتراف کرتے ہیں اور اُن کی محبت اور احترام سے ہمارا دل معمور ہو جاتا ہے۔ اولیاء کرام اور صلحاء اُمت کی زندگیوں کو پڑھ پڑھ کر اور ان کے حالات سُن سُن کر خود ہم سب کے ذہن میں ولایت و صالحیت کا ایک معیار قائم ہو گیا ہے اور جب کوئی نئی اور اجنبی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اُسی معیار پر اُس کے اقوال و افعال کو پرکھتے ہیں !

جن اولیاء اور صلحاء اُمت کو ہم جانتے ہیں، اُن کو اللہ نے دین کی فہم عطا فرمائی تھی ۔ اُن کی زندگیاں پاکیزہ اور بااخلاق تھیں۔ اُن کی رفتار و گفتار میں وقار اور سنجیدگی پائی جاتی تھی ۔ اُن کی آنکھوں میں غیرت اور شرم و حیا تھی کہ "حیا کو ایمان کی شاخ" فرمایا گیا ہے ! اُن کی باتوں میں ربط و توازن تھا اور جہاں کہیں سوز و جذب کی جھلک آگئی ہے تو وہاں بھی اُن کے اقوال چاہے مبہم اور دقیق ہو گئے ہوں مگر غیر سنجیدہ نہیں ہونے پائے !

اور اولیاء اللہ اور صلحاء اُمت تو بڑی ہستیاں ہیں، عام شریف انسانوں سے دُنیا اخلاق، سنجیدگی اور وقار و غیرت کی توقع رکھتی ہے، جو آدمی خفیف حرکتیں کرتا اور گالیاں بکتا ہے۔ اُس کو معاشرت میں عزت و احترام کا مقام نہیں دیا جاتا ۔ بازاری اور شریف آدمی میں امتیاز اور فرق کیا جاتا ہے ۔

اگر کسی آدمی کے بارے میں یہ اطلاع ملے کہ فلاں آدمی عورتوں کے سامنے کھلے خزانے پیشاب کر دیا کرتا ہے اور کبھی کبھی ہوا میں اُڑنے لگتا ہے ۔ تو کوئی ہوشمند شخص اُس آدمی کو ولی اللہ تو کجا ، اُسے ایک مرد معقول بھی نہ سمجھے گا ۔ اب رہا ہوا میں اُڑنا ۔ تو ہوا میں اُڑنا اور دریا میں چلنا یہ ولایت کا کوئی لازمی نشان نہیں ہے کہ یہ کام ایک جادوگر بھی کر سکتا ہے ۔ ہاں ! زہد و تقویٰ، غیرت و حیا ، وقار و سنجیدگی اور اتباع شریعت ولایت کے خواص و لوازم ہیں۔

ہم نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے کہ یہ کوئی ما بہ النزاع مبحث اور اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ اس باب میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ مقدمات ذہن میں رکھئے اور آگے بڑھیئے ۔

اگست کا رسالہ "تاج" ہمارے سامنے ہے، اُس میں " تذکرہ تاج الاولیا" کے عنوان سے ایک مضمون ہے ،جو محمد یوسف شاہ تاباں کی تالیف کا ایک جزو ہے۔ اس کا ایک اقتباس :-

"حضور تاج الاولیاء، تاج الملت والدین شہنشاہ ہفت اقلیم سید محمد بابا تاج الدین ادام اللہ برہانہ

کی ذات ستودہ صفات موجودہ زمانہ میں حضور رحمتہ اللعلمین کا مجسمہ ہے جس کی تعریف نہ کوئی کرسکا نہ کرسکے !"

اس مبالغہ کے تیور ذرا دیکھتے جائیے — آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:-

"مجذوب کیلئے چند درجے ہیں۔ بعض مجذوب کو ایک تہائی نبوت دیتے ہیں، بعض کو آدھی نبوت بعض کو چوتھائی نبوت، بعض کو آدھی سے زائد، جس کو آدھی سے زیادہ نبوت دی جاتی ہے تو وہ مجذوب صفت نبوت کے سبب تمام مجاذیب سے بڑھ جاتا ہے۔ اور خاتم الاولیاء ہوتا ہے اور تمام ولیوں کا، مجذوبوں کا سردار ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے پیغمبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور سب کے سردار ہیں۔ نبوت کا خاتمہ آپ پر ہوا۔ اسی طرح ولایت کا خاتمہ اس مجذوب پر ہوا۔ جذب پیمبری کا جزء ہے۔"

مرزا غلام احمد قادیانی دوسرے باطل دعووں کے علاوہ اپنی ذات میں نبوت کی ظلیت اور بروزیت کا بھی اعلان کرتا رہا۔ مگر یہاں "ظل" و "بروز" کے اس موہوم پردے کو بھی اُٹھا دیا گیا اور کسی ابہام اور لاگ لپیٹ کے بغیر صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ تاج الدین ناگپوری کو آدھی سے زیادہ نبوت دی گئی تھی۔ ہم اس عبارت کو لکھ رہے ہیں اور قلم کانپ رہا ہے اور زبان بار بار "استغفراللہ" دُہرا رہی ہے۔ اُس شخص کی جرأت کو کیا کہئے جس نے یہ عبارت لکھی ہے۔ اور اُس کی جسارت پر کن لفظوں میں ملامت کیجئے جو ان خرافات کی اشاعت کر رہا ہے!

جس "خاتم الاولیاء (؟)" کو مدیر ماہنامہ "تاج" کے پیر و مرشد یوسف شاہ تاجی صاحب ظلّی یا بروزی نبی سمجھ رہے ہیں۔ اُن کی زندگی کی چند جھلکیاں ناظرین نے دیکھ لیں۔ تو پھر یہ "سلسلۂ تاجی" اور "خانوادہ ناگپوری" کھل کر سامنے آجائے گا۔

"تذکرہ تاج الاولیاء[1]" ایک کتاب کا نام ہے۔ جس کے مؤلف کوئی صاحب "محمد حسام الدین" ہیں۔ مؤلف کے تعارف میں لکھا ہے۔ "ہمشیرزادہ حضرت بابا صاحب قبلہ" کتاب کی پیشانی پر آیت کریمہ "الا ان اولیاء اللّٰہ لاخوف علیہم ولاہم یحزنون" ثبت ہے۔ اور کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے:-

"یعنی تاج الاولیاء، رئیس المجاذیب المتاخرین حضرت سیدنا بابا تاج الدین ناگپوری قدس سرہٗ العزیز کی سیرت پاک اور ملفوظات طیبہ کا بیش بہا مجموعہ۔"

اس "سیرت پاک" (؟) اور "ملفوظات طیبہ" (؟) کے چند اقتباسات:-

"کبھی جنگل میں، کبھی بستی میں گشت لگاتے، کبھی مکان آجاتے تو نانی صاحبہ آپ کے لئے کھانا پیش کرتیں، تو آپ کھانا پھینک دیتے اور کنکر پتھر یہ فرماتے ہوئے نوش فرماتے "دیکھو نانی جی! آج کل ہم یہی کھاتے ہیں"۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جب آپ گھر تشریف لاتے اور نانی صاحبہ کھانا پیش کرتیں تو حضور فرماتے۔ "میرے ساتھ آؤ، کھانا کھاتا ہوں" تو یہ بےچاری آپ کے ہمراہ گھنٹوں پھرتیں اور جب حضور آپ سے مخاطب ہوتے تو یہ کھانا آگے بڑھاتیں تو ارشاد

---

[1] ان اقتباسات اور حوالوں کیلئے ہم جناب مولوی ابو منظور شیخ احمد (ناندیڑ۔ دکن) کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہوتا کہ "یہاں نہیں کھانا" کسی مقام کو بتلا کر فرماتے "وہاں کھاتا ہوں"۔ غرض حضور آپ کو بہت
پھراتے۔ جب پھرتے پھرتے تھک جاتیں تو حضور کھانا لے کر زمین میں دفن فرما دیتے اور مٹی، پتھر
تناول فرماتے۔" (صفحہ ۲۵-۲۶)

پکے پکائے کھانے کو دفن کر دینا، کھانے کا بیجا استعمال اور کفرانِ نعمت ہے۔ بوڑھی نانی کو اس طرح حیران پریشان کرنا اور
پھرانا۔ اگر شانِ جذب ہے تو اس سے قساوتِ قلبی کی بُو آتی ہے اور مٹی پتھر کھا لینا کسی انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ پکا پکایا
کھانا بھی اُسے میسّر ہو۔ یہ بالکل لایعقل لوگوں کی باتیں ہیں۔

یہ تو "سیرتِ طیبہ" کا ایک سادہ سا ورق ہے، اوراقِ رنگا رنگ تو اب آپ کے سامنے آ رہے ہیں:-

"ایک روز حضور ایک درخت پر جو سر راہ تھا بیٹھے تھے کہ ایک مارواڑی درخت کے
نیچے سے گزر رہا تھا کہ حضور نے اس پر پیشاب کر دیا۔ مارواڑی نے پلٹ کر حضور کی جانب
طیش سے دیکھا تو حضور نے ارشاد فرمایا "دیکھتا کیا ہے مقدمہ جیت کر لے آ"۔ (اس
کے بعد مارواڑی کے مقدمہ جیتنے کا ذکر ہے) (صفحہ ۲۸)

ایک راستہ چلتے آدمی پر درخت پر بیٹھ کر پیشاب کر دینا اگر جذب و کرامت ہے تو پھر تہذیب و شائستگی کو چاہیے کہ
وہ گلا گھونٹ کر مر جائیں!

"ایک یورپین عہدہ دار کی بیوی باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ حضور نے اس کے سامنے جا کر
پیشاب کیا۔ ایسا ہی چار پانچ دفعہ حضور نے اس کی بیوی کے سامنے پیشاب کیا" (صفحہ ۳۰)

"ایک روز حضور بالکل برہنہ یورپین لیڈیز کلب میں گھس گئے۔ اسی طرح آپ نے دوسرے
روز بھی کلب میں گھس کر پیشاب فرمایا" (صفحہ ۳۰)

ایک طرف یہ کھلی ہوئی بے حیائی۔ اور دوسری طرف صاحبِ ملفوظات کا یہ دعویٰ کہ "مجھے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا نے اپنا
پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"۔ بفرضِ محال اس کو مان بھی لیا جائے کہ بابا تاج الدین ناگپوری کی واقعی تربیت ولایت میں حضرت
سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تربیت فرمائی تھی اور اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا تھا — تو وہ سیدہ فاطمۃ الزہرا-

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اس ردائے نجابت پہ لاکھوں سلام

اور

آسیا گردان ولب قرآں سرا

کہ شرم و حیا اور غیرت و وقار جن پر ختم تھا، کیا اُن کا تربیت یافتہ اور پیغامبر ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ کہ
[illegible] کے مجمع میں ننگا گھس جائے اور اُن کے سامنے بار بار پیشاب کرے۔ حضرت خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا اس کردار کے ایک
[illegible]دار آدمی کی مُربّی ہوں اور اسے اپنا قاصد اور پیغامبر بنا کر بھیجیں۔ یا اللہ! یہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں -- تیرے غضب اور
[illegible]دہائی!

[illegible] حیا" پر حضور کی (ان ناگپور کے مصنوعی "حضور" کی نہیں۔ اُن کی جو واقعی حضور ہیں۔ اُن پر درود و سلام ہوں) دو حدیثیں

ناظرین کے غور وفکر کے لئے پیش کی جاتی ہیں :۔

"عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الحیاء والایمان قرناءٌ جمیعاً فاذا رُفع احدُھما رُفع الآخر"

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور ایمان یہ دونوں ہمیشہ ساتھ اور اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک اٹھا لیا جائے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے)

(صدقت یارسول اللہ)

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحیاء من الایمان والایمان فی الجنۃ والبذاءُ من الجفاء والجفاءُ فی النار"

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے (یا ایمان کا ثمرہ ہے) اور ایمان کا مقام جنت ہے اور بے حیائی و بے شرمی بدکاری میں سے ہے اور بدی دوزخ میں لے جانے والی ہے)

(صدقت یا نبی اللہ)

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات واقوال کہ جو معنوی تقدیس اور اخلاقی بلندیوں کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اپنا آپ جواب ہیں۔ ایک ایک لفظ کس قدر متوازن اور دل نشین ہے۔ اور دوسری طرف اس "بڑ" کو ملاحظہ کیجئے :۔

"جب حضور وسط ندی میں پہنچے تو آپ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے فرمانے لگے۔ ہر! حضرت اللہ کے پاس ساڑھے تین پیسے ہیں۔ تین پیسے لے لیا۔ آدھا پیسہ لیا، جب شاہ تاج الدین" (ص۲۷-۲۸)

اور

"حضور کبھی کبھی گالیاں ارشاد فرمایا کرتے تھے" (ص۵۰)

جی ! "حضور" ؟ جب عورتوں کے سامنے برہنہ ہو کر پیشاب کر دیا کرتے تھے تو "گالیاں ارشاد فرمانا" اُن کے نزدیک کیا بڑی بات تھی ــــ حضور (؟) ہی جو ٹھہرے !

"تذکرہ تاج الاولیاء کے تین صفحوں (ص۱۳۱ تا ص۱۳۳) پر بابا تاج الدین ناگپوری کی ایک کرامت درج ہے کہ ایک مُردہ لڑکی کے منہ میں باباصاحب کا جھوٹا پانی ڈالا گیا اور لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی ــ پھر:[1]

"حضور نے شبانہ روز گانا سنا اور اس کو خوب نچوایا"۔

اور" جب زنڈیاں حضور کے دربار میں گانے اور ناچنے لگیں تو آپ فرماتے" میں بھی ناچوں، گاؤں"

---

[1] اپنی اس "کرامت" کی کچھ قیمت بھی تو وصول کرنی تھی۔

اور گانے تو آپ کا چہرہ اس قدر سرخ ہو جاتا کہ لوگ آپ کے چہرہ پر نظر نہ جما سکتے ۔ (صفحہ ۱

کیا عجب ہے کہ "تصوف اسلامی" (؟) کے یہ دعویدار بلکہ ٹھیکہ دار رنڈیوں کے ناچ دیکھنے اور گانا سننے کو "سماع" کی وہ قسم قرار دے دیں، جس کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ "اہل کو حلال اور نااہل کو حرام ہے"۔

"داس گرو مہاراج ——— آپ برہمن ہیں۔ حضور کے خاص نظر کردہ ہیں، ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں، صاحب دل ہیں اور صاحب کشف ہیں، ہمیشہ اشعار ذیل حضور بابا صاحب قبلہ کی شان میں پڑھتے اور حضور کے نام کی مالا جپتے ہیں اور بعد میں پوجا کرتے ہیں:۔

بابا رحم کرنا، بچوں کا پالن کرنا   میں اندھا ہوں بندہ تیرا مجھ کو پھود کھلانا

(صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴)

یہ وہ عجمی "تصوف" ہے جو کفر و ایمان کو گلے ملاتا اور دیر و حرم کے فرق کو مٹاتا ہے۔ جس میں صاحب کشف اور صاحب دل ہونے کے لئے "ایمان" کی قید نہیں۔ اور "تذکرہ تاج الاولیاء" کے صفحہ ۴۷ پر تو جو گالی تاج الدین ناگپوری صاحب سے منسوب ہے وہ اس قدر فحش ہے کہ اسے ہم شرم کے مارے دُہرا نہیں سکتے!

ایک طرف یہ زندگی ہے جس کی چند جھلکیاں آپ دیکھ چکے ہیں۔ دوسری طرف آپ کے سامنے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور کلمات طیبہ کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو ماہ اکتوبر کے ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) سے ماخوذ ہیں:۔

"ایک بار آپ نے دیکھا کہ خلیفہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی داڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ جب اس نے نماز ختم کی تو آپ نے اسے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح کی نماز، نماز نہیں ہے۔ یہ نماز قیامت کے روز ناپاک گیند کی صورت میں تیرے منہ پر ماردی جائے گی۔"

یہ ہے اہل اللہ کا "**جذب و سوز**" جو وقت کے مسلمان بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو اس طرح ٹوکتا ہے اور ایک وہ "جذب" ہے جو کافروں کی روحانی تربیت کرتا ہے۔

"ایک روز آپ (سفیان ثوری) حمام میں گئے۔ اتفاق سے ایک بے داڑھی مونچھ کا لڑکا وہاں آ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی اسے باہر نکال دو۔ کیونکہ ہر ایک عورت کے ساتھ تو ایک ہی شیطان رہتا ہے۔ لیکن اس قسم کے لڑکوں کے ساتھ اٹھارہ شیطان رہتے ہیں جو اُن کو لوگوں کی نظروں میں مزین کرکے پیش کرتے ہیں۔"

ایک طرف تصوف کا یہ اخلاق و تقویٰ ——— دوسری طرف "جذب و تصوف" (؟) کی وہ بے راہ روی کہ رنڈیوں کا گانا سنا اور ان کا ناچ دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ "تذکرہ تاج الاولیاء" کے مؤلف کے بقول ایک مری ہوئی لڑکی[1] کو اپنی کرامت سے زندہ کرکے اُس بیچاری کو بھی نچوایا جاتا ہے۔

ایک طرف وہ ملفوظات کہ جن میں نہ صرف یہ کہ بدحواسیاں اور بے ربطیاں بلکہ گالیاں تک پائی جاتی ہیں اور دوسری

---

[1] نہ جانے اصل واقعہ کیا ہے؟

طرف اخلاق و شائستگی اور عرفان و حکمت کے یہ گہر ہائے شب چراغ ملتے ہیں۔

"آپ فرمایا کرتے تھے کہ اے حدیث کے جاننے والو! حدیث کی زکوٰۃ دو۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت حدیث کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا۔" دو سو حدیثوں میں سے پانچ پر عمل کرنا۔"

"فرمایا — اگر ایک سال میں آنکھوں سے آنسو ایک ہی قطرہ نکلے۔ لیکن وہ ہو، خدا ہی کے لئے تو یہ بھی بہت ہے۔"

"فرمایا — جو درویش کسی امیر و سلطان کا فریفتہ ہو، جان لو کہ وہ چور اور ریاکار ہے۔"

"فرمایا — پہلی عبادت خلوت نشینی ہے، پھر طلبِ علم ہے۔ اس کے بعد علم پر عمل اور اس کے بعد اس کی اشاعت۔" (ملفوظات، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ)

یہ ہیں وہ اہل اللہ جنہوں نے عرفان و ہدایت اور سلوک و تصوف کی شمعیں روشن کی ہیں۔ جن کا "جذب" بھی شریفانہ شائستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں نازل ہوں۔

اُن لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے، جنہوں نے بے حیائی کی باتوں کو "کرامت" اور گالیوں کو "کلمات طیبات" ہے۔ اور اس خرافات کو عرفان و تصوف کا بہت بڑا کارنامہ سمجھ کر منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ وہ اس طرح اس نام کو بٹہ لگا رہے ہیں!

اگر اس قسم کی خلافِ شریعت اور خلافِ اخلاق باتوں کو ہی "جذب" کہتے ہیں اور اس مزاج و کردار کے آدمی "مجذوب" ہیں، تو یہ پورا فلسفۂ جذب و سوز اسلام کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا اور اس قسم کے لایعقل لوگوں کی حرکات پر "کا ٹھپہ لگا کر "جذب" کے بارے میں یہ تک کہہ دینا کہ:

"جذب پیمبری کا جزو ہے۔"

حضورؐ کی "سیرت مقدسہ" پر کتنا گمراہ کن الزام ہے!

ایک آدمی کسی دماغی مرض کی وجہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ مخبوط اور مجنون ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی شریعت کی پابندیوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ان غیر ذمہ دارانہ حالات کو "جذب" اور ایسے ہوش و حواس کھوئے ہوئے کو "مجذوب" ہی کہنے پر اصرار کرتا ہے، تو وہ کہہ سکتا ہے۔ مگر جب اس قسم کے مجذوب کو یہ سمجھا جائے۔

"شہنشاہ ہفت اقلیم سید محمد بابا تاج الدین (نگار اللہ برہانہٗ) کی ذات ستودہ صفات موجودہ زمانہ میں رحمۃ للعٰلمین کا مجسمہ ہے، جن کی تعریف کوئی کر سکا نہ کر سکے۔"

تو ان "مبالغوں" کو کوئی غیرت مند کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ اس ہوش و حواس، مزاج، اخلاق اور گفتہ کردار کے آدمی کو "حضور رحمۃ للعٰلمین کا مجسمہ" کہنا کتنا بڑا بول ہے۔ جس کے تصور سے ایمان لرز جاتا ہے کہ یا اللہ! سُن رہے ہیں اور یہ ہو کیا رہا ہے؟

اگر غیر مسلموں کے سامنے تاج الدین ناگپوری کے سوانح حیات پیش کرکے یہ کہا جائے کہ "یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا مجسمہ تھے" تو خود حضورؐ کی ذات کے بارے میں غیر مسلم کیا رائے قائم کریں گے؟

ہم نے "جذب و تصوف" کی بے اعتدالیاں بھی دیکھی ہیں۔ شرح و بیان میں بھی اور قول و عمل میں بھی۔ مگر رسالہ

تو تمام حدود کو توڑ دیا ہے:-

جنہیں دیکھا ہے میں نے بھی، جنہیں پوجا ہے میں نے بھی
وہی آقا وہی سرکار، تاج الدین بابا ہیں! (رسالہ "تاج" ماہ اگست ۵۶ء)

خود ایک شعر ذہین شاہ تاجی مدیر "تاج" کا بھی اس شمارے میں شائع ہوا ہے۔

حقیقت ثم وجہ اللہ کی ہے منکشف ہم پر
جدھر منہ کیجئے سرکار تاج الدین بابا ہیں (استغفر اللہ)

اگر یہ "وحدت الوجود" ہے تو پھر "شرک" کسے کہتے ہیں۔

خود بابا تاج الدین ناگپوری کا یہ دعویٰ کہ:-

"مجھے حضرت سیدہ فاطمہ زہرہؓ نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔"

مُریدِ بابا تاج الدین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو "آدھی سے زیادہ نبوت دی گئی تھی"۔ اور "وہ حضورؐ رحمۃ للعٰلمین کے مجسمہ تھے" —— اور —— "جن کی تعریف نہ کوئی کرسکا نہ کرسکے۔"

حالانکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے سزاوار ہیں —— پھر بابا تاج الدین سے "پوجنے" اور "ثم وجہ اللہ" کی صفات کی نسبت —— ان کڑیوں کو ملا کر سوچئے کہ گمراہی کی کس حد تک یہ معاملہ پہنچ چکا ہے!! توبہ!

مدیر "تاج" کے مسلک و مشرب کو ہم ایک حد تک جانتے تو تھے۔ مگر اس کا پتہ نہ تھا کہ یہ حضرت ان بھول بھلیوں کی اس آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر صرف "وحدت الوجود" ہی کا مسئلہ مابہ النزاع ہوتا تو اس پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ مگر "سلسلۂ تاجی" کے "فکر و عمل" اور معتقدات کی چند جھلکیاں اوپر پیش کی گئی ہیں اس کے بعد ہم کہیں تو کیا کہیں؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے!
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

ہم "تبصرہ پر تبصرہ" اور "جواب علی الجواب" کے اس سلسلہ کو بند کرتے ہیں۔ ہم نے اس فرصت میں خاصی شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ اربابِ بصیرت کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے بہت کافی ہے کہ کس کا کیا موقف ہے!

ہم دعا کرتے ہیں کہ جس "جذب و سوز" کا ماہنامہ "تاج" مبلغ و ناشر ہے، اُس کی پرچھائیں سے بھی مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بچائے رکھے، اور مسلمانوں کو اُس انسانِ کامل اور داعیٔ برحق کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے، جن کی زندگی غیرت و شائستگی، وقار و سنجیدگی، شرم و حیا اور پاکیزگی و تقویٰ کے پھولوں سے معطر ہے۔ اور جن کی نعلینِ مبارک کے ذرّے بھی جس انسان کو چھو جائیں گے وہ شائستہ اور غیرت مند ہو جائے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور ہر بے حیائی، فحاشی اور بے راہ روی سے برأت کا اعلان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے صحتِ جسم و روح، اصابتِ فکر و نظر، غیرت و نیکوکاری، خوش اخلاقی اور اتباعِ سنت کی توفیق طلب کرتے ہیں (آمین!)

ادیٔ اکبر

اقی جاوید بی اے

خوش زمیں پہ وہ بھیجا ہوا خدا کا رسولؐ
حجاز و نجد کے صحرا میں زندگی کا وہ پھول

وہ بزمِ قدسِ رسالت کی آخری مشعل
وہ سلسبیلِ ہدایت کا جگمگاتا کنول

وہ جس نے لات و ہبل کا طلسم توڑ دیا
فضائے قدس سے رشتہ زمیں کا جوڑ دیا

وہ جس کی گود میں لی رحمتوں نے انگڑائی
محیطِ خلد بنی اس زمیں کی پہنائی

وہ جس نے کاکلِ ہستی کے پیچ کھول دیئے
مئے حیات میں مشک و عبیر گھول دیئے

وہ جس نے تیرہ ضمیروں کو مہر و ماہ کیا
صنم کدوں کے غلاموں کو عرش جاہ کیا

چراغِ سطوتِ شاہی کے گل کئے جس نے
سیاہ رات کے پردے الٹ دیئے جس نے

وہ دوشِ پاک پہ ڈالے ہوئے دریدہ گلیم
اٹھا جلو میں وہ لے کر اک انقلابِ عظیم

وہ انقلاب جو ہے سنگِ میلِ بدر و حنین
زمیں کو جس نے پلایا ہے خونِ گرمِ حسینؓ

وہ انقلاب کہ قرآنِ پاک جس کی دلیل
دلوں میں جس نے جلا دی یقین کی قندیل

وہ انقلاب کہ جس سے ہے گرم نبضِ حیات
چمک رہی ہے ابھی تک جبینِ نیل و فرات

کھلے ہیں جس کی ہواؤں سے معرفت کے پھول
ہوا ہے فارس و روما پہ زندگی کا نزول

لیا ہے سطوتِ کسریٰ و کَے سے جس نے خراج
بدل دیا ہے زمانے کا تلخ و ترش مزاج

اُس انقلاب کی شمعیں جلیں گی ہستی میں
زمانہ کتنا ہی ڈوبے خرد کی پستی میں

افکار

عاصی کرنالی

کہیں دُنیا میں مروت کی نظر ہے کہ نہیں
یہ نیستاں ہے، یہاں کوئی شجر ہے کہ نہیں

حُسن نے ڈال لیا عارضِ رنگیں پہ نقاب
کہ کوئی واقفِ آدابِ نظر ہے کہ نہیں

لوگ سورج کے نکلنے کو سمجھتے ہیں سحر
سوچتا ہوں کہ یہ مفہومِ سحر ہے کہ نہیں

جن کی کرنوں سے ہیں تقدیر کی راہیں روشن
اُن ستاروں کو کچھ اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں

پھُول کے بعد ذرا خارِ گلستاں کو بھی دیکھ
وہی نظارہ بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں

موجِ دریا کی طرح چاہیئے ہستی کا سفر
یہ نہ دیکھو کہ کوئی راہ گزر ہے کہ نہیں

چمنِ شوق کی افسردہ کلی ہیں ہم لوگ
اِس طرف بادِ مروت کا گزر ہے کہ نہیں

اشکِ اخلاص جسے کہتے ہیں اے دیدۂ تر
تیرے دریا میں وہ انمول گہر ہے کہ نہیں

آدمی عیب سے بچتا رہے، یہ بھی ہے ہنر
آپ انصاف سے کہیئے، یہ ہنر ہے کہ نہیں

عرضِ نیاز

فضا ابن فیضی

الٰہی مجھ کو بینائی عطا کر — خدائی کو تماشائی عطا کر
مرا نالہ رہینِ خاک کیوں ہو — اسے تو عرش پیمائی عطا کر
رہے تیری طلب، پا کر بھی تجھ کو — وہ ذوقِ ناشکیبائی عطا کر
مرے ذرّوں کی تقدیرِ زبوں کو — طرازِ انجم آرائی عطا کر
لبِ قلزم کو وسعت دینے والے — اس اک قطرے کو پہنائی عطا کر
مری دنیا کی پیرانہ سری کو — توانائی و برنائی عطا کر
میں ہنگاموں سے اب اکتا گیا ہوں — مجھے محفل میں تنہائی عطا کر
ہیں محرومِ بصیرت دل کی آنکھیں — عطا کر ان کو بینائی عطا کر
ہنر کے بربطِ خاموش کو پھر — ہوائے نغمہ پیرائی عطا کر
طبیعت ہو جو غواصِ معانی — تو دُرِّ نکتہ آرائی عطا کر
سوادِ خطِ طغرائے جبیں کو — فروغِ روئے سودائی عطا کر
تخیل کو بلندی کی سند دے — تفکر کو توانائی عطا کر
رہے حسنِ بیاں میں دلفریبی — زباں کو لطفِ گویائی عطا کر

فضاؔ کے ناتراشیدہ قلم کو
تمیزِ نکتہ آرائی عطا کر

نقشِ تازہ

ماہر القادری

منزلیں ہی منزلیں ہیں کارواں کے سامنے — گرد ہیں لیکن یہ سب عزمِ جواں کے سامنے
میرے شکوے اُس بُتِ نامہرباں کے سامنے — آبگینے جس طرح کوہِ گراں کے سامنے
اب نہیں ہے کچھ بھی سعیِ رائیگاں کے سامنے — ایک نقشِ سجدہ پھر بھی اُن کے آستاں کے سامنے
رکھ دیئے کس شوخ نے کچھ جھلملاتے سے چراغ — ماہ و انجم کے مقابل، کہکشاں کے سامنے
خندۂ گل، گریۂ شبنم، چمن کی دھوپ چھاؤں — کتنے نازک مسئلے ہیں باغباں کے سامنے
چوٹ کھانے کو ترستا ہے بڑی مدت سے دل — لے چلو مجھ کو کسی ابرو کماں کے سامنے

زمزمہ سنجانِ گلشن، خوشنوایانِ بہار
دم بخود ہیں سب مری طرزِ فغاں کے سامنے

روحِ انتخاب

عبدالقادر عودہ شہید

ہم مسلمان اس بات پر تو بہت خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ ہم اسلام سے منسوب ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم اسلام کے اہم ترین احکام سے ناواقف ہیں اور اس کی عظیم ترین بنیادوں سے لاپروائی برتتے ہیں !

اسلام کے احکام عبارت ہیں اُن مبادی اور نظریات سے جن کو لے کر قرآن نازل ہوا اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس لائے، انہی مبادی اور نظریات کو ہم اسلامی شریعت کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے شریعت مجموعہ ہے اُن مبادی و نظریات کا جن کو اسلام نے توحید، ایمان، عبادات، شخصی احوال، جرائم، معاملات اجتماعی، امارات اور سیاست، غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جاری و نافذ کیا ہے !

اسلام کی بنیادوں میں عظیم ترین بنیاد اس کے احکام کو روبہ عمل لانا ہے۔ کیونکہ اسلام اپنے احکام کی تعلیم و دعوت اور اپنے شعائر اور ضابطوں کی اقامت کے بغیر پایا نہیں جاسکتا۔ اس طرح یہ بات آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس نے شریعتِ اسلامی پر عمل کی طرف سے لاپروائی برتی یا اس کو معطل کردیا تو گویا اس نے اسلام ہی سے غفلت برتی اور اس کو معطل کردیا۔

اسلامی احکام دونوں نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک تو وہ احکام ہیں جن سے "مذہب" کی اقامت ہوتی ہے اور یہ مشتمل ہیں عقائد و عبادات کے احکام پر۔ اور دوسرے وہ احکام ہیں جس کے ذریعہ سلطنت وجماعت کی تنظیم ہوتی ہے۔ اور افراد اور جماعت کے باہم روابط کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اور یہ احکام معاملات، تعزیرات، شخصی حالات، دستوری اور حکومتی ضوابط و قوانین وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اس طرح گویا اسلام مسجد و ایوان، عبادت و قیادت سب کو اپنے دائرہ میں لے کر ان کے درمیان امتزاج پیدا کرتا اور دین و دُنیا کی تفریق کو مٹاتا ہے۔ جس طرح مذہبی احکام اسلام کا جزو ہیں اسی طرح حکومت اس کا دوسرا اہم جزو ہے۔ اور بالکل سچ فرمایا عثمان غنیؓ نے کہ :-

إِنَّ اللهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ !

(اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعہ اس شر کو دفع فرماتا ہے جو قرآن کے ذریعہ دفع نہیں کرتا !)

اسلام کے احکام اپنے تنوع اور کثرت کے باوجود محض دُنیا و آخرت میں انسان کی سعادت و فلاح کے مقصدِ وحید کے لئے ہیں۔ یہیں سے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر دُنیوی عمل کا اُخروی پہلو ہوتا ہے۔ پس کوئی تصدیری فعل ہو کہ مدنی، جنائی ہو کہ دستوری یا حکومتی، اس کا ایک اثر ادائے فرض کے پہلو سے یا مسائل کے حل و عقد کے تعلق سے یا کسی کا حق دلوانے یا ساقط کرنے کی رُو سے یا کسی سزادہی کی خاطر یا جواب دہی کے ضابطوں کے معاملہ میں دُنیا میں مترتب ہوتا ہے۔ لیکن وہی فعل جس کا اثر اس طرح دُنیا میں مترتب ہوتا ہے اس کا ایک دوسرا اثر آخرت کی زندگی پر بھی مترتب ہوتا ہے اور وہی آخرت کا عذاب و ثواب کہلاتا ہے۔

جب شریعت کا مقصد ہی دُنیا و آخرت میں لوگوں کی سعادت و فلاح ٹھہرا تو وہ ایک ایسی وحدت ہے جو تجزیہ کو

قبول نہیں کرتی، اور ایک ایسا تسلسل ہے جو کبھی ٹوٹتا نہیں تو پھر اس کا کچھ حصہ لے لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا اس کے مقصد کو فوت کر دینے کے مترادف ہے!

شریعتِ اسلامی کے احکام دُنیا و آخرت کے لئے یونہی عبث شروع نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ خود شریعت کی منطق ہی اس کی مقتضی ہوتی ہے۔ شریعت کے اصول اس لئے برقرار کئے گئے ہیں کہ یہ دُنیا آزمائش و فنا کی جگہ ہے۔ اور آخرت بقاء اور جزاء کا گھر۔ انسان اپنے اعمال کے لئے دُنیا میں مسئول ہے اور آخرت میں جزا و سزا کا مستحق۔ اگر اس نے یہاں اچھے کام کئے تو اپنا بھلا کیا اور اگر بُرے کام کئے تو اپنا بُرا کیا۔ نیز یہ بات کہ صرف دُنیوی سزا اُخروی سزا کو روک نہیں دیتی کہ وہ اس سے خود بخود ساقط ہو جائے اِلّا یہ کہ انسان سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے اور اس کی طرف رجوع لائے۔

شریعتِ اسلامی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے بالکل ممتاز ہے۔ کیونکہ اس نے دین و دُنیا کی تفریق کو ختم کر کے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ اور وہ دُنیا و آخرت دونوں کے لئے شروع کی گئی ہے اور یہی وہ بات ہے جو شریعت پر ایمان رکھنے والوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کی اطاعت علانیہ اور پوشیدہ ہر حال میں کریں۔ مشکلات میں بھی کریں۔ اور آسانی و فراغت کے وقت بھی کریں کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور احکامِ شریعت کے پابند ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ اطاعت بھی عبادت ہی کی ایک نوع ہے جو اُن کو اللہ تعالیٰ کا قرب بخشتی ہے اور یہ کہ اس قانونِ الٰہی کی اطاعت کے نتیجے میں اُن کو اس کا بہترین صلہ ملے گا!

یہ سب چیزیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ایک ایسے معاشرے میں جو مذکورۂ بالا تصورات کی بُنیاد پر قائم کیا گیا ہو۔ کم سے کم جرائم ہوں، اس میں امن کی محافظت اور نظمِ اجتماعی کی ضمانت وجود میں آئے۔ برخلاف اس کے انسان کے خود ساختہ قوانین کا کیا حال ہے؟ ان لوگوں کے باطن میں جن پر کہ یہ منطبق ہوتے ہیں عام طور پر کوئی اندرونی محرک ایسا نہیں ہوتا کہ از خود انھیں ان قوانین کی اطاعت پر آمادہ کرے۔ وہ صرف ان کی اتنی ہی اطاعت کرتے ہیں جتنا کہ ان کی ظاہری گرفت کا انھیں اندیشہ ہوتا ہے اور اگر کوئی کسی بھی جرم کے ارتکاب کی طاقت رکھتا ہے اور اس کا موقع پاتا ہے اور قانون کی پکڑ کا اندیشہ بھی نہیں رکھتا تو پھر اس کو اس جرم کے ارتکاب سے روکنے کے لئے واضعانِ قانون کے ہاں کوئی اخلاقی ضابطہ ہے، نہ طریقہ کار، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان ممالک میں کثرت سے جرائم ہو رہے ہیں اور روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ جہاں قانون کا اطلاق تو وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے مگر اخلاق کمزور سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور مجرموں کی تعداد "روشن دماغ" تعلیم یافتہ طبقات میں اخلاقی فساد کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس گروہ کے افراد خود اپنے قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں انتہائی کمال کا مظاہرہ کرتے ہیں!

احکامِ شرعی ناقابلِ تقسیم ہیں اور تفریق کو ہرگز قبول نہیں کرتے۔ یہ محض اسی لئے نہیں جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے کہ تفریق شریعت کے مقصد کو فوت کر دیتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ شریعت کے نصوص میں اس بات کی سختی سے ممانعت آئی ہے کہ اس کے بعض حصوں پر عمل کیا جائے، اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی جیسے کہ اس کے بعض حصوں پر ایمان اور بعض حصوں کے انکار کی ممانعت آئی ہے۔ اس لحاظ سے سارے احکامِ شریعت پر عمل اسی طرح واجب ٹھہرتا ہے جس طرح کہ ان ساری چیزوں پر ایمان جن کو شریعت لے کر آئی ہے۔ لہٰذا جو کوئی اس کُل پر ایمان نہیں لائے گا اور عمل نہیں کرے گا [illegible] کے اس قول کے تحت آئے گا:-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ -

(کیا تم کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے اس کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں وہ رسوائی کا شکار رہوا اور آخرت میں ایسے لوگ سخت ترین عذاب میں ڈال دئے جائیں گے -

شریعت کے بعض حصوں پر عمل کرکے بعض حصوں کے چھوڑنے کو حرام قرار دینے والے کئی نصوص وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً :-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ - إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ - (البقرہ ۱۵۹-۱۶۰)

یقیناً وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی کھلی حقیقتوں اور ہدایتوں کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کے لئے کتاب میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت بھیجنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ . . . . . .

شریعت اسلامی کسی خاص وقت کے لئے نہیں ہے کہ دوسرے وقت سے اس کا تعلق نہ ہو۔ کسی خاص دور سے وہ متعلق نہیں کہ اس کے سوا دوسرے ادوار میں وہ کام نہ دے سکے، اُن کا دامن کسی خاص زمانہ کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے، وہ تو ایک دائمی شریعت ہے جس کا تعلق ہر زمانہ سے ہے اور اس وقت تک کے لئے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ زمین اور اس کی ساری چیزوں کا بذات خود بجا طور پر وارث ہو جائے گا اور شریعت کے نصوص کچھ اسی طرح مرتب کئے گئے ہیں کہ ان پر زمانہ کے تغیرات کا نہ تو کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ زمانے کے تغیرات و نیرنگیوں سے ان کی جدت اور تازگی میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اس کے عام اصول اور بنیادی نظریات تغیر کا مطالبہ ہی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ نصوص اپنے عمومیت اور قابلیت عمل کی حیثیت سے اس طرح ہیں کہ ان کا اطلاق ہر جدید حالت پر ہوتا ہے -

اسی لئے نصوص شریعت تغیر اور تبدیلی و ترمیم کو قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ غیر الٰہی قوانین کے نصوص تغیرات اور ترمیمات کا آئے دن نشانہ بنتے رہتے ہیں!

شریعت اسلامی قانون وضعی سے تین پہلوؤں سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے :-

(۱) شریعت اللہ کی طرف سے ہے، اس کے برخلاف قانون انسانی دماغ کا ساختہ ہے اور دونوں چیزیں شریعت اور قانون اپنے اپنے صانعین اور واضعین کے صفات کی جھلک اپنے اندر رکھتی ہیں۔ چونکہ قانون انسانی عقل کی پیداوار ہے اس لئے وہ اپنے اندر بشری نقائص اور بشری مجبوریوں اور بے تدبیریوں کو نمایاں کئے ہوئے ہے، تب ہی وہ بار بار تبدیلیوں اور ترمیمات کا نشانہ بنتا رہتا ہے، چاہے آپ اس کا نام "ارتقاء" رکھ لیں۔ جب کبھی انسانی سوسائٹی ایک ایسے مرحلہ پر پہنچتی ہے۔ جو پہلے سے متوقع نہیں تھی یا اس کے حالات اتنے بدل جاتے ہیں کہ پہلے اس کا ذہن میں تصور بھی واضح نہیں تھا تو قانون میں ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس طرح قانون ہمیشہ ناقص اور نامکمل ہی رہتا ہے اور اس کے لئے کمال کی حد کو اس وقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں جب تک کہ اس کے واضعین کمال سے متصف نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن

[illegible]

بات ہے۔ کیونکہ آدمی ماضی پر نگاہ ڈال سکتا ہے مگر مستقبل کے حالات کی پیش بینی اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے برخلاف شریعت کا صانع اللہ تعالیٰ ہے اور شریعت اپنے اندر خالق کی قدرت، اس کے کمال، اس کی عظمت اور اس کے علمی احاطہ کا جو گزشتہ و آئندہ سب کو شامل ہے، زبانِ قال و زبانِ حال دونوں سے اعلان کرتی ہے۔ پس شریعت کو علیم و خبیر ہستی نے بنایا ہے جو کہ حال و مستقبل کی ساری ضروریات سے پوری طرح آگاہ ہے!

اس شریعت پر تیرہ سو برس سے زیادہ کا زمانہ گزرا ہے، جس کے دوران میں لوگوں کے طریقہ ہائے زندگی بدل گئے، اُن کے آراء و افکار اور علوم و فنون میں عظیم الشان انقلابات آگئے۔ ایجاد و اختراع کے میدان میں ایسی حیرت انگیز چیزیں دُنیا کے سامنے آئیں کہ انسان کے حاشیۂ خیال میں نہ آئی تھیں۔ اور قانونِ وضعی کے اصول و نصوص کئی مرتبہ بدل گئے تاکہ جدید حالات اور نئے ظروف کے ساتھ مطابق ہوسکیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس قانون کے ان اصول و قواعد میں جو آج انسانی زندگیوں پر منطبق کئے جاتے ہیں اور ان اصول و قواعد میں جو اُس دَور میں منطبق کئے جاتے تھے جبکہ شریعت کا نزول ہوا تھا۔ زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے، مگر ان سب تغیرات و انقلابات کے درمیان شریعتِ اسلامی اپنے مقام پر اٹل ہے، نہ اس نے کسی تغیر کو قبول کیا ہے نہ ترمیم کو۔ اس کے مبادیات اور نصوص میں اب بھی انسانی سوسائٹی کی تنظیم اور اُن کی ضروریات کی کفالت و ترقی کا مکمل انتظام ہے۔ وہ ان کی فطرت اور طبائع سے اب بھی اتنی ہی قریب ہے جتنی پہلے تھی۔ وہ ان کے امن و سکون کی سب سے بڑی محافظ ہے!

یورپی قوانین کا بلادِ اسلامیہ میں داخلہ کا پہلا اثر یہ مترتب ہوا کہ ان ممالک میں خاص قسم کی عدالتیں وجود میں آئیں جو مغربی طرز کے قوانین کو جاری کرنے والی تھیں اور ان عدالتوں میں یا تو یورپین جج مقرر ہوئے یا وہ مقامی جج جنہوں نے ان قوانین کی تعلیم تو خوب حاصل کی تھی مگر شریعت کی تعلیم سے کورے تھے اور ان نئی عدالتوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک مخصوص دائرے سے باہر ہر چیز سے بے نیاز سمجھتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شریعت عملاً معطل ہوگئی۔ کیونکہ وہ لوگ سوائے اپنے وضع کردہ قوانین کے کسی اور قانون کو لوگوں کی زندگی پر منطبق نہیں کرتے تھے!

اس طرح سے تعلیم کے ذمہ داروں نے بھی اس قانون کی تعلیم کے لئے خاص مدارس قائم کردیئے اور وہاں بڑے اہتمام کیساتھ ان مغربی قوانین کی تعلیم دی جانے لگی اور شریعت کے ساتھ بے نیازی اور لاپرواہی کا ثبوت دیا گیا۔ البتہ چند مسائل شریعت پر توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً وقف وغیرہ کے احکام اور اس کا جو افسوسناک نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا کہ تقریباً سارے قانون دان حضرات جو کہ اس تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق تھے، شریعتِ اسلامی کے احکام و قوانین سے بالکل بے بہرہ اور ان کو زندگی کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے، یہ حضرات اسلام کے احکام سے انتہائی افسوسناک حد تک بے خبر تھے۔ اُس دین سے بے خبر تھے جس کی پیروی کا یہ مسلمان حکومتیں دعویٰ کرتی تھیں۔ بالآخر شریعت سے اس بے خبری نے یہ گُل کھلایا کہ شریعت سے ماخوذ چند نصوص کی تفسیر اس انداز سے کی جانے لگی جو اُن کے قوانین وضعی سے تو اتفاق کرلیں مگر شریعت کی رُو سے بعض احوال میں بالکل متغائر ہوں۔

(اُردو ترجمہ از عمر بن عبداللہ ایم اے عثمانیہ)

ہماری نظر میں

افکارِ صدا | از:- سید ذاکر حسین صدا لکھنوی (ایم اے) کتابت، طباعت، کاغذ دیدہ زیب اور معیاری۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ طعامستان، پیر کالونی کراچی۔

جناب صدا لکھنوی خاموش اور نمود و شہرت کے معاملہ میں ایک قناعت پسند شاعر ہیں۔ اُن کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ خود کراچی کے ادبی حلقوں میں وہ پوری طرح متعارف نہیں ہیں۔ صدا صاحب کو حضرت آرزو لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اُن کے "سلاموں" کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، موصوف "دو تخلصوں" کے شاعر ہیں۔ سلاموں میں ذاکر اور غزلوں میں صدا تخلص کرتے ہیں۔

صدا کے کلام میں سادگی اور زبان کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ موصوف غزل میں فلسفہ اور تصوف لانے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر میں جب کوئی چیز خود بخود نہیں آتی بلکہ "لائی" جاتی ہے تو اس میں آورد کی بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صدا کے کلام میں واردات کی ترجمانی قرینہ کے ساتھ ملتی ہے اور وہ اظہارِ خیال کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ چند نمونے:-

نسیمِ صبح کا انداز یہ بتاتا ہے ___ اُٹھا اُٹھا یہ سرا پردۂ بہار اُٹھا

اپنی سی کر کے دیکھئے یہ حوصلہ ہے جی کا ___ شاید نصیب میں ہو مُنہ دیکھنا خوشی کا

اک پتنگے میں بھی جب تک دم رہا ___ شمعِ محفل کا وہی عالم رہا

ہوش اتنا ہے کہ بُت خانہ میں رکھا تھا قدم ___ اب خدا جانتے رہا یا مرا ایمان گیا

آنکھ سے اشکِ ندامت اِس طرف دامن تک گئے ___ اور اُدھر فردِ گنہ کا ہر ورق سادا ملا

خطروں سے کھیلتے تھے کبھی اب یہ حال ہے ___ پتہ بھی ہل گیا تو کلیجہ دہل گیا

وہ کیا پھیر سمجھیں گے راہِ وفا کے ___ جو اوروں کے نقشِ قدم دیکھتے ہیں

حالِ دل کا نہ پوچھ اے ہمدم ___ اب تو غم بھی نہیں خوشی کیسی

بات وہ بھی تھی جو رہی دل میں ___ لب تک آئی تو اور بات ہوئی

دے دیا دل آپ کو پہچان کے ___ چوٹ یہ کھائی ہے ہم نے جان کے

ہم ہیں وہ چوبِ خشک کہ پوچھا نہیں کبھی ___ آتی ہوئی خزاں نے نہ جاتی بہار نے

بیمار کی منت ہے کہ بیٹھے ہی رہیں آپ ___ وہ تو یہ سمجھائے گا آرام نہیں ہے

جب دل نہ رہا دل اُسے کیا کہہ کے پکاریں ___ ٹوٹے ہوئے شیشہ کا کوئی نام نہیں ہے

باغباں! ساری بہاریں ہیں ہمارے دم سے ___ خاک اُڑتی نظر آئے گی اگر ہم نہ رہے

دوسرا رخ:- تقریر اُن کی سن کے ہم اتنا سمجھ سکے ___ باطن میں انکسار نہ تھا غرور تھا (صدا)

بالکل سپاٹ اور بے مزہ شعر ہے۔

ہم سادہ دل پرستش کرتے ہیں بس اُسی کی — جو خلق کا ہو چُتلا، جو بُت ہو سادگی کا (صفحہ ۵)

"مجسم سادگی یا سراپا سادگی" کہنا چاہیئے تھا۔ "جو بُت ہو سادگی کا" یہ کیا اندازِ بیان ہے۔ کاش! مصرعہ ثانی یوں ہوتا:-

"جو خلق کا ہو پُتلا، پیکر ہو سادگی کا"

دل کی اُلجھن رہ گئی اور وہ پہچان گیا — چارہ گر بادرد مجھے دیکھ کے پہچان گیا (ص۶)

"دل کی اُلجھن رہ گئی" میں "وہ" کی تعقید بہت کھٹکتی ہے، چارہ گر کے آنے سے پہلے "درد" کی بس یہی حالت تھی کہ دل کو اُلجھن تھی اور ہیجان تھا — یہ تو بڑے معمولی درجہ کا "دردِ دل" ہوا۔

میدانِ حشر بن گیا ہے عرصۂ حیات — کس کو یہاں ہے فکر کہ اوروں پہ کیا ہوا۔ (ص۱۵)

"بن گیا" میں "الف" بُری طرح دب رہا ہے۔ "اوروں پہ کیا ہوا" بھی محلِّ غور ہے!

فصلِ گل کیا آگئی گلزار تک! — ہو گئے جو سبز سُوکھے خار تک (ص۳۶)

اس قسم کے سپاٹ شعر مجموعہ کلام سے چھانٹ دینے چاہیئے تھے۔

جس کے دل ہے وہی سمجھتا ہے — جلنا کچھ اور ہے جلانے سے (ص۷۱)

مصرعہ ثانی زبان اور اظہار کے اعتبار سے کس قدر کمزور ہے اور بندش کی سُستی اُس پر مستزاد!

"ماہنامہ تخلیق" ترتیب:- مشفق خواجہ۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت فی پرچہ بارہ آنہ۔ سالانہ آٹھ روپے۔
ملنے کا پتہ:- دفتر "تخلیق" ۲۲/۳ جہانگیر روڈ۔ کراچی ۵

ماہنامہ تخلیق بڑی آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ مضامین کا تنوع اور پھر حُسنِ ترتیب غرض شروع سے لے کر آخر تک رسالہ دل چسپ ہے۔ لکھنے والے مشّاق، نومشق، مشہور اور گمنام، جدید و قدیم ہر لہجہ اور ہر حلقہ کے ہیں۔ اس شمارے کے سب سے زیادہ وزنی تنقیدی مضامین ہیں۔ جو فاضل مُدیر نے اپنے مجلّہ کے لئے خاص طور سے حاصل کئے ہیں۔ اور یہ اُن کی بڑی کامیابی ہے!

مذہب سے غالباً جان کر دامن بچایا گیا ہے۔ مگر یہ بھی بڑی بات ہے کہ "تخلیق" کا رجحان لا مذہبیت اور تشکیک و افکار کی طرف بھی نہیں ہے، ورنہ مذہب پر طنز و تعریض آج کل فیشن ہو گیا ہے۔

"مغنی نامہ" غالب کی مثنوی کا دل چسپ اُردو ترجمہ ہے۔ مگر اس قسم کے شعر جہاں جہاں آگئے ہیں نظم بے رنگ سی ہو گئی

جبھی خود ستا ہے تما با ہیں وہ — کہ جانے یہ دُنیا کہ دانا ہیں وہ
تھا لب تشنگاں سے دغا کوش وہ — ہوا اپنی ہی مے سے مدہوش وہ
وہ آوارہ نظروں کو دے گوشمال — ہوس کو ہے سرمایۂ انفعال

"دے گوشمال" درست نہیں "گوشمالی کرنا" بولتے ہیں۔

تپش سے جلے اسپ کا مغز سر — ہو زخمی پئے گرگ بھی سر بسر

اس ترجمہ میں شعریت کا دُور دُور پتہ نہیں۔

نہیں گنجوی پھر بھی ہوں مایہ دار — بہت ہے جو طُم سے ہوں یوں نغمہ بار

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ پھر شعر میں تاثیر کا نام و نشان تک نہیں۔

جوش ملیح آبادی کی آخر کی دو رباعیوں میں نری آمد ہی آورد پائی جاتی ہے "اعترافِ شکست" کے یہ شعر کتنے بے مزہ ہیں:-

آنچ آتشِ گل کی ـــــ مدو جزرِ سینہ ہے

"آتشِ گل" کی "آنچ" تو "لیلۃ القدر کی رات" والی بات ہوئی۔

زندگی کے اشکوں سے آستینِ جاں نم ہے

"آستینِ جاں" کس قدر نامانوس ترکیب ہے! اور جاں کی آستین کا تصور کرنے میں سامع اور قاری کو کتنا تکلف ہوتا ہے۔

کرنوں کی دلکشی آہٹ تک نظارہ آخرِ شب ہی سہی

"کرنوں کی آہٹ" ہی ایک اعجوبہ سے کم نہ تھی کہ "دلکشی" نے اس اعجوبگی میں اور اضافہ کر دیا۔

شعلہ زن صرصرِ غم ہے یا سمومِ صحرا (صـ۷۴)

ہم سمجھتے ہیں یہ کتابت کی غلطی ہے کہ "یا" - "کہ" کی جگہ چھپ گیا - اور اگر شاعر نے "یا" ہی نظم کیا ہے تو "یا" کے الف
کا بری طرح گرنا، اُن کے ذوق نے گوارا کس طرح کر لیا۔

کوئی زنجیرِ در ٹوٹی نہ آوازِ صبا آئی کوئی تاریک سایہ پھر نہ کلیوں کو مسل جائے

"تاریک سایہ" کا کلیوں کو "مسلنا" کتنی غرابت رکھتا ہے۔

تمھارے ذہن میں بھی نقشۂ تعمیرِ جہاں وہ تحیر تھا کہ میں قادرِ اظہار نہ تھا (صـ۵۱)

"قادرِ اظہار" کی ترکیب نے رہی سہی شعریت کو غارت کر دیا۔

"اپنے بزرگوں کے تمغات اور انگریزی افسروں کے سرٹیفکٹ" (صـ۷۵)

تمغہ کی جمع "تمغات" کتنی عجیب اور نامانوس ہے۔

"اس کے رُوکھے سیاہ بال........" (صـ۸۲)

بال اور رُوکھے ـــ یہ کس قدر ناروا بلکہ مضحکہ خیز جدت ہے۔

مدیر کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ نثر و نظم کے مضامین کو پڑھے اور کم سے کم لفظوں کی اُونچ نیچ کو ہموار کر دے!
"تخلیق" کے مرتب کا کسی ادبی جماعت سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا مگر ترقی پسند اُن کے ادارے کے مشیر ضرور ہیں
ان لوگوں کی رائے و مشورت ادب میں جب اور جہاں بھی ہوگی ٹیڑھ پیدا ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی!

مہران ٹیکسٹائل ملز
حیدرآباد سندھ
جس میں
مضبوط دھاگا
اور
پائیدار خوشنما کپڑا
تیار ہوتا ہے
آپ پاکستان کو اسی وقت خوش حال بنا سکتے ہیں
جبکہ آپ پاکستان کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں

آپ کا پسندیدہ
سگریٹ
شاہین
دس سگریٹ کے ایک پیکٹ کی قیمت تین آنے -/3/-
پریمیئر ٹوباکو کمپنی پاکستان کراچی

یعقوب کے بسکٹ
خوش ذائقہ
خوش رنگ
اور
صحت کیلئے فائدہ بخش
سب کی پسند کے بسکٹ
تیار کردہ
سیٹھ محمد یعقوب اینڈ سنز
یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر
اسٹاکسٹ:- زین العابدین برادرس کراچی
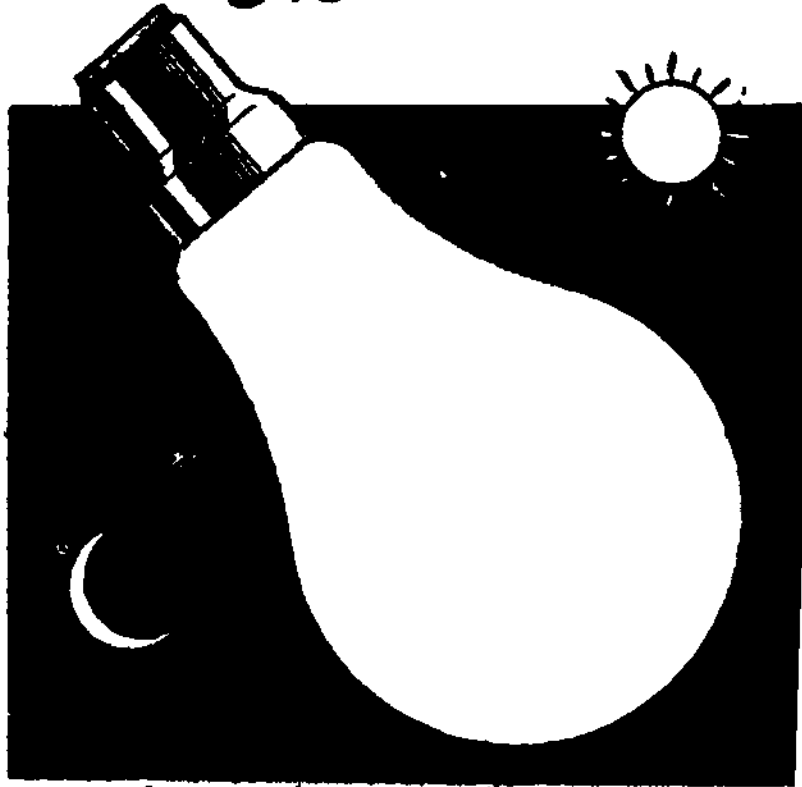
جی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفیسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ
جی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہتر ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

جی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

M.P.

رحمن پرنٹنگ پریس کراچی

فاران کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۸ ماہنامہ نمبر ۹

فاران

دسمبر ۱۹۵۶ء

ایڈیٹر — ماہر القادری

سالانہ چندہ ... چھ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصر سے ہمارا قلبی تعلق اس بناء پر نہیں ہے کہ اس خطہ میں سویز کینال اور دریائے نیل واقع ہیں۔ وہاں کے خانوں میں فراعنۂ مصر کی حنوط شدہ لاشیں۔ ممیاں۔۔ رکھی ہوئی ہیں۔ اور اہرام کو تاریخی عظمت حاصل ہے اور اہلِ مصر سے ہمارے ربط و اتحاد اور محبت کی بنیاد اسلامی رشتۂ اخوت ہے۔ اُس ملک کی غالب اکثریت اللہ کے فضل سے اسلام کی حلقہ بگوش ہے۔ اس لئے ہم اور مصری عوام ایک ہی زنجیر کی کڑیاں، ایک ہی تسبیح کے دانے، ایک ہی درخت کی شاخیں - ایک ہی جسم کے اعضاء اور ایک ہی ملت کے فرد ہیں۔ اُن کا غم ہمارا اپنا ذاتی غم اور اُن کی خوشی ہماری اپنی خوشی ہے!

مصر سے روس اور بھارت کے تعلقات کی بنیاد اِن حکومتوں کے محض سیاسی مفادات ہیں۔ جس دن یہ حکومتیں محسوس کریں گی کہ مصر سے تعلقات باقی رکھنے میں اُن کے مفادات پر آنچ آرہی ہے، اُسی دن مصر کے یہ غرض پرست دوست اس کے لئے وہ نہ رہیں گے جو اَب ہیں۔ اُن کو طوطے کی طرح آنکھیں بدلنے میں کچھ دیر نہ لگے گی کہ ڈپلومیسی کا یہی مزاج واقع ہوا ہے اور صدیوں سے سیاست باز اسی کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مگر اس کے برخلاف مصر سے ہمارا دلی تعلق اور دینی رشتہ کسی عنوان نہیں ٹوٹ سکتا۔ چاہے ہمارے سیاسی اغراض اور تجارتی مفاد پر زد ہی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔ اسلامی حکومت کے ارباب حل و عقد مصر کے بارے میں سیاسی حالات کا اندازہ لگا کر اپنی پالیسی اور موقف میں اونچ نیچ پیدا کرلیں مگر مصر کے ساتھ مسلم عوام کے رابطہ، محبت و اخوت میں بال برابر فرق نہیں آسکتا۔ اگر غیروں کے بہکانے سے مصر کے مسلمان ہم سے رُوٹھ بھی جائیں گے تو ہم اُن کو منانے کی پوری کوشش کریں گے۔ بھائی، بھائی سے آخر کب تک روٹھا رہے گا - دینی اخوت اپنا اثر دکھا کر رہے گی - اور اخلاص و محبت کی ایک ہی نگاہ میں سارے گلے شکوے دور

روس اور بھارت، مصر کے سیاسی حلیف ہیں اور ہم اہل مصر کے دینی بھائی ہیں۔ "سیاسی حلیفیاں" قائم ہوتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ مگر دینی رشتہ کسی حالت میں بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ اسلامی اخوت کی وہ زنجیر ہے جو شکست و ریخت سے ناآشنا ہے!

حکومت مصر نے سویز کینال کمپنی (Suez Maritime Canal Company) کو جن شرائط پر خاکنائے سویز (Isthmus of Suez) کو کاٹ کر جہاز گزرنے کے لئے موزوں بحری راستہ بنانے کی اجازت دی تھی اور اس کے بعد جو معاہدات ہوئے تھے۔ اُن کے قانونی مضمرات پر بحث و نزاع کا طویل باب کھل سکتا ہے مگر بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ سویز کینال حکومت مصر کی حدود ریاست میں واقع ہے۔ حکومت مصر نے کمپنی کو فرمان کے ذریعہ "Concession" عطا کیا تھا۔ حق ملکیت نہیں دیا تھا۔ اس لئے حکومت مصر کمپنی کو "نیشنلائز" کرنے (قومیانے) اور کمپنی کو دی ہوئی مراعات واپس لینے کا حق رکھتی ہے۔ لہذا حکومت مصر نے اپنے حاکمانہ اور مالکانہ حقوق کا جو استعمال کیا، اُس کے لئے اُس کے پاس وجہ جواز موجود ہے!

امریکہ اور برطانیہ نے ایسے ہی موقعوں پر عرب ملکوں کو پریشانی میں ڈالنے کے لئے اسرائیلی حکومت کو قائم کرایا تھا۔ چنانچہ اسرائیلی افواج نے مغرب کی سامراجی حکومتوں کے دیئے ہوئے جدید ترین اسلحہ کی پوری قوت کے ساتھ مصر پر ہلہ بول دیا۔ اُدھر یہ فوجیں قاہرہ کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ دوسری طرف سے برطانیہ اور فرانس نے مصر کے شہروں پر خوفناک بمباری شروع کر دی اور اپنی فوجیں مصر کے ساحلی علاقہ میں اُتار دیں۔ طہران کانفرنس کے ارکان کو اگر صحیح واقعات نظر نہ آسکے تو وہ اپنی بصیرت اور بصارت کا علاج کرائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل تینوں کی تینوں حکومتیں مصر پر جارحانہ حملہ اور ظالمانہ اقدام کی مجرم ہیں۔ جو کوئی ان ظالموں، مفسدوں اور شرارت پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے یا دبا دبا نرم لہجہ اختیار کرتا ہے، وہ خود بے ضمیر ہے اور اس کے دل و دماغ اور زبان و قلم کہیں اور سے ہدایت حاصل کرنے کے بعد "ہز ماسٹرس وائس" کا فرض انجام دیتے ہیں۔

امریکہ کی سیاست اور تجارت پر یہودی سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا خاصا اثر ہے۔ برطانیہ کی رہی سہی چودھراہٹ بھی امریکہ کو کھلتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی اُسے پسند نہیں ہے کہ برطانیہ اور فرانس کمزور ناکارہ اور بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں، حکومتوں کی قوت و اثر کو امریکہ اشتراکیت زدہ ریاستوں کے مقابلہ میں دباؤ، چھیڑ چھاڑ اور قوتوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے باقی رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس لئے امن و صلح کے تمام مواعظ (؟) اور ثالثی کی تمام کوششوں کے باوجود مصر کی حمایت کا اُس کے دل میں رتی برابر درد نہیں ہے اور اسرائیل اور فرانس و برطانیہ کے عزائم اور اُن کی سازشوں سے کو ہم بے خبر اور بالکل بے تعلق نہیں سمجھتے!

روس جو آج مصر کا بڑا ہمدرد اور دمساز نظر آتا ہے۔ کل یہی روس تھا جس نے شائیلاکوں کی اس اسرائیلی حکومت کر کے اپنے سفارتی تعلقات اُس سے قائم کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ اور اس میں اُس کی دور اندیشی، پیش فاد پرستی اور ڈپلومیسی یہ تھی — روس اچھی طرح جانتا تھا کہ اسرائیلی حکومت ایک خطرناک پستول ہے جسے امریکہ انیہ نے عرب ممالک کے سو سینے کے مقابل رکھ دیا ہے۔ اس لئے اسرائیلی حکومت کا وجود عرب ممالک کے لئے پریشانی اور اضطراب و انتشار کا سبب بنا رہے گا اور ملکوں، حکومتوں اور قوموں کے اضطراب و انتشار سے ائدہ اٹھانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ امن و سکون اور صلح و آشتی کی فضا اشتراکیت کو سازگار آ ہی نہیں سکتی!

یہ فتنہ دُنیا دین تو ملکوں کے انتشار، سیاسی رقابت اور حریفانہ کشمکش کے ماحول ہی میں پر پُرزے نکالتا ہے۔ روس کی پیش بینی اور ڈپلومیسی کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ آج مصر، روس سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہے! اور:۔

یہ ابتدا ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم!

بھارت کے مہاسبھائی اسرائیلی حکومت سے ساز باز رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے تباہ کرنے کا جو پروگرام انہوں نے بنایا ہے اُس کی کامیابی کے لئے اسرائیل کی "اسلام دشمنی" سے وہ ہر وقت فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ بھارت میں عملاً مہاسبھا کا راج ہے۔ گاؤکشی اور اُردو زبان کے مسئلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بے اختیاری اور بے اثری ظاہر ہو چکی ہے۔ مہاسبھائیوں کی جیت اسی میں ہے کہ جس طرح ممکن ہو سکے مسلم ممالک کا اتحاد نہ قائم ہونے دیں اور اسلامی حکومتیں کمزور ہوتی چلی جائیں۔ پنڈت نہرو اپنی لادینیت اور وسیع المشربی کے باوجود ہندو قوم کے ایک فرد ہیں اور مہاسبھائی عزائم کے خلاف وہ جا نہیں سکتے!

عرب ممالک میں "اسلام" کے مقابلہ میں "عرب قومیت" کے احیاء کی جو غیر اسلامی تحریک چلائی جا رہی ہے، اسلامی ملکوں میں ہندوستانی سفارت خانے اُس سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں۔ پنڈت نہرو اور اُن کی حکومت نے یہ جان کر جمال ناصر کو سوئز کینال کے معاملہ میں شہ دی ہے کہ یہ جرأت مندانہ اقدام مصر کو بہت زیادہ مہنگا پڑے گا اور اُس کا نتیجہ اسلامی ممالک میں انتشار و افتراق کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ خود مسلم عوام اور حکومتوں کے مابین کشمکش برپا ہو گی اور عالمگیر اسلامی اتحاد پر اس کی ضرب آ کر پڑے گی!

ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے جمال ناصر کو اپنے اعتماد میں لے رکھا ہے اور دوسری طرف مہاسبھائی لیڈر اسرائیلی حکومت سے ساز باز کئے ہوئے ہیں۔ یہ دودھاری تلوار ہے جس سے مظلوم اور سادہ لوح مصر کو سابقہ پڑا ہے! سوئز نال کے واقعہ کے بعد اسلامی ممالک جس پریشانی اور ابتری سے دوچار ہیں۔ اور اُلجھنیں بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں —— سے بھارت بہت خوش اور مطمئن ہے۔ یہ سب کچھ اُس کی تمناؤں کے مطابق ہو رہا ہے!

جرأت مندانہ اقدام!

اگر کوئی "ممولا" شہباز سے لڑنے کی جرأت کرتا ہے تو اُس کی یہ جرأت لائقِ تحسین ہے، جرأت جو صلہ مندی اور بیباکی ہی نے قوموں کی تقدیروں کو بدلا ہے اور دُنیا میں انقلاب پیدا کئے ہیں —— کشورکشائی اور ناتحانہ اقدام کا سہرا عقلِ مصلحت اندیش کے نہیں، جنونِ باک کے سر رہا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "جنونِ بے باک" کے اظہار کے لئے بھی وقت اور موقع کی ضرورت ہے —— جوش کے ساتھ ہوش کا رہنا بھی ضروری ہے!

حیدرآباد دکن میں "جوشِ بے خرد" کے خونیں نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ بلند بانگ دعووں کے غبارے ہوا کی موج کے ذرا سے اضطراب کو بھی نہ سہار سکے! کسی جرأت مندانہ اقدام کے وقت عواقب سے بالکل آنکھیں بند کر لینا، ہر بڑی سے بڑی خطرناکی کا سبب بن سکتا ہے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام آتشِ نمرود میں بے دھڑک کود پڑے تھے، اس لئے کہ وہ اُن کے دین و ایمان کا معاملہ تھا۔ اور جب کسی کے دین و ایمان کو یہ حکم پیش آئے تو اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مسلمانوں کا جرار لشکر لے کر تبوک جا پہنچے تھے۔ اس لئے کہ غنیم کے فوجیں جمع کرنے اور حجاز پر حملہ آور ہونے کی خبر گرم تھی!

آج بھی حملہ آور دشمن کو اسی طرح مرعوب کیا جا سکتا ہے، مراکش اور الجزائر کے مسلمان اپنی آزادی کے لئے بجا طور پر اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہیں۔ اس لئے :۔

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

مصر میں ایسی کوئی صورت در پیش نہیں تھی۔ نہ تو اہلِ مصر کا دین و ایمان خطرے میں تھا۔ نہ اُن پر کوئی حملہ کر رہا تھا۔ اور نہ وہ کسی غیر ملک کے غلام تھے۔ جس سے چھٹکارا پانے کے لئے اقدام ناگزیر تھا۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ فرانس اور برطانیہ کا سوئیز کینال پر عمل دخل مصر کے مفاد کے قطعاً منافی تھا۔ ان مفسدوں اور شرارت پسندوں کے اختیار و تصرف سے نہر سوئیز کو آزاد ہونا ہی چاہیئے تھا۔ مگر چند سال کے بعد سوئیز کینال کمپنی کے معاہدہ کی میعاد ہی ختم ہو رہی تھی۔ سوئیز کمپنی کو اختتام معاہدہ سے پہلے اپنے اختیار و تصرف میں لینے کی یہ تدبیر تھی کہ حکومتِ مصر کمپنی کے اکیس فی صدی حصے اور خرید لیتی۔ اس طرح کمپنی میں اُس کے اکیاون فی صدی (۲۱ + ۳۰) حصے ہو جانے سے کمپنی کے نظم و نسق کی زمام حکومتِ مصر ہی کے ہاتھوں میں آ جاتی !

تمام عرب ممالک کے لئے اور اُن میں بھی خاص طور سے مصر کے لئے سوئیز کمپنی سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک اور مضرت رساں وجود اسرائیلی حکومت کا ہے۔ جمال ناصر صاحب کو جرأت ہی دکھانی تھی تو اللہ تعالیٰ کی اس مغضوب قوم سے ٹکر لیتی تھی۔ اس مسئلہ کا سب سے زیادہ قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ سوئیز کمپنی کو نیشنلائز کرنے کے بعد کتنے ہی دن تک مذاکرے ہوتے رہے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس مصر کی دھمکی سے مرعوب بھی تھے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے بعد جو یہ دفعۃً ملا تھا۔ اور دشمن پر جو مرعوبیت طاری تھی بس اس سے پُورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا۔ اُس وقت کوئی معاہدہ ہو جاتا تو فرانس و برطانیہ کو بہر حال جھکنا پڑتا اور مصر کا پلہ بھاری رہتا۔ مگر حکومتِ مصر نے گفت و شنید کی تمام دعوتوں اور مذاکروں کو اس طنطنے کے ساتھ ٹھکرا دیا جیسے اُس کے قبضہ میں کوئی ایسا خفیہ ہتھیار ہے کہ فرانس و برطانیہ نے ذرا بھی حرکت کی تو ان حکومتوں کے دھوئیں اڑا دیئے جائیں گے !

طنطنوں، دعووں اور دھمکیوں کا وہ فلک شگاف غلغلہ اور اپنی قوت کا یہ عالم کہ اسرائیلی لشکر کسی مؤثر مزاحمت کے بغیر یلغار کرتا ہوا مصر میں داخل ہو گیا۔ ادھر فرانس اور برطانیہ نے ہنستے کھیلتے اپنی فوجیں مصر کے ساحل پر آتار دیں وہ جو کسی دل جلے شاعر نے کہا ہے کہ :۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

تو مصر نے سچ مچ اپنے گریبان ہی پر زور چلایا کہ سوئیز کینال کو ناقابلِ گزر بنانے کیلئے اپنے ہی جہازوں کو ڈبو دیا۔ پنڈت نہرو سے ذاتی تعلقات پر جمال ناصر کو بڑا ناز تھا۔ مگر پنڈت جی ہندی کی اس کہاوت :۔

"چڑھ جا بچہ اِشولی پر رام بھلی کرے گا !"

کے اثبات کا خاموشی کے ساتھ مشاہدہ فرماتے رہے۔ اب رہا روس، تو روس نے برطانیہ اور فرانس کو جنگ بند کرنے کی دھمکی اُس وقت دی ہے جب اُن کی فوجیں مصر کے ساحلی علاقہ پر اُتر چکی ہیں۔ اور اسرائیل کا مصر کے سینکڑوں میل کے رقبہ پر قبضہ ہو چکا ہے !

برطانیہ اور فرانس، مصر کے چپہ چپہ سے واقف ہیں۔ ان ظالموں نے چُن چُن کر فیکٹریوں، پُلوں، ریلوے اسٹیشنوں

ور دوسرے اہم تجارتی، صنعتی اور فوجی مرکزوں کو تہس نہس کیا ہے۔ سویز کینال کی دسیوں سال کی آمدنی بھی مصر کے س نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو چند دن میں اُسے اُٹھانا پڑا۔ اور جانوں کے نقصان کی تلافی تو کسی عنوان ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسروں کے بل بوتے پر اقدام کر بیٹھنے کے ایسے ہی تباہ کن نتائج نکلا کرتے ہیں!

اس چند دن کی جنگ میں یہ تماشا بھی دنیا نے دیکھ لیا کہ شام، شرق اردن اور حجاز کی فوجوں کی اپنے ہی علاقوں میں لیس پیش قدمی اور مارچنگ کی خبریں آتی رہیں۔ اسرائیلی حکومت کے کسی درخت کے پرندے کی طرف بھی گولی نہیں چلائی گئی!

وہ جو "بند مٹھی کے بھرم" کی پرانی کہاوت ہے۔ تو سویز کینال کے اس قضیہ نے عرب ملکوں کے اس بھرم کو کھول دیا، اور ان کے مقابلہ میں اسرائیلیوں کی جرأت کو بڑھا دیا۔ اسرائیلی آج فاتحانہ پوزیشن میں ہیں۔ اب تک وہ عرب ممالک سے خوف زدہ تھے کہ یہ حکومتیں مل جل کر یلغار پر آمادہ ہو گئیں تو اسرائیلی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گی۔ اب یہودیوں کا یہ ڈر نکل گیا۔ علماء ازہر کے جہاد کے فتووں کی کارفرمائی بھی یہودیوں اور نصرانیوں نے دیکھ لی۔!

اس قضیہ سے پہلے مصر بالکل آزاد تھا۔ مگر اب اُس کی آزادی اپنے محافظ و دستگیر اور بچانے والے سوویٹ روس کی پناہ میں ہے! اور جو ملک روس کی پناہ اور حمایت میں آ جاتا ہے، وہ "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ رہنا پڑتا ہے۔ روس ہمدردیوں کے بیج ہر طرف یونہی نہیں بکھیرتا پھرتا۔ وہ اُسی زمین میں تخم ریزی کرتا ہے جہاں کی زمین اُس کے مفادات اور نظریوں کے لئے زرخیز ہوتی ہے۔ روس کے ٹینک، راکٹ اور جٹ پلین کسی ملک کی حمایت و امداد کے لئے تنہا نہیں آتے۔ اُن کے ساتھ روس کے افکار و نظریات بھی آتے ہیں!

روس کے مقابلہ میں مصر کی پوزیشن اب "حلیف حکومت" کی بلندی سے گر کر نیازمندی اور حاشیہ برداری کی سطح تک پہنچ چکی ہے۔ اور دوسری طرف جس سویز کینال پر بلا شرکتِ غیرے اپنا قبضہ و تسلط جمانے کے لئے سب کچھ کیا گیا تھا، اُس پر انٹرنیشنل فوج کی نگرانی خود مصر کو قبول کرنی پڑی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی خطرے نہیں ٹلے بلکہ ان میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے!

جمال ناصر نے کیا کیا؟

شاہ فاروق کی معزولی اور جلا وطنی کے بعد مصر کے اربابِ کار کو اپنے ملک کو ترقی دینے کے لئے بڑا زریں موقع مل گیا تھا۔ مگر جمال ناصر جو مصر کا ڈکٹیٹر بننے کی تمنا اپنے اندر رکھتا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے جنرل نجیب کو سازش کے ذریعے بے اثر بنا کر اپنی مطلق العنانی کیلئے راستہ صاف کیا۔ پھر اُس نے عرب دنیا کی سب سے زیادہ منظم اور با وقار دینی جماعت "اخوان المسلمین" کو ٹھکانے لگایا۔ اُن کے اکابر کو پھانسیاں دیں اور اُن کے ارکان پر وہ ظلم کئے کہ نیرو اور حجاج جیسے ظالموں کے کارنامے ان عقوبتوں کے آگے ماند پڑ گئے اور آج بھی ہزاروں "اخوان" قید و بند کی مصیبتوں میں گرفتار ہیں! آج یہ ہزاروں سرفروش آزاد ہوتے تو کم سے کم اسرائیل کو مصر پر یلغار کی جرأت نہ ہوتی۔ اور ہوتی تو جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ "اخوان" مصر کے قوتِ بازو، اسلام کے سرفروش خدمت گزار اور ملت کے مخلص فرزند تھے۔ اُن کو ناصر نے تباہ کر

شاہ فاروق کے دور میں مصر جن عیش پرستیوں اور نفس کی دراز دستیوں میں مبتلا تھا۔ جمال ناصر کی حکومت نے ان بدکاریوں اور بداخلاقیوں کی سرپرستی کی، فوجی کلب گھروں میں ناؤ نوش کی پارٹیاں اور نیم برہنہ رقص کی محفلیں جمائی گئیں اور جب بدکاری کی یہ محفلیں رنگ پر آئی ہوئی تھیں تو فوجی افسروں کو مخاطب کرکے فرمایا گیا کہ یہ خشک ملّا اور قدامت پرست "اخوان" تم سے عیش و مسرت کی یہ نعمتیں چھین لینا چاہتے تھے!

جمال ناصر نے ایک طرف مصر میں بے اخلاق معاشرت کی حوصلہ افزائی کی اور دوسری طرف اسلامی اخوت اور وحدتِ ملی کے مقابلہ میں "مصری قومیت" کو ابھارا۔ "نحن ابناء الفراعنۃ"۔ "ہم فراعنۂ مصر کی اولاد ہیں۔" یہ اُسی کا دیا ہوا "قرآنہ لعوۃ" ہے۔ وہ فرعون جس کی مذمت اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے اور اہل ایمان نے جس نام (فرعون) کو اپنے لئے آج تک گالی سمجھا ہے۔ اُس کو جمال ناصر اور اس کے حواریوں نے مقبول اور محبوب بنانے کی تحریک شروع کی ہے۔ جو شخص "فرعونیت" کو زندہ کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ وہ اس مملکت سے کس طرح خوش رہ سکتا ہے جو صرف "اسلام" کے نام پر وجود میں آئی ہے۔ جس کے دستور میں کتاب و سنت کو قانون کی اساس تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اسلامی روایات کی تجدید و احیاء جس کے پروگرام میں شامل ہے!

تہران کانفرنس میں پاکستانی اکابر نے جو پارٹ ادا کیا ہے، اُس سے پاکستانی عوام اپنی بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں اور پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر فیروز خاں نون کے احمقانہ بیان پر تو ہر طبقہ نے لعنت بھیجی ہے!

وزیرے چنیں شہریارے چناں!

حکومتِ مصر کے لئے ہمارے اربابِ اقتدار کی یہ روش جائز طور پر وجہ شکایت ہو سکتی ہے مگر جمال ناصر کی حکومت نے پاکستان کے ساتھ شروع ہی سے بیگانوں جیسا سلوک کیا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ میں اُس نے ہماری حمایت نہیں کی۔ پنڈت نہرو سے اُس نے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں۔ مصر میں پاکستانی سفارت خانہ کے مقابلہ میں بھارت کے سفارت خانہ کو زیادہ سے زیادہ اہمیت بلکہ عزت دی گئی ہے! انگلستان اور فرانس سے سفارتی تعلقات توڑنے کے بعد مصر نے اپنے مفادات کی نگرانی بھارت کو سونپی ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلامی اخوت کا رشتہ ہی پاکستان اور مصر کو مربوط کئے ہوئے ہے۔ جب جمال ناصر صاحب "مصری وطنیت" اور "فرعونی قومیت" کی مقراض سے اس رشتہ ہی کو کاٹ دینے پر تلے ہوئے ہیں تو پھر پاکستان کے ساتھ ہم [illegible]

بھی وہ کر گزریں [illegible]

[illegible] ریا۔ اور [illegible]

[illegible] جمال ناصر کی حکومت نے [illegible]

[illegible] بزرگوار نواب نصیب یاور [illegible]

بہت سے خواص کو بھی ناگوار گزرا [illegible]

[illegible] ادھر لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں نواب نصیب یاور جنگ [illegible]

پریشانی اور مصیبت [illegible]

[illegible] رہنے کے بعد فرمایا کہ:-

[illegible] دل کو مذہبی تعلیم کا شوق ہے۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔"

حضرت علامہ نے ایک نظر بہادر خاں کو دیکھا اور فرمایا کہ:-

"اچھی بات ہے۔ کل صبح یہیں اسی مقام پر آجانا!"

دوسرے دن بہادر خاں وہاں موجود تھے۔ حضرت علامہ نے اُن کو وہیں مسجد کی نکڑ کے قریب زمین پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

جو نقارے بج رہے ہیں اُس میں یہ طوطی کی آواز کہاں سے آئی ؟ ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ لوگ ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کریں کہ سویز کینال کے تصفیہ کے بعد مصر اور دوسرے عرب ممالک کی پریشانیاں بڑھ گئی ہیں یا گھٹ گئی ہیں ؟ انٹرنیشنل فوج کی نگرانی نے سویز کینال کے مسئلہ میں اور پیچ ڈال دیئے ہیں یا کم کر دیئے ہیں ؟ مصر کے روس کی حمایت اور پناہ میں آجانے کے بعد مصر کی اپنی سیاسی پوزیشن کیا رہ گئی ہے ؟

مصر جمال ناصر کا نام نہیں ہے، جمال ناصر پاکستان کو چاہے کتنا ہی ٹھکراتا رہے۔ مگر اُس کی نادانی اور حماقت کے سبب اپنے مصری بھائیوں کو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ مصر عہد فاروقی کی زندہ یادگار ہے۔ اس یادگار کی حفاظت کے لئے ہم کسی ممکن قربانی سے انشاء اللہ گریز نہ کریں گے !

جمال ناصر کو مصر میں "فرعونیت" کو اور پاکستان میں عوامی لیگ اور ری پبلیکن پارٹی کو "متحدہ قومیت" کو زندہ کرنے کا اگر حق حاصل ہے تو اسلام پسند بھی اللہ کے دین کو، کتاب و سنت کو اور اسلامی روایات کو زندہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جس کو جس سے محبت ہوگی وہ اسی کے لئے دوڑ دھوپ کرے گا۔ وقت خود فیصلہ کر دے گا کہ ان میں سے کس کو زندہ رہنا چاہیئے اور کس کے لئے موت مقرر کر دی گئی ہے !

اللہ تعالیٰ اسلامی ممالک اور اُن کے عوام کو اپنوں اور غیروں کے شر سے محفوظ رکھے اور اُن کو اقامتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو کر تمام دنیا کو امن و آسودگی کا گہوارہ بنا دے !! ؏

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی !

ماہر القادری

۲۱ نومبر ۱۹۵۶ء

ابو منظور شیخ احمد
(ناندیڑ دکن)

ایک ایمان افروز یادداشت

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا آخری درسِ تفسیر

مولوی بہادر خاں حیدر آبادی (المعروف بہ نواب بہادر یار جنگ) کی علمی و مذہبی خدمات میں ایک نمایاں اور نوعیت کے اعتبار سے ایک نہایت اہم خدمت اُن کا درسِ تفسیر تھا۔ مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس طرز پر ہوئی تھی کہ انھیں بچپن ہی سے قرآن کے ساتھ ایک گہرا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جس نے آگے چل کر انھیں علوم و معارفِ قرآنی کا ایک جید عالم اور اس کی اشاعت کا ایک پُرجوش مبلغ بنا دیا۔ مرحوم کو اس سرائے فانی میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ اپنی نانی کے زیرِ تربیت آ گئے۔ اور چودہ سال تک اُنہی کے زیرِ تربیت رہے۔ اُن کی نانی صاحبہ ایک دین دار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے نواسے پر مذہبی رنگ چڑھانے کی پوری پوری کوشش فرمائی اور کامیاب رہیں۔ وہ ادائے نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کی پابندی کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ چنانچہ کسی دن مرحوم تلاوتِ قرآن کئے بغیر نانی کی خدمت میں جاتے اور سلام کرتے تو وہ نہ سلام کا جواب دیتیں نہ کوئی بات کرتیں۔ مرحوم پوچھتے تو فرماتیں کہ:-

"تم نے اللہ میاں سے آج باتیں نہیں کیں اس لئے نہ میں تم سے بات کروں گی اور نہ تمہارا سلام لوں گی"

خود مرحوم جب مادری تربیت کی اہمیت کا ذکر فرماتے تو اپنا یہ واقعہ ضرور بیان کرتے اور کہتے کہ:-

"میرے اندر جو کچھ ہے وہ اسی چودہ سالہ کمائی کا حاصل ہے"

اس کے بعد آپ نے حیدر آباد کے دو اساتذہ مولوی سعادت اللہ خان صاحب (مدرس مدرسہ دار العلوم) اور مولوی سید اشرف شمسی صاحب (صاحب "تفسیر شمسی") سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، و فقہ کی باضابطہ تعلیم کا آغاز کیا۔ اور خصوصاً علامہ شمسی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے۔ مرحوم کی عمر چودہ سال کی تھی کہ ایک دن اُن کے والد بزرگوار (نواب نصیب یار جنگ ثالث) انھیں حضرت علامہ کے پاس لے گئے وہ مسجد سے نماز پڑھ کر گھر لوٹ رہے تھے۔ راستہ ہی میں نواب نصیب یار جنگ بہادر نے روک لیا اور بہادر خاں کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ:-

"اس خانہ زاد کو مذہبی تعلیم کا شوق ہے۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا"

حضرت علامہ نے ایک نظر بہادر خاں کو دیکھا اور فرمایا کہ:-

"اچھی بات ہے۔ کل صبح یہیں اسی مقام پر آ جانا"

دوسرے دن بہادر خاں وہاں موجود تھے۔ حضرت علامہ نے اُن کو وہیں مسجد کی نکڑ کے قریب زمین پر بیٹھ جانے کا حکم دیا

یہ فوراً بیٹھ گئے ۔ بچپن میں بہت زیادہ جسیم تھے اس لئے دوزانو بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی اور خاندانی جاگیردار ہونے کے باعث زمین پر اس طرح بیٹھنے میں عار ہونا چاہیئے تھا ۔ لیکن انہوں نے کوئی شرم محسوس نہ کی اور استاد کے حکم کی فوراً تعمیل کر دی ۔ متواتر تین چار روز تک یہی عمل ہوتا رہا ۔ بہادرخاں جاتے اور حضرت علامہ اُن کو زمین پر بٹھا دیتے ۔ جب کسی نے حضرت علامہ سے اس برتاؤ کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ :-

"میں بہادرخاں کا امتحان لے رہا تھا چونکہ یہ نواب زادہ ہے اس لئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے اندر فی الواقع علم کا حقیقی ذوق موجود ہے یا نہیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ امتحان میں کامیاب اُترا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کو مذہبی علم کی سچی لگن لگی ہوئی ہے"۔

باضابطہ تعلیم کا یہ تعلق جلدی ہی ختم ہو گیا ۔ لیکن آگے چل کر جو وسعتِ معلومات انہوں نے بہم پہنچائی وہ دراصل اُن کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا ۔ معمولاً روزانہ ڈیڑھ ڈھائی سو صفحات کا مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد جب جاگیر کی ساری ذمہ داریاں اُن کے کاندھوں پر آپڑیں تو اس زمانہ میں بھی اُن کا مطالعہ نہ چھوٹا ۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ :-

"جاگیر کے مقدمات کے سلسلہ میں میں جب وکلاء صاحبان کے پاس جایا کرتا تو بگھی میں بیٹھے ہوئے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا کرتا "۔

اُن کا کتب خانہ[1] بہت وسیع تھا اور اس کا بڑا حصہ مختلف قدیم وجدید تفاسیر اور دیگر مذہبی کتب پر مشتمل تھا ۔ ان کتابوں میں اکثر عربی زبان میں تھیں جن کا مطالعہ وہ پورے غور و تعمق کے ساتھ کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ مطالعہ کے نشانات اُن کی تقریباً ہر کتاب پر آج تک موجود ہیں ۔ مرحوم کی عالمانہ حیثیت کی نسبت اُن کے بچپن کے ساتھی اور قریبی دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق پروفیسر ریاضیات و طبعیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) نے اپنے ایک مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح اور کامل تعارف کے لئے ہر طرح کافی ہے ۔ فرماتے ہیں :-

"مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہو گئی ۔ اور وہ ابتدائی عمر ہی میں دُنیا کے دھندوں میں پھنس گئے یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے ۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا ۔ بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتب اور ملّا انسان کی صلاحیتوں کو، جو اکتساب علم کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہیں ۔ نقصان پہنچاتے ہیں ۔ چنانچہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں ؎

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق ۔۔۔ نہ خرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علماء نے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا ۔ مولوی محمد بہادرخاں مرحوم کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے ۔ انہوں نے اپنے فطری ذوقِ علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعہ سے کی اور علم کی جن

---

[1] مرحوم کی وفات کے بعد اس کتب خانہ کو ان کی بیگم صاحبہ نے "قائدِ ملت لائبریری" کے نام سے افادۂ عام کیلئے وقف کر دیا ہے ۔

شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی اُن میں اس قدر ید طولیٰ حاصل کیا کہ باضابطہ اسناد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے۔ وہ مطالعہ کرتے تھے، مشاہیر علماء سے بحث کرتے تھے اور خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ اکتساب علم کے یہی تین ضروری اجزاء ہیں اور مرحوم ان تینوں سے بہرہ ور تھے۔ اُن کا ذاتی کتب خانہ ملک کے معدودے چند کتب خانوں میں سے ہے۔ جن میں مختلف علوم و فنون کی معیاری اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے ان میں سے اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کتابوں پر جابجا اُن کے مطالعہ کے نشانات موجود ہیں بلادِ اسلامیہ کے سفر میں اور ہندوستان کے متعدد دوروں میں اُن کی ملاقات بڑے بڑے علماء سے ہوئی اور اپنی ذکاوت اور ذہن رسا کی بدولت وہ ان علماء کی گفتگو اور بحث مباحثہ سے بہترین طور پر استفادہ کرسکے۔ اُن کی قوتِ فکر کا اظہار اُن کی تقریروں اور علمی صحبتوں میں اچھی طرح ہوتا تھا۔ غرض ایک عالم کے لئے جتنی ضروری صفات ہیں وہ اُن میں کافی موجود تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے مختلف النوع کمالات میں اُن کے علمی کمالات کو بھی جگہ دینا لازمی ہے۔ دُنیائے اُردو کے نزدیک وہ سب سے بڑے خطیب تھے۔ اس لئے اُن کی اُردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی اُن کی مہارت مسلّمہ تھی اور تفسیر کا انہوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔"

("مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور ایک عالم کی حیثیت سے"۔ مندرجہ اخبار "تنظیم" حیدرآباد دکن۔ "قائدِ ملت نمبر")

مرحوم کو عربی میں جس درجہ کی مہارت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے سلسلہ میں مصر پہنچے تو نحاس پاشا سے ملنے گئے۔ چونکہ گفتگو چند خاص اہم مسائل پر ہونے والی تھی۔ اس لئے گمان ہوا کہ شاید ٹھیک طور پر عربی زبان میں اظہار خیال نہ کرسکیں گے۔ اس لئے ایک قادیانی مبلغ کو جو وہاں موجود تھے ترجمان کی حیثیت سے ساتھ لے گئے۔ مرحوم فرماتے تھے کہ:۔

"چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ترجمان صاحب میری ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے اُن کو درمیان سے ہٹا دیا اور نحاس پاشا سے کہا کہ میں عجمی ہوں۔ اگر جمع کو واحد۔ واحد کو تثنیہ اور مذکر کو مؤنث کہہ جاؤں تو معاف فرمائیے اور مطلب سمجھ لیجئے۔ اس کے بعد راست گفتگو شروع ہوئی اور بہت دیر تک ہوتی رہی۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ مصر کے اچھے اخباروں میں میری تصویر چھپ چکی ہے اور ایک تعارفی نوٹ لکھا گیا ہے۔ جس کا عنوان تھا "حیدرآباد کا ایک نواب جو عربی فصاحت میں گفتگو کرتا ہے"۔

مرحوم محض گفتگو ہی نہیں بلکہ عربی میں پوری فصاحت اور روانی کے ساتھ تقریر بھی کرسکتے تھے۔ چنانچہ اُن کے انتقال سے ڈیڑھ دو سال قبل جب مصر کے قونصل جنرل حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو مرحوم نے بھی اُن کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا۔ مدعوئین میں وزیر اعظم اور دیگر حکام کے علاوہ شہر کے تمام علماء و مشائخ بھی تھے۔ اس موقع پر مرحوم نے عربی میں ایک پُرجوش اور افزا آفرین تقریر فرمائی تو سب لوگ متحیر ہوگئے اور خود قونصل جب جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

"ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عربی میں اس بے تکلفی اور فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں۔"

جن لوگوں نے مرحوم کی یہ تقریر سنی تھی، اُن کا بیان ہے کہ اُن کی اُردو تقاریر میں جو روانی اور تاثیر پائی جاتی تھی بالکل وہی کیفیت اُن کی اس تقریر میں موجود تھی۔

مرحوم نے فن تجوید و قرأت کو باضابطہ قاری روشن علی صاحب[1] سے حاصل کیا تھا۔ اور اس فن سے اس درجہ واقف تھے کہ اکثر قاری، مرحوم سے داد حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ پھر اس فن سے دلچسپی بھی اس قدر تھی کہ ہر سال شبِ قدر میں قرأت کا جلسہ اپنی ڈیوڑھی میں منعقد کیا کرتے۔ جس میں ملک کے بڑے بڑے اہل فن مدعو کئے جاتے اور وہ قرأت سبع و فن تجوید کے سلسلہ میں اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے۔ خود مرحوم اس میں حصہ لیتے اور قرأت خوانی کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔

مرحوم اگرچہ سیاسیاتِ حاضرہ میں دخیل ہو کر سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے تھے۔ لیکن قرآن کی تعلیم و تبلیغ کو انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے جلسۂ سالانہ منعقدہ سنہ [illegible]ھ میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:-

"یہ بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی قوم زندگی کے اہم مراحل میں بنیادوں کے استحکام کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر زمانہ قوموں کی تعمیر کے لئے چند لوازمات چاہتا ہے اور ان لوازمات کے بغیر اگر کوئی قدم اٹھایا بھی گیا تو وہ استوار اور مضبوط نہیں ہو سکتا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اُن کی انقلابی ترقیاں جن کو دیکھ کر دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ چند خصوصیات کی سرمایہ دار تھیں اُن میں سب سے پہلی چیز اپنی حیاتِ اجتماعی کے مقاصد و منشاء کی نسبت مسلمانوں کا وہ صحیح تصوّر و ایقان تھا جو قرآن نے اُن میں پیدا کر دیا تھا۔ انسان کا تصوّر و ایقان ہی اس کے عمل کی اصل اور بنیاد ہے۔ اور وہ بلندیٔ تخیّل اور رفعتِ تصوّر جو قرآن نے مسلمان کو عطا کیا۔ اس کی ذلتوں کو عزّت سے اور محکومیوں کو حکومت سے بدلنے کا باعث ہوا۔ قرآنی تعلیمات کے سوا اور کونسی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاجِ خسرو اور تختِ کسریٰ کا مستحق بنا دیا تھا۔ **مجلس اتحاد المسلمین ہر اس سیاست کو جو قرآن کے منبعِ فیض سے سیراب نہیں ہے، سراب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی**۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی تنظیمی وسعت کے بعد بھی اس نے جو دستور اپنے لئے مرتب کیا۔ اُس میں اپنے وجود کی پہلی غرض اعتصام بحبل اللہ قرار دی۔ زمانے ممکن ہے راستوں میں کچھ تبدیلی کر دی ہو۔ لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلّت و خواری کے جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت سے آپ سب ارکانِ مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکانِ عاملہ و شوریٰ مملکتی مجلس، صدر صاحبان و عہدہ دارانِ مجالسِ ضلع وابستہ ذاتی اور مبلغینِ مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً، رکنیتِ مجلس کی شرطِ اوّلین کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک، عمل کی

---

[1] موصوف حیدرآباد دکن کے ممتاز قاری ہیں اور اپنے فن کے ایسے یکتا و یگانہ ہیں کہ ان کی شہرت عرب تک پہنچ چکی ہے۔

نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھ کر قرآن مجید کی کم از کم تین آیتیں روز تلاوت کیا کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھہرائے بلکہ ماہواری تحتہ رپورٹ میں، جو ملکی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے - بہ صدا قت دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اس شرط کا پابند رہا ہے۔ میری اس عمل پر مزاولت نے ثابت کیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاح انفرادی و اجتماعی کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے ہم میں بہت بڑی جماعت اُن لوگوں کی ہے جو بہ علمی کے باعث قرآن اور اس کے تراجم سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اُن کے لئے ہماری ہر شاخ کا فرض ہے کہ آبادی کی کسی مسجد میں، کسی پڑھے لکھے مسلمان کے ذریعہ قرآن اور اس کا کوئی مستند ترجمہ سنانے کا انتظام کرے۔ میری اور ملکی مجلس کی تنقیحوں میں آئندہ سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس شرط کی کس حد تک تکمیل کی جا رہی ہے۔ میں اس سلسلہ میں اُن مساعی کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مولوی محمد عبدالرحیم صاحب واعظ مرکز رعالی کی طرف سے جاری ہیں۔ اُن کے تفسیری رسالے اس مقصد کی تکمیل کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں، کیا سررشتۂ امور مذہبی سے میری یہ خواہش بیجا ہوگی کہ وہ تمام ائمہ مساجد پر نماز فجر یا مغرب کے بعد ان رسالوں کو سبقاً سبقاً مصلیوں کو پڑھ کر سنانا حکماً لازمی قرار دے دے؟

اسی طرح انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے مجلس کے سالانہ اجلاس منعقدہ شہر ورنگل میں آپ نے اپنے صدارتی خطبہ کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:-

"آپ چاہے مجھے رجعت پسند کہیں مگر میں آپ کے موجودہ مسائل کا واحد علاج آپ کے مسلمان ہو جانے میں سمجھتا ہوں۔ مسلمان ہو جانے سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کا زاویۂ فکر اور نقطۂ نظر اسلامی ہو جائے۔ آپ حالات کا اسلامی نظر سے مطالعہ کرنے لگیں اور معاملات کو اسلامی فکر سے سوچنے لگیں - اس کیفیت کے پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن حمید کی بامعنی تلاوت کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لیجئے اور روز سونے سے پہلے سوچئے کہ آپ آج اسلام سے کس قدر قریب یا دور ہو رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا ہم سب کو صراط مستقیم کی طرف رہبری فرمائے اور اس پر ثابت قدم رکھے۔ آمین!"

قرآن حمید کی بامعنی تلاوت کو وظیفۂ حیات بنانے کا یہی شدید جذبہ تھا۔ جس کے زیر اثر مرحوم نے صرف ذاتی مطالعہ پر اکتفا نہ کیا بلکہ باقاعدہ درس تفسیر کا آغاز کر دیا۔ یہ درس روزانہ بعد نماز فجر اپنے محلہ کی چھوٹی سی مسجد میں (جو ڈیوڑھی کے عقب میں واقع ہے) ایک گھنٹہ تک پابندی کے ساتھ دیا کرتے۔ یہ درس صرف انہی دنوں میں ناغہ ہوتا جن میں وہ حیدرآباد سے باہر دورہ پر جایا کرتے ورنہ کڑاکے کے جاڑے، پریشان کن گرمیوں اور موسلادھار بارش تینوں موسموں میں یہ عیش کا پروردہ اور دولت کا آفریدہ نواب روزانہ مسجد میں چٹائی پر بیٹھ کر اپنے آقا کے کلام کو سمجھایا کرتا۔ حتیٰ کہ طبیعت ناساز بھی ہو جاتی تب بھی یہ شغل جاری رہتا۔ مرحوم نے لوگوں سے یہ کہہ رکھا تھا کہ اگر میں کبھی تساہل برتوں تو آپ کو حق حاصل ہے کہ مجھے گھر سے کھینچ نکالیں۔ آخری تین چار برسوں میں مسلسل جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور قلبی موثرات نے مرحوم کی صحت کو بہت زیادہ خراب کر دیا تھا اور نزلے اور گلے کے مرض نے مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔ حتیٰ کہ سردیوں میں صبح دس بجے تک بلند آواز سے بات بھی نہ کر سکتے تھے۔

اس کے باوجود درسِ تفسیر میں ہرج واقع تر ہونے دیا۔ لوگوں کو اپنے سے بہت قریب کر لیتے اور انتہائی پست آواز میں چشم و ابرو کو وضاحت کا آلہ بناتے ہوئے تفہیم و تشریح فرمایا کرتے۔ آپ اپنی بے شمار خدمات میں سب سے زیادہ اہم اور اشرف خدمت اسی خدمت کو خیال فرماتے تھے۔ کہتے تھے۔

"مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے۔"

ایک مرتبہ درس ختم ہونے کے بعد حسبِ عادت دعائے ماثورہ (اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ الخ) پڑھی۔ نہ معلوم کیا خیال آیا کہ گریہ طاری ہو گیا۔ فرمانے لگے۔

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ساری ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے، یہی اُن کی پناہ گاہ ہے۔"

اسی لئے ان کو شکایت تھی کہ جو لوگ میری تقریروں کو ایسی دلبستگی سے سننے کے عادی ہیں وہ تفسیر میں کیوں شرکت نہ کرتے۔ حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہاں تک کہہ جاتے کہ:۔

"اب میں ان جلسوں وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔ بس یہی کرو کہ ہر شخص انفرادی کوشش کرے، یہاں پندرہ بیس آدمی اللہ رسول کی باتیں سنتے ہیں۔ اب یہ لوگ جاکر اپنے گھر میں بیان کریں۔ اس طرح پورے شہر میں تبلیغ ہو جاتی ہے۔ اور یہی چیز زیادہ مفید ہے۔"

مرحوم اور تقریروں کے لئے نوٹ شاذ ہی کبھی تیاری کرتے تھے۔ لیکن تفسیر بڑے اہتمام سے سناتے تھے۔ رات میں سونے سے قبل ایک گھنٹہ یا صبح نماز فجر سے پہلے[1] جس آیت کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اس سے متعلق مختلف نئی پرانی تفسیریں دیکھ لیتے اور ساتھ ہی مختلف ترجمے پیش نظر رکھتے تھے۔

جب مرحوم نے یہ کام شروع کیا تو ساتھیوں نے اور ایک آدھ بڑی طاقت نے یہ باور کرایا کہ یہ تمہارا مقام نہیں۔ خود فرماتے تھے کہ "یہ میرا مقام نہیں"۔ لیکن دونوں کے کہنے میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔ وہ منع کرتے تھے اس لئے کہ چٹائی پر بیٹھنا اور عوام سے اس طرح ملنا "جاگیرداریت" کے خلاف ہے۔ اور یہ فرماتے تھے اس نقطۂ نظر سے کہ مفسر کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بارہا فرمایا کرتے:۔

"میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سُناتا ہوں۔ میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کر لیا کرتا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر یہی کام مسجد میں ہو اور بجائے خاموش سوچنے کے، آواز بلند[2] کہتا جاؤں تو دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ بس اس وجہ سے یہاں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا ہے۔"

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "تدبر قرآن" میں فرمایا ہے کہ قرآن کے تدبر و مطالعہ کا بہترین وقت تہجد کا وقت ہے۔

[2] اس مطلب کو مرحوم اکثر *Loud Thinking* کے لفظ سے ادا کیا کرتے تھے۔

ان الفاظ میں فی الواقع کوئی تصنع نہیں تھا۔ ورنہ پندرہ بیس آدمیوں کو ایک گھنٹہ تک تفسیر نہ سُنائی جاتی۔ انھیں کبھی سترکا و تفسیر کی تعداد کا خیال نہ آیا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ صرف دوؐ ہی سامعین رہے۔ لیکن مرحوم برابر تفسیر سُناتے رہے اور اسی طرح مطالب بیان کرتے رہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جس کی تقریروں کے لئے لوگ ہزاروں کی تعداد میں دوڑے دوڑے چلے آتے ہوں۔ اس کا دو، ایک آدمیوں کے آگے مستقل مزاجی سے قرآن سُناتے رہنا نفسیاتی اعتبار سے بڑا مشکل کام ہے!

ایک مرتبہ تفسیر میں اسی قسم کے اعتراض کو دُہراتے ہوئے کہنے لگا۔

"عموماً "بڑے طبقہ" کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ارے نصیب یاور جنگ کے گھر میں تو ہمیشہ گانا بجانا ہوا کرتا تھا، آج یہ بہادر خاں کو کیا سُوجھی ہے کہ جو قرآن پڑھانے بیٹھا ہے۔ تو میں جواب دیتا ہوں کہ ارے یہاں جب تک تم لوگوں کے ہاں قرآن خوانی ہوتی تھی، ہمارے ہاں گانا ہوا کرتا تھا۔ اب تم لوگ گانے بجانے لگے ہو تو میں قرآن لئے بیٹھا ہوں۔"

اس پر سب حاضرین بے اختیار ہنس پڑے اور خود مرحوم بھی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے!

درسِ تفسیر کے لئے مرحوم پوری سادگی کے ساتھ کُرتہ اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے، شیخ الہند کے ترجمہ والی حمائل ساتھ لئے مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ کبھی جناح کیپ بھی پہنتے تھے۔ سردی کے دنوں میں شب خوابی کا لباس جسم پر ہوتا۔ جس پر غالباً اُون کا ایک پُھندار جُبّہ پہنے ہوتے۔ پاؤں میں پمپ شوز۔ ٹکا جُوتا یا جُوتے کو کاٹا ہوا سلیپر ہوتا۔ نماز خود ہی پڑھاتے اور نماز کے بعد نہایت رقّت و صدقِ دل سے دعائیں مانگتے۔ اور "ربنا اٰتنا فی الدنیا" والی دعا کی تکرار چار چار پانچ پانچ بار کرتے۔ پھر دعا ختم کر کے بڑی دیر تک سر جھکا کر روتے اور گڑگڑاتے۔ اس کے بعد کلام پاک کھولا جاتا۔ تلاوتِ آیت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف انداز میں سُناتے۔ حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ بھی بتادیتے۔ سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے۔ جب خود ترجمہ کر چکتے تو پوچھتے کوئی ترجمہ چُھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ آپ جسے چاہے اختیار کریں۔ اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اصول بتلائے جاتے۔ لغات کی تشریح ہوتی اور پھر مطالب و مسائل زیرِ بحث آتے۔ درس میں بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے۔ فلسفہ کی گُتھیاں سُلجھائی جاتیں۔ فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں سُنائی جاتیں۔ اگر کوئی خاص پتہ کی بات بتانی ہوتی یا کوئی نکتہ بیان کرنا ہوتا تو فرماتے:۔

"دیکھو میاں! ایک بات بولتوں یاد رکھو اور باندھ رکھو مگر بڑے مَولی صاب سے نکّو بولنا۔"[1]

---

[1] یعنی "دیکھو میاں! ایک بات کہتا ہوں۔ یاد رکھو اور باندھ رکھو مگر بڑے مولوی صاحب سے نہ کہنا" اس فقرے کے الفاظ اور اندازِ بیان میں مزاحی رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ایک امرِ واقعی پر متنبّہ کیا گیا ہے۔ مقصودِ بیان یہ ہے کہ عام مولوی صاحبان کی ذہنیت اور نفسیات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ مناسب نہیں ہے کہ کسی کا حوالہ دے کر ہر قسم کے نکات اُن کے سامنے بیان کئے جائیں اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ان نکتوں پر نکتہ چینی ہوگی اور معقول استدلال کی بجائے خواہ مخواہ انھیں نزاعات و اختلافات کا موضوع بنادیا جائیگا۔ اور اس طرح بات کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہر اچھی اور مفید بات اخذ کرلی جائے۔ چاہے وہ جہاں سے ملے لیکن مدرسی علماء کے سامنے بیان کرنے میں احتیاط کی جائے!

آیات کو پڑھ کر بار بار وجد کرتے اور فرماتے "اہا ہا کیا بات فرمائی گئی ہے"۔ روزانہ بالعموم ایک ہی آیت کی تفسیر ہو سکتی تھی اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار چار، پانچ پانچ روز تک بیان ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً سورۂ فتح کی آیت هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ زیرِ تفسیر آئی تو صرف "اظہارِ دین" یعنی دینِ اسلام کے دیگر ادیان پر غلبہ کی تفسیر پانچ روز تک ہوتی رہی۔ ایک روز تعلیماتِ اسلام کے غلبہ کا ذکر ہوا۔ دوسرے روز عبادات کا۔ تیسرے دن فرائض و معاملات کا۔ چوتھی نشست میں اخلاقیات کا اور پھر آخری مرتبہ ظاہری غلبہ کی وضاحت کی گئی اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں قرآن ختم کرنا ہے ورنہ ابھی فلسفیانہ پہلو رہ گیا اور دوسرے نقاطِ نظر سے تشریح نہ ہو سکی۔ فرماتے تھے "بڑی مشکل ہوتی ہے قرآن کے حرف حرف کا یہ عالم ہے کہ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست!

اسی طرح بیعتِ رضوان کا ذکر آیا تو ایک نشست میں تو صرف واقعۂ بیعت سنایا گیا۔ اور دوسرے دن عارفِ رومیؒ کے بعض اشعار سے اس کی نہایت بلند اور عارفانہ توضیح کی گئی۔ جب کوئی سورت ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا۔ تاکہ ایک اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے۔ غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی تھی۔ اور اسی لئے چھ برس میں پورے کلام پاک کی تفسیر بیان کی جا سکی۔ اس درس کی نسبت مرحوم کے ایک سوانح نگار مولوی غلام محمد صاحب بی اے نے بالکل صحیح کہا ہے:۔

"وہ، جسے نام نہاد علماء، عالم کہتے ہوئے عار محسوس کرتے تھے ایسی جامع و مانع تفسیر سنایا کرتا جو اُن جیسے پچاسوں کے لئے بصیرت کا باعث تھی۔ کاش شریک ہو کر استفادہ کرتے لیکن نفس پرستی کی بیڑیاں تھیں، سند کی فصیل حائل تھی۔ اُن کو توڑنا کوئی آسان بات تو نہ تھی!"

تفسیر میں جب ایک پارہ ختم ہو جاتا تو بڑی ہی احسان مندی سے اللہ کی جناب میں حمد و ثنا کرتے اور شکر کرتے کہ اُس نے اپنے ایک حقیر بندے سے اتنی تفسیر سنانے کا کام لیا۔ پھر اپنی طرف سے تمام سامعین کی مٹھائی سے تواضع فرماتے۔ مرحوم شرکاءِ تفسیر کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ اکثر فرماتے کہ:۔

"اگرچہ ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ بھائی چارہ جو یہاں مسجد میں بنتا ہے، بہت پُرخلوص ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی غرض شامل نہیں ہوتی۔ میرا سگا بھائی جائداد پر لڑے گا لیکن آپ لوگ نہیں لڑیں گے۔ لڑائی جھگڑے، بغض و عناد، حسد، لالچ یہ سب بلائیں وہیں سڑک پر مسجد سے باہر رُک جاتی ہیں اور آپ لوگ خالص و مخلص بن کر مسجد میں آتے ہیں اور اس طرح صحیح دینی اُخوت کی بنا پڑتی ہے"۔

قرآن مجید پڑھنے اور پڑھانے کے دوران میں شدتِ تاثر کا یہ عالم ہوتا کہ بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ ادھر قرآن مجید کی آیتوں پر ایک نظر ہی پڑی تھی اور اُدھر دل کی کیفیتیں آنکھوں کی زبانی ظاہر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جب کافی وقت گزر نے پر بھی قابو نہ حاصل کیا جا سکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی۔ ایک روز رمضان کے مہینے میں حسبِ دستور درس کے لئے مسجد میں آئے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ آتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے ادھر نیت باندھی اور اُدھر گھگی بندھ گئی۔ بڑی مشکل سے نماز ختم کی۔ تھوڑی دیر تک حسبِ عادت مراقبہ میں رہے پھر درس شروع ہوا۔

لیکن آنسو برابر جاری تھے ۔ جب تک تفسیر سناتے رہے اشکوں کا سیلاب بہتا رہا۔ تفسیر ختم کرکے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ۔ دل کا درد ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا ۔ دعا ختم کرکے حاضرین کو مخاطب کیا اور صرف اتنا کہا کہ "میاں قرآن پڑھو"۔ ان الفاظ میں معلوم نہیں کیا جادو بھرا ہوا تھا کہ سب کے سب زار و قطار رونے لگے۔ تفسیر ختم کرکے ایسے لاجواب انداز اور اس درجہ خلوص و رقت سے دعا کرتے کہ اس کی قبولیت کا یقین ہو جاتا ۔ کہتے کہ "ربنا ہمارے قلوب کو قرآن کے معانی و مطالب کیلئے کھول دے ہم کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرما ۔ خدایا ہم کو سیدھے اور غلط راستہ میں امتیاز کرنے کی توفیق دے ۔ ہم وہی کریں جو تیرا حکم ہے اور جس پر تیرے نیک بندے چلتے رہے وغیرہ وغیرہ ۔ اس کے بعد عربی میں ایک لمبی چوڑی دعا پڑھتے اور منہ پر سیدھا ہاتھ پھیر کر اٹھتے اور السلام علیکم کہہ کر مکان کی طرف چلے جاتے ۔

جب چھ سال کی طویل مدت کے بعد قرآن مجید ختم ہو سکا تو مسرت و انبساط کا جو عالم مرحوم پر طاری تھا ۔ اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی ۔ بس آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے ۔ خوشی سے بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے ۔ اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین کو کھانے پر بھی مدعو کیا ۔ اور پُر تکلف دعوت دی ۔ باوجود نوکروں کی موجودگی کے، خود ہی سربراہی میں مصروف تھے ۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنائے تو مرحوم فرمانے لگے :۔

"پہنائیے صاحب ! میں آج ضرور پہنوں گا ۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن رہے ہیں ۔ ایک وہ جبکہ زیارت بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا ۔ اور ایک آج جبکہ اس کے فضل و کرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں"

ایک صاحب نے عرض کیا "نواب صاحب ! یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے" مرحوم نے فرمایا :۔

"آپ کو یہ کیسے گمان ہو گیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا ۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے ۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا ۔ اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہیگا ۔"

چنانچہ دوسرے ہی روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور یوم وفات تک جاری رہی ۔ ۳ ۔ رجب ۱۳۶۳ھ بروز اتوار آپ کی تفسیر کا آخری دن تھا ۔ سورۂ بقر کے چوبیسویں رکوع (پارۂ دوم کے آٹھویں رکوع) کی ابتدائی چار آیتوں تک کی تفسیر بیان کی جا چکی تھی ۔ آج پانچویں آیت زیر درس تھی ۔ وقت مقررہ پر مسجد میں تشریف لائے تو تفسیر سے پہلے کہنے لگے کہ :۔

"آج میں زیادہ تیار نہیں ہوں ۔ اور روزانہ جو مطالعہ رات میں کر کے یہاں آتا تھا وہ آج نہیں کر سکا ۔ گذشتہ دو راتوں سے سالگرہ[1] کے عشائیوں میں وقت گزرا اور یہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ ہم کبھی کبھی اللہ کی طرف سے ہٹ کر اس طرح دنیوی کاموں میں لگ جاتے ہیں ۔ خدا ہمیں بھلائی کی توفیق دے ۔"

پھر قرآن کھولا اور یہ آیت تلاوت فرمائی :۔

---

[1] ۔ واضح رہے کہ یکم رجب نظام دکن میر عثمان علی خان کا یوم پیدائش ہے ۔ اس زمانہ میں اس موقع پر سرکاری و غیر سرکاری پیمانے پر جلسے منعقد ہوتے تھے ۔ اور پارٹیاں دی جاتی تھیں ۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ [1]

اور ترجمہ کے بعد الفاظ و مطالب کی تشریح فرمانے لگے۔ لفظ فِتْنَةٌ کے متعلق فرمایا کہ اردو میں اس کے معنی شرارت اور خرابی کے لئے جاتے ہیں۔ مگر عربی میں اس کے اصل معنی ہیں "آزمانا اور امتحان کرنا"۔ اور اس مقام پر لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کے الفاظ کے ساتھ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ کے الفاظ اس حالت کو واضح کرتے ہیں جس کو "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب دین اللہ کے لئے نہ ہو۔ کفار برسرِ اقتدار ہوں۔ کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں۔ اور مسلمان اُن کے قہر و غلبہ کی وجہ سے خدا کے احکام پر پُوری طرح عمل نہ کر سکتے ہوں۔ تو یہ دراصل "فتنہ" کی حالت ہے۔ اس حالت کو "فتنہ" اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ فتنہ کا قطعی استیصال کرو اور اس کے قطعی استیصال تک لڑو۔ اُس وقت تک لڑو جب تک اللہ کے نام اور احکام کا بول بالا نہ ہو جائے۔ اور اس کی حمایت میں لڑنے والی قوتوں کو کامل غلبہ اور فتح حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ باز آجائیں تو ہاتھ روک لو اور زیادتی نہ کرو۔ اور پناہ دو۔ بجز چند ظالمین کے جن کے تذکرے ہی میں شر موجود ہے۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اُٹھا کر حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد تلوار میان میں ڈال دینے والوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور ابوسفیان کے مکان میں پناہ لینے والوں اور خانۂ کعبہ و مسجدِ حرام میں گھسنے والوں کو پناہ دی۔ بجز پانچ یا چند ظالمین کے جن کے متعلق حکم تھا کہ اگر وہ کعبے کے پردوں کو بھی لپیٹ لیں اور حرم میں بھی گھس جائیں تب بھی اُن کو وہاں قتل کر دو۔

اس سے آگے کی آیات میں چند حرام مہینوں کا ذکر ہے [2]۔ تمہیدی طور پر اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:-

"عرب میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرّم اور رجب مقدس مہینے سمجھے جاتے تھے، چونکہ ذی الحجہ کے مہینے میں لوگ حج کے لئے دُور دُور سے آتے تھے اور سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہو جاتا تھا اس لئے اس اثناء میں امن کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور آپس کی خانہ جنگیاں موقوف کر دی جاتی تھیں۔ اسی طرح محرّم کا مہینہ واپس ہونے کے لئے پُرامن بنا دیا جاتا تھا اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لئے خاص تھا۔ اس لئے اس مہینہ میں بھی جنگ ملتوی کر دی جاتی تھی۔ اور اسی بناء پر ان چار مہینوں کو حرام (یعنی حرمت والے) مہینے کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ نالائق عرب اگر کسی سے انتقام لینا یا غارت گری کرنا چاہتے تو حرام مہینوں میں بھی جنگ کا اعلان کر دیتے۔ اور کہتے کہ ہمارے لئے یہ مہینے مقدس نہیں ہیں۔ مقدس مہینے بعد میں آئیں گے جب ہم صلح کر لیں گے یا لڑائی ختم کر دیں گے۔ اس طرح جب چاہتے مہینوں کو اور اُن کی ترتیب ہی کو بدل دیتے"

یہاں تک بیان کر کے فرمایا کہ:-

"آج یہیں تک رہنے دیجئے۔ باقی انشاء اللہ کل کریں گے"

لیکن آہ! وہ ایسا آج تھا کہ جس کی کل قیامت اور روزِ جزاء ہی ہے۔ یہ بات کس کے خیال میں آسکتی تھی کہ "کل" نمودار تو ہوگا

---

[1] ترجمہ:- "اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں۔ مگر ظالموں پر"۔ (بالفاظ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ)

[2] اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

لیکن اس "کل" میں چھپانے والا عندلیب اور اپنی طرز میں بیان کرنے والا مفسر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوجائے گا اور "کل" نمودار تو ہوگا لیکن ایک عالم کو جانے والے کے غم میں سوگوار دیکھے گا۔

ایک دن پہلے یعنی ہفتہ کے روز بارش ہو رہی تھی اور مرحوم سمیت درسِ تفسیر میں صرف چار آدمی تھے اس لئے وَقَاتِلُوهُمْ والی آیت کی تفسیر ختم ہونے کے بعد گزشتہ دو آیتوں کی تفسیر کا خلاصہ بھی بغیر فرمائش بیان کر دیا تاکہ سب لوگ مستفید ہوں۔ اس سے حاضرین بہت خوش ہوئے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری تفسیر ہے۔ گزشتہ دو آیتوں کے الفاظ یہ ہیں:-

"وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔
وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۝ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ
جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" [1]

ان آیات کے متعلق فرمانے لگے کہ "کتنے کھلے اور صاف احکام ہیں۔ فرمایا ہے کہ جب وہ لڑائی چھیڑ دیں، معاہدہ توڑ دیں اور خود ابتدا کریں تو مارو اُن کو جہاں وہ نظر آئیں اور اگر موقع ہو اور ضرورت محسوس ہو تو ان کو مکہ سے بھی نکال دو جہاں سے تم کو انہوں نے نکالا اور اب بھی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ فتنہ قتل سے بری چیز ہے۔ اگر چند آدمیوں کو قتل کر دیا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن "فتنہ" کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قتل ہو جانے کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے اگر وہ فتنہ برپا کریں اور اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے چند آدمیوں کو مسلمان قتل کر دیں تو یہ عین رحمت ہے۔" پھر سرسیدؒ کی تفسیر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "بعض فتنے ایسے اُٹھے تھے کہ مسلمانوں کو "جارحانہ" اقدام کرنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے بڑے بڑے فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے۔" پھر "مسجد حرام" کے معنی بتاتے ہوئے فرمایا کہ کعبہ کے اطراف کی مسجد کو مسجد حرام کہتے ہیں۔ یہ حرمت والی مسجد بھی ہے اور یہاں بعض حلال اور جائز باتیں حرام بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شکار کرنا اور عوام الناس کے بقول "جانوروں کے سید" کبوتر تک کو مارنا جو وہاں بہت پایا جاتا ہے۔ گھاس اکھیڑنا وغیرہ۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ پھر حکم ہے کہ مسجد حرام میں اپنے ہاتھ کو ابتداءً سے روکو لیکن اگر وہ وہاں بھی لڑنے لگیں تو ان سے وہاں بھی لڑو۔ اور کاٹ ڈالو کیونکہ منکروں کی یہی سزا ہے۔ ہاں اگر کفار باز آجائیں اور ظلم نا بند کر دیں تو اُن سے کہو کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ باری تعالیٰ کے ابرِ کرم سے سرسبز وادیاں اور خشک چٹانیں برابر سرابر آبِ رحمت پاتی ہیں۔ چنانچہ ابوسفیانؓ۔ عکرمہؓ بن ابوجہل۔ ہندہؓ اور وحشیؓ اسی حکم کے تحت معاف کئے گئے۔

تفسیر ختم ہوئی تو ایک صاحب نے مرحوم سے شیعہ سنی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ آپ نے جواب دیا کہ میں واقعات و حقائق اور مختلف لوگوں کی رائیں بتا سکتا ہوں۔ لیکن آپ یہاں اس مسجد میں میری ذاتی رائے دریافت نہیں کر سکتے۔ یہاں مجھے بالکل غیر جانبدار رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ شیعہ حضرات حضرت علیؓ کو افضل اور دیگر خلفاء کو غاصب کہتے ہیں حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کسی کو کسی پر فضیلت دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ اُن میں سے

---

[1] ترجمہ:- "اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو اُن کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا۔ اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ لڑو اُن سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ۔ پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو اُن کو مارو۔ یہی ہے سزا کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔"
(ترجمہ شیخ الہندؒ)

تم جس کسی کی اقتدا کروگے، ہدایت پاؤ گے، رہا میرا ذاتی حال تو میں تمام صحابۂ کرام میں حضرت عمرؓ سے زیادہ متاثر ہوں۔ اور مجھے اُن کی طرف خاص کشش ہے، بلکہ اُن کے نام ہی سے مجھ پر خاص اثر ہوتا ہے۔ پھر بات کو مختصر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب جھگڑا دو اور تُو تُو میں میں سے کیا فائدہ۔ جبکہ جو ہونا تھا۔ ہوگیا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ آج سب حاضرین کا نام پوچھیں گے اور ضروری تعارف کرائیں گے۔ اس سے پہلے ایک دن انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ کسی دن آپس میں تعارف کرائیں گے۔ لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث سارے حاضرین سے نام نہ پوچھ سکے۔ صرف ایک شخص سے نام دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا "تفسیر علی[1]"۔ نام بڑا معنی خیز تھا۔ لیکن کچھ عجیب سا۔ اس لئے اس پر ایک خفیف سا قہقہہ پڑا اور مرحوم نے بھی سنجیدگی سے تبسم فرمایا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ایسے بہت سے نام ہوتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا نام "محمد عبد الرب العالمین" ہے۔ مرحوم نے سنجیدگی کے ساتھ مسکرا کر کہا "ایک عالمین بڑھا دیا گیا ہے۔ عبد الرب تو ہوا ہی کرتا ہے"۔ اس کے بعد دوسروں کا نام پوچھے بغیر سلام علیکم کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس دن بارش کی وجہ سے مرحوم نے اپنا ہلکا جوتا مسجد کے اندر لا رکھا تھا۔ جب باہر نکلنے لگے تو چپکے سے جوتا ہاتھ میں اٹھایا اور باہر لے جاکر نیچے ڈال کر پہن لیا۔ میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں جوتے کے بالکل قریب تھا لیکن اس پر میری نظر نہ پڑی۔ جب انہوں نے جوتا اٹھا لیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہائے اتنا اچھا موقع کھو دیا۔ کاش! میں جوتا لے جاکر باہر رکھ دیتا۔ تاہم میں نے فوراً ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی روز ضرور کوشش کرکے جوتا اٹھانے کی سعادت حاصل کروں گا۔ مگر آہ! یہ کسے خبر تھی کہ وہ موقع آخری اور بالکل آخری تھا"

مسجد کے باہر دو مسلمان طالب علم سامنے آگئے۔ اور کتابیں طلب کیں۔ مرحوم نے پوچھا کیا آپ لوگوں کا امتحان ہوگیا؟ کیا پہلی کتابیں واپس کردیں؟ طالب علموں نے جواب دیا۔ جی ہاں! فرمایا "چلو میرے ساتھ! کتابیں ضرور ملیں گی، ارے بھئی! یہ بچے بڑے اچھے ہیں"۔ پھر حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا "یہ بچے تو مجھ سے زیادہ قابل ہیں"۔ یہ کہہ کر بچوں کو ساتھ لئے گھر کی طرف چلے گئے۔ مگر بارہ پندرہ گھنٹوں کے اندر دنیا ہی سے چلے گئے۔

(رحمۃ اللہ وطاب ثراہٗ)

---

[1] تفسیر علی ادھیڑ عمر کے ایک انتہائی غریب شخص تھے۔ موز (کیلے) بیچا کرتے تھے۔ مسجد ننگے پیر آیا کرتے۔ سب سے پہلے آتے اور نماز روزانہ جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے۔ درس تفسیر کے وقت نہایت ادب اور عقیدت سے بیٹھتے تھے۔ اور غالباً تلنگی زبان میں کچھ نوٹ بھی کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی مرحوم سے کوئی سوال بھی کیا کرتے تھے۔ میرے ایک محب صادق جناب صادق احمد صاحب بی اے (حیدرآباد) کا بیان ہے کہ "مرحوم کی وفات پر پندرہ بیس دن گزر رہے تھے۔ میں کالج جا رہا تھا۔ جب ریزیڈنسی روڈ سے میرا گزر ہوا تو میری نظر تفسیر علی پر پڑ گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک لکڑی میں آگے پیچھے دو ٹوکریاں لٹکائے اور اُن میں کیلے رکھے ہوئے اپنی دھن میں کچھ آواز سے قرآن مجید کی بعض سورتیں پڑھتے اور ورد کرتے چلے جارہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا اور رقت طاری ہوگئی۔ میں نے دل میں کہا کہ جس شخص نے مرحوم کی تفسیر سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور اس پر عمل کیا وہ یہی ہیں جو اب ننگے پیر ہیں۔ لیکن حلال کی روزی اللہ کی راہ میں کما کر کھاتے ہیں اور جب ہم حشر کا رُخ قیامت کے دن ایک گروہ کی شکل میں گزریں گے تو ہماری صف میں آگے یہی تفسیر علی ہوں گے"

سعید رمضان   ترجمہ۔ آباد شاہپوری

حسن البنّاء

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم   کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

"یہ میرے وہ دلی تاثرات ہیں جنہیں مَیں عمر بھر فراموش نہیں کروں گا"
۱۳-فروری ۱۹۴۹ء

حادثہ فاجعہ۔

نمازِ فجر ادا کر کے مَیں موتمرِ اسلامی کے کچھ کاغذات ٹائپ کرنے بیٹھ گیا۔ اٹھا تو حادثۂ فاجعہ کی خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ خدا کرے یہ خبر سچی نہ ہو .... میرا ہاتھ بے سکت ہے اور قلم جامد ہو کر رہ گیا ہے ...... حسن البنّاء قتل کر دیئے گئے ...... اس خبر کی صداقت کو دل نہیں مانتا۔ جھوٹ ہے!! نہیں! نہیں! خبر سچی ہے۔ ریڈیو پر نشر ہوئی ہے۔ اس مردِ عظیم پر کل شام گولی چلائی گئی۔ پھر اُسے اپنے پاک خون میں غلطاں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جہاں مانے کے وقت اس کی روح جنت کو پرواز کر گئی۔ اور ہمیں زمین پر اس کی شریر انیوں اور تلخیوں کا سامنا کرتے رہنے کے لئے چھوڑ گئی۔ اس عظیم انسان کو ایک مجرم ہاتھ نے قتل کر دیا ...... اسلام کے حق میں اس نے بُرا کیا ...... بہت بُرا۔

یا فضیلۃ المرشد! آپ جنت میں اپنے جس پاک اور بلند مقام پر بھی ہوں۔ آپ پر سلامتی ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کو وہ جزائے خیر عطا فرمائے جو وہ ایک امام کو اس کے شاگردوں اور پیروکاروں کی طرف سے عطا کر سکتا ہے!

حسن البنّاء امام تھے، امامت کے ہر مفہوم کے اعتبار سے۔ وہ ہر بات میں ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اپنے علم میں، اپنے ایمان میں اپنے اخلاص میں۔ اپنی زندہ دلی میں، اپنی تیز فہمی میں، اپنی باریک بینی میں، اپنی وسیع القلبی میں اور اپنی پاک روح میں۔

حسن البنّاء اللہ کی حجت تھے۔ میرا خیال ہے کہ اسلام انسان کی تعمیر اعلیٰ نمونہ پر کرتا ہے اور گوشت اور خون کے اس مجسمہ کو پاکیزہ و شفاف نورانی سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ حسن البنّاء ایک باہیبت و جلال عقل تھے اور ایسی روح تھے جو سِرِّ بلند سے رابطہ رکھتی تھی۔ اور اللہ کے ذکر سے نہیں تھکتی تھی۔ وہ پہاڑ کی ایک بلند چوٹی تھے، جس میں علو اور ثبات تھا اور جس میں قوم کی قوت پنہاں تھی۔ وہ بڑے تجربہ کار تھے۔ اُن کا اندازہ اکثر غلط نہ ہوتا تھا۔ وہ سوز و گداز، سحر بیانی اور مروت کے لحاظ سے ایک تحیر خیز شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے ہمارے دل اللہ کی محبت سے بھر دیئے تھے اور ہمارے سینوں میں اسلام کی آتشِ عشق بھڑکا دی تھی۔ اور ہمیں پاکیزہ کٹھالی میں اس طرح پگھلا دیا تھا کہ ذرا کھوٹ باقی نہ رہا تھا۔

حسن البنّاء جس روز قتل ہوئے وہ تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ اُن کے تلف ہو جانے سے انسانیت تلف ہو گئی۔ وہ اُن انسانوں میں سے تھے جنہیں مادرِ گیتی شاذ و نادر ہی جنم دیا کرتی ہے!

حسن البنّاء اللہ کی راہ میں مسلسل تگ و دو اور شب و روز کے متواتر جہاد کے بعد قتل کر دیئے گئے!

مجھے اُن کا ملک کے طول و عرض میں سیماب وار گھومنا اور دورے کرنا کبھی نہ بھولے گا۔ وہ دن بھر میں دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سوتے تھے۔ وہ مرکزِ عام یا اپنے گھر میں اللہ کی عبادت اور "الشہاب" کے لئے دعوتی مضامین لکھنے میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے۔ مجھے ان کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو وہ مسلمانوں کی تغافل کیشی اور اسلام فراموشی پر اکثر بہایا کرتے تھے۔

یہ وہ گہری اور شیریں آواز تھی، یہ وہ زندہ اور پُرشوق ایمان تھا اور یہ وہ سوزاں روح تھی جس کے ذریعہ میں نے اللہ کو پہچانا۔ جس کی شعاعوں نے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیا —— وہ ایک بُردبار اور ارجمند شخصیت تھی۔

یہ وہ حیرت انگیز انسان تھا جس نے امّت کو پستیوں سے اُبھارا، اسے جھنجوڑ جھنجوڑ اُٹھایا اور اس کی روح و ضمیر میں زندگی کی رَو دوڑادی۔ اور آج جبکہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکا ہے اپنے پیچھے شریف اور زندہ قوم چھوڑ گیا ہے۔ جو اپنے رب کو پہچانتی ہے اور اپنے فرض کو ادا کرتی ہے!

امام حسن البنّاء اس فاسد و تاریک زمانہ میں ایک امید درخشاں تھے جنہیں اللہ کی رحمت اس دُنیا میں لائی تھی۔ اُن کا قتل مصر اور اہلِ مصر کی پیشانی پر ہمیشہ ایک رسوا کن داغ رہے گا۔

جمعہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۹ء

آپ فوت نہیں ہوئے!

میں ابھی ابھی سرتاج ہوٹل کراچی میں اپنے بالاخانہ کی گیلری سے باہر جھانک رہا تھا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو قدرے جُھک کر چل رہا تھا۔ اُس کی چال نے مجھے اخوان مصر میں سے ایک محترم اخ (بھائی) کی یاد دلادی!

اے اخوان مصر! اے نورِ نبوت سے مستنیر پاک نوجوانو! اے عظمتِ رفتہ کی یادگارو! اور اے دلِ مجروح کے عزادارو! کس کے وہم و گمان میں تھا کہ اس مردِ عظیم کے سایۂ طاعت میں نسیم حسن و حریت کی اٹکھیلیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تند آندھیاں اپنے دامن میں اس گھٹا ٹوپ گناہ کی جھاڑی لئے ہم پر اُمنڈ آئیں گی!

حسن البنّا نسیم خوشگوار تھے، جو اللہ کی رحمت کو لئے پیاسی انسانیت پر چلی اور ہمیں برتر و اولیٰ انسانوں کے دَور —— انبیاء و مرسلین اور اللہ کے محبوب بندوں کے دَور —— کی یاد دلاکر اور جنّت و نیکی کا مشتاق بنا کر گزر گئی۔ وہ ایک ایسا چشمہ تھے جس سے ہم جی بھر کر سیراب ہوتے تھے۔ لیکن اس کا پانی کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ وہ ایک ایسا پاکیزہ و صاف دریا تھے جس میں ہماری ساری میل کچیل دُھل جاتی تھی۔ اور وہ اسی طرح پاک و صاف اور بے پایاں رہتا تھا۔ نہ تنگ ہوتا تھا نہ غلیظ۔

یا فضیلۃ المرشد! کیا کہنے والے سچ کہتے ہیں کہ آپ وفات پاگئے .... اور یہ کہ آپ نے قاہرہ کی ایک سڑک پر قتل ہو کر وفات پائی۔ مسجدِ قیسون میں چند لوگوں نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی اور آپ دفن کردیئے گئے اور یہ کہ آپ کو الوداع کہنے والا آپ کے اہلِ بیت اور چند اقرباء کے سوا اور کوئی نہ تھا؟ .... نہیں اے فضیلۃ المرشد! آپ نے وفات نہیں پائی۔ اس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو پیدا کیا .... آپ نہیں مرے .... اُس خدائے لایزال کی قسم جس نے ہمیں آپ کی ذات سے نوازا اور آپ کی صحبت سے بہرہ ور فرمایا۔ آپ فوت نہیں ہوئے۔ آپ نے ہمارے دلوں کو قرآن کے نور سے آگاہ کیا۔ ہمیں اسلام کے راستہ پر ڈالا اور ہماری شیرازہ بندی کی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ہم دعوت و تربیت کا وہ کام جاری رکھیں گے جو آپ شب و روز انجام دیا کرتے تھے۔ منگل کے درس، مرکزِ عام کے فرائض

خصوصی مذاکرات، عام خطابات اور استدلال کے معرکے اسی طرح جاری رہیں گے ...... جب ہمارے دلوں میں یہ جذبات رچ بس چکے ہیں اور ا
مانت ہماری گردنوں کا قلادہ بن چکی ہے۔

یا فضیلۃ الاستاذ! آپ ہمیں اس حال میں چھوڑ گئے ہیں کہ آپ نے سخت بوجھ ہم پر لاد اور اسے ہمارے رگ و ریشہ اور اعصاب میں
شہد کی صورت پیوست کر دیا۔ بس اے روح حبیب! باغ بہشت میں شادان و فرحاں رہ ...... !

جمعۃ المبارک ۱۰ر جون ۱۹۴۹ء

سرگوشی!

(فاطمہ جناح ہسپتال کراچی کے ایک بلند کمرے میں — دس بجے صبح کے قریب)

سیدی فضیلۃ الاستاذ المرشد!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اے عظیم انسان! اللہ آپ کو صبح مبارک کرے۔ اور .... کیا جنت میں بھی صبح و شام
ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ آپ ہمیں یہاں ظلمت کے درمیان حیران و سرگردان چھوڑ کر جنت میں جا بسیں۔
فضیلۃ الاستاذ! ہم آپ کی محبت میں ان پرندوں کی طرح تھے، جنہیں آپ نے اپنے اللہ کے اذن سے ان کے قفس سے
رہا اور جو رہائی پاتے ہی مسرت کے مارے آزاد فضا میں پرواز کرنے لگے۔ لیکن ابھی وہ آپ تک لوٹ نہ پائے تھے تاکہ آپ ا
اللہ کی راہ میں آزمائیں کہ آپ ان کو چھوڑ کر سب سے مقدس پڑوس اور سب سے اونچی منزل کی طرف چلے گئے۔ چنانچہ آندھیوں
نے انہیں گھیر لیا ہے اور اب انہیں ایک ایسے آشیانے کی تلاش ہے جس میں وہ جمع ہو سکیں۔ اللہ کے سوا کسی کو خبر نہیں کہ
آشیانہ کہاں ہے۔ یا سیدی! زمانہ اپنے دامن میں ہماری خاطر کچھ بھی چھپائے ہوئے ہے، ہم اللہ سے اپنے عہد پر ثابت قدم
کی دعا کرتے ہیں ......

یا سیدی! آپ کی روح کہاں ہے؟ جو ہمارے دلوں سے حرماں نصیبی کو زائل کر دے۔ آپ کی آنکھیں کہاں ہیں، جن
آسمانی نور کا پرتو ہم اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیں۔ آپ کا وہ حیرت ناک ضمیر کہاں ہے جو ہمیشہ ہمارے اندر یہ اعتماد قائم رکھتا تھا کہ
اپنے راستے پر گامزن رہیں۔ اور یہ کہ حسن البنا کے پیش نظر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں —
یا سیدی! آپ وہ انسان تھے جس نے ہمیں ایمان کی راہ دکھائی تھی، جس پر اعتماد کیا جاتا تھا اور جس کے دامن صداقت
راحت کامل ملا کرتی تھی۔

ہم آپ کے یہ کلمات ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ "اے اخوان! مجھے تمہارے بارے میں تم پر ٹوٹ پڑنے والی دنیا کا
نہیں ہے کیونکہ اللہ کے اذن سے تم اس سے کہیں طاقتور ہو۔ لیکن مجھے تمہارے متعلق دو باتوں کا خوف ہے۔ میں ڈ
ہوں کہ تم کہیں اللہ کو بھول نہ جاؤ اور اپنے آپ پر بھروسہ نہ کرنے لگو۔ یا کہیں تم اپنی اخوت کو فراموش نہ کر دو اور اس ط
تم میں سخت جنگ نہ چھڑ جائے۔"

یا فضیلۃ الاستاذ! ہم اللہ کو کبھی نہیں بھولیں گے اور اپنی اخوت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ اور اللہ کے دشمن
کچھ بھی کریں گے، ہم ان دونوں باتوں کو یاد رکھیں گے۔

سیدی الاستاذ! اس دن کو یاد کیجیے جب فلسطین کے پہلے معرکے میں محترم اخوان کی شہادت کی خبر آپ کو ملی تھی۔ ا
یاد کیجیے کہ اس وقت آپ نے کہا تھا "اے اللہ ہمیں جنت کا اشتیاق ہے ..... اس کی حوروں اور اس کے فواکہات

خاطر نہیں بلکہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، اور صحابہ کرام سے ملاقات کی خاطر۔ اور یہ سب معزز ترین شہداء ہیں۔ اللہ نے آپ کی سعی ہے۔ کیا آپ کی ان حضرات سے ملاقات ہوئی؟ اور آپ نے انہیں کس حال میں پایا؟ اللہ تعالےٰ نے دنیا اور آخرت میں جو عزت وعظمت سے نوازا۔ خدا کرے آپ اس سے لطف اندوز ہوں۔ فآتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ۔

آہ، یا استاذ! آپ واپس نہیں آئیں گے کہ میں آپ سے دریافت کروں۔ اور ہم آپ کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتے کہ آپ کی باتیں سنیں۔ خدا کرے ہم زندگی کا ایمان اور عزم کے ساتھ سامنا کرسکیں اور جو بیج آپ نے بویا تھا جلد پھل لے آئے۔ فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ اور اے روح حبیب الحبہ پر اللہ کی طرف سے سلامتی اور اس کی برکات نازل ہوں!

منگل ۱۱ر جولائی ۱۹۴۹ء

آخری ملاقات

(شام کے نو بجے ہیں۔ میں ابھی چند منٹ ہوئے افطاری سے فارغ ہوا ہوں اور اب ایک واشنگ ٹب میں ہاتھ دھو رہا ہوں جہاں سے آرام باغ کے سامنے کی سڑک دکھائی دے رہی ہے)

میری نظر ایک کار پر جا پڑی ہے جو ہو بہو فضیلۃ المرشد کی کار کی طرح ہے جس میں وہ سوار ہوا کرتے تھے۔ میرا دل دھڑکنے اور سینے میں اٹھنے لگا ہے۔ مجھے وہ آخری لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے جب میں نے فضیلۃ المرشد الشہید الشان کے انداز کو دوبالا کرتے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لمحات کو گزرے ابھی چند گھنٹے ہوئے ہیں یا جیسے زمانہ کی گردش رک گئی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے جامد ہوکر رہ گئے ہیں اور ریڈیو پر جتنی خبریں نشر ہوئی ہیں، سب جھوٹی، لاحاصل اور بے حقیقت ہیں۔

مرشد حبیب سفید لباس پہنے اور سفید دھاریدار کمبل اوڑھے مرکز عام کی مسجد کے قریبی کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے ہیں۔۔۔ پیارا سرخ چہرہ۔۔۔ نرم و شیریں آواز جس میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آب دہن کی گھلاوٹ ہے اور خوش آمد آسمانی جرس کا ترنم ہے۔۔۔ اور۔۔۔ فضیلۃ الاستاذ اپنی اس تقریر سے ابھی فارغ ہوئے ہیں جس میں آپ نے اخوان کو الوداع کہا ہے کیونکہ آپ کل صبح حجاز کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔

مجھے اپنے پاس بلاتے ہیں اور مشرق اردن کے سفر کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیتے ہیں۔ مجھے اپنے بیش بہا افکار میں لیتے ہوئے کام خاص میرے سپرد کرتے ہیں۔ میں اپنے اس اعزاز پر زندگی بھر نازاں رہوں گا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہ ہماری اس دنیا میں آخری ملاقات ہے۔ اور اب ہمیں شاید اللہ تعالیٰ نے اگلی دنیا ہی میں ملائے گا۔

[illegible] تو خوب جانتا ہے کہ وہ ایک صدق شعار بندے اور مخلص مجاہد تھے اور ایک [illegible] کو ایک مرکز پر جمع کیا اور انہیں نجاست سے پاک کیا اور تیرے اذن سے انہیں گراں [illegible] پہنچایا۔ اے اللہ! اپنی بارگاہ میں ان کے درجات بلند کر اور انہیں انبیاء اور صدیقین کے زمرہ میں شامل کر اور اپنے [illegible] جمیل پر نظر [illegible] عطا کر اور ہماری طرف سے انہیں وہ نیک بدلہ عنایت فرما جو تیرے دامن جود وکرم میں ان کے لئے ہو [illegible] دعوت کو ہر قسم کی عزت و عظمت سے نواز۔ اے اللہ! انہیں سعادت سے بہرہ ور کر۔ خدایا! انہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کر۔ بار الہا! ہمیں [illegible] شادمانی عطا کر۔ اور اے اللہ! ہمیں ان کے ساتھ صالحین کے زمرہ میں شامل کر اور جو عہد ہم نے ان سے باندھا تھا اس پر ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں ان کی طرف سے نیک بدلہ دے اور ہمارے دلوں میں وہ نور ڈال دے جو ہماری راہ کو روشن و منور کردے۔ اللھم آمین۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہ وسلم۔

(المسلمون)

علامہ محمد اسد لیوپولڈ
مترجم۔ سید عرفان بی ایس سی

دینِ فطرت

شاہراہِ حیات

بیسویں صدی کے طرۂ امتیاز نعروں میں سے ایک نعرہ اس "فضائے بسیط کی فتح" ہے۔ ذرائع نقل و حرکت میں اس قدر انقلاب آیا ہے جس کا تصور گذشتہ نسلیں نہیں کر سکتیں۔ تاریخ انسانی میں زمانۂ ماقبل کے مقابلے میں انہی ذرائع کے طفیل مال و اسباب کے انتقال کا پیمانہ وسیع تر اور اس کی رفتار تیز تر ہو گئی ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ قوموں کی معاشی زندگی میں باہمی ربط و تعاون ہے۔ آج کوئی قوم یا جماعت یا گروہ زیادہ عرصہ تک دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ معاشی ترقی نے مقامی حیثیت سے آگے بڑھ کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور سیاسی فاصلے اور جغرافیائی دوریاں سمٹتی جا رہی ہیں۔ یہ نہ صرف تجارت بلکہ افکار اور تہذیبی اقدار کی بڑھتی ہوئی اہمیت بھی اپنے ساتھ لئے پھرتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں طاقتیں یعنی معاشی اور تہذیبی اقدار ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں تاہم ان کے جاذب نظر اصولوں میں کافی فرق ہے۔ معاشیات کے قوانین کا تقاضا تو یہی ہے کہ قوموں کے مابین مال و اسباب کا انتقال باہمی ہونا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی قوم صرف خریدار نہیں رہ سکتی۔ وہاں جائے کہ دوسری قوم ہمیشہ فروخت کنندہ رہے۔ انجام کار ان میں سے ہر ایک کو بیک وقت دونوں ہاتھوں "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا پارٹ ادا کرنا ہے۔ چاہے یہ کام بالواسطہ طریق سے ہو یا معاشی طاقتوں کی تشکیل میں اور ... کے وسیلہ سے ہو۔ لیکن ثقافتی میدان میں تبادلے کے اس ٹھوس توازن کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ کم سے کم یہ ظاہری نہیں ہوتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افکار اور تہذیبی موثرات کا تبادلہ لازماً "لینے اور دینے" کے اصول پر مبنی نہیں ہوا کرتا ... خاصہ ہے کہ جو اقوام اور تہذیب سیاسی اور معاشی لحاظ سے زیادہ قوی ہوتی ہیں وہ کمزور یا کم جفاکش قوموں پر جادو کا سا اثر ڈالتی ہیں۔ ان کمزور قوموں سے خود متاثر ہوئے بغیر وہ زندگی کے عقلی اور عملی پہلوؤں میں ان پر اثر انداز ہوتے ... ہم عالم مغرب اور دنیائے اسلام کے تعلقات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہی کچھ نظر آتا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ تاریخ کے ایک مبصر کے نقطۂ نگاہ سے آج مغربی تہذیب جس یک طرفہ طریق سے دنیائے اسلام پر اثر انداز ہو رہی ہے حیران کن نہیں کیونکہ یہ ایک تاریخی عمل کا صریح نتیجہ ہے۔ جس کے لئے بہت سی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں۔ شاید ... وہ اس سے مطمئن ہو۔ لیکن ہمارے لئے یہ مسئلہ جہاں نقادوں کا رہی رہتا ہے۔ ہماری حیثیت محض باذوق و باقصد اسے تماشائیوں کی نہیں بلکہ اس ڈرامہ میں حقیقی کرداروں کی ہے۔ ہم نبی آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ ہمارے لئے فی الحقیقت یہ مسئلہ اسی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے برعکس نہ صرف ذہن کے اس ذہنی رجحان کا نام ہے جو مختلف تہذیبی شکلیں اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ بذات خود تہذیب کا مکمل دائرہ ہونے کے علاوہ ایک ایسا نظام ہے جس کے خدوخال واضح طور سے متعین

ہیں۔ جب کوئی پردیسی تہذیب ہمارے درمیان شعاع ریزی کرتی ہو۔ جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔ اور ہماری تہذیبی ہیئت میں خاص زیست کے تغیرات پیدا کرنی چاہتی ہو تو اس وقت ہم پر یہ جاننے کا فرض عائد ہوتا ہے کہ آیا یہ اجنبی اثرات ہمارے تہذیبی کمالات سے میل رکھتے ہیں یا ان کے خلاف پڑتے ہیں۔ آیا یہ اسلامی تہذیب کے جسم میں توانائی پذیر خوناب کا پارٹ ادا کرتے ہیں یا زہر کا سا عمل کرتے ہیں۔

اس سوال کا جواب ہمیں صرف تجزیہ کرنے سے مل سکتا ہے۔ ہمیں دونوں یعنی مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے تحریک انگیز مقاصد دریافت کرنے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ معلوم کرنا ہے کہ ان میں تعاون کہاں تک ممکن ہے۔ چونکہ اسلامی تہذیب بہ لحاظ بنیاد ایک مذہبی تہذیب ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں یہ بتانا چاہئے کہ حیاتِ انسانی میں مذہب کیا پارٹ ادا کرتا ہے۔

جس چیز کو ہم "مذہبی رجحان" کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ انسان کی عقل اور حیاتیاتی ساخت کا فطری نتیجہ ہے انسان میں اتنی قابلیت نہیں کہ وہ خود کو موت وحیات، لامحدودیت اور ازل وابد کا راز سمجھائے۔ یہاں اس کی قوت ادراک سپرانداختہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے سامنے کل کی دو راہیں ہیں۔ اولاً زندگی کو بحیثیت "کل" کے سمجھنا ترک کر دے۔ انسان اس صورت میں صرف ظاہری تجربات کی شہادت پر ایمان لائے گا اور اپنے نتائج کو صرف ان کی وسعت تک محدود رکھیگا پس وہ زندگی کے اجزاء کے ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہوگا اور جس رفتار سے اس کا علم فطرت ترقی کرے گا اسی نسبت سے اس کا علم اجزاء حیات بھی مقدار میں بڑھے گا۔ لیکن با ایں ہمہ اس کا علم اجزاء تک محدود رہے گا۔ کلیت کی گرفت بذاتِ خود انسانی منطق کے مقررہ لوازمات کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ طبعی علوم کا نتیجہ یہی کچھ ہے۔ دوسری راہ مذہب ہے جس کو سائنس کے شانہ بہ شانہ اچھی طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔ مذہب ایک باطنی اور بیشتر وجدانی احساس کے ذریعہ زندگی کی توحیدی تشریح کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ عقیدہ ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے کہ ایک ایسی مختارِ کل تخلیقی قوت (خدا) موجود ہے جو نہ صرف ساری کائنات پر پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق حکمرانی کر رہی ہے بلکہ وہ انسان کی قوت مدرکہ سے بالاتر بھی ہے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے ضروری نہیں کہ یہ نظریہ انسان کو ایسے حقائق ومعارف اور زندگی کے ایسے اجزاء کی جانچ و پڑتال سے روکے جو اپنے آپ کو ظاہری مشاہدہ کے لئے پیش کرے۔ کیونکہ خارجی یعنی سائنسی اور باطنی یعنی مذہبی تصور میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن موخرالذکر فی الاصل زندگی کو ذات اور تحریک انگیز قوت کی آمیزش یا بالفاظ دیگر ایک متناسب اور ہم آہنگ کلیت کی حیثیت سے سمجھنے کے لئے واحد نظریاتی امکان ہے۔ گو "متناسب" کا لفظ بہت غلط استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا مطلب انسان کا بذات خود ایک متبادل رویہ ہے۔ دین دار آدمی جانتا ہے کہ جو کچھ اس کو پیش آتا ہے یا اس کے دل میں گزرتا ہے وہ کبھی بھی بیکار طاقتوں کے اندھا دھند عمل کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ وہ اس کو صرف خدا کے باخبر ارادہ کا نتیجہ مانتا ہے۔ اس لئے وہ بلحاظ ساخت ایک عالمگیر پلان کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اس طرح آدمی میں اپنی خودی (یعنی شخصیت) اور حقائق اور اشکال کی ظاہری دنیا جس کو دوسرے الفاظ میں تعبیر کہتے ہیں کے مابین اختلاف کو دور کرنے کی قابلیت آ جاتی ہے۔ روح کی دقیق ساخت کے باوجود اور اپنی خواہشات، اپنے خطرات، اپنے جذبات اور اپنے غیر مصدق شکوک کے ہوتے ہوئے۔ انسان اپنے آپ کو ایسی فطرت سے دوچار ہوتے ہوئے پاتا ہے جس میں جود اور سفاکی، خوف اور تحفظ حیرت انگیز اور ناقابل طور سے ملائے گئے ہیں۔ اور جو انسانی ذہن کی بناوٹ اور اسالیب سے بالکلیہ جدا خطوط پر کام کر رہی ہے۔ اس نزاع کے ختم کرنے میں نہ تو خالص عقلی فلسفہ کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نہ تجرباتی سائنس کو۔

ٹھیک یہی مقام ہے جہاں مذہب اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔

مذہبی تصور اور تجربہ کی روشنی میں بشری اور از خود آگاہ ذات اور بے زبان مگر ظاہراً غیر ذی روح فطرت کو روحانی تناسب کے رشتہ میں پرو دیا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں یعنی انسان کی شخصی آگاہی (معرفت) اور فطرت جو اس کے گرد و پیش اور اس کے اندر رہتی ہے ایک ہی تخلیقی قوت (خدا) کے مظہر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگرچہ شکل و صورت میں مختلف ہی سہی۔ پس مذہب کی وجہ سے انسان کو جو بے پایاں فائدہ ملتا ہے وہ اس بات کا علم ہے کہ وہ (انسان) تخلیق کے ابدی سلسلہ کی ایک سوچی سمجھی کڑی ہے اور اس کی یہ پوزیشن کردہ عالمگیر قید و بند کی لامحدود ساخت کا ایک مخصوص حصہ ہے ہمیشہ برقرار رہے گی اس نظریہ کا نفسیاتی نتیجہ روحانی تسکین کا ایک گہرا احساس ہے۔ یعنی امیدوں اور خطرات کے درمیان ایسا تناسب جو ایک عابد کو چاہے وہ کسی مذہب کا پیرو ہو ایک لامذہب سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ بنیادی وصف تمام بڑے مذاہب میں مشترک ہے۔ چاہے ان کے مخصوص عقائد کچھ بھی ہوں۔ اس کے علاوہ ان میں دوسری مشترک خاصیت وہ اخلاقی اپیل ہے جو انسان سے خدا کے حکم کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ اس نظریاتی تشریح اور چند نصائح سے ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسلام نہ صرف ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی بلحاظ اکثریت ایک اکائی ہے۔ خدا کی وحدانیت اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بلکہ یہ عملاً ہمیں دکھاتا ہے کہ کس طرح ہم میں سے ہر ایک اپنی شخصی اور بنیادی حیات کے حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنے علم (عرفان) میں عمل و فکر کا اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ زندگی کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اسلام میں کسی کو رہبانیت پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ روحانی طہارت کی خاطر کسی چور دروازہ کو ڈھونڈنے کے لئے نفس کشی اور تپسیا کی ضرورت تسلیم نہیں کی جاتی۔ نجات حاصل کرنے کے لئے لغو عقائد ماننے پر زور نہیں دیا جاتا۔ درحقیقت اس قسم کی باتیں اسلام سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ تو عقائد معرفت کے لئے بنیاد بن سکتی ہیں اور نہ فلسفۂ حیات کے لئے۔ اسلام قوانینِ قدرت کے عین مطابق زندگی کا ایک پروگرام ہے جس کو اللہ نے اپنی مخلوق پر عائد کیا ہے۔ اس کا منتہائے مقصود بشری حیات، روحانی اور مادی پہلوؤں میں کامل تناسب ہے۔

اسلام میں عبادت کا نظریہ دوسرے مذاہب کے نظریہ ہائے عبادت سے مختلف ہے۔ یہاں اس کا دائرہ صرف دینی اشغال مثلاً نماز یا روزہ تک محدود نہیں بلکہ انسان کی تمام عملی زندگی پر حاوی ہے۔ اگر بلحاظ مجموعی ہماری حیات کا مقصد خداوند تعالےٰ کی پرستش کرنا ہے تو لازماً ہمیں اس زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں کی کل حیثیت میں ایک پیچیدہ اخلاقی ذمہ داری سمجھنا چاہئے۔ پس ہمیں اپنے تمام افعال کو چاہے وہ ظاہراً حقیقت ہی کیوں نہ ہوں امورِ عبادت سمجھ کر کرنا چاہئے یا بالفاظ دیگر ان کو خدا کے عالمگیر پلان کا ایک جزو مانتے ہوئے پورا کرنا چاہئے۔ ایک اوسط درجہ قابلیت رکھنے والے آدمی کو یہ باتیں خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کا مقصد نصب العین کو عملی جامہ پہنانا نہیں ہے؟

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کی پوزیشن شکوک و شبہات سے بالاتر دکھائی دیتی ہے۔ اوّلاً یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی حیات کے گوناگوں افعال میں اس زندگی کا مقصد وحید خدا کی پرستش کرنا ہے۔ ثانیاً اس غرض و غایت کا حصول اُس وقت تک ناممکن رہے گا جب تک ہم اپنی زندگی کو دو یعنی روحانی اور مادی حصوں میں تقسیم کرنے پر مُصر رہیں گے۔ کیونکہ ان دونوں کو ہمارے عمل اور فکر و علم میں ایک ہی متناسب ذات میں یکجا ہو جانا چاہئے۔ ہمارا نظریہ توحید

ہماری زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو یکجا کرنے اور متوازن بنانے کی کاوشوں میں منعکس ہونا چاہئے۔

اس خیال کا منطقی نتیجہ اسلام اور دیگر معلوم مذاہب کے درمیان مزید اختلاف کا انکشاف ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلحاظ تعلیم و تربیت نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان مابعد الطبیعی تعلقات کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ اتنے ہی اصرار کے ساتھ فرد اور اس کے معاشرے کے مابین دنیاوی تعلقات کی نوعیت بھی بیان کرتا ہے۔ اسلام اس دنیوی زندگی کو محض ظاہری وجود (Empty shells) یا آنے والی زندگی کا ایک بے معنی ظل (پرتو) نہیں سمجھتا بلکہ اُسے ایک کامل اور واضح شخصیت گردانتا ہے۔

خدا خود بھی نہ صرف ذات (جوہر اصلیت Essence) بلکہ مقصد اور انجام کے لحاظ سے بھی ایک ہے۔ اس لئے اس کی مخلوق تو ذات کے لحاظ سے شائد مگر مقصد اور انجام کے لحاظ سے یقیناً ایک ہے۔

پس اسلام انسان کی زندگی کا مطمح نظر اس وسیع معنیٰ میں ہے جس کی تشریح اوپر ہو چکی ہے خدا کی عبادت قرار دیتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہم کو انسان کی مجرد دنیاوی زندگی کے اندر اندر کمال تک پہنچنے کا امکان یقین دلاتا ہے۔ تمام مذاہب کو چھوڑ کر صرف اسلام کا دعوےٰ ہے کہ اس آب و گل کی زندگی میں بشری تکمیل ممکن ہے۔ اسلام عیسائیت کے برعکس اس دعوے کی تکمیل کو جسمانی (دنیوی) خواہشات کے مغلوب کرنے تک ملتوی نہیں رکھتا اور نہ ہندومت کی طرح ترقی پذیر سطح پر آواگون کے لامتناہی سلسلہ کا یقین دلاتا ہے۔ اور نہ بدھ مت کے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ کمال اور نجات کا حصول اپنی شخصیت اور دنیا کے ساتھ اپنے جذباتی تعلقات کے مٹانے پر منحصر ہے بلکہ اسلام کو اپنے اس دعوے پر اصرار ہے کہ انسان اپنی مجرد دنیاوی زندگی میں اُس کی تمام ممکنہ خوبیوں کو بروئے کار لا کر کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

غلط فہمی دور کرنے کی خاطر مناسب ہوگا کہ لفظ "کمال" کو ہم نے جن معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی تشریح بھی کریں جب تک ہمارا واسطہ حیاتیاتی لحاظ سے محدود انسانوں کے ساتھ ہے ہم یقیناً کمالِ مطلق کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر مطلق چیز کا تعلق صرف خدا کی صفات سے ہے۔ انسانی کمال اپنے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی معنوں میں لازماً ایک مشروط انداز اور محض مخصوص ڈھنگ رکھتا ہے۔ اس سے مُراد نہ تو مقصودہ اچھے اوصاف کی تحصیل ہے اور نہ ان نئی خوبیوں کا تدریجاً حصول ہے جو کسی کے استعداد کے بغیر حاصل کئے جائیں بلکہ کسی فرد کے قبل الوجود اچھے اوصاف کی اس طریقہ سے افزائش مراد ہے جو اس کی جبلّی مگر خوابیدہ صلاحیتوں کو جگا دے۔ چونکہ مظہر حیات فطری لحاظ سے تغیر پذیر ہے۔ اس لئے ہر انسان میں پیدائشی قوتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ تمام انسانوں کو کمال کا صرف ایک ہی نمونہ بننا چاہئے یا ان میں بننے کی صلاحیت ہے ایسی بے جوڑ بات ہوگی جیسی کہ دو ہم رتبہ اوصاف والے گھوڑوں کے متعلق فرض کر لیا جائے کہ ان میں سے ایک کو دوڑ میں کمال حاصل ہو اور دوسرے کو بھاری بوجھ کھینچنے میں! اس کا امکان ہے کہ دونوں کمال کے درجے تک پہنچے ہوئے ہوں مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے کیونکہ ان کی اصلی خوبیاں مختلف ہیں۔ انسان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر "کمال" کو کسی مخصوص وضع میں معیار بنانا جائے جس طرح عیسائیت نے تارک الدنیا راہب کو معیار قرار دیا ہے تو انسانوں کو اپنا ذاتی تشخص ترک کرنا پڑے گا یا بدلنا ہوگا اور یا اس کو مغلوب کرنا ہوگا۔ اس کا صریح نتیجہ خدا کے اس قانون سے روگردانی ہوگی جو ذاتی تشخص کو تسلیم کرتا ہے۔ جو اس سطح ارض کے تمام جانداروں پر حاوی ہے اس لئے اسلام جو جبر و استبداد کا مذہب نہیں۔ انسان کو اپنی ذاتی، شخصی اور مجلسی زندگی میں وسیع اختیارات دیتا ہے

تاکہ مختلف افراد کے مختلف اوصاف، طبائع اور نفسیاتی میلانات ان کی مخصوص جبلی خواہش کے بموجب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ پس ایک آدمی تارک الدنیا بھی ہو سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو جائز حدود کے اندر ما نفس پرستی کی زندگی سے پورا پورا حظ اُٹھا سکتا ہے۔ وہ صحراؤں میں گھومنے والا خانہ بدوش بھی ہو سکتا ہے جس کے پاس کل کے لئے روٹی نہ ہو۔ یا ایک متمول تاجر بھی ہو سکتا ہے جس کے گرد دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں۔ جب تک وہ اخلاص سے اور جان بوجھ کر خدا کے عائد کردہ احکامات کو بجا لاتا ہے۔ اُس کو اپنی ذاتی زندگی اپنی فطرت کے اقتضا کے مطابق ڈھالنے کی آزادی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی جدوجہد اور کاوشوں کے ذریعہ خدا کی عطا کردہ زندگی کی توقیر کرے۔ اور اس طرح اپنی ارتقا کے طفیل اپنے بھائیوں کی روحانی، مجلسی، اور مادی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

اسلام میں اس "آزادی" کی بنیاد اس تصور پر مبنی ہے کہ اس کی اصلی فطرت آغاز پیدائش (ابتدا ہی) سے نیک ہے۔ عیسائیت انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیتا ہے۔ ہندومت کی تعلیمات اس کو لحاظ اصلیت کمینہ اور ناپاک مانتی ہیں۔ اس لئے نجات کے حصول کی خاطر تناسخ کے لاتناہی سلسلہ میں اس کے لئے ٹھوکریں کھانا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان سب کے برعکس اسلام اس کو پیدائشی پاکیزہ اور استعداد ذاتی کے لحاظ سے ـ جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے ـ کامل مانتا ہے۔ اللہ تعالے نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ترجمہ (یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات (ترجمہ) اس کے بعد ہم اس کو ذلیل ترین بنا دیتے ہیں ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ سورۃ ۹۵ : ۴،۵

اس آیت میں یہ نظریہ بتلایا گیا ہے کہ انسان ابتدا سے نیک اور پاک ہے۔ مزید برآں یہ کہ لادینیت اور نیک اعمال کی کمی اس کی پیدائشی کاملیت کو ختم کر سکتی ہے۔ برعکس اس کے وہ اس ابتدائی اور ذاتی کاملیت کو نہ صرف برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ دوبارہ بھی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر خدا کی وحدانیت پر اعتقاد رکھے اور اس کے قوانین کے سامنے مطیع و فرماں بردار ہو۔ پس اسلام کے نزدیک برائی نہ تو ناگزیر ہے اور نہ ازلی۔ یہ تو صرف انسان کی بعد کی زندگی کا ثمرہ ہے اور خدا نے جس جبلی اور اچھے اوصاف سے انسان کو نوازا ہے ان کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ وہ خوبیاں ہر فرد میں مختلف ہوتی ہیں۔ مگر استعداد ذاتی کے لحاظ سے کامل ہوتی ہیں۔ ان کی مکمل ارتقا اس دنیائے خاکی میں انسان کی ذاتی زندگی کے مقررہ عرصہ میں ممکن ہے۔ ہم یہ بات تسلیم شدہ مانتے ہیں کہ حیات بعد ممات جذبہ و نظر کے بالکل بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہمیں مزید اوصاف اور نئی صلاحیتیں عطا کرے گی۔ جن کے طفیل انسانی روح کی مزید ارتقا ممکن ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس کا تعلق صرف ہماری آنے والی زندگی سے ہے۔ اس دنیوی زندگی میں بھی اسلامی تعلیمات کا یہ دعویٰ مطلق ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے نیک اور قبل الوجدان خصوصیات کو ترقی دے کر کمال کے مدارج طے کر سکتا ہے جن سے ہماری شخصیتیں مرکب ہیں۔

تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ دین ہے۔ جس نے انسان کے لئے اس کی روحانی خوشی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی ضائع کئے بغیر پوری دنیاوی زندگی سے لطف اُٹھانا ممکن بنا دیا ہے۔ یہ تصور اُس مسیحی تصور سے کس قدر مختلف ہے جس کی رو سے انسانیت ایک موروثی گناہ جس کا ارتکاب آدمؑ اور حوّا نے کیا جس کے بھاری بوجھ کے نیچے برابر ٹھوکریں

کھارہی ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کم از کم نظریاتی حیثیت سے زندگی آلام و مصائب کی ایک تاریک وادی تصور کی جاتی ہے۔ گویا یہ دو متضاد طاقتوں یعنی برائی جس کی علامت شیطان ہے اور نیکی جس کی نمائندگی عیسےٰ مسیح کرتے ہیں اُس کی رزم گاہ ہے۔

شیطان جسمانی ترغیبات کے ذریعہ انسانی روح کو خدا تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ روح کا تعلق عیسےٰ علیہ السلام سے ہے جبکہ جسم شیطانی اثرات کی آماجگاہ ہے۔ ہم اس مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ مادہ کی دنیا لازماً ظلمانی ہے مگر روح کی دنیا قدسی نژاد اور اچھی ہے۔ بشریت سے متعلقہ چیز خواہ مادّی ہو یا نفسانی۔ جس کو مسیحی مذہب کی اصطلاح میں نفس امّارہ کہتے ہیں۔ آدم کے اس فعل کا بالراسط نتیجہ ہے۔ جب اس نے مادہ اور تاریکی کے جنمی شہزادہ یعنی ابلیس کے آگے سپر ڈال دی۔ اس لئے تحصیل نجات کے لئے آدمی کو اس گوشت و پوست کی دنیا سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ بلکہ آنے والی روحانی دنیا کو ہر وقت پیش نظر رکھے جس میں انسانیت کے گناہ کا کفارہ عیسےٰ کے صلیب پر چڑھنے سے پورا کیا جاتا ہے۔

ہر چند اس عقیدے پر عمل نہیں کیا جاتے جیسا کہ اس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا ہے۔ تب بھی اس قسم کی تعلیمات کا وجود مذہب سے رغبت رکھنے والے آدمی میں بُرے ضمیر کا ایک دائمی احساس پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس دنیا کو ترک کرنے کے حکم ناطق اور اس زندگی کو گزارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی فطری خواہش کے مابین ڈانواڈول رہتا ہے۔ ایک موروثی اور ناگزیر پاپ اور عیسےٰ کے صلیب پر چڑھنے سے اُس کے پُراسرار بعید الفہم نجات کا نظریہ جس کو ایک متوسط فہم والا شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی روحانی آرزوؤں اور اس کی جائز خواہشاتِ زیست کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے

اسلام میں ہمیں کسی پیدائشی گناہ کا علم نہیں کیونکہ یہ خدائی نظریۂ انصاف سے مطابقت نہیں رکھتا خداوند ارض و سما کسی بچے کو اس کے باپ کے افعال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ وہ کس طرح انسانوں کی ان لاتعداد نسلوں کو ایسے گناہ کا ذمہ دار قرار دے سکتا ہے جو ہمارے جد اوّل کی نافرمان برداری کی وجہ سے سرزد ہوا۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ اس عجیب مفروضہ کی فلسفیانہ تشریحات پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن آلائش سے پاک ذہن کے لئے یہ نظریہ عقیدۂ تثلیث کی طرح ہمیشہ بناوٹی اور ناقابلِ اطمینان رہے گا۔ اسلامی تعلیمات میں جس طرح موروثی گناہ کا ذکر نہیں اسی طرح تمام انسانوں کی ہمہ گیر نجات کا اقرار بھی نہیں۔ نجات اور عذاب کا تعلق ذات (فرد) سے ہے (نجات اور عذاب فرداً فرداً ہونگے) ہر مسلمان اپنا کفارہ خود ادا کرے گا۔ وہ اپنے قلب میں روحانی کامیابیوں اور ناکامیوں کی تمام ممکنات کا حامل ہے۔ انسان کی شخصیت کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ لہا ما اکتسبت و علیہا ما اکتسبت۔ ایک دوسری آیت میں کہا گیا ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ

اگرچہ اسلام عیسائیت کی طرح زندگی کے پژمردہ پہلو کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی زندگی کو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دینے کی تعلیم بھی نہیں دیتا جو جدید مغربی تہذیب اس کے ساتھ منسوب کرتی ہے۔ اگر مسیحی فکر دنیوی حیات کو گھاٹے کی تجارت سمجھتی ہے تو جدید مغرب عیسائیت کے عین برعکس زندگی کی پرستش بعینہٖ اسی طرح کرتا ہے۔ جس طرح پیٹو اپنی خوراک کی پرستش کرتا ہے۔ اسلام اس کے خلاف دنیوی حیات کو نہایت سکون اطمینان سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کو پوجتا نہیں بلکہ ایک بلند تر زندگی تک پہنچنے کے لئے ایک ضروری منزل سمجھتا ہے۔ اور چونکہ یہ ایک ضروری منزل ہے اس لئے آدمی کو اپنی دنیوی زندگی سے نفرت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اور نہ اس کی تحقیر کرنے کا!

اس دنیا میں ہمارا سفرِ حیات خدا کے پلان میں ایک ضروری اور اہم کڑی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی بے پایاں قدر و قیمت
تی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ صرف ایک مددگار (Instrument) قیمت ہے۔ اسلام میں نہ
بدیہ مغرب کی اس مادّی خوش امیدی (optimism) کے لیے گنجائش ہے۔ جس کا دعویٰ ہے کہ "میری بادشاہت
دنیا تک محدود ہے" اور نہ عیسائیت کے اس عقیدہ کے لیے جو زندگی سے نفرت کرنے کا درس دیتا ہے اور جس کا کہنا ہے۔
میری بادشاہت اس عالم سے متعلق نہیں" اسلام نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ قرآن پاک ہمیں یہ دعا کرنے کی
ہم کرتا ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاٰخرة حسنة (سورہ ۲ : ۲۰۱) (ترجمہ) اے میرے پروردگار! مجھے
دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی) پس اس دنیا اور اس کے مال و متاع کی قدردانی کسی صورت میں بھی ہماری روحانی
مشوں کی راہ میں سنگِ گراں نہیں بن سکتی۔ مادی ترقی ہمیں مرغوب ضرور ہے مگر مقصد بالذات نہیں۔ ہماری تمام عملی
نوں کا مدعا ایسے شخصی اور مجلسی حالات کی تخلیق اور بقا ہونا چاہیے جو بنی نوع انسان میں اخلاقی قوت کی افزائش و
میں ممد و معاون ہو۔ اس اصول کے بموجب انسان کو ہر بڑے اور چھوٹے عمل میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔
ی دینیات میں انجیل مقدس کی اس مشہور ہدایت (حکم کے لیے) کوئی جگہ نہیں کہ "سیزر یعنی حاکم وقت کے حقوق بھی ادا
ور خدا کے حقوق بھی (Give Caesar That which belongs to Caesar and give
God That which belongs to God) کیونکہ اسلام زندگی کے اخلاقی اور مجلسی، معاشی ضروریات کے مابین
کے وجود کو نہیں مانتا۔ ہر چیز میں آپ کو صرف ایک دفعہ انتخاب کی آزادی ہے۔ چاہے حق کو اپنا لیں یا باطل کو۔ بیچ کے سارے
ت انتخاب سلب کر لیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عمل چونکہ علمِ اخلاق کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ اس لیے اس پر شدید اصرار
ا ہے۔

ہر مسلمان فرداً فرداً اپنے گرد و پیش کے واقعات کا ذمہ دار ہونے، اور ہر وقت اور ہر سو حق کے نفاذ اور باطل کی تنسیخ
لیے جد و جہد کو فرض کیا گیا ہے۔ اس حکم کا جواز قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں مل سکتا ہے:۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون بالله (سورہ ۳ : ۱۱۰)

(ترجمہ) تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)
یہ آیت اسلام کے جنگ جویانہ معرکوں یعنی ابتدائی فتوحات اور اس کے نام نہاد امپیریلزم کا اخلاقی جواز ہے!
شمنانِ اسلام کو اس کے امپیریلسٹ ہونے پر ہی اصرار ہے تو ہم ایک لمحہ کے لیے (اس مفروضہ کو) مانے لیتے
اسلام امپیریلسٹ تھا۔ مگر یاد رہے کہ اس قسم کا امپیریلزم ہوسِ ملک گیری کا نتیجہ نہ تھا اور نہ اس کا معاشی
ی خود غرضیوں کے ساتھ کوئی علاقہ تھا تاکہ دوسری قوموں کو نقصان پہنچا کر مسلمانوں کے آرام و آسائش میں اضافہ
ی طرح اس کا مدعا غیر مسلموں کو بالجبر آغوشِ اسلام میں لانا بھی نہیں تھا۔ اس کے پیشِ نظر انسان کی ممکنہ ترقی کے
ور نئی معاشرت کی تشکیل رہی تھی۔ اور اب بھی ہے۔ کیونکہ تعلیماتِ اسلام کے بموجب علمِ اخلاق کی وجہ سے
ذن پر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ حق و باطل میں ارسطو کی طرح محض تمیز کرنا جس کے ساتھ حق کی
ت اور باطل کی تنسیخ کا جذبہ نہ ہو بذاتِ خود ایک عظیم بد اخلاقی ہے۔

منظر غازی آبادی

سلام اے رسولِ پاکؐ

دُنیا میں آہ و اشک ہیں عام اے رسولِ پاکؐ
عالم رہینِ درد تمام اے رسولِ پاکؐ
محوِ فغاں ہیں آج عوام اے رسولِ پاکؐ
اُمّت کی ہر سحر ہوئی شام اے رسولِ پاکؐ
بدلے گا کب جہاں کا نظام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ
سلام اے رسولِ پاکؐ

گمراہ مقتدی ہیں کہ بھٹکے ہیں خود امام
رہرو بھی دم بلب ہیں کہ رہبر ہیں تشنہ کام
کرتے ہیں کفر و شرک شب و روز صبح و شام
وہ لوگ! جن کے لب پہ ہے "دینِ مبیں" کا نام
بدنام ہو رہا ہے یہ نام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ
سلام اے رسولِ پاکؐ

اچھے ہیں طور آج گدا کے نہ شاہ کے
خوگر ہیں لوگ جرم کے عادی گناہ کے
سوتے ہیں خشک چشمۂ فیض و رفاہ کے
زر کے، ہوس کے، نام کے، منصب کے، جاہ کے
ہیں آپ کے غلام ۔ غلام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ

دُنیا سمجھ رہی ہے اندھیرے کو شمع طور
باقی نہیں رہا ہے دلوں میں یقیں کا نور
اُلجھے ہوئے دماغ ہیں کھوئے ہوئے شعور
پہنچا گئے تھے نوعِ بشر کو جہاں حضور
انسان کھو چکا وہ مقام اے رسولِ پاکؐ
ہو آپ پر درود و سلام اے رسولِ پاکؐ

سلام اے رسولِ پاکؐ

سلام اے رسولِ پاکؐ

فضاؔ ابن فیضی

عشق

چہرۂ صبح کو دیتا ہے شعاعِ خورشید
رات کی گود کو مہتاب عطا کرتا ہے

چشمِ نرگس کو سکھاتا ہے یہ آدابِ نظر
سینۂ گل کو زرِ ناب عطا کرتا ہے

جوئباروں کو بناتا ہے ہم آہنگِ خرام
سینۂ بحر کو سیلاب عطا کرتا ہے

عقلِ کوتاہ نظر کو یہ ستاروں کی طرح
بینشِ دیدۂ بیخواب عطا کرتا ہے

یہ حیات اور تمدن کے پرافسانے کو
ایک عنوانِ نظرتاب عطا کرتا ہے

سوزِ انفاس سے آذر کے صنم خانے کو
یہ حرم کے در و محراب عطا کرتا ہے

وہ شبانی ہو، کلیمی ہو کہ خیر البشری
عشق ہر ساز کو مضراب عطا کرتا ہے

آئینۂ صبحِ ازل اس کی اُفق تابی سے
لالہ گوں شامِ ابد اس کی شفق تابی سے

تسکین قریشی

سوز و ساز

کس سے پوچھیں ہم نے کہاں وہ چہرۂ رُوشن دیکھا ہے
محفل محفل ڈھونڈ چکے ہیں گلشن گلشن دیکھا ہے

کس کو دیکھیں کس کو نہ دیکھیں پھول بھی ہیں کلیاں بھی مگر
جس سے لگی آنکھ اسی کو دل کا دشمن دیکھا ہے

بہارِ صحنِ گلستاں، کیا دیکھے وہ دیوانہ
جس کی نظر نے ایک ہی گل میں سارا گلشن دیکھا ہے

دیکھو، منزل منزل لٹتے ہوئے ہیں خاک نشیں
ہم سے پوچھو کیا کیا، ہم نے رہزن دیکھا ہے

انہیں جو چاہو سمجھو لو وہ یہی تسکیں ہیں جنہیں
کل اک ہم نے کوئے بتاں میں خاک بدامن دیکھا ہے

شفقت کاظمی

کوئی مونس کوئی ساتھی نہ رہا تیرے بعد
یاد آتی ہے مجھے تیری وفا تیرے بعد

اب مجھے خندۂ عشرت سے سروکار نہیں
اپنی تقدیر پہ ہوں نوحہ سرا تیرے بعد

کس سے امیدِ رہ و رسمِ محبت رکھوں
کون دیتا ہے مجھے دادِ وفا تیرے بعد

میں نے تدبیر تو کی اپنی طرف سے لیکن
کوئی تسکین کا پہلو نہ ملا تیرے بعد

نہ رہا کوئی مرے ذوقِ نظر کا ساماں
سونی سونی ہے زمانے کی فضا تیرے بعد

نہ سہی اپنا مقدر جو مجھے راس نہیں
میں بھی ہوں اپنے مقدر سے خفا تیرے بعد

اپنی محرومیٔ قسمت کو دعا دیتا ہوں
نہ شکایت ہے کسی سے نہ گلا تیرے بعد

ادا ہو نہ سکا حق ترے احسانوں کا
تیرے شفقت کو ہے اقرارِ خطا تیرے بعد

رنگارنگ

زکی کاکوروی

یہ کس نے میری اسیری کا انتظام کیا — فضا میں رنگ بکھیرے ہوا کو دام کیا
رہی شراب مرے حق میں ہوگئی ہے زہر — وہ جس شراب نے ساقی کو لالہ فام کیا
ہمیں نے جام پئے زہرِ غم کے ہنس ہنس کر — ہمیں نے دعوتِ ساقی کا احترام کیا

خیال رامپوری

یادِ گیسو میں کیوں رواں ہیں اشک — رات ہے کارواں ٹھہر جائے
گام زن ہیں رہِ وفا پہ ہم — اب جہاں تک یہ رہگزر جائے

غنی احمد غنی

گلوں میں رنگ ہے کلیوں میں تازگی تم سے — بہارِ رنگ کے لائی ہے دل کشی تم سے
اُمنگ دل میں ہے نظروں میں دلکشی تم سے — خدا گواہ عبارت ہے زندگی تم سے
نہ آؤ خلوتِ غم میں یہاں وہ لُطف کہاں — ملوں گا آکے سرِ جوئبار ہی تم سے
ہزاروں شعر اسی کش مکش میں کہہ ڈالے — نہ حرفِ شوق مگر کہہ سکا ابھی تم سے

اثر انصاری

کم حوصلے بھی ہوگئے غم ہوگیا جو کم — منزل قریب آئی تو رُکنے لگے قدم

صابر دہلوی

جستجوئے دوست آخر جستجوئے دوست ہے — رہبرِ راہِ طلب گُم کردۂ منزل سہی

محشر بدایونی

چٹک رہے کلی لیکن آہستگی سے — یہ آواز گوشِ خزاں تک نہ پہنچے

ماہر القادری

ایک ایک گام پہ دنیا مجھے ٹھکراتی ہے — مجھ کو اس زحمتِ بے جا پہ ہنسی آتی ہے

یہ چہرۂ بے رنگ یہ ویران نگاہیں — اے دوست! مرے غم کو شکایت نہ سمجھنا

کسی آوارۂ غربت کی تمنا کے نجوم
ڈوب جاتے ہیں سرِ شام تجھے کیا معلوم

رُوحِ اِنتخاب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک مبغوض ذلیل ترین نام اس آدمی کا نام ہے جو ملک الاملاک (بادشاہوں کا بادشاہ یعنی شاہنشاہ) کہلاتے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کا لباس اختیار کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کا لباس پہنتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے کے قدم اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہولیں تو آگ اُس کو نہیں چھو سکتی۔

حضور نے فرمایا۔ دو آنکھوں کو آگ نہیں چھو سکتی۔ ایک وہ جو آنکھ اللہ کے ڈر سے روئی۔ دوسری وہ جو اللہ کے راستہ میں پہرہ دیتی رہی۔

حضور نے فرمایا۔ فتنہ وفساد کے زمانے میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرکے آنے کے مثل ہے۔

حضور نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو خرید فروخت اور مطالبہ کرنے میں نرمی سے کام لے۔

حضور نے فرمایا۔ مومن بھلائی سے (یعنی علم سے) کبھی سیر نہیں ہوتا۔ حتّٰی کہ اُس کی انتہا جنت ہوتی ہے۔

فرمایا۔ قیامت میں وہ لوگ مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوں گے جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس آدمی جاسوس بھیجے اور اُن پر عاصم بن ثابت انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ یہ لوگ مقام ہدآۃ پہنچے، بنی لحیان کو خبر ہوگئی۔ تقریباً سو آدمی تیرانداز اُن کی تلاش میں متفرق ہوکر نکل پڑے اور نشانِ قدم دیکھتے ہوئے چلے۔ جب حضرت عاصمؓ اور اُن کے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو ایک جگہ محصور ہوگئے اور اُن کو لوگوں نے گھیر لیا اور کہا تم اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کردو اور اُتر آؤ۔ ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ ہم تم کو قتل نہ کریں گے۔ حضرت عاصمؓ نے کہا۔ اے قوم! کافر کی ذمہ داری پر نہ اُتروں گا اور کہا یا اللہ! اپنے نبی کو ہمارے حال سے مطلع فرما دے۔ پھر اُن پر تیروں کی بارش ہونے لگی اور حضرت عاصمؓ شہید ہوگئے۔ اور خبیبؓ اور زید بن دثنہ اور ایک مرد اُن کے عہد وپیمان پر نکل آئے۔ جب یہ تینوں حضرات اُن کے قابو میں آگئے تو تینوں کی مشکیں کس لیں اور اپنی کمانوں کی زہ کھول دی تو اس تیسرے شخص نے کہا۔ یہ پہلی بدعہدی ہے، واللہ! میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔ میرے لئے ان شہیدوں کی تقلید اچھی ہے۔ میں ان کی اقتدا کروں گا۔ کافروں نے ان کو بہت کھینچا لیکن ... نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کھائی تو کافروں نے ان کو بھی شہید کردیا اور ان دونوں کو لے کر چلے گئے۔ مکہ پہنچ کر مکہ ... کے ہاتھ اُن کو فروخت کرڈالا۔ یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے۔ حارث کے بیٹوں نے حضرت خبیبؓ کو خریدا تاکہ اپنے ... کا بدلہ لیں جس کو حضرت خبیبؓ نے بدر میں قتل کیا تھا۔

حضرت خبیبؓ کچھ عرصہ تک قید رہے۔ پھر سب نے اُن کے شہید کرنے کا فیصلہ کیا . . . . . پھر وہ لوگ ان کو شہید کرنے حدِ حرم سے باہر لے گئے۔ تو حضرت خبیبؓ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر کہا۔ واللہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم گمان کروگے کہ موت سے

بہ سے نماز میں دیر کر رہے ہیں تو میں دیر تک اطمینان سے نماز پڑھتا۔ پھر دعا کی کہ ان کو گن گن کر مار اور کسی کو
پھر یہ شعر پڑھے۔

فلست ابالی اقتل مسلما
علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

وذالک فی ذات الالہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع[1]

جب میں اسلام پہ مر رہا ہوں تو مجھے کوئی پروا نہیں، میرا گرنا اللہ کے لئے ہے چاہے جس پہلو گروں — یہ اللہ
ت ہے۔ اگر وہ چاہے تو کھال کے ٹکڑے ٹکڑے میں برکت عطا کر دے۔
حضرت خبیبؓ نے شہادت کے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کی سنت نکالی۔ حضور نے اپنے اصحاب کو ان لوگوں
ت کی اطلاع دی۔
جب قریش کو حضرت عاصمؓ بن ثابت کے قتل ہونے کی خبر ملی تو کچھ لوگوں کو بھیجا کہ ان کا مثلہ کر کے لاؤ۔ کیونکہ
نے ان کے کسی بڑے شخص کو قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصمؓ کی حفاظت فرمائی۔ شہد کی مکھیاں
، ماندان کے گرد جمع ہو گئیں۔ کافروں کو جرات اُن کے پاس آنے تک کی نہ ہوئی۔
حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ بات
۔ زیادہ بولنا دل کو سخت کر دیتا ہے اور سخت دل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہے۔
حضرت عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے حضور سرور کائنات سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کس بات
ت حاصل ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ اپنی زبان کو روکو اور گھر[2] تمہارے لئے کافی ہو۔ اور اپنی خطاؤں
ہو۔
حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نامحرم عورت کے پاس تنہائی میں
ہاں! اس کے محرم کے ساتھ جا سکتے ہو۔
حضور نے فرمایا . . . . آنکھوں کا زنا بدنگاہی ہے۔ کانوں کا زنا (حرام آواز کا) سننا ہے۔ زبان کا زنا (حرام)
ہے۔ ہاتھ کا زنا ناجائز استعمال ہے۔ پاؤں کا زنا (حرام چیز کی طرف) قدم اٹھانا ہے۔ قلب خواہش اور تمنا کرتا ہے
ان کی شرمگاہ اُس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب[3]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ شہید کو شہادت کے وقت اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے چٹکی
سے ہوتی ہے

---

[1] یہ اشعار عہد افتادہ شہید نے پھانسی کے تختہ پر چڑھتے ہوئے پڑھے تھے۔
[2] یعنی اپنی زبان کے شر سے لوگوں کو بچانے کے لئے گھر میں بیٹھے رہنا زیادہ بہتر ہے۔
[3] یعنی عمل کر لیا تو اس خیال کی تصدیق ہو گئی ورنہ تکذیب۔

اشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

عوامی لیگ والے اپنی حرکتوں کے سبب پاکستانی عوام میں انتہائی نامقبول ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اکھڑی ہوئی
کرجانے اور باندھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کر رہے ہیں۔ مگر ہر تدبیر الٹی ہی پڑتی ہے۔ پولیس کی سنگینوں کے
یہ میں ان کے جلسے ہوتے ہیں۔ مگر کس قدر ناکام، ویران اور اداس! لیکن شاباش ہے ان کی بے غیرتی "کو، اتنی کچھ
ن دیکھنے کے بعد بھی نہ یہ لوگ عبرت پکڑتے ہیں اور نہ ان کو اپنے کرتوتوں پر پشیمانی ہوتی ہے۔

لاہور کے ایک جلسہ کی رُوداد تماشائی کے کانوں تک اس طرح پہنچی ہے — کہ عوامی لیگ والوں نے پولیس کی
سے لاہور کے ایک محلہ میں جلسہ کیا۔ یوں سمجھو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا اے کرجان متی نے کنبہ جوڑا۔ سامعین
تعداد غالب پولیس کے سپاہیوں اور کرایہ کے آدمیوں کی تھی۔ تھوڑے سے تماشائی بھی جمع ہو گئے تھے۔ مگر "مخلوط انتخاب"
ایت میں تقریر کے آغاز ہی پر لوگ اٹھنا شروع ہو گئے اور آخر میں دس پندرہ آدمی رہ گئے۔

—— بھائیو! ہمیں سامعین کی تعداد کی کمی پر افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ہزار تماشائیوں اور غیر ذمہ دار آدمیوں
مقابلے میں دس سنجیدہ اور معقول آدمی زیادہ وزن رکھتے ہیں۔ آپ چند سامعین اس محلہ کی آبادی کا عکس ہیں . . .
. . . . . مقرر نے کہا

—— جی! ہم تو "مصدوین" ٹینٹ والے کے آدمی ہیں۔ شامیانے اکھاڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں . . . "
سے آواز آئی۔

وہ جو پرانی کہاوت اور قدیم ضرب المثل ہے کہ "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"، تو سمبر کے واقعات کو ری پبلکن پارٹی اور
ن لیگ والے اپنے حق میں "نعمتِ غیر مترقبہ" سمجھ رہے ہیں کہ اس ہنگامہ کے آگے "جداگانہ انتخاب" کی ہم دب کر
، اور عوام کی توجہ دوسری طرف مڑ گئی مگر "بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی" مخلوط انتخاب کا تو ایک نہ ایک دن
نا ہو کر ہی رہے گا۔ ان "مخلوطیوں" کا کچا چٹھا قوم کے سامنے آچکا ہے۔ اب وہ ان کے فریب میں نہیں آسکتے۔ کا ٹھ کی
یا ایس ایک ہی بار چولہے پر چڑھتی ہے اور کانگریسی ناؤ تو جاہلوں کے تھپیڑے کبھی نہیں سہار سکتی! شاعروں کو چاہیئے
، "گٹھ جوڑ" کی وفات کے قطعے اور مرثیے ابھی سے تیار کر رکھیں۔

کراچی کی سعید منزل کے سامنے جونٹ پاتھ ہے وہ نجومیوں، رمالوں اور جوتشیوں کا گڑھ ہے . . . ر فرلانگ تک یہی لوگ
نا نیاں اور دریاں بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں اور ان سے فال نکلواتے ہیں، ہاتھ دکھاتے ہیں۔ رمل کے
، پھینکے جاتے ہیں قسمت کے نوشتے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

ایک نجومی اور اُس کے "گاہک" کی بات چیت تماشائی "فاران" کے پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لئے کرتا ہے :—

—— تمہارا کہیں دل اٹکا ہوا ہے۔

—— (آہ بھر کر) مگر کامیابی کب تک ہوگی۔

—— اب کی برسات تک! لیکن اُس کا بھائی تمہارے خلاف ہے اُس سے بچے رہنا۔

—— اُس لڑکی کا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہے وہ ۔۔۔۔۔!

—— (ہونٹوں پر زبان پھیر کر) وہ اپنے محلہ میں ایک نوجوان کو "بھائی جان" کہتی ہے۔ میری مراد اُسی شخص سے تھی۔ علم جھوٹا نہیں ہو سکتا۔۔۔ میاں! اور ہاں! پانچ سال پیچھے نہیں ایک بیماری لگے گی، مگر تم اچھے ہو جاؤ گے۔ پندرہ بیس دن دُکھ رہے گا۔

—— اور ۔۔۔ جی ۔۔۔۔

—— (بات کاٹ کر) تمہاری قسمت میں دریا کا ایک سفر لکھا ہے۔" اس سفر میں تمہارے وارے نیارے ہوں گے اور شادیاں تمہاری —— ڈھائی ہوں گی (ڈھائی شادیاں ۔۔۔ حیرت کے ساتھ) ہاں! ڈھائی شادیاں ایک شادی ادھوری، یعنی کسی جگہ بات چیت چل کر رہ جائے گی۔ اور دو پوری شادیاں! تمہاری دوسری بیوی بائیں رخسار پر تل ہوگا۔ اُس کے آتے ہی تمہارے بھاگ کھل جائیں گے۔ بکالے گھنٹے کو سال میں دو بار دیں چھا سب بلائیں دُور ہو جائیں گی۔

—— مگر مجھے تو کُتے سے بڑا ڈر لگتا ہے؟

—— تو کالی بلی ہی سہی۔

—— اور کالی بلی نہ ملے —— تو

—— چتکبری سہی، اُس کے بدن پر کالے دھبے ہونے چاہئیں!

—— (دو آنے نجومی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے) کوئی اور بات تو بتانے سے نہیں رہ گئی!

—— دو آنے دے رہے ہو —— ایں! کیا مجھے بھکاری سمجھ رکھا ہے!

—— میرے پاس یہی دو آنے ہیں جو آپ کی نذر کر دئے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو میری جیب کی تلاشی لے سکتے ہیں۔

—— دو آنے کے پیسے جیب میں ڈال کر فال کھلوانے کے لئے آئے تھے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے معلوم ہوتا تو تم سے بات بھی نہ کرتا۔

—— ایک بات عرض کروں، بُرا تو نہ مانئے گا ۔۔۔۔ جی! آپ کو اتنی تک خبر نہیں ہے کہ میری جیب میں کیا ہے تو آپ آنے والی زندگی کا حال کس طرح بتا سکتے ہیں؟

نجومی نے خفیف ہو کر گنڈیاں بیچنے والے کو آواز دی اور وہ آدمی اُٹھ کر چلا گیا

"فاران" کے خریدار صاحبان کی خدمت میں

جن حضرات کی میعادِ خریداری ماہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں ختم ہو رہی ہے۔ اُن کی خدمت میں دفتر سے اطلاعی کارڈ بھیجے گئے ہیں۔ پاکستانی خریدار اپنا سالانہ چندہ منی آرڈر کے ذریعہ ارسال فرمادیں۔ اور اس میں "توحید نمبر" کے ڈاک کی رجسٹری وغیرہ کے مصارف کی رقم آٹھ آنے کا بھی اضافہ کردیں۔ ورنہ وی پی اُن کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اور اُس کا چھڑانا اُن کا اخلاقی فرض ہوگا۔ جن حضرات کو خریدار رہنا منظور نہ ہو وہ دفتر "فاران" کو اطلاع ضرور دے دیں۔

بھارت کے خریدار صاحبان

دفتر "الحسنات" رام پور (یوپی) کو اپنا چندہ فوراً بھیجدیں۔ اور سالانہ چندہ (چھ روپے) میں آٹھ آنے کا مزید اضافہ فرمادیں۔ یہ "توحید نمبر" کے ڈاک کی رجسٹری وغیرہ کے مصارف کی رقم ہے۔ شکریہ!

مینجر "فاران"

ہماری نظر میں

مقدمہ مشکوٰۃ شریف
از:۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، ترجمہ:۔ خواجہ محمد علی، ضخامت ۱۱۲ صفحات
قیمت ایک روپیہ دو آنہ، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلامی ۲۲ ربانی روڈ، پرانی انارکلی لاہور

احادیث کے مشہور و مقبول اور قابل اعتبار مجموعہ "مشکوٰۃ شریف" کے مقدمہ کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی افادیت ثقاہت اہمیت اور علمی منزلت مسلم ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز اس کے مصنف ہیں۔ یہ مقدمہ تیرہ فصول پر مشتمل ہے جن میں سند و روایت کے اعتبار سے احادیث کی اقسام سے بحث کی گئی ہے۔

مشہور اور متواتر، غریب و عزیز میں کیا فرق ہے؟ شذوذ، نکارت، تعلیق، انقطاع تدلیس و اضطراب کسے کہتے ہیں؟ صحیح حسن اور ضعیف حدیثوں کی کیا تعریف و قیود ہیں؟ حدیث کے مدارج کیا ہیں؟ —— یہ تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں، کتب حدیث کے مراتب کا بھی ذکر ہے، صحاح ستہ کے علاوہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم کا بھی اجمالی تذکرہ ہے۔

اس مقدمہ کو پڑھ کر محدثین کرام کے لئے بے اختیار دعا نکلتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی صحت کو جانچنے کے لئے ان بزرگوں نے کس قدر احتیاط و دیانت، دقت نظر اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ اردو داں طبقہ کو اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے!

آنحضرت اور جوانی
از:۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ضخامت ۳۴ صفحات، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ: ——
دارالادب پاکستان، ۵۲ چیل پاڑہ، کراچی ۵!

جناب حسام الدین صاحب غوری نے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اسلامی بنیادوں پر ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے اپنی نگرانی میں ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ مفید کتابچہ اسی ادارہ کی طرف سے اشاعت عام کی غرض سے شائع ہوا ہے۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوانی کس قدر عفت و پاکیزگی اور دیانت و امانت کے ساتھ گزاری، یہاں تک کہ قریش آپ کو "امین" کہنے لگے! پھر نبوت ملنے کے بعد حضورؐ نے مسلم نوجوانوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت فرمائی اور انہیں بڑے بڑے کام سونپے! کتاب پڑھ کر یہ خیال ابھرتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو اگر اسلامی بنیادوں پر صحیح تربیت دی جائے، تو تقدیر ملت کا ڈوبا ہوا ستارہ افق پر آج بھی طلوع ہو سکتا ہے۔

حسن معاشرت
از:۔ محترمہ خیرالنساء بہتر، ضخامت ۰۰ صفحات، قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ: ——
کتبہ اسلام، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ (بھارت)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی والدہ محترمہ کی یہ قابل قدر تصنیف ہے۔ اللہ کے فضل سے یہ گھرانہ کا گھرانہ ہی دین کی خدمت میں مصروف ہے (اللّٰھم کثر امثالھم)

مسلمان لڑکیوں کو گھریلو زندگی، پرورش اولاد، خانہ داری اور حسن اخلاق کا سبق دینے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور

اپنے موضوع پر بہت مفید کتاب ہے۔ نو ابواب ہیں:۔ میکہ ۔ سسرال ۔ خانہ داری اور اس کے طریقے ۔ تربیت اولاد ۔ چھوٹے بچوں کا علاج ۔ مہمان کی خاطر مدارات ۔ چند پند ۔ دعا ۔ معمولات
زبان انتہائی سادہ اور عام فہم، اندازِ بیان دل نشین اور فکر خالص اسلامی ہے! دین و دنیا کو بس اعتدال کے ساتھ سمویا ہے۔ بچیاں، دلہنیں، مائیں اور بڑی بوڑھیاں سبھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں!

وجدانِ حافظ

از:۔ منور لکھنوی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ ۔ قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دہلی

جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی وسیع المشرب، علم دوست اور خوش فکر شاعر ہیں۔ کالی داس کی "کمار سمبھو"، گوتم بدھ کی ملفوظات "دھمپد"، اور بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ اور یہ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اب انھوں نے حافظ شیرازی کے بعض منتخب اشعار کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔
علامہ شبلی نعمانی جو بلند پایہ ناقد اور بے مثال نثر نگار ہونے کے علاوہ نغز گو شاعر بھی تھے اس نزاکت اور دشواری کو جانتے تھے کہ کسی زبان کے شعر کا منظوم ترجمہ "شعریت" کو کس قدر گھٹن اور ضیق میں مبتلا کرتا ہے۔ اسی لئے انھوں نے شعر العجم میں فارسی شعروں کا نثر میں ترجمہ کیا!
جناب منور لکھنوی کی ہمت کو آفرین ہے کہ انہوں نے اتنی خطرناک ذمہ داری اپنے سر لی۔ اور ایسے کام کو ہاتھ لگایا ہے کہ جو اگر سلیقہ سے انجام نہ پائے تو خود مترجم کی اپنی ذاتی شاعرانہ شخصیت کے زوال کا اندیشہ ہے۔
منظوم تراجم سے ہم خوش گمانی نہیں رکھتے اس لئے "وجدانِ حافظ" بے دلی کے ساتھ اٹھائی۔ مگر کتاب کے دوسرے ہی شعر کے ترجمہ پر طبیعت کو انشراح ہونے لگا:۔

جاں فدائے تو کہ ہم جانی و ہم جانانی
ہر کہ شد خاکِ درت رست ز سرگردانی (حافظ)

ترجمہ

تجھ پہ قرباں کہ تو جان بھی جاناں بھی ہے
جو بنا خاک ترے در کی، پریشاں نہ رہا

کچھ اور شگفتہ نمونے:۔

خرد اگر پیش گاہ حقیقت شود پدید
شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد

حقیقتِ باطن کا جلوہ کہیں بھی جب آشکار ہوگا
مجاز پہ ہے نگاہ جس کی وہ راہرو شرمسار ہوگا

خاطرت کے رقم فیض پذیرد ہیہات
مگر از نقشِ پراگندہ ورق سادہ کنی

دل ترا فیض کی تاثیر کرے خاک قبول
یہ ورق نقشِ پریشاں سے اگر صاف نہیں

ف صفحہ ۴۰ پر جنس کی تعداد پانچ افراد کے لئے جو لکھی ہے وہ محل نظر ہے۔ ایک مہینے کی خوراک کے لئے گھی تین سیر کم ہے اور پندرہ سیر دال دو من گیہوں کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔

گدائی درِ جاناں بہ سلطنت مفروش
کسے ز سایۂ ایں در بہ آفتاب رود

سلطنت کیا درِ جاناں کی گدائی کے عوض
چھوڑ کر چھاؤں کہیں دھوپ میں جاتا ہے کوئی

گر دگیراں بعیش و طرب خرم اند و شاد
ما را غمِ نگار بود مایۂ سرور

ہم کو تو غمِ دوست ہے سرمایۂ صد عیش
دُنیا ہو کسی بات سے مسرور نہیں کیا

چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را
غبار خاطرے از رہگذار ما نہ رسد

جی اس طرح کہ خاک بھی ہو جائے تو اگر
ثابت نہ ہو غبار کسی کی نگاہ میں

بہ خرمنِ دو جہاں سر فرو نمی آرند
دماغِ کبر گدایانِ خوشہ چیناں بیں

لاتے نہیں نظر میں خرمن کو دو جہاں کے
جو خوشہ چیں گدا ہیں اُن کے جگر تو دیکھو

"دماغ" کو "جگر" سے بدل کر شعر کا لُطف ہی غارت کر دیا، کاش! ترجمہ میں دُوسرا مصرع اس طرح ہوتا۔—

ع جو خوشہ چیں گدا ہیں اُن کے دماغ دیکھو!

دشمن بہ قصدِ حافظ اگر دم زند چہ باک
منت خدائے را کہ نیم شرمسارِ دوست

دشمن اگر ہے جان کا گاہک تو خوف کیا
شُکر خدا کہ دوست کے احساں سے پاک ہوں

"نیم شرمسارِ دوست" ہی میں شعر کا سارا طلسم بند ہے، اسی کا ترجمہ نہ ہو سکا!

نظیرِ دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر
نہادم آئینہ ہا در مقابلِ رخِ دوست

چاند سورج کے آئینوں میں بھی
دوست کا سا حسین نہیں دیکھا

"نہادم آئینہ ہا" کا ترجمہ نہ ہونے سے شعر کا "حسن" ہی جاتا رہا۔ اصل شعر کتنا شگفتہ اور رواں ہے اور ترجمہ —— بس ترجمہ ہے!

جناب منور لکھنوی کی یہ کوشش بہر حال قابل قدر ہے اور ترجمہ میں اُن کی قادر الکلامی کا جگہ جگہ ثبوت ملتا ہے!

اقبالؔ کا مردِ قلندر

از:- جلال کرنولی (چیف لیکچرار اُردو فارسی، اسلامیہ کالج وانمباڑی) ضخامت ۱۱ صفحات
قیمت دو آنے، ملنے کا پتہ: مکتبہ مظفری نیو ٹاؤن وانمباڑی، ضلع شمالی ارکاٹ (مدراس)

اس کتابچہ میں وہ اشعار جمع کئے گئے ہیں جن میں علامہ اقبال نے "مردِ قلندر" کا ذکر کیا ہے۔ فاضل مرتب نے اُن اشعار کی شرح بھی فرمائی ہے۔

"اصطلاح عام میں۔ بیچو اور بند رکھلانے والا"

"قلندر" کی یہ تعریف "فیروز اللغات" کے حوالے سے نقل کی ہے۔ "کھلانے والا" پڑھ کر طبیعت سخت مکدر ہوئی۔

"فیروز اللغات" میں الفاظ کے اسی انداز پر معنی لکھے گئے ہیں تو یہ بڑی کمزور لغت ہے۔ "ریچھ اور بندر سیا نے دا" لکھنا چاہئے تھا!

تعمیری قاعدہ (مکمل)

از:- عبدالغنی اصغر و عبدالواحد رحیمی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت چھ آنے —
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر ادب، ۳۰ دل محمد روڈ، لاہور

بچوں کے لئے جدید اسلوب پر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں دینی اسپرٹ بھی پائی جاتی ہے چھوٹے بچوں کی فہم اور نفسیات کو اس قاعدہ کے مرتبین نے ملحوظ رکھا ہے!

عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

از:- پروفیسر عبدالحمید ایم اے، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت دس آنہ —
ملنے کا پتہ:- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور

عقیدہ ختم نبوت پر یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتی ہے۔ فاضل مصنف نے عمرانی نقطۂ نگاہ سے بتایا ہے کہ نبوت کے سلسلے کو اگر ختم نہ مانا جائے تو اس سے اُمت میں کس قدر تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اُمّت واحدہ کو کتنے شدید تفرق و انتشار سے دوچار ہونا پڑے گا "ختم نبوت" کا عقیدہ جو کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اُمّتِ مسلمہ کی سالمیت اور وحدت کا ضامن ہے!

شادی کمیشن کی رپورٹ پر ایک نظر

از:- شہزادی عابدہ سلطانہ، ضخامت ۱۸ صفحات، قیمت فی کاپی ڈھائی آنہ —
ملنے کا پتہ:- ادارۂ خواتین اچھرہ، لاہور

شادی کمیشن کی بدنام اور مغرب زدہ رپورٹ پر شہزادی عابدہ سلطانہ نے انگریزی زبان میں تبصرہ کیا تھا۔ جو روزنامہ "ڈان" میں بالاقساط شائع ہوا تھا، ادارہ خواتین لاہور نے اس معرکہ آرا مضمون کا اُردو ترجمہ خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے تاکہ اُردو داں طبقہ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔ شہزادی عابدہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انھوں نے "شادی کمیشن رپورٹ" کی خلافِ شریعت دفعات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ استدلال، اندازِ بیان اور زبان ہر چیز خوب سے خوب تر ہے!

گناہِ بے لذت

از:- مفتی مولانا محمد شفیع صاحب، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت بارہ آنہ —
ملنے کا پتہ:- ادارۂ اسلامیات انارکلی، لاہور

مسلمان کا مذاق اُڑانا — اپنا نسب بدل کر ظاہر کرنا — پاجامہ ٹخنوں سے نیچا پہننا — امام سے آگے نکل جانا — نماز میں کپڑوں سے کھیلنا — صدقہ دے کر احسان جتانا — غیر اللہ کی قسم کھانا (وغیرہ) ایسے گناہ ہیں جن کے کرنے میں نہ کوئی دنیاوی نفع ہے اور نہ لذت ہے۔ اس کتاب میں ایسے تمام گناہوں کا ذکر اور اُن کے متعلق احکام ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر کامیاب اور سو فیصدی مفید ہے!

تعمیر ادب (حصہ اول ۲)

از:- عبدالغنی اصغر، و عبدالواحد رحیمی، ۱۲ صفحات، قیمت تین آنہ —
ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر ادب ۳۰ دل محمد روڈ، لاہور

بچوں کے لئے ہر اعتبار سے مفید قاعدہ ہے۔ جس سے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں فائدہ اُٹھانا چاہئے!

خوش رنگ پھول

از: — نذیر احمد ناظر۔ ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت چھ آنے —
ملنے کا پتہ: — آسان کتاب گھر، قصور

اس کتابچہ میں بچوں کے لئے ہلکی پھلکی نظمیں درج ہیں۔

چال صبا کی ہے متوالی — وجد میں ہے ہر گل کی ڈالی ص۱

"صبا" "وجد" اور "گل" بچوں کے لئے کتنے مشکل لفظ ہیں، تو دوسرا مصرع کاش اس طرح ہوتا: —

ع جھومتی ہے ہر پیڑ کی ڈالی

خوشبو سے مخمور فضا ہے — فرحت سے معمور ہوا ہے ص۱

یہ شعر بھی بچوں کے لئے مشکل ہے — اور خوشبو سے فضا کا مخمور ہونا بے جوڑ سی بات ہے۔

بیٹھا پڑتا زمیں کا ہے جوبن — اور پھولوں سے ہیں لدے گلشن ص۲

پہلا مصرع کسی عشقیہ مثنوی کے لئے موزوں تھا۔ بچوں کو "جوبن کا بیٹھا پڑنا" سمجھانے میں کتنی دشواری پیش آئے گی۔ مصرع ثانی میں "لدنا" بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ "لدنا" گرد و غبار کے لئے بولتے ہیں۔ یہاں "سے پٹے" کا محل تھا!

سدِّ باب ذریعہ

از: — علامہ ابن قیم، ترجمہ: — مولانا عبداللہ العمادی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت دس آنہ
ملنے کا پتہ: — مکتبۂ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد دکن۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہی کتاب کی افادیت اور ثقاہت کی سب سے بڑی شہادت اور ضمانت ہے
"سدباب ذریعہ — اصول شریعت میں سے اس اصل عظیم کی تشریح پر مشتمل ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شئے کو حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہنچانے والے تمام وسائل و ذرائع کو بھی ممنوع کر دیتا ہے تاکہ اس شئے کی تحریم مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور لوگ اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں۔ اس کو علامہ موصوف نے مدلل بحث کے ساتھ ۹۹ مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ اسلام نے ان تمام امور کو ممنوع قرار دیا ہے جو خواہ بجائے خود مباح ہوں لیکن جنھیں کسی گناہ کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، جو کسی انسان کو بلا ارادہ کسی مفسدہ میں مبتلا کر سکتے ہوں" (ناشر)

کتاب اپنے موضوع پر بے مثال ہے۔ ترجمہ بھی سادہ، عام فہم اور دل نشین ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف، مترجم اور ناشر کو اجر جزیل عطا فرمائے (آمین)

قادیانیت کا آغاز و انجام

مرتبہ — پروفیسر الیاس برنی۔ ضخامت ۳۲ صفحات (بلا قیمت برائے تقسیم عام)
ملنے کا پتہ: — مطبع ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، کنگلمنڈی، حیدرآباد دکن (بھارت)

پروفیسر الیاس برنی (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ) نے قادیانیت کے خلاف جو قلمی جہاد کیا ہے۔ اس کا ان کو آخرت میں اتنا اجر ملے گا کہ ہم خود اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے!

اس کتابچہ میں جناب برنی نے قادیانیوں کی کتابوں ہی کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ —
قادیانیت "سرکار انگریزی کا خود کاشتہ پودا" ہے — یہ انگریزوں کی نمک پروردہ جماعت ہے —
قادیانیوں نے انگریزی راج میں مسلمانوں کی مخبری کی ہے — مرزائے قادیان نے بیسیوں کتابیں سلطنت انگریزی

کی تائید اور جہاد کی مخالفت میں لکھی ہیں — مرزا غلام احمد حکومت برطانیہ کو قادیانی تلوار کہتا تھا — گورنمنٹ برطانیہ ایک ڈھال ہے جس کے نیچے احمدی جماعت آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے — قادیانی عام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں - - - - - - !

یہ کتابچہ اگرچہ "لقامت کہتر" ہے مگر "لقیمت بہتر" ہے، یہ چند صفحے ہی قادیانیت کا پول کھولنے کے لئے بہت کافی ہیں!

قہقہے از: — نذیر احمد ناظر، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت پانچ آنہ —
ملنے کا پتہ: — آسان کتاب گھر دارالادب قصور

بچوں کے لئے مزاحیہ نظمیں جناب نذیر احمد ناظر نے کہی ہیں۔ مقصد ہنسی ہنسی کی باتوں میں اخلاق کا درس دینا بھی ہے۔

— ڈھب کوئی ایسا کیجئے (صفحہ ۵)

"ڈھب کرنا" روزمرہ نہیں ہے۔ شعروں میں کہیں کہیں بندش بہت سست ہوگئی ہے!

یادگارِ صفی مرتبہ — خواجہ حمید الدین شاہد ایم۔ اے، ضخامت ۲۰ صفحات، (بڑا سائز) قیمت دس آنہ۔
ملنے کا پتہ: — سب رس کتاب گھر، ادبیات اردو، رفعت منزل۔ خیرت آباد، حیدرآباد دکن

بہبود علی صفی اورنگ آبادی، دکن میں مشہور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ داغ کے رنگ میں غزلیں کہتے تھے وضع اور مشرب رندانہ تھا۔ کلام میں صفائی، روزمرہ اور سادگی کی فراوانی ہے:—

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے　　　شب کو اک آواز آتی ہے "الٰہی کیا کروں"

ہرا تڑکا الٰہی! ذرہ ذرہ دھر کا جاگا　　　مری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا　　　بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

جب اُس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا　　　زبان پر نہیں صورت پہ اعتبار کیا

تیری مژگاں کے تصور نے جگایا رات بھر　　　ہم تو سنتے تھے کہ کانٹوں پر بھی آجاتی ہے نیند

سب کو کیا کیا بندھی ہیں اُمیدیں　　　وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے

چراغِ زندگی مدھم ہے لیکن　　　چراغِ آرزو مدھم نہیں ہے

رضائے دوست پہ مرمٹنے والے　　سمجھ کر کیا کریں گے خیر و شر کو

اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ　　سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا　　قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا

اس یاد کے پورے کر دلائے کوئی کیا یاد　　میرا ہی کہا یاد نہ اپنا ہی کہا یاد

حضرت مضطر اورنگ آبادی کے سالانہ یادگار جلسہ میں جو مضامین نظم و نثر اُن کی شخصیت اور شاعری پر پڑھے گئے تھے وہ اس کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ مضامین سطحی زیادہ اور بلند کم ہیں!

ارمغانِ امجد | مرتبہ — خواجہ حمید الدین شاہد (ایم۔ اے) ضخامت ۸۰ صفحات (بڑا سائز) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل، خیرت آباد، حیدرآباد دکن (بھارت)

حضرت امجد حیدرآبادی دکن کے مشہور رباعی گو شاعر ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے امجد صاحب کو "حکیم الشعراء" کا خطاب دیا تھا اور ٹھیک دیا تھا کہ اُن کی رباعیاں حکمت و معرفت کی ترجمان ہوتی ہیں۔ امجد قلندر صفت شاعر ہیں۔ قدیم صوفی شعراء کی جیتی جاگتی یادگار! جس رنگ میں وہ رباعیاں کہتے ہیں۔ اُس میں اُن کا کوئی رلیف نہیں ہے — چند نمونے۔ —

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے　　مانند حباب اُبھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس　　تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

ہر راہِ کرم حُسنِ عمل تکتا ہے　　احسان سے بابِ معرفت کھلتا ہے
ہمدردی غیر میں ہے اپنا بھی بھلا　　کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے　　کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی　　سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں　　پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز　　کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

اے قطرۂ آب پھیل دریا ہو جا　　اے طائرِ مدح مرغِ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر　　اے ذرۂ خاک اُٹھ ثریا ہو جا

جناب خواجہ حمید الدین شاہد کی یہ ادب دوستی اور جوہر شناسی اُردو تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اُن کی تحریک پہ حضرت امجد حیدر آبادی کی علمی خدمات کے اعتراف کے لئے بڑے پیمانہ پر ایک تقریب منائی گئی۔ جس میں امجد صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ اور کیسۂ زر پیش کیا گیا۔

اس کتاب (ارمغانِ امجد) میں حضرت امجد حیدر آبادی کے جشن الماسی و Diamond jubilee (منعقدہ ۲۱ جنوری ۱۹۵۵ء) کے مقالات، نظمیں، مشاہیر کے پیام، سپاس نامہ و جواب سپاس نامہ اور اس تقریب کی مکمل روداد شامل ہے، حکیم الشعراء کی شاعری پر بعض مقالے خاصے وزنی اور دلچسپ ہیں۔ اس تقریب کے سات فوٹو گروپ بھی کتاب کی زینت ہیں!

ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں

از:- مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، ضخامت ۴۰ صفحات (قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی، لاہور

اس کتاب میں کتاب و سنت اور اقوال ائمہ کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ کفر، ایمان اور مسلمان کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اور اعتقاد و عمل کا کیا درجہ رکھنے سے کفر و ایمان اور فسق و زندقہ کا کیا حکم لگایا جاسکتا ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ فاضل مصنف نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے!

فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو

(جلد اوّل) مرتبہ:- مولوی غلام رسول و مولوی محمد اکبرالدین صدیقی (ایم - اے)

صفحات ۲۹۵ (بڑا سائز) قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیرت آباد، حیدر آباد دکن (بھارت)

ادارۂ ادبیات اُردو ۱۹۳۱ء میں قائم کیا گیا تھا، اس چھبیس سال کی مدت میں اس ادارے نے اُردو زبان و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں،" ادارۂ ادبیات اُردو" کی کامیابی میں ڈاکٹر محی الدین زور کی انتھک کوششوں کا بڑا حصہ ہے کہ موصوف اس کے بانی ہیں اور خمس نا لقشہ اور روح رواں بھی!

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو کی اس کتاب کا نمبر ۲۰۱ ہے! ادارۂ مذکور کے کتب خانہ کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ اس کتب خانہ کی پانچ ہزار کتابوں کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔

فلسفہ و مذہب ـــ علوم طبیعی ـــ فنون (باغبانی، لاسلکی، عطر سازی وغیرہ) ـــ اجتماعیات ـــ لسانیات ـــ ادبیات ـــ تاریخ و تذکرہ ـــ حوالات (ڈائرکٹریاں، اخبارات و رسائل، رپورٹیں وغیرہ) ان عنوانات کے تحت کتابیں فہرست میں درج کی گئی ہیں، ایک نمونہ؛ ـــ

ملے یہ عنوان کھٹکا، کوئی اور موزوں عنوان ہوتا تو بہتر تھا ـــ نیز کتاب کے سامنے اُس کی قیمت بھی درج ہوتی تو اچھا تھا!

نشان سلسلہ	مؤلف	کتاب	مقام وطبع	سنہ	صفحات	معطی	کیفیت
۱۱	عبدالباری ندوی (مترجم)	حکایۃ النفس	حیدر آباد دارالطبع جامعہ عثمانیہ	۱۹۲۸	۹۲۵	جامعہ عثمانیہ	ترجمہ کتاب " میزل آن سائیکالوجی " از جے - ایف - اسٹوٹ

یہ فہرست بڑے کام کی چیز ہے، عوام و خواص سبھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں!

اسلام اور تھیا کریسی

از:۔ عبدالحمید صدیقی ایم۔ اے، ضخامت ۱۷۵ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ، دلکھائی، چھپائی اور کاغذ بہ چیزیں دیدہ زیب، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغِ راہ، لاہور

پاکستان میں ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی کمی نہیں ہے مگران میں کتنے ایسے ہیں جن کے فکر و عمل کا محور " اسلام " ہے اور جو اقامتِ دین کی تڑپ اپنے اندر رکھتے ہیں! پروفیسر عبدالحمید صدیقی (ایم۔ اے) کو علم کے ساتھ عمل کی بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے۔ اسلام پسند اربابِ قلم اور اہلِ فکر میں آن کو ممتاز و بلند مقام حاصل ہے، موصوف کا قلم اشاعتِ دین کے لئے وقف ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ " تھیا کریسی " اصل میں کسے کہتے ہیں؟ پھر اس سے بحث کی ہے کہ " اسلام میں تھیا کریسی کیوں نہیں ہے "؟ اس کے بعد " اسلام اور تھیا کریسی " کے اساسی تصورات اور دونوں کے مقاصد کا تقابل کیا ہے۔

دلائل قوی، تنقید محتاط و معتدل اور اندازِ بیان سنجیدہ اور شگفتہ ہے، کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ گروہ میں زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے۔ تاکہ ذہنوں کے شکوک کا ازالہ ہو سکے۔ اور یورپ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں دور ہو سکیں! کتاب کے آخر میں " کتابیات " پڑھ کر مصنف کی کاوش و عرق ریزی کا اندازہ ہوا کہ انہوں نے اردو، انگریزی اور عربی کی درجنوں کتابیں پڑھنے کے بعد یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

نادر شاہ اور اتحادِ سنی و شیعہ

از:۔ حافظ محمد اسلم جیراج پوری، ضخامت ۳۲ صفحات، (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ حسن احمد صاحب مہتمم مدرسہ فیض الاسلام کوڈیور، جولا پیٹ (مدراس)

جب رسالہ " طلوعِ اسلام " دہلی سے نکلتا تھا تو ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون حافظ محمد اسلم جیراج پوری مرحوم کا اس میں چھپا تھا۔ یہ کتابچہ اسی مقالہ سے ماخوذ ہے۔

اس کتابچہ میں سنی اور شیعہ علماء کے ایک مناظرہ کی روداد درج ہے، یہ مناظرہ نادر شاہ کے ایماء سے ہوا تھا، مناظرہ انتہاء یہ بتایا گیا ہے کہ شیعی مناظر نے " سبِ شیخین " کے چھوڑنے کا اعلان کیا، متعہ کی تحریم تسلیم کی، تمام صحابۂ کرام کو " عدل " مانا، اور مناظرہ کے آخر میں شیعی، حنفی اور شافعی علماء نے ایک دوسرے سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔

" صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں، اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کی جائے۔" (صفحہ ۲۴)

واقعہ بھی یہ ہے کہ " شیعیت اہلِ بیتِ اطہار سے والہانہ محبت کا نام ہے "۔ " سبِ صحابہ " شیعیت نہیں " رفض " ہے! افسوس ہے کہ ایران کے مجوسی نہاد اہلِ علم نے " شیعیت " کے پردے میں " رفض " کی داغ بیل ڈال کر دین میں ایک مستقل

تفرقہ پیدا کر دیا۔

آسان درس قرآن
(حصہ دوم)

مؤلفہ :- مولوی حافظ محمد یعقوب، ضخامت ۴۸ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ :- محمد انیس انصاری نیا بازار کامٹی (ایم پی)

لائق مؤلف نے قرآن پاک کی دس سورتوں کی عام فہم زبان میں تشریح کی ہے۔ جذبۂ ایمانی کی کتاب میں فراوانی ہے۔

"داخل ہوگا اس میں وہی بدبخت جو جھٹلایا ——— اور دور دور رہے گا اس سے وہ متقی جو اپنا مال خرچ کیا۔" (صفحہ ۱۷)

"اس نے جھٹلایا" اور "جس نے اپنا مال خرچ کیا" لکھنا چاہئے تھا کہ یہی روزمرہ ہے!

MILLAT HIGH SCHOOL MULTAN
Plans and observes
SIRAT PROJECTS

ضخامت ۴۲ صفحات! (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ :— ملت ہائی اسکول، ملتان شہر

ملت ہائی اسکول ملتان، اس اعتبار سے اپنی طرز کا واحد ادارہ ہے۔ جس میں محکمہ تعلیمات پاکستان کے مجوزہ نصاب کی تعلیم کے علاوہ اخلاقی اور اسلامی بنیادوں پر بھی طلباء کی تربیت کی جاتی ہے۔ اس مدرسہ کے اساتذہ اور منتظمین سب کے سب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس ہائی اسکول کے طلباء کے رگ و ریشہ میں اسلامی اخلاق پیوست کر دیا جائے!

اس مقصد کے لئے ملت ہائی اسکول ملتان میں "پندرہ روزہ" اور "ہفتہ وار" دینی پروگراموں کا انتظام کیا جاتا رہتا ہے۔ اس سال ربیع الاول کے شروع کے پندرہ دنوں میں "سیرت" کا پروگرام رکھا گیا، ہم نے اس مقدس پروگرام کی ایک جھلک اپنی آنکھ سے دیکھی ہے۔ اور ملت ہائی اسکول کے ارباب حل و عقد کے لئے دل سے دعائیں نکلی ہیں!

اس کتابچہ میں "پڑھنا"، "لکھنا"، "بولنا"، اور ساتھ ہی گرامر کی مشق، سیرت نبوی ہی کے اسباق سے کرائی گئی ہے، ہر سوال اسی مقدس موضوع پر ہے! دینی تربیت کا یہ ایک مثالی طریقہ ہے جس کو پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں عام ہونا چاہئے!

ملت ہائی اسکول کے کارکنوں کی دینی فکر کی اس اپج پر رشک آتا ہے، یہی وہ "فراست مومن" ہے جس کے سامنے یونان و روما کی عقل و دانش گرد ہے! پاکستان کے لئے وہ دن کتنا مبارک ہوگا جب اس دینی فکر اور مضبوط کیریکٹر کے افراد کی مشورت سے یہاں کا نظام حکومت چلے گا! اللہ یہ دن کب آئے گا؟ (اللّٰھم انصرھم)

مشرقی پاکستان کے حالات و مسائل کا جائزہ

از :- سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۴۶ صفحات (قیمت درج نہیں) —
ملنے کا پتہ :- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور

اسی سال مارچ کے مہینہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا، اور وہاں کے بڑے بڑے شہروں کے تاریخی اجتماعات میں تقریریں کی تھیں، مشرقی پاکستان کے مسلم عوام کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اپنی بستیوں سے پیدل چل چل کر مولانا مودودی کی تقریر سننے اور انہیں دیکھنے کے لئے پہنچتے تھے!

۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مولانا موصوف نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہال ڈھاکہ میں جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے کارکنوں
طاب کیا تھا، مولانا کی یہ تقریر کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔ اس تقریر کے چند ذیلی عنوانات سے اس کی قدر و
ت اور اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
مہاجرین کی خدمات اور اُن کی غلطیاں —— شکایت کے حقیقی اسباب —— زبان کا مسئلہ —— شکایات
، جائز فائدہ اٹھانے والے عناصر —— کمیونسٹ —— ہندو —— سیاسی قسمت آزما —— ارباب حکومت کی
بے تدبیری —— متحدہ محاذ کا انجام اور اُس کے نتائج —— اصلاح کا موقعہ —— اصلاح کی تدابیر ——
ارکانِ جماعتِ اسلامی کو ہدایات!

"خوب سمجھ لیجئے کہ جماعتِ اسلامی کی طاقت کا انحصار جن چیزوں پر ہے ان میں اوّلین چیز اللہ اور اُس کے دین سے تعلق ہے، جماعتِ اسلامی کوئی ایسی سیاسی پارٹی نہیں ہے جو کوئی سیاسی کھیل کھیلنے کے لئے بنائی گئی ہو، اسے اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے، اور یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبہ اور گوشے میں برپا کرنا ہے، فکر و نظر میں، اخلاق و تمدن میں، سیاست و حکومت میں، معاشرت و معیشت میں، یہ کام جماعت اُس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اُس کے کارکنوں میں اخلاص نہ ہو اور جو اخلاص اس کام کے لئے درکار ہے وہ صرف تعلق باللہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے!" (صفحہ ۲۹)

اُن لوگوں کو کیا کہئے کہ حق و صداقت کے اس مبلّغ و منادی پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑتے ہیں اور نہ بندوں سے شرم کرتے ہیں اور نہ اللہ سے!

WHAT AGITATES THE MIND OF THE EAST | از:۔ عبدالحمید (ایم۔ اے) ضخامت ۳۲ صفحات (قیمت درج نہیں) — ملنے کا پتہ:۔ مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور

برطانیہ کے مشہور مزدور لیڈر مسٹر بیون (ANEURIN BEVAN) نے روزنامہ "ڈان" (کراچی) کے
مذہبی نمائندہ سے ایک انٹرویو میں اس دینی جد و جہد کا مذاق اُڑایا تھا جو مسلم ممالک میں "مذہبی دیوانے" (Religious
Enthusiasts) جاری کئے ہوئے ہیں! مسٹر بیون نے کہا کہ مصر اور دوسرے عرب ممالک میں "اخوان" "ایران میں" فدائیان
اسلام، اور پاکستان میں "جماعتِ اسلامی" —— یہ عناصر دراصل ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے ہیں، جس طرح یورپ
کے "مذہبی دیوانے" یورپ میں ناکام ہو گئے، اسی طرح مسلم ممالک میں یہ مذہبی لوگ بھی ناکام ہو جائیں گے"
جناب پروفیسر عبدالحمید نے مسٹر بیون کے ان اعتراضات کا بڑی وزنی عقلی دلیلوں کے ساتھ جواب دیا ہے۔ انہوں
نے بتایا ہے کہ مسٹر بیون عیسائیت کو یورپ میں ناکام پا کر اور کلیسا کو بے دست و پا دیکھ کر "اسلام" کو بھی اسی فیتہ سے
ناپنا چاہتے ہیں، یہ اُن کا زاویۂ نگاہ ہی سرے سے غلط ہے، اسلام ایک زندہ تحریک اور ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، تہذیب
و تمدن کی تمام مفید ترقیوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی اسلام صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے یہ عظیم ترین انقلابی تحریک ناکام
نہیں ہو سکتی"، انگریزی پڑھے لکھے لوگ اس کتابچہ کو پڑھیں تو ان کو اس سے روشنی ملے گی!

اقبال اور مسٹر | از:۔ منشی عبدالرحمٰن خاں، ضخامت ۹۶ صفحات، مجلّد رنگین گرد پوش کے ساتھ — قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:۔ گوشۂ ادب، انارکلی، لاہور

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے صدر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے "اقبال اور ملّا" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں "ملّا" کی آڑ میں علمائے دین پر خوب پھبتیاں چُست کی ہیں بلکہ یوں کہئے کہ اپنے دل کا بخار نکالا ہے! اور سب سے بڑی جسارت بلکہ تحریف و خیانت یہ کی ہے کہ اپنے ان مزعومہ خیالات کا جوڑ علامہ اقبال کے شعروں سے ملا دیا ہے۔

منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اقبال کے مکاتیب اور اُن کے مضامین کے بعض اقتباسات کے ذریعہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے ان الزامات کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقبال علماء دین کا بہت احترام کرتے تھے، اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی ______

"اقبال نے بے شک "ملّا" پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ملّا سے ان کی مُراد ہمیشہ "کٹھ ملا" ہی سے ہے"۔

"اقبال اور ملّا، جس نیک مقصد کے ساتھ لکھی گئی ہے اُس کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی کتاب کے جواب کے لئے جس انشاء اسلوب نگارش اور فلسفیانہ فکر و بصیرت کی ضرورت تھی، اُس کی افسوس ہے کہ کمی محسوس ہوتی ہے!

مصنّف کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے خاص کد ہے، اس کتاب میں مولانا مودودی کے تذکرہ کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر انہوں نے "اینٹی فرنٹ ملّا" کے تحت سٹر پریڈیز کے ساتھ مولانا مودودی صاحب کا بھی ذکر کر ہی ڈالا اور اس طرح انہوں نے اپنی کتاب کی ثقاہت کو بلا وجہ داغدار کر لیا! یہی وہ "کٹھ ملاؤں" کی ذہنیت ہے جس کے لئے اقبال نے کہا تھا:-

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

"زیر بحث رسالہ "اقبال اور ملّا" کے مصنّف **ماشاء اللہ** ایم اے، پی، ایچ، ڈی ہیں" (صفحہ ۲۸)

اس عبارت سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ مصنّف کا نام "ماشاء اللہ" ہے!

"اگر شجر و بحر آفتاب و ماہتاب ۔ ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۱۵)

"حجر کا املا "بحر" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ______" مرزا غلام مصطفیٰ صاحب تبسّم علامہ اقبال کو ملنے گئے (صفحہ ۹۴) "سے ملنے گئے" لکھنا تھا کہ یہی روزمرہ ہے!

دینِ خالص از:- مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت آٹھ آنہ ______

ملنے کا پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد دہلی۔

اس کتاب کے عنوانات ہی سے کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

اللہ اور رسول کا اتّباع ______ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتّباع کا معیار ______ امتہ محمدیہ کے تین گروہ محدثین، فقہاء، اولیاء اللہ ______ اللہ اور رسول کی اطاعت کا معیار ______ اللہ اور رسول کی عظمت و محبت ______ محبت و عظمت کی علامات!

"حضرت مولانا منظور حسین صاحب کے کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ فقہ حنفی کی پابندی کرتے ہوئے کتاب و سنت کا اتّباع کرنا ہی راہِ نجات ہے اور باقی جہالت و ضلالت ہے" (صفحہ ۵)

تقلید کا یہی وہ غلو ہے جس نے مسلکِ تقلید کو بدنام کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو افراط و تفریط سے بچائے ہے!

پیغامِ رحمت | مرتبہ — محمد خلیل الرحمٰن مکتستانی! ضخامت ۳۲ صفحات،
جناب سید سرور شاہ گیلانی ایڈیٹر "الجماعت" کراچی ۳ سے مفت طلب کی جا سکتی ہے!

اس کتابچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک اور اخلاق و عادات کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے "شمائلِ مقدس" کے اکثر واقعات حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام سے مروی ہیں!

مجموعۂ نظمِ حالی | مرتبہ: — ظہیر احمد صدیقی (ایم۔ اے)، ضخامت ۱۷۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ پندرہ آنہ،
ملنے کا پتہ: — ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن حامد علی بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ ۲

جناب ظہیر احمد صدیقی (ایم۔ اے) نے مولانا حالی کی پندرہ نظموں کو ایڈٹ کیا ہے اور ہر نظم کی خصوصیات دل نشین انداز میں بیان کی ہیں۔ اُن کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔

حالی اپنے اشعار اور نثر کی طرح بے داغ اور عظیم تھے (صفحہ ۱۰) مفہوم تو سمجھ میں آ گیا مگر یہ اندازِ بیان صحتِ وجدان کو کھٹکتا ہے — "تمکین" (صفحہ ۱۴۴) کے معنیٰ "بردبار" محلِ نظر ہے "تمکین" کے معنیٰ رکھ رکھاؤ، قدر و منزلت اور جگہ پکڑنے کے ہیں — "ناتی" (صفحہ ۱۸۱) "ساتھی" کو نہیں رشتہ دار کو کہتے ہیں — "لعبت" (صفحہ ۱۶۲) کے معنیٰ "حسین اور خوبصورت" پڑھ کر حیرت ہوئی۔ "لعبت" تو کھلونے اور گڑیا کو کہتے ہیں — "ودیعت" (صفحہ ۱۸۱) "بخشنے اور عطا کرنے" کو نہیں "امانت اور سپردگی" کو کہتے ہیں: — "فرہنگِ الفاظ" کتاب کا کمزور حصہ ہے!

مولانا حالی کے مسدس موسوم بہ "ننگِ خدمت" کے اس مصرعہ میں: —

ع حق نے شائستۂ ہربات بنایا تھا ہمیں

"شائستۂ ہربات" کی ترکیب پڑھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے "شائستۂ ہر باب" ہوگا!

رسالہ نجاتیہ | از: — مولانا محمد فاخر زائر اللہ آبادی (متوفی ۱۱۶۴ھ) مع اضافات نواب صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۰۷ھ)
ترجمہ: — مولانا حافظ محمد اسحٰق صاحب، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: —
جمعیۃ اہلِ حدیث شیش محل روڈ، لاہور

سلفی مسلک کے عقائد پر یہ ایک معلومات آفریں اور ایمان افروز رسالہ ہے، ہر صفحہ پر متن کے نیچے اُردو ترجمہ ہے! کتاب کے آغاز میں مصنف کے سوانح حیات درج ہیں!

مصری افسانے | مترجمہ: — مولانا عبد الرحمٰن طاہر سورتی (بہ نظر ثانی نعیم احمد ملک ایم۔ اے) ضخامت
۱۹۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ: — انجمن ترقی تعلیم خرشاب (دعل)

عربی کے سات افسانوں کا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، افسانوں کے عنوانات: —

سفرِ حیات — چاندی کے تیس سکے — لاپتہ مجرم — فریشال — موت کا تعاقب — خداوند!! اسے گھڑی بھر کے لئے بُلا دے — مکافات!

ہر افسانہ میں دین و اخلاق کی جھلک ملتی ہے، ترجمہ شگفتہ اور سہل ہے، علامہ محمد سورتی مرحوم کے فرزند ارجمند سے ایسے ہی ترجمہ کی توقع تھی!

"گھبرایا ہوا" کی جگہ "گبھرایا ہوا" (صفحہ ۵۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ——— "قدموں کی چاپوں کو بغور سنتی رہی" (صفحہ ۵) "چاپ" کی جمع "چاپوں" عام طور پر سننے میں نہیں آئی، ——— "یہ ایک قدیم محل ہے جو زمانہ کے چکر میں آکر تباہ حال ہوا" (صفحہ ۶۶) اس جملہ کا اندازِ بیان کسی "آدمی کی تباہ حالی" کے لئے زیادہ موزوں تھا! ——— اصل افسانوں کے ساتھ اُن کے لکھنے والوں کے نام ضرور دینے چاہیئے تھے!

تحقیق گیارہویں

مُرتّبہ: — شعبۂ تبلیغ جماعت غرباءِ اہلِ حدیث، محمدی مسجد، بنس روڈ، کراچی (مفت مل سکتا ہے)

اس کتابچہ میں حنفی مذہب کی مشہور کتاب ——— ردّ المحتار ——— کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "خدا کے سوا اوروں کی نذر کے حرام ہونے پر اُمّت کا اجماع ہے، نہ یہ نذر ماننی جائز ہے اور نہ اس کا پورا کرنا ضروری ہے، بلکہ حرام اور قطعی حرام ہے" ——— اور ..... یعنی اس کے حرام ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ نذر نیاز مخلوق کے لئے ہے اور مخلوق کے لئے نذر جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت کے لائق کوئی مخلوق نہیں، دوسری وجہ یہ کہ جس کے لئے یہ نذر کی گئی ہے وہ میّت ہے اور میّت کسی چیز کی ملکیت یا اختیار نہیں رکھتی، تیسری وجہ یہ ہے کہ نذر نیاز کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میّت نفع نقصان پہنچا سکتی ہے، اور ایسا عقیدہ صریح کفر ہے" (اُردو ترجمہ ——— عبارت ——— ردّ المحتار)

آخر میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کا فتویٰ درج ہے جس میں "گیارہویں" کو بدعت بتایا ہے! افسوس! حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مبلّغ توحید کو اُن کے نادان عقیدت مندوں نے "اللہ کا شریک" بنا کر چھوڑا ہے (معاذ اللہ)